بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سنی شیعہ کشمکش

۱۹۷۹ء کے ایرانی انقلاب، مشرقِ وسطیٰ کے تنازعات
اور پاکستان کے داخلی حالات کے تناظر میں

حضرت
مولانا
ابوعمار زاہد الراشدی

—ناشر—

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

عنوان : سنی شیعہ کشمکش
تالیف : مولانا ابو عمار زاہد الراشدی
مرتب : ناصر الدین خان عامر
مجموعہ : مئی ۲۰۲۴ء
ناشر :
اشاعت :

فہرست

- ☆ پیش لفظ 19
- ☆ عرضِ ناشر 20
- ☆ سعودی حکومت کا اقدام اور شاہِ ایران 21
- ☆ شیعہ سنی فسادات کون کرانا چاہتا ہے؟ 21
- ☆ ایرانی عوام کی جدوجہد 24
- ☆ عالمِ اسلام میں سنی شیعہ کشیدگی اور اردن کے شاہ حسین 25
- ☆ "شریعت بل" فرقہ وارانہ ہے؟ 27
- ☆ ایران میں گیارہ روز 28
  - وفد کے شرکاء 29
  - دورہ کا مقصد 29
  - ایران میں ہماری سرگرمیاں 30
    - شوریٰ نگہبان کے جناب آیت اللہ جنتی سے ملاقات 31
    - شوریٰ نگہبان کے جناب آیت اللہ خزعلی کے ساتھ نشست 31
    - نامور فنکار حسین صادق کے فن پاروں کی نمائش 32
    - قم کے دینی مدارس 33
    - جناب آیت اللہ منتظری سے ملاقات 34
    - سیدہ فاطمہ رحمہا اللہ کے مزار پر حاضری 34
    - تہران کی امام جعفر صادقؒ یونیورسٹی میں دوپہر کا کھانا 34
    - شوریٰ ملی کی کارروائی کا مشاہدہ اور ارکانِ شوریٰ سے ملاقات 35
    - ایران عراق جنگ کے اثرات 36
    - تہران کی مسجد ابوذر غفاریؓ کے جلسۂ عام میں شرکت 36
    - تہران کے سابق شاہی محلات 37

- ◦ شوریٰ نگہبان کے قانون دان ارکان سے ملاقات 37
- ◦ مشہد اور امام مسلمؒ کا شہر نیشاپور 37
- ◦ انقلابِ ایران کے شریک کار سُنی راہنما مولانا عبدالعزیز سے ملاقات 38
- ◦ زاہدان کے سُنی اساتذہ وطلبہ سے ملاقات 38
- • انقلاب ایران ۱۹۷۹ء 39
- ◦ فکری بنیاد 39
- ◦ معاشرہ پر اثرات 40
- ◦ فرقہ وارانہ مسائل کا حل 42
- ◦ اہلِ سُنت کی حیثیت 43
- • ایران میں اہلِ سنت کے مسائل 43

☆ کرم ایجنسی کے افسوسناک واقعات 46

☆ مولانا عبدالعزیزؒ 48

☆ الشیخ ابوالنصر البیانونیؒ 48

☆ بنوری ٹاؤن کا المیہ 49

☆ ایرانی انقلاب کا پھیلتا ہوا دائرہ 50

☆ ایران عراق جنگ: اسلامی اتحاد کانفرنس میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی شرکت 52

☆ سانحۂ مکہ اور ایرانی راہنما کی دھمکی 52

☆ گلگت کے فسادات اور حکومت کی ذمہ داری 53

☆ ڈیرہ اسماعیل خان کے سنگین حالات 55

☆ ”شریعت بل“ اور تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ 55

☆ اہلِ تشیع کے ہاں عورت کی حکمرانی کی حیثیت 56

☆ تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ: نفاذِ اسلام کی جدوجہد میں معاون یا رکاوٹ؟ 58

- • ایران کی اہلِ سُنت اقلیت کی حیثیت 59
- • ایران کا دستور اور سرکاری مذہب 61
- • انقلابِ ایران ۱۹۷۹ء کے اثرات بیرون ممالک پر 62

- ۱۹۵۱ء میں پاکستانی علماء کے ۲۲ دستوری نکات 63
- انقلابِ ایران کے بعد پاکستان میں اہلِ تشیع کے عزائم 63
- انصاف کا تقاضہ 64

☆ مولانا حق نواز جھنگوی شہیدؒ 65

☆ پاکستان میں نفاذِ اسلام: ایک ایرانی راہنما کا تجزیہ 67

☆ ''شریعت بل'' پر فرقہ واریت کا اعتراض 69

☆ امام مالکؒ کی طرف متعہ کے جواز کی نسبت 70

☆ الاستاذ عبد الفتاح ابو غدۃ کے ساتھ ملاقات 70

☆ مسئلہ کشمیر: چین اور ایران کا طرزِ عمل 72

☆ سنی شیعہ کشمکش کے اسباب و عوامل 74
- عقائد و نظریات کا اختلاف 74
- دینی تحریکات میں اہل تشیع کی شرکت 76
- محاذ آرائی اور تشدد کی حالیہ فضا کے اسباب و عوامل 77
  - (۱) قومی معاملات میں جداگانہ شیعہ تشخص کا مطالبہ 77
  - (۲) حضرات صحابہ کرامؓ پر تبرّا 78
  - (۳) اہلِ تشیع کے ماتمی جلوس 79
- مستقبل کے امکانات 80

☆ کھاریاں فائرنگ کیس: ارباب حل و عقد کی خدمت میں عرضداشت 81

☆ پاکستان کے دینی حلقے: ایک بی بی سی پروگرام کی تفصیل 83
- جھنگ کی سُنی شیعہ کشمکش 83
- دینی مدارس کا ناگفتہ بہ تصور 84
- توہینِ رسالت کا ایک مقدمہ اور اس کے کردار 85
- مسئلہ ختم نبوت اور قادیانیت 86
- لاہور ہائی کورٹ میں توہینِ رسالت کا مقدمہ 88

☆ ایران کے اہلِ سُنت علماء کی حالت زار 89

☆ مولانا ضیاء الرحمان فاروقی شہیدؒ.......................91
☆ امن فار مولا یا مطالبات کا ون وے ٹریفک.......................92
☆ مذہبی راہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریاں.......................94
☆ انسدادِ دہشت گردی کا قانون اور مذہبی حلقے.......................95
☆ "تحریک نفاذِ فقہ جعفریہ" سے "تحریکِ جعفریہ".......................97
• سید محمد دہلوی صاحبؒ اور مولانا محمد علی جالندھریؒ.......................97
• جداگانہ شیعہ تشخص کے مطالبات.......................98
• سپاہ صحابہؓ کا شدت پسندانہ طرز عمل.......................98
☆ سنی شیعہ کشیدگی کی آڑ میں!.......................99
• مسلح تصادم کے خارجی محرکات.......................100
◦ دارالعلوم کورنگی کراچی کا واقعہ.......................100
◦ لاہور کینٹ کے علاقہ کماہاں کا واقعہ.......................101
◦ چنیوٹ کی ایک امام بارگاہ کا واقعہ.......................102
☆ سنی شیعہ اختلافات اور امامِ مسجدِ نبویؐ.......................102
☆ سپاہ صحابہؓ کا موقف اور انصاف کے معروف تقاضے.......................103
• سپاہ صحابہؓ پاکستان کا موقف.......................104
• وزیر اعظم کے نام خط اور اس کا جواب.......................105
• اعلیٰ سطحی عدالتی کمیشن کے قیام کی ضرورت.......................106
☆ سپاہ صحابہؓ کے مظاہرے اور مطالبات.......................106
☆ باغِ فدک اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ.......................108
☆ ایرانی سفیر کے طالبان حکومت سے چار مطالبات.......................109
• (۱) ایرانی سفار تکاروں کو رہا کیا جائے.......................110
• (۲) شمالی اتحاد کو حکومت میں شریک کیا جائے.......................110
• (۳) داخلی معاملات میں متوازن طرز عمل اختیار کیا جائے.......................111
• (۴) بین الاقوامی ضابطوں کو قبول کیا جائے.......................112

☆ اسلام کا نظامِ حکومت اور رائے عامہ.......... 113
- "جمہوریت" اپنے لغوی معنوں میں.......... 113
- نظامِ حکومت کی تشکیل میں رائے عامہ کی اہمیت.......... 114
  - اہلِ تشیع کا امامت کا تصور.......... 115
  - اہلِ سنت کا خلافت کا تصور.......... 115
- نظامِ حکومت کے نظم میں رائے عامہ کی اہمیت.......... 116
- نظامِ حکومت کے راہنما اصول.......... 117

☆ اسلام میں عامۃ الناس کی رائے.......... 117
- مغربی جمہوریت.......... 117
- اسلام میں رائے عامہ کی حیثیت اور دائرہ کار.......... 118
  - خلیفہ اولؓ کا انتخاب عوامی رائے سے.......... 118
  - خلیفہ دومؓ اور عوامی رائے.......... 118
  - عوامی مشاورت کی ضرورت.......... 119

☆ سنی شیعہ کشیدگی کے اسباب پر ایک نظر.......... 120
- وزیر اعظم کی کمیٹی اور ملی یکجہتی کونسل.......... 120
- باہمی تعاون واشتراک کا دور.......... 122
  - مولانا مفتی جعفر حسین کا خیر مقدم.......... 123
  - ایک شیعہ اے ایس آئی کی وضع داری.......... 123
- تعبیرات کا نہیں، اعتقادات کا اختلاف.......... 125
- سُنی شیعہ کشمکش کے اسباب.......... 125
  - (۱) صحابہ کرامؓ پر تبرّا.......... 125
  - (۲) عزاداری کے جلوس.......... 126
  - (۳) جداگانہ مذہبی تشخص کے مطالبات.......... 126
  - (۴) انقلابِ ایران کے اثرات.......... 127
- سُنی ردعمل.......... 127

☆ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر دین کی تکمیل؟........................129
☆ سنی شیعہ کشیدگی اور جناب ظفر حسین نقوی........................130
☆ سنی شیعہ تنازعہ کے بارے میں کمیٹی........................136
☆ متعہ اور پاکستان لاء کمیشن........................137
• متعۃ الحج........................138
• متعۃ النکاح........................138
• متعۃ الطلاق........................140
• پاکستان لاء کمیشن کی تجویز........................140
☆ مذہبی قوتوں کو آپس میں لڑانے کا امریکی منصوبہ........................142
☆ جہادی تربیتی مراکز اور تحریکِ جعفریہ پاکستان........................144
☆ جہادی تربیتی کیمپ: وزیر داخلہ کے نام کھلا خط........................149
☆ پاکستان، افغانستان اور ایران کی کنفیڈریشن کی تجویز........................153
• جہادِ افغانستان اور وسطی ایشیا سے روس کی پسپائی........................154
• ترکی کی خلافتِ عثمانیہ اور ایران کے صفوی حکمران........................155
• افغانوں اور مغلوں کی کشمکش........................155
☆ شورٰی سے ولایتِ فقیہ تک........................156
☆ شام میں علمائے اہل سنت کی رہائی........................157
☆ کیا اسلامی نظام صرف مولویوں کا مسئلہ ہے؟........................158
• ۱۹۵۱ء میں ۲۲ دستوری نکات پر مکاتبِ فکر کا اتفاق........................158
• ۱۹۷۳ء کی اسلامی دفعات پر مکاتبِ فکر کا اتفاق........................159
• عوامی حمایت کی کسوٹی........................160
• نفاذِ اسلام صرف مذہبی جماعتوں کی ذمہ داری ہے؟........................160
☆ حق نواز کی پھانسی اور مذہبی انتہا پسندی........................161
☆ سنی و شیعہ رہنماؤں سے ایک دردمندانہ گزارش........................164
☆ پارلیمنٹ کے ذریعے اجتہاد؟........................166

☆ امریکہ عالمی قیادت کا اہل نہیں: جناب آیت اللہ خامنہ ای کا خطاب............167
- اسرائیل اور برطانیہ کی حالیہ کشمکش............167
- امریکہ کے عالمی کردار پر ایک نظر............169
- امریکہ عالمی قیادت کا اہل نہیں............170

☆ ایرانی قوانین اور اقوامِ متحدہ کا منشور............170
- مسلم ممالک میں شرعی سزاؤں کے خلاف مہم............171
- اقوام متحدہ کا منشور اور اسلامی تعلیمات............172
  - مجرم کی عزتِ نفس............172
  - سنگین جرائم یا انسانی حقوق؟............173
  - شریعت سے دستبرداری کا ایجنڈا............174
- اقوام متحدہ کے منشور پر نظر ثانی کی ضرورت............174

☆ ہاشمی سلطنت کا قیام: نئی امریکی سازش؟............175

☆ مولانا ضیاء القاسمیؒ اور اہلِ سنت کی ترجمانی............179

☆ سعودی عرب کی مجوزہ سیاسی اصلاحات............180
- سعودیہ میں عوامی مشاورتی نظام کی تجویز............180
- اسلام کے سیاسی نظام میں رائے عامہ کا کردار............181
  - سیدنا صدیق اکبرؓ کی خلافت............181
  - سیدنا عمر فاروقؓ کی وصیت............182
  - عوامی نمائندوں کا تصور............183

☆ دورِ جدید میں اجتہاد............184

☆ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی روایات اور ان کے ذرائع............186

☆ فلسطینی وزیراعظم محمود عباس اور بہائی فرقہ............186

☆ مولانا اعظم طارقؒ: گرفتاری سے شہادت تک............190

☆ صدام حسین کا اصل قصور جس کا تذکرہ کہیں نہیں............200
- صدام حسین کی گرفتاری............200

- بعث پارٹی اور عرب قومیت پرستی.......................200
- ۱۹۶۷ء کی اسرائیل عرب جنگ کے نتائج.......................201
- صدام حسین: کل کا دوست، آج کا دشمن.......................201
- صدام حسین کے جرائم.......................202

☆ تعلیمی نصاب میں تبدیلی اور آغاخان فاؤنڈیشن.......................203

- سیکولر تعلیمی نصاب کا مغربی ایجنڈا.......................204
- آغاخان کمیونٹی: پس منظر اور عقائد و نظریات.......................205
- تعلیمی نصاب میں مجوزہ تبدیلی پر اضطراب.......................207
- امریکی سفیر اور آغاخان فاؤنڈیشن میں معاہدہ.......................209
- آغاخانی فرقہ کا تعارف.......................211
- نصابِ تعلیم میں مبینہ تبدیلیاں اور حکومتی وضاحتیں.......................212

☆ شیعہ کی تکفیر کے بارے میں ہمارا موقف.......................215

☆ سنی شیعہ کشیدگی: فریقین ہوش کے ناخن لیں.......................216

- کشمکش کے خارجی و داخلی عوامل.......................217
- انتقام در انتقام کا جاہلی رواج.......................218
- امن فارمولے کی ضرورت.......................218

☆ سنی شیعہ کشیدگی۔ چند اہم معروضات.......................219

☆ سنی شیعہ کشمکش کا کارڈ.......................227

☆ فرقہ وارانہ کتابوں کی ضبطی کا معاملہ.......................230

- قادیانیت: مسلم فرقہ یا الگ مذہب؟.......................230
- علمی تحقیقات پر پابندی؟.......................231

☆ قرآن کریم کے چالیس پارے.......................232

☆ صدام حسین اور عرب قومیت.......................233

- صدام حسین کی پھانسی.......................233
- سقوطِ خلافتِ عثمانیہ کے بعد عرب قومیت کے تین رخ.......................235

- ایران عراق جنگ اور اس کی پشت پناہی 236

☆ ہم خیال مسلم ممالک کا الگ بلاک بنانے کی ضرورت 237

☆ خلافت و امامت اور حکومتی نظام کی تشکیل کے جدید تقاضے 239

☆ مولانا جامیؒ اور خواجہ وارثؒ 242

☆ ایران اور فلسطین: امریکی صدر کا مشرقِ وسطیٰ کا دورہ 243

- عرب اخبارات کے تبصرے 243
- فلسطینیوں پر اسرائیلی جبر و تشدد کا نیا راؤنڈ 245
- مسئلہ فلسطین: لبنان میں برطانوی سفیر کا اعترافِ حقیقت 246

☆ اہل السنۃ والجماعۃ کا معیار 247

☆ دہشت گردی کے محرکات کی نشاندہی کی ضرورت 248

☆ مسلکی اختلافات اور اجتماعی قومی تقاضے: امامِ اہلِ سنتؒ کا طرز عمل 249

☆ علامہ علی شیر حیدری شہیدؒ 250

☆ شدت پسندی اور کشمکش کا ماحول: عالمی قوتوں کی ضرورت 253

☆ دینی جدوجہد کے عصری تقاضے اور مذہبی طبقات 255

☆ سنی شیعہ اختلافات: والد محترمؒ اور عم مکرمؒ کا موقف و اسلوب 258

☆ محرم الحرام اور اہلِ سنت کے مقدسات 259

- محرم الحرام کا ماحول 260
- جناب آیت اللہ خامنہ ای کا فتویٰ 260
- ایک سکھ سردار کا مشاہدہ 261

☆ مقدسات کا تحفظ: ملی مجلس شرعی کا اعلامیہ 264

☆ قومی و ملی تحریکات میں اہلِ تشیع کی شمولیت 265

☆ مشرقِ وسطیٰ کی معروضی صورتحال اور چند تجاویز 274

- عرب دنیا کی صورتحال اور استعماری ایجنڈا 275
- مشرق وسطیٰ میں اہل تشیع کی سیاسی پیشرفت اور آلِ سعود 276
- چند تجاویز 277

☆ خلافت وامامت: اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کا بنیادی اختلاف........278
☆ مشترکہ دینی تحریکات اور حضرت امام اہلِ سنتؒ........282
☆ ایران میں زواجِ متعہ کا قانونی فروغ........284
☆ حضرت شیخ احمد فاروقی المعروف مجدد الفؒ ثانی اور ان کی جدوجہد........286
• تصوف کی اصلاح........288
• اہلِ سُنت کے عقائد کا تحفظ........288
• مغل بادشاہ اکبر کے "دینِ الٰہی" کے خلاف جدوجہد........289
• حضرت مجدد الفؒ ثانی کی جدوجہد کا طریق کار........291
• جدوجہد کے اثرات و نتائج........292
• خلاصۂ کلام........294
☆ اسلامی خلافت: دلیل و قانون کی حکمرانی........296
• خلافت کا معنیٰ اور تصور........296
• خلافت نبی اکرمؐ کی نیابت کا نام ہے........298
• خلافت اور پاپائیت میں فرق........298
• خلافت وامامت: اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کا بنیادی اختلاف........299
• آج کے دور میں خلافت وامامت........301
• آج کے دور میں خلافت کے قیام کی صورت........302
• قیامِ خلافت کی ضرورت اور شرعی حیثیت........304
☆ گلگت بلتستان میں خونریز کشیدگی........306
☆ امتِ مسلمہ کی صورتحال: ہوشمندانہ حکمتِ عملی کی ضرورت........310
☆ شام کا بحران........312
☆ اسلام کا نظامِ خلافت........313
• خلافت کا معنیٰ........314
• خلیفہ کس کا نائب ہے؟........315
• خلافت اور امامت میں فرق........316

- خلافت پر تھیاکریسی کا الزام.............317
- خلافت، دلیل و قانون کی حکومت.............317
- نظامِ خلافت کا رفاہی پہلو.............319
- خلافت کی شرعی حیثیت.............320
- خلافت کا تاریخی تسلسل.............321
- نظامِ خلافت کا خاتمہ.............322
- خلافت کا سیاسی ڈھانچہ.............324
  - ◦ خلافت کے قیام کی عملی صورتیں.............325
  - ◦ خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط.............327
- خلافت کی بحالی کی جدوجہد.............328
- خلافت اور رائے عامہ.............329
- آج کے دور میں خلافت کی بحالی کی قابلِ عمل صورت.............331

☆ نفاذِ اسلام کی جدوجہد اور اس کی حکمتِ عملی.............332

☆ شیخ الازہر ڈاکٹر احمد الطیب کی ایرانی صدر محمود احمدی نژاد سے ملاقات.............334

☆ متحدہ سنی محاذ کے قومی سنی کنونشن ۱۹۸۸ء کی قراردادیں.............339

☆ مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی و مذہبی کشمکش.............341
- مصر میں ”اخوان المسلمون“ کی حکومت کا خاتمہ.............341
- نئی نسل کی اپنے ماضی سے بے خبری.............342
- ایران اور سعودی عرب کی کشمکش.............342
- پاک سعودیہ تعلقات.............343
- آلِ سعود کا تاریخی پس منظر.............344

☆ دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی کا سانحہ.............345

☆ سنی شیعہ جھگڑوں کی وجوہات.............351
- دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی کا سانحہ.............351
- سُنی شیعہ کشیدگی کے اسباب.............352

◦ حضرات صحابہ کرامؓ پر تبرّا...........................352
◦ ماتمی جلوسوں کی گزر گاہ...........................353
◦ فقہ جعفریہ کے نفاذ کا مطالبہ...........................353
◦ مشرقِ وسطیٰ کی سُنی شیعہ کشمکش کا کارڈ...........................354
☆ شہداء کا مشن جاری رکھنے کی ضرورت...........................355
☆ شیعہ سنی کشیدگی کا خاتمہ ممکن ہے!...........................357
• جناب محمد الطاف قمر کے خیالات...........................357
• غزالہ یاسمین صاحبہ کا خط...........................357
☆ مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ صورتحال اور حضرت شیخ الہندؒ کا نظریہ...........................361
☆ اسلامک اسٹیٹ آف عراق وشام...........................364
• اسلامک اسٹیٹ کا پس منظر...........................364
• عراقی وزیر اعظم اور شامی صدر کے لیے عالمی حمایت...........................364
• سقوطِ خلافتِ عثمانیہ اور مشرقِ وسطیٰ کی جغرافیائی تقسیم...........................365
☆ ”دولتِ فاطمیہؓ“ کی واپسی کی کوششیں!...........................367
☆ دولتِ فاطمیہؓ کیا تھی؟...........................368
☆ پاکستان کو ”سنی ریاست“ قرار دینے کا مطالبہ...........................370
• متفقہ یادداشت...........................371
◦ مطالبہ نمبر ا: متعلقہ نصاب دینیات...........................372
◦ مطالبہ نمبر ۲: متعلقہ ماتمی جلوس شیعہ...........................375
◦ مطالبہ نمبر ۳: سنی اوقاف بورڈ...........................376
◦ مطالبہ نمبر ۴: متعلقہ نشریات ریڈیو ٹیلی ویژن...........................376
◦ مطالبہ نمبر ۵: متعلقہ مسئلہ ختم نبوت...........................377
☆ دینی جدوجہد کے لیے متفقہ ۸ نکات...........................378
☆ باہمی اختلافات اور تعاملِ صحابہؓ...........................380
☆ مذہبی ہم آہنگی اور باہمی رواداری کے تقاضے...........................382

- اختلاف ہونا فطری بات ہے.................................382
- عالمی سطح پر ہم آہنگی اور رواداری.................................383
- قومی و ملی سطح پر ہم آہنگی اور رواداری کے تقاضے.................................384
  - (۱) اختلاف کی سطح اور دائرہ کا لحاظ رکھا جائے.................................384
  - (۲) اظہارِ اختلاف کے لیے معقول انداز اختیار کیا جائے.................................385
  - (۳) قومی و ملی معاملات میں مشترکات کو ترجیح دی جائے.................................385
  - (۴) ایک دوسرے کے معاشرتی بائیکاٹ سے گریز کیا جائے.................................385

☆ ایران کا علاقائی تشخص: چند چشم کشا خبریں.................................386

☆ حرمین شریفین کا تحفظ ہر چیز پر مقدم ہے.................................388
- انقلابِ ایران ۱۹۷۹ء: خیر مقدم اور مایوسی.................................388
- سعودی حکومت کی پالیسیاں: تحفظات اور تقاضے.................................389

☆ مشرقِ وسطیٰ میں ایران کا کردار.................................391
- ایرانی راہنماؤں کے مسلم ممالک کے دورے.................................391
- یمن کا تنازعہ اور ایران.................................391
- ایران کا ایٹمی معاہدہ اور عربوں کا تحفظ.................................392
- افغان جہاد کے راہنما گلبدین حکمت یار کی خواہش.................................392
- ایرانی قیادت کی خدمت میں!.................................393

☆ سنی شیعہ کشمکش: خواہشات اور حقائق.................................393

☆ مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال اور امریکہ.................................396
- سعودیہ ایران کشمکش: تین اہم خبریں.................................396
- امریکی صدر باراک اوباما کے خیالات.................................396
- سنی شیعہ کشمکش کی آبیاری میں عالمی کردار.................................397

☆ یمن کا تنازعہ اور عالمِ اسلام کی ذمہ داری.................................399
- عالمی قوتوں کی دلچسپی.................................399
- انقلابِ ایران ۱۹۷۹ء کی منفی ترجیحات.................................399

- اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کی ذمہ داری 400

☆ عالمی قوتوں کے ساتھ ایران کے جوہری معاہدے کا جائزہ 402

☆ مشرقِ وسطیٰ میں مسلکی کشمکش 404

- خاموش علاج کی ضرورت واہمیت 405
- مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال: چند اہم خبریں 405
- داعش پر قابو پانے میں پاکستان کا کردار 406

☆ ایران کا ایٹمی سمجھوتہ اور مشرقِ وسطی کا مستقبل 407

- ایٹمی ہتھیاروں کی اجارہ داری 407
- ایران کا مد مقابل کون؟ 409

☆ سنی شیعہ تصادم روکنے کی ضرورت 409

- دلیل و مناظرہ کو قتل وقتال پر ترجیح دینے کی ضرورت 409
- اسباب و عوامل کا سامنا کرنے کی ضرورت 410
- ملکی وعالمی سطح پر ثالثی کی ضرورت 411
- عالمی قوتوں سے گریز کی ضرورت 412

☆ مسلکی اختلافات اور صدر ممنون حسین 413

☆ اہلِ تشیع کا جداگانہ تعلیمی نصاب کا مطالبہ 414

☆ سعودیہ ایران کشمکش اور اس کے مضمرات 415

☆ مشرقِ وسطی میں ایران اور سعودیہ کا کردار 418

☆ ترکی اور مشرقِ وسطی کی صورتحال پر ایک اجلاس 419

☆ ملی یکجہتی کونسل کا پس منظر 420

☆ مشرق وسطی کی صورتحال اور ایران پر اسلحہ فراہمی کا الزام 422

- سقوطِ خلافتِ عثمانیہ اور مشرقِ وسطیٰ کی جغرافیائی بندر بانٹ 423
- سنی شیعہ کشمکش: علمی مباحث سے قتل وقتال تک 423
- ایران کا واقعاتی کردار 424

☆ فرزندِ جھنگویؒ اور جمعیۃ علماء اسلام 425

☆ انقلابِ ایران اور مریم رجاوی.................................427
☆ مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں امریکی منصوبہ.................................430
• منصوبہ کے مندرجات.................................431
◦ خلیجی ریاستیں.................................432
◦ دیگر ممالک.................................433
☆ استنبول اعلامیہ، متحدہ مجلسِ عمل، دفاعِ پاکستان کونسل.................................435
• استنبول اعلامیہ.................................435
• متحدہ مجلس عمل کی بحالی.................................436
• دفاعِ پاکستان کونسل کی آل پارٹیز کانفرنس.................................437
☆ اسلام میں حقِ حکمرانی کی بنیاد اور اقوام متحدہ کا منشور.................................438
• اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور قرآن وسنت کی عملداری.................................438
• تشکیلِ حکومت کی صورتیں.................................439
• اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کا اختلاف.................................440
☆ متحدہ مجلسِ عمل کی بحالی.................................442
☆ خلافتِ عثمانیہ، سنی شیعہ کشمکش اور ہمارے اکابر.................................444
☆ تہران میں چند روز.................................447
• تہران یونیورسٹی کی میزبانی.................................447
• سرکاری خبر رساں ایجنسی ارینا سے گفتگو.................................448
☆ تہران یونیورسٹی میں فقہ حنفی کا شعبہ قائم کرنے کی تجویز.................................449
☆ پُرامن بقائے باہمی کیلئے اسلام کی تعلیمات.................................451
☆ سفرِ ایران کے چند تاثرات ومشاہدات.................................454
• ساڑھے پچیس ہزار کا ناشتہ.................................455
• ایرانی اہلِ سنت کی جدوجہد اور مصروفیات.................................455
• خطۂ ایران اور عربی زبان.................................456
☆ مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال.................................457

- یمن کے صدر کا ایران سے مطالبہ..457
- مشرقِ وسطیٰ میں سُنی شیعہ کشیدگی کا واقعاتی تناظر..............................458
- سُنی شیعہ کشیدگی کا مستقبل کیا ہے؟..459
- عالمی قوتوں کے ایجنڈے سے باخبر رہنے کی ضرورت..................................460

☆ وحدتِ امت اور تحفظِ ختم نبوت کے ضروری تقاضے..................................461

☆ فرقہ وارانہ کشیدگی کی صورتحال..463

☆ ”کل جماعتی مجلسِ عمل تحفظِ ناموسِ صحابہ کرامؓ واہلِ بیت عظامؓ“..................464

- مذہبی شخصیات کی حرمت وناموس کا تقاضہ..464
- اہلِ سنت کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے سب طبقات قابلِ احترام ہیں.......................465
- اہلِ تشیع کی معروف قیادت کا افسوسناک اعلان......................................465
- مجلس عمل کے لیے چند تجاویز..466

☆ نفاذِ شریعت اور فقہ جعفریہ..467

☆ مسلم حکومتیں اور اسلامی نظام...468

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

سُنی شیعہ اختلافات اور مختلف دائروں میں باہمی کشمکش کی تاریخ صدیوں کو محیط ہے اور برصغیر پاک وہند و بنگلہ دیش بھی ایک ہزار سال سے زائد عرصہ سے اس کی آماجگاہ چلے آرہے ہیں۔ یہ اختلافات عقیدہ وفکر میں بھی ہیں، سیاست و معاشرت میں بھی ہیں اور اسلام کی تعبیر و تشریح کے بنیادی معاملات میں بھی ہیں اور ان میں کمی کی بجائے دن بدن وسعت اور شدت مسلسل اضافہ پذیر ہیں۔

گزشتہ نصف صدی کے دوران میں نے سینکڑوں مجالس میں ان مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے اور سینکڑوں مضامین و مقالات میں انہیں موضوع بحث بنایا ہے۔ میری تحریر و تقریر کا میدان مسائل و عقائد کی بحث سے زیادہ تاریخی، معاشرتی اور سیاسی دائرے رہے ہیں اور ان کے مختلف پہلوؤں پر میری گزارشات اخبارات و جرائد میں بکھری ہوئی ہیں۔ فرزند عزیز حافظ ناصر الدین خان عامر نے بڑی کاوش کے ساتھ ان مضامین کو زیر نظر مجموعہ کی صورت میں مرتب کیا ہے جو یقیناً اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے دوستوں کے لیے کارآمد ہو گا، اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبولیت سے نوازیں اور زیادہ سے زیادہ دوستوں کے لیے نفع کا باعث بنائیں، آمین یارب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی
خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ
۲۲ اگست ۲۰۲۳ء

عرضِ ناشر

سعودی حکومت کا اقدام اور شاہِ ایران

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور---۳۰نومبر ۱۹۷۳ء

حالیہ عرب اسرائیل جنگ کے بعد تیل کا ہتھیار عربوں کے لیے بہت مفید اور کارگر ثابت ہوا ہے اور کیونکہ امریکہ کے سوا اسرائیل کے سرپرستوں نے مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں اپنے موقف پر نظرِ ثانی کی ضرورت کو محسوس کر لیا ہے اور مغربی ممالک کے طرزِ عمل میں خوشگوار تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ یہ امر مزید خوش آئند ہے کہ عرب قائدین اس مؤثر ہتھیار سے بھرپور فائدہ حاصل کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ چنانچہ سعودی عرب کے شاہ فیصل نے اعلان کیا ہے کہ جب تک اسرائیل تمام مقبوضہ عرب علاقے خالی نہیں کرتا اور فلسطینی عوام کو خود ارادیت کا حق نہیں دیا جاتا، سعودی عرب تیل کے ہتھیار سے مؤثر طور پر کام لینے، مصری مفادات کو تقویت پہنچانے اور عرب اتحاد کو مستحکم کرنے کی پالیسی پر گامزن رہے گا۔

دوسری طرف امریکہ نے عرب ممالک کو دھمکی دی ہے کہ اگر انہوں نے تیل کی سپلائی بحال نہ کی تو انہیں سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ جبکہ ایران کے شاہ رضا شاہ پہلوی نے بیروت کے اخبار الحوادث کو انٹرویو دیتے ہوئے تیل کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کی عرب پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے عرب ممالک پر زور دیا ہے کہ وہ مغربی ممالک کو تیل کی سپلائی بحال کر دیں۔ شاہِ ایران نے کہا ہے کہ تیل روٹی کی مانند ہے اور عربوں کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ لوگوں کو بھوکا ماریں۔

اے کاش! شاہِ ایران کو ان مظلوم و مقہور فلسطینی عوام کی بھوک اور افلاس پر بھی رحم آتا جو اسرائیل اور اس کے سامراجی آقاؤں کے ہاتھوں بے گھر ہو کر امدادی کیمپوں میں موت سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔

شیعہ سنی فسادات کون کرانا چاہتا ہے؟

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور---۳دسمبر ۱۹۷۶ء

جدید ڈپلومیسی کی ایک تکنیک یہ بھی ہے کہ جو غلط کام خود کرنا چاہو اسے اپنے مخالف کی طرف منسوب کر کے اس قدر پراپیگنڈا کرو کہ عوام کی نظروں میں اس کارِ بد کی ذمہ داری سے خود بچ سکو اور مخالفین کو بدنام کرنے کا ایک بڑا بہانہ ہاتھ آئے۔ حکمران گروہ دراصل اسی تکنیک کو اختیار کر کے اپوزیشن رہنماؤں کی مسلسل کردارکشی میں مصروف ہے۔ پیپلز پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد سندھ

میں لسانی فسادات، پٹ فیڈر کے جھگڑے، عراقی اسلحہ کا چکر اور شیر پاؤ مرحوم کے المناک قتل کے ضمن میں اپوزیشن لیڈروں کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا حکمران گروہ کی اسی حکمتِ عملی کا شاہکار ہیں۔ اور اب حکمران گروہ کے مداح حلقوں کی طرف سے اپوزیشن قائدین کے بارے میں ایک اور خدشے کا اظہار کسی نئے طوفان کی آمد کی خبر دے رہا ہے۔

اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ قومی حلقوں کو خطرے کی اس مدھم انداز میں بجنے والی گھنٹی کی طرف متوجہ کریں۔ گزشتہ دنوں جمعیۃ علماء اسلام کے قائد اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظمِ اعلیٰ حضرت مولانا مفتی محمود مدظلہ نے مدارس و مساجد کی آزادی و خود مختاری کے تحفظ کے سلسلہ میں غور و خوض کے لیے مختلف مکاتبِ فکر کے نمائندوں کا ایک اجلاس راولپنڈی میں طلب کیا جس کی مفصل رپورٹ ترجمانِ اسلام کے گزشتہ شمارے میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ قومی اخبارات میں اس عظیم اجلاس کی مفصل کاروائی کی اشاعت کو مخصوص ذرائع سے رکوانے کے بعد سرکاری اخبارات و جرائد نے وفاق المدارس کے کنونشن کے بارے میں جو تاثر پیدا کرنے کی کوشش شروع کر رکھی ہے اس سے حکمران گروہ کے مذموم عزائم کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ سب سے پہلے پیپلز پارٹی کے جماعتی آرگن روزنامہ مساوات لاہور نے مساجد و مدارس کنونشن کے بارے میں ''ٹیبل نیوز'' شائع کی اور اب اسی ٹیبل نیوز کو پارٹی کے نیم سرکاری آرگن ہفت روزہ تلوار راولپنڈی نے غیاث الدین جانباز ایڈیٹر ''تلوار'' کے قلم سے اس طرح نمایاں کیا ہے کہ

> ''اسلام آباد میں مفتی محمود کی دعوت پر اسلامی مدارس کے علماء کا اجتماع بھی ہوا۔ میں اس اجتماع کی جو سن گن لگا سکا ہوں وہ انتہائی خطرناک ہے۔ میری معلومات کے مطابق مفتی صاحب نے ان علماء کو عاشورہ محرم کے لیے اہم ہدایات دی ہیں جن میں ایک ہدایت یہ بھی شامل ہے کہ عاشورہ کے دوران فرقہ پرستی پر مبنی ایک خاص فرقہ کے خلاف متعصبانہ تقریریں کی جائیں تاکہ ملک کے عوام کو فرقہ پرستی کے نام پر لڑایا جا سکے اور ملک میں لاء اینڈ آرڈر سچویشن پیدا کر کے جمہوریت اور جمہوری اداروں کے خلاف وہی کھیل کھیلا جا سکے جو ۱۹۵۹ء کے عام انتخابات کے انعقاد سے قبل ایوب خان نے ۷ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو کھیلا تھا اور جس کے نتیجے میں ملک میں پارلیمانی جمہوریت کا چراغ روشن ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اور پھر تیرہ سال تک قوم کو آمریت کا جبر و استحصال برداشت کرنا پڑا اور آخر ملک دولخت ہوا۔
>
> سنا ہے کہ مفتی محمود نے ان تمام علماء کو اکٹھا کیا تھا جو ذہنی اور نظریاتی اعتبار سے

پاکستان کے قیام کی جدوجہد کے مخالف تھے یا ان مخالفین کے قرب کے سبب ان کا دل و دماغ بھی پاکستان کو قبول نہیں کرتا۔ بہرحال اگر میری سن گن صحیح ہے تو پھر وطنِ عزیز کے لوگوں کو آئندہ ایک ڈیڑھ ماہ تک اپنی آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی اس لیے کہ وطنِ عزیز میں جمہوریت کے خلاف اگر کوئی سازش کامیاب ہوگئی تو پھر پاکستان کی بقاء و سالمیت کو بھی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ گزشتہ پندرہ دنوں کے دوران مولانا نورانی، میاں طفیل، مولانا مودودی، مفتی محمود اور اصغر خان کے بیانات کا جو لب و لہجہ رہا ہے اس سے بھی حزبِ اختلاف کے عزائم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر مبشر حسن واحد رہنما ہیں جنہوں نے اس لب و لہجہ کو محسوس کیا ہے ورنہ تو انتخابات کی ہماہمی میں کسی نے بھی وفاقی مدارس کے معلموں کے اجتماع اور ہفتہ نفاذِ شریعت کے پس پردہ عوامل کا نوٹس لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔" (ہفت روزہ تلوار، راولپنڈی۔ ۲۳ نومبر ۱۹۷۶ء)

اس طویل اقتباس کو ایک بار پھر ملاحظہ کیجئے اور وفاق المدارس کے کنونشن پر عائد کی جانے والی "چارج شیٹ" کے پس منظر میں حکمران گروہ کے عزائم کو تلاش کیجئے۔ ذرا سے غور کے بعد حکمران گروہ کے ارادے عریاں ہوکر آپ کے سامنے آجائیں گے۔ جہاں تک کنونشن میں مفتی محمود صاحب کے خطاب اور کنونشن کے فیصلوں کا تعلق ہے اس سلسلہ میں خفا کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور شرکاء کنونشن اس امر کے عینی شاہد ہیں کہ اس میں مدارس و مساجد کی آزادی اور حقوق نسواں کمیٹی کی سفارشات کے علاوہ کوئی مسئلہ زیرِ بحث نہیں آیا اور محرم یا اس کی مناسبت سے فرقہ وارانہ مسائل کا تو کوئی محل ہی نہیں تھا۔

البتہ روزنامہ مساوات اور ہفت روزہ تلوار کا یہ واویلا حکمران گروہ کے عزائم کی خوب نشاندہی کرتا ہے اور یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے حکمران گروہ نے انتخابات کے عمل کو سبوتاژ کرنے اور اپوزیشن کو آئندہ انتخابات سے قبل مکمل طور پر کرش کر دینے کے لیے راہ ہموار کرنا شروع کر دی ہے۔ اس لیے قومی حلقوں کا فرض ہے کہ وہ صورتحال پر فوری توجہ دیں اور قوم کو فرقہ وارانہ اختلافات کے نام سے لڑانے کی اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے مشترکہ لائحۂ عمل اختیار کریں۔ مساوات اور تلوار نے خطرہ کی گھنٹی بجادی ہے اور اگر اس آواز کی طرف توجہ نہ دی گئی تو اس کے نتائج سنگین ہوں گے اور ان کا فائدہ ایک فاشسٹ گروہ کے آمرانہ عزائم کی تقویت ہی کی صورت میں سامنے آسکتا ہے۔

ایرانی عوام کی جدوجہد

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۱۵ دسمبر ۱۹۷۸ء

برادر پڑوسی ملک ایران کے عوام ایک عرصہ سے شہنشاہیت کے خاتمہ کے لیے نبرد آزما ہیں، ان کی پر جوش تحریک کی قیادت علامہ آیت اللہ خمینی اور علامہ آیت اللہ شریعت سدار جیسے متصلب شیعہ راہنماؤں کے ہاتھ میں ہے اور اس تحریک میں علماء و طلباء کے علاوہ خواتین، مزدور، ملازمین اور دوسرے طبقے بھی سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ ہزاروں ایرانی اس وقت تک اس جدوجہد میں اپنی جانوں پر کھیل چکے ہیں اور تحریک کی شدت کا یہ عالم ہے کہ شاہ ایران کی قائم کردہ متعدّد حکومتیں فوجی طاقت کے بھرپور استعمال کے باوجود صورتحال پر قابو پانے میں ناکامی کے بعد دستبردار ہو چکی ہیں۔ مگر تحریک کی شدت میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ امریکی صدر جمی کارٹر کی زبردست پشت پناہی کے باوجود ایران میں شاہ اور شاہی خاندان کا مستقبل محفوظ نہیں ہے۔

پاکستان کا قومی پریس اور سرکردہ سیاستدان ایرانی عوام کی اس جدوجہد کے بارے میں ان خدشات کا اظہار کر رہے ہیں کہ اس کے پیچھے کمیونسٹ عناصر کا ہاتھ ہے اور اگر یہ تحریک کامیاب ہوگئی تو ایشیا کے اس خطہ میں کمیونزم کا نفوذ ایک بڑی اور مؤثر کاوٹ عبور کر جائے گا۔ اسی خدشہ کے پیش نظر پاکستان میں شاہ ایران کی حمایت اور ایرانی عوام کی جدوجہد کی مخالفت کا رجحان دیکھنے میں آرہا ہے مگر ہمارے خیال میں یہ نقطۂ نظر درست نہیں ہے۔

- اولاً اس لیے کہ ایرانی عوام کی اس تحریک میں مذہبی عنصر کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے اور تحریک اور عوامی جذبات پر مذہبی راہنماؤں کے کنٹرول کا یہ عالم ہے کہ اس کی موجودگی میں کمیونسٹ عنصر کے مؤثر ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔
- ثانیاً اس لیے کہ کمیونزم ہمیشہ جبر اور گھٹن کے راستے سے آگے بڑھتا ہے جبکہ ایران میں شہنشاہیت کا وجود ہی جبر اور گھٹن کی سب سے بڑی علامت ہے۔ اور کمیونزم کا راستہ روکنے کے لیے ضروری ہے کہ شہنشاہیت ختم ہو اور کھلی فضا قائم ہو کیونکہ کھلی فضا میں کمیونزم کے جراثیم اپنی موت آپ مرجاتے ہیں۔
- ثالثاً اس لیے کہ ایرانی عوام کی اس تحریک میں کمیونسٹ عناصر کا عمل دخل موجود ہو تب بھی حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ تحریک کے کمیونسٹ عنصر کے مقابلہ میں مذہبی عنصر کو تقویت دی جائے اور اسے زیادہ مؤثر بنایا جائے۔

- رابعاً اس لیے کہ پاکستان اور ایران دو پڑوسی ملک ہیں اور ملکوں کے درمیان دوستی افراد اور خاندانوں کے حوالے سے نہیں بلکہ عوام کے حوالے سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اس دوستی کے پیش نظر بھی ایرانی عوام اس بات کا استحقاق رکھتے ہیں کہ ان کی جدوجہد کی حمایت کی جائے۔
- خامساً اس لیے کہ تحریک کے قائدین بار بار اس عزم اور ارادے کا اظہار کر رہے ہیں کہ وہ ایران میں اسلامی قوانین و نظام کا نفاذ کریں گے اور چونکہ ایسا کہنے والے مذہبی پیشوا ہیں اس لیے اس عزم کے بارے میں بے اعتمادی کا اظہار بھی نہیں کیا جا سکتا، اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ ایران میں اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک کو سپورٹ کیا جائے۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم پاکستانی پریس اور قومی راہنماؤں سے یہ عرض کریں گے کہ وہ صورتحال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں اور ایران کے حالیہ واقعات کو دائیں اور بائیں بازو کے حوالے سے دیکھنے کی بجائے انسانیت کے نقطۂ نظر سے دیکھیں اور ایرانی عوام کی جدوجہد کی حمایت کریں۔

عالمِ اسلام میں سنی شیعہ کشیدگی اور اردن کے شاہ حسین

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۱۲ مارچ ۱۹۸۲ء

اردن کے شاہ حسین نے گزشتہ دنوں ایک اخباری انٹرویو میں کہا ہے کہ عالمِ اسلام میں شیعہ سنی تنازعات کو ہوا دینے کی مسلسل کوشش کی جا رہی ہے اور بین الاقوامی سطح پر سازشی عناصر اس سلسلہ میں مصروفِ عمل ہیں۔

اسلام میں ایک جائز حد کے اندر اختلافِ رائے کی افادیت و ضرورت کو تسلیم کیا گیا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علمی اختلاف کو رحمت قرار دیا ہے۔ لیکن یہ اختلاف وہ ہے جو علمی مسائل میں جائز حدود کے اندر نیک نیتی سے دینی امور کی وضاحت کے لیے کیا جائے۔ علماء، فقہاء اور مسلم دانشوروں میں اس اختلاف رائے نے ملتِ اسلامیہ کی ترقی و عروج اور اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ہماری علمی و ملی تاریخ کا ایک حصہ ہے اور ہم اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن اختلاف و نزاع کا وہ پہلو جس نے ملتِ اسلامیہ کو مختلف اور متحارب گروپوں میں تقسیم کیا ہے ہمیشہ سے مذموم رہا ہے اور آج بھی مذموم ہے۔ اسلامی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات

سامنے آتی ہے کہ امتِ مسلمہ کو متحارب فرقوں میں تقسیم کرنے والے اختلافات میں سے بیشتر بلکہ تقریباً سبھی تنازعات کا پس منظر علمی اور دینی نہیں بلکہ سیاسی رہا ہے۔ اور اس نوعیت کے کسی اختلاف اور تنازعہ کے اسباب و محرکات کو بے نقاب کرنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو اس کے پس منظر میں دشمنوں کی سازش صاف طور پر جھلکتی ہوئی دکھائی دے گی۔

یہی وجہ ہے کہ ان فرقہ بندیوں اور ان کی بنیاد میں کارفرما تنازعات سے ہمیشہ دشمن قوتوں نے فائدہ اٹھایا ہے اور جب بھی ملتِ اسلامیہ کسی مشترکہ مقصد کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی ہے دشمن کے خفیہ ہاتھ نے مسلمانوں میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کی چنگاری کو ہوا دی ہے۔ برصغیر کی آزادی سے پہلے کی صورتحال پر ایک نظر ڈالیں، آپ دیکھیں گے کہ علماء حق کی عظیم قوت جب بیرونی استعمار اور مغربی استعمار کے خلاف آزادی کی جنگ میں مصروف تھی عین اس وقت غیر ضروری مسائل اور رسوم و روایات کے تحفظ کے عنوان سے کفر کے فتوؤں کی یلغار ہوئی اور ملتِ اسلامیہ کو فرقہ وارانہ کشمکش کا میدانِ کارزار بنادیا گیا۔ لیکن یہ استعماری سازش اکابر علماء حق کی بصیرت و تدبر کا سامنا نہ کر سکی اور ان عظیم مجاہدین نے اپنا رخ فرنگی اور استعمار ہی کی طرف رکھا اور قافلۂ حریت کی رفتار میں کوئی کمی نہ آنے دی۔

آج بھی یہی صورتحال عالمی اور قومی سطح پر درپیش ہے۔ عالمِ اسلام خود کو منظم کرنے اور اپنے وسائل کے سہارے آگے بڑھنے کے لیے جدوجہد میں مصروف ہے اور ملتِ اسلامیہ میں مذہبی رجحانات کا فروغ اور اپنے ماضی کی طرف پلٹنے کا جذبہ ترقی پذیر ہے۔ ان حالات میں اردن کے شاہ حسین کے بقول استعماری قوتیں ملتِ اسلامیہ کو شیعہ سنی اور دیگر فرقہ وارانہ جھگڑوں میں الجھانے کی سازش کر رہی ہیں اور مختلف مقامات پر اس سازش کے عملی نتائج بھی ہمارے سامنے ہیں۔ قومی سطح پر ملک کے اندر دیکھیں تو بھی صورتحال کچھ اس قسم کی ہے کہ پوری قوم اسلامی نظام کے مؤثر نفاذ اور جمہوری حقوق کی بازیابی کے لیے سیاسی و دینی قوتوں کو یکجا اور متحد دیکھنا چاہتی ہے لیکن فرقہ پرست عناصر قومی تقاضوں اور امنگوں سے بے پرواہ ہوکر فرقہ واریت کی آگ کو اشتعال اور عصبیت کا ایندھن فراہم کر رہے ہیں۔ مساجد پر مخالفانہ قبضہ کی مہم جاری ہے، اوقاف اور دیگر مشترکہ دینی اداروں کی فرقہ وارانہ تقسیم کے مطالبات ہو رہے ہیں، فرقہ وارانہ بنیاد پر ملازمتوں وغیرہ کی تقسیم کے لیے کونسلیں بن رہی ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے فرقہ پرستوں کے نزدیک اس قوم کو تین چار حصوں میں تقسیم کر کے آپس میں گتھم گتھا کر دینے کے سوا دین کی خدمت کا اور کوئی میدان باقی نہیں رہ گیا۔

ان حالات میں یہ کہے بغیر کیا چارہ ہے کہ دشمن کا ہاتھ ہمیں ہمارے قومی مقاصد سے دور رکھنے اور

آپس میں الجھائے رکھنے کے لیے پوری قوت کے ساتھ مصروفِ کار ہے۔ اس موقع پر ہم قومی سوچ اور جذبہ رکھنے والے حضرات سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور اپنی سوچ، تدبر اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے فرقہ پرستوں کی راہ روکنے کی کوشش کریں۔ اور اس آگ کو اس سے پہلے کنٹرول کرنے کا سامان کرلیں کہ یہ پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور پھر سوچ اور تدبر کے بروئے کار لانے کی کوئی صورت خدانخواستہ باقی نہ رہ جائے۔ ہم اپنے مسلک اور ولی اللّٰہی تحریک سے تعلق رکھنے والے علماء اور کارکنوں سے بھی عرض کریں گے کہ جہاں تک اپنے حقوق کے تحفظ کا تعلق ہے اس حق کا استعمال ناگزیر اور ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے اصل ہدف اور مقصد کو سامنے سے نہ ہٹنے دیں۔ اور یہ بات کسی لمحہ نہ بھولیں کہ اس ملک میں ولی اللّٰہی تحریک کا مقصد وحید یہ ہے کہ استعماری نظام کو زندگی کے تمام شعبوں سے اکھاڑ پھینکا جائے اور فک کل نظام کے ولی اللّٰہی اصول کے مطابق عوام کو دینی، معاشی اور معاشرتی حقوق کی مکمل ضمانت پر مبنی اسلامی نظام فراہم کیا جائے۔ اس کے سوا ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے، دشمن ہمیں مختلف جھگڑوں میں الجھا کر اس مقصد سے غافل کرنا چاہتا ہے لیکن ہماری کامیابی اسی میں ہے کہ دشمن کی اس چال کو ناکام کرتے ہوئے مکمل اسلامی معاشرہ کے قیام کی منزل کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔

”شریعت بل“ فرقہ وارانہ ہے؟

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۱۲ ستمبر ۱۹۸۶ء

...... تیسرا اعتراض یہ ہے کہ شریعت بل فرقہ وارانہ ہے اور ملک کے تمام فرقوں کے لیے قابل قبول ہونے کی بجائے صرف ایک فرقہ کے نظریات پر مبنی ہے۔ یہ الزام بھی قطعی بے بنیاد ہے کیونکہ شریعت بل کو دیوبندی مکتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ بریلوی مکتبِ فکر کے مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، پروفیسر محمد طاہر القادری، مولانا عبد المصطفٰی الازہری، مولانا مفتی مختار احمد نعیمی، مولانا غلام علی اوکاڑوی اور مولانا ابوداؤد محمد صادق، اور اہل حدیث مکتبِ فکر کے مولانا معین الدین لکھوی، مولانا حافظ عبد القادر روپڑی، مولانا عبد الرحمان سلفی اور مولانا حافظ عبد الغفور جہلمی جیسے سرکردہ علماء کرام کی حمایت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ روزنامہ جنگ کی سروے رپورٹ کے مطابق عام شیعہ آبادی میں سے بھی ۷۵ فیصد حضرات شریعت بل کی حمایت کر رہے ہیں۔ جبکہ اسلامی نظریاتی کونسل میں شامل تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام نے اس سلسلہ میں جو متفقہ سفارشات کی ہیں وہ بھی شریعت بل کی حمایت میں ہیں۔

اس لیے اگر شریعت بل میں کوئی فرقہ وارانہ بات ہوتی تو اسے تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام کی ہمہ گیر حمایت حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس گزارش کو دہرا لینا بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اعتراض کرنے والوں کو شریعت بل کی ان دفعات کا حوالہ دینا چاہیے جن کی بنیاد پر وہ اسے فرقہ وارانہ قرار دے رہے ہیں۔

البتہ اس ضمن میں ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ فقہ جعفریہ کو دوہرے پبلک لاء کے طور پر نافذ کرنے کا مطالبہ کرنے والے انتہا پسند شیعہ عناصر صرف اس وجہ سے شریعت بل کی مخالفت کر رہے ہیں کہ اس میں ان کے اس غیر اصولی مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس لیے اگر شریعت بل کو اس پس منظر میں فرقہ وارانہ قرار دیا جا رہا ہے تو یہ الزام لگانے والوں کو اس ضمن میں خود اپنے موقف کی بھی وضاحت کرنی چاہیے کہ دوہرے پبلک لاء کے طور پر فقہ جعفریہ کے نفاذ کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ اگر وہ خود بھی اس ضمن میں شریعت بل پیش کرنے والوں کے موقف سے اصولی طور پر متفق ہیں تو پھر انہیں اس پس منظر میں شریعت بل پر فرقہ وارانہ بل کی پھبتی کسنے کا کوئی اصولی یا اخلاقی حق حاصل نہیں ہے۔......

ایران میں گیارہ روز

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۶ فروری ۱۹۸۷ء

کوئٹہ کی جامع مسجد سفید کے خطیب مولانا قاری عبد الرحمٰن ایرانی انقلاب کے ان پرجوش حامیوں میں شمار ہوتے ہیں جو نہ صرف خود انقلابِ ایران کے محاسن و فضائل کے پرچار میں مصروف رہتے ہیں بلکہ ان کی مسلسل کوشش رہتی ہے کہ پاکستان کے دینی حلقوں کے روابط ایرانی انقلاب کے رہنماؤں کے ساتھ مثبت بنیادوں پر استوار ہوں اور پاکستان میں نفاذِ اسلام کی جدوجہد کے سلسلہ میں ایران کے انقلابی رہنماؤں کے تجربات سے استفادہ کیا جائے۔ گزشتہ سال حج بیت اللہ کے موقع پر مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں ان سے ملاقات ہوئی تو انقلاب ایران کی بہت سی خوبیوں کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے پیشکش کی کہ اگر آپ ایران میں اس انقلاب کے اثرات کو براہ راست دیکھنا چاہیں تو حکومت ایران کی طرف سے اس کا اہتمام ہو سکتا ہے۔ میں نے گزارش کی کہ میں ایرانی انقلاب کے نتائج و ثمرات کو براہ راست دیکھنے کے لیے ایران جانے کی خواہش رکھتا ہوں بشرطیکہ میرے ساتھ اور دوست بھی ہوں اور ایران میں جن حضرات سے ہم ملنا چاہیں ان سے ہمیں ملنے کی اجازت ہو۔ میری مراد اس سے ایران کے اہلِ سنت تھے جن کے بارے میں مختلف حلقوں سے دبے لفظوں میں یہ باتیں سامنے آ رہی تھیں

کہ ایران کے اہلِ سنت اپنے حقوق اور مستقبل کے بارے میں مطمئن نہیں ہیں۔ انہوں نے اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ وہ مناسب موقع پر اس سلسلہ میں مجھ سے رابطہ قائم کریں گے۔

وفد کے شرکاء

اس پس منظر میں مجھے پاکستانی علماء، وکلاء اور دانشوروں کے اس وفد میں شامل کر لیا گیا جس نے یکم جنوری سے ۱۲ جنوری تک ایران کے مختلف حصوں کا مطالعاتی دورہ کیا اور میری گزارش پر پنجاب اسمبلی کے رکن اور جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا منظور احمد چنیوٹی کو بھی وفد میں شامل کیا گیا۔ یہ وفد پندرہ ارکان پر مشتمل تھا جس میں ہم دونوں کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے:

(۱) چودھری صفدر علی، سیکرٹری اطلاعات جماعت اسلامی پاکستان (۲) حافظ حسین احمد، سیکرٹری اطلاعات جمعیۃ علماء اسلام (مولانا فضل الرحمٰن گروپ) پاکستان (۳) ممتاز صحافی جناب مختار حسن (۴) ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی، سربراہ شعبہ بین الاقوامی تعلقات قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد (۵) نواب محمد احسن خاکوانی ایڈووکیٹ، ملتان (۶) مولانا مفتی دائم الدین، سکھر (۷) جناب اسد اللہ بھٹو ایڈووکیٹ، سکھر (۸) جناب راجہ رب نواز ایڈووکیٹ، کوئٹہ (۹) جناب مولانا قاری عبد الرحمٰن، کوئٹہ (۱۰) جناب ڈاکٹر عطاء الرحمٰن، کوئٹہ (۱۱) جناب رشید بیگ، کوئٹہ (۱۲) جناب ڈاکٹر عبد الواسع، لورالائی۔

ہم یکم جنوری کو نماز عصر سے قبل تفتان سے بین الاقوامی سرحد عبور کر کے ایران کی حدود میں داخل ہوئے اور ۱۲ جنوری کو صبح آٹھ بجے کے قریب یہیں سے دوبارہ پاکستان واپس آ گئے۔ ایران کی انقلابی حکومت کا ادارہ ”سازمان تبلیغات اسلامی“ اس دورہ میں ہمارا میزبان تھا اور ادارہ کے بیرونی امور کے ڈائریکٹر حجۃ الاسلام جناب محمد علی تسخیری نے میزبانی کے امور کی براہ راست نگرانی کی۔ ایرانی سرحد پر زاہدان کی انتظامیہ کے نمائندے اور سازمان تبلیغات اسلامی کے مقامی عہدہ دار ہمارے خیر مقدم کے لیے موجود تھے اور انہوں نے ۱۲ جنوری کو واپسی پر ہمیں خدا حافظ کہا۔

دورہ کا مقصد

ایران میں گیارہ روزہ قیام کے دوران ہم نے چھ دن تہران میں قیام کیا اور انہی میں سے ایک دن کا حصہ قم میں گزارا۔ دو دن مشہد میں رہے، دو دن زاہدان میں قیام رہا اور باقی وقت سفر میں گزرا۔ وفد میں مختلف طبقات اور متنوع افکار کے حامل حضرات شریک تھے، ظاہر ہے کہ ایران میں ہر ایک نے اپنے ذہن کے مطابق صورتحال کا جائزہ لیا اور پھر اسی بنیاد پر اپنی سوچ کا رخ متعیّن کیا۔ چنانچہ مولانا منظور احمد چنیوٹی اور راقم الحروف نے بھی اس دورہ کے آغاز پر اپنے طور پر ایک ذہنی ترتیب قائم کر لی کہ

کن باتوں کا جائزہ لینا ہے اور ایرانی انقلاب کے راہنماؤں سے ملاقات کے دوران کون سے امور پر گفتگو کرنی ہے۔ ہم اپنی ترتیب کے مطابق مندرجہ ذیل امور کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔

1. ایران میں مذہبی بنیاد پر آنے والا یہ انقلاب کیا صرف شاہ ایران کے خلاف عوامی نفرت کا وقتی ردعمل تھا یا اس انقلاب کی کوئی فکری بنیاد بھی موجود ہے؟
2. کیا ایرانی انقلاب کے قائدین اور مذہبی حلقے اس انقلاب کے تحفظ اور دوام کے لیے ذہنی اور عملی طور پر تیار ہیں؟
3. کیا اس انقلاب کے نتیجہ میں اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں کوئی عملی تبدیلی بھی آئی ہے، یا یہ صرف ایک لیبل ہے جو اسی پرانے نظام پر چسپاں کر دیا گیا ہے؟
4. انقلاب ایران کے رہنماؤں نے فرقہ وارانہ مسائل پر کس طرح قابو پایا ہے؟
5. ایران میں اہلِ سنت کس حال میں ہیں اور کیا وہ موجودہ انقلاب اور اپنے حقوق و مفادات کے بارے میں مطمئن ہیں؟
6. پاکستان میں نفاذِ اسلام کی جدوجہد کی راہ میں حائل رکاوٹوں بالخصوص فرقہ وارانہ الجھنوں اور فقہی تشخص کے تعین کے بارے میں ایرانی راہنماؤں کا نقطہ نظر کیا ہے؟

یہ تھے وہ سوالات جو ایران کی سرحد عبور کرتے ہوئے ہمارے ذہنوں میں گھوم رہے تھے اور جب ہم نے واپسی پر میرجاوہ اور تفتان کے درمیان آہنی پھاٹک سے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو ہم دونوں کم از کم مطمئن تھے کہ ایک حد تک ہم ان سوالات کے جوابات حاصل کر چکے تھے۔ ایران میں قیام کے دوران ہماری سرگرمیوں کی تفصیلات کچھ اس طرح رہی ہیں:

ایران میں ہماری سرگرمیاں

تہران میں یونیورسٹی کے وسیع گراؤنڈ میں ادا کی جانے والی نماز جمعہ کے اجتماع میں شرکت کی۔ یہ اجتماع تہران میں جمعۃ المبارک کا واحد اجتماع ہوتا ہے جس میں کم و بیش پانچ چھ لاکھ افراد شریک ہوتے ہیں اور صدر ایران جناب علی خامنہ ای، یا اسپیکر قومی اسمبلی جناب ہاشمی رفسنجانی، یا سپریم کورٹ کے چیف جسٹس خطبۂ جمعہ اور امامت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ جس روز ہم نے اس عظیم اجتماع میں شرکت کی اس روز چیف جسٹس جناب آیت اللہ عبد الکریم اردبیلی نے خطبہ دیا، ان کے پہلے خطبہ کا موضوع اولاد کی تربیت کے سلسلہ میں ماں باپ کی ذمہ داری تھا جبکہ دوسرے خطبہ میں انہوں نے ایران کے قومی مسائل مثلاً عراق ایران جنگ، کویت کی اسلامی کانفرنس اور دیگر مسائل پر روشنی ڈالی۔ گویا یہ اجتماع ایک طرح سے قومی مسائل پر عوام کو اعتماد میں لینے کا اجتماع تھا جو ہر جمعہ کو منعقد ہوتا ہے

اور اسے ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے پورے ایران میں نشر کیا جاتا ہے۔

شوریٰ نگہبان کے جناب آیت اللہ جنتی سے ملاقات

ایران کی اعلیٰ ترین کونسل ''شوریٰ نگہبان'' کے فقیہ جناب آیت اللہ جنتی سے ہماری اجتماعی ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے انقلاب ایران کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ باقی مسلم ممالک میں بھی دینی انقلاب کی جدوجہد ہونی چاہیے۔ اس مجلس میں ہماری طرف سے ان مشکلات کا ذکر کیا گیا جو پاکستان میں نفاذِ اسلام کی راہ میں حائل ہیں، بالخصوص انہیں توجہ دلائی گئی کہ پاکستان میں شیعہ فقہ کے مستقل نفاذ کا مطالبہ نفاذِ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے۔

جناب آیت اللہ جنتی نے بتایا کہ ایران میں شیعہ اکثریت کی بنا پر پبلک لاء میں صرف انہی کی فقہ نافذ ہے جبکہ اہلِ سنت اور دوسرے مذاہب کو پرسنل لاء میں ان کے مذہب کے مطابق فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہماری طرف سے یہ بھی کہا گیا کہ پاکستان میں فقہ جعفریہ کے بطور پبلک لاء نفاذ کے مطالبہ کے ساتھ ایران انقلاب کی نمائندگی کا تاثر بھی دیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے انقلاب ایران کے بارے میں عوامی تاثر مجروح ہو رہا ہے اور ان لوگوں کی توقعات مایوسی میں بدل رہی ہیں جو یہ سمجھتے تھے کہ ایران میں مذہبی انقلاب کی کامیابی کے بعد پاکستان کی دینی قوتوں کو اس سے تقویت حاصل ہوگی اور ان کے لیے منزل تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔

جناب آیت اللہ جنتی سے اس امر کا ذکر کیا گیا کہ شیعہ سنی فسادات کے سلسلہ میں بھی بعض مواقع پر ایران کا حوالہ سامنے آتا ہے جس سے عمومی تاثر انقلاب ایران کے خلاف بن جاتا ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ یہاں سے ایک وفد پاکستان جائے اور صورتحال کا خود جائزہ لے کر ان شکایات کے ازالہ کی کوشش کرے۔ جناب آیت اللہ جنتی نے اس سلسلہ میں ضروری غور و خوض اور اقدامات کا وعدہ کیا۔ جناب آیت اللہ جنتی کو ''شریعت بل'' کے مختلف پہلوؤں اور تازہ صورتحال سے بھی آگاہ کیا گیا۔

شوریٰ نگہبان کے جناب آیت اللہ خزعلی کے ساتھ نشست

شوریٰ نگہبان کے ایک اور ممبر جناب آیت اللہ خزعلی کے ساتھ ایک مستقل نشست قرآن کریم کے سلسلہ میں منعقد ہوئی۔ اس نشست میں ایک نوجوان ایرانی قاری نے قرآن کریم کی تلاوت کی اور عمدہ تلاوت کی۔ پھر جناب آیت اللہ خزعلی نے قرآن کریم کے بارے میں ایران کی انقلابی حکومت کے اقدامات کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ان کی نگرانی میں ایک مستقل سرکاری ادارہ قرآن کریم کی اشاعت میں

مصروف ہے۔ انہوں نے اس خبر کو افسوسناک قرار دیا کہ پاکستان میں ایران کے مطبوعہ قرآن کریم پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ ہماری طرف سے وضاحت کی گئی کہ ایران کے کسی ایک مطبع کے چھاپے ہوئے قرآن کریم کو اس میں واضح غلطیوں کے باعث ضبط کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جناب آیت اللہ خزعلی نے اس بات کا ذکر کیا کہ ہم پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم قرآن کریم میں تحریف کے قائل ہیں، یہ بات غلط ہے، ماضی میں کچھ حضرات نے ایسا لکھا ہے مگر ہم اسے نہیں مانتے اور اسی قرآن کریم پر ہمارا ایمان ہے جو آج موجود ہے اور اس میں کسی حرف کی کمی یا زیادتی کو ہم نہیں مانتے۔

مولانا منظور احمد چنیوٹی نے اس موقع پر کہا کہ شیعہ اکابر کی کتابوں میں بہت سی روایات موجود ہیں جن میں موجودہ قرآن کریم کو اصلی ماننے سے انکار کیا گیا ہے، اس کے جواب میں جناب آیت اللہ خزعلی نے کہا کہ یہ ضعیف روایات ہیں ہم انہیں معتبر تسلیم نہیں کرتے، جس طرح اہلِ سنت کے بعض حضرات کی کتابوں میں بھی ایسی روایات موجود ہیں جنہیں اہلِ سنت تسلیم نہیں کرتے۔ مولانا چنیوٹی نے کہا کہ اہلِ سنت کے ہاں تو ایسی چند ایک روایتیں ہیں لیکن آپ کے ہاں ہزاروں روایات ہیں۔ خزعلی صاحب نے جواب دیا کہ ضعیف روایت ایک ہو یا ایک ہزار ہو بہر حال ضعیف ہیں ہم انہیں تسلیم نہیں کرتے۔ مولانا چنیوٹی نے کہا کہ اس کی وضاحت تو ہو گئی لیکن ایک بات کی وضاحت باقی ہے، وہ یہ کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو شخص قرآن کریم میں تحریف کا قائل ہے وہ مسلمان نہیں ہے، کیا آپ بھی اس فتوٰی کی تائید کرتے ہیں؟ جناب آیت اللہ خزعلی نے اس سوال کا جواب نہیں دیا اور بات کا رخ دوسری طرف مڑ گیا۔

بہر حال اس گفتگو سے قطع نظر ہم نے یہ محسوس کیا کہ ایرانی انقلاب کے راہنماؤں کا رخ قرآن کریم کی اشاعت کی طرف خاصا واضح ہے، ان کی تقاریر و بیانات میں جابجا قرآن کریم کی آیات سے استدلال ہوتا ہے، ریڈیو پر وقتاً فوقتاً قرآن کریم کی تلاوت اور درس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور دیواروں پر مختلف مسائل کے حوالہ سے قرآن کریم کی آیات کے جملے جگہ جگہ نمایاں طور پر تحریر دکھائی دیتے ہیں۔

نامور فنکار حسین صادق کے فن پاروں کی نمائش

ہمیں ایران کے معروف آرٹسٹ حسین صادق کے فن پاروں کی ایک نمائش دکھائی گئی جس میں زندگی کے مختلف حقائق کو انقلابی افکار کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے اور اس نامور فنکار نے انسانی زندگی کے تضادات کو بڑے خوبصورت انداز میں اجاگر کیا ہے۔ بالخصوص ''ناصر خان'' کے عنوان سے ایک فن پارہ کو بہت پسند کیا گیا جس میں ایک روایتی جاگیردار کے مظالم اور کمزور طبقوں کی مظلومیت اور بے

بسی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

قم کے دینی مدارس

تہران میں چھ روزہ قیام کے دوران ہمیں ایک دن قم لے جانے کا اہتمام کیا گیا۔ قم ایران کا دینی و علمی مرکز ہے اور جناب آیت اللہ خمینی کا مدرسہ فیضیہ بھی قم میں ہے جو انقلاب ایران کا فکری مرکز ہے۔ ہمارے ساتھ سازمان تبلیغات اسلامی کی طرف سے سرینگر سے تعلق رکھنے والے جناب مقصود علی رضوی اور لکھنو کے جناب خادم حسین بطور رہبر اور ترجمان ہمسفر تھے، ان کی زبانی جو کچھ معلومات حاصل ہوئیں ان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ:

- قم کے مختلف مدارس میں اس وقت اٹھارہ ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں، ان میں ایک ہزار طلبہ پاکستانی ہیں، بعض پاکستانی طلبہ سے ہماری ملاقات بھی ہوئی۔
- ان مدارس میں اثناعشری جعفری فقہ کے مطابق مکمل مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہر طالب علم کے لیے عربی اس معیار کی لازمی ہے کہ وہ لکھ سکے اور گفتگو اور تقریر کر سکے، اس کے علاوہ انگریزی یا فرانسیسی زبانوں میں سے بھی ایک زبان اسی معیار پر لازمی ہے۔
- ان مدارس میں اسلامی نظامِ حیات کے مختلف شعبے بطور نصاب پڑھائے جاتے ہیں، مدرسہ فیضیہ کے ایک کلاس روم میں داخل ہوئے تو کم و بیش تین سو طلبہ کلاس میں تھے اور آیت اللہ قفقازی اسلامی حکومت کے معاشرتی فرائض پر لیکچر دے رہے تھے اور طلبہ کو املاء کرا رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ ہم بھی لیکچر میں شریک ہوئے، بے حد معلوماتی لیکچر تھا۔
- ہمیں بتایا گیا کہ یہ مدارس مکمل طور پر آزاد ہیں، نہ حکومت سے کچھ وصول کرتے ہیں اور نہ نظام میں حکومت کا کوئی دخل ہے۔ ان مدارس کے اخراجات خمس کی اس رقم سے پورے ہوتے ہیں جو اہلِ تشیع اپنے اماموں کو ادا کرتے ہیں۔
- ہمیں بتایا گیا کہ وہ مجتہد جن کی اس وقت تمام دنیا کے اثناعشری شیعہ تقلید کرتے ہیں وہ چار ہیں: (۱) جناب آیت اللہ خوئی، نجف اشرف (۲) جناب آیت اللہ خمینی، تہران (۳) جناب آیت اللہ گلپایگانی، قم۔ چوتھے بزرگ کا نام مجھے یاد نہیں رہا، شیعہ حضرات ان اماموں کو اپنا خمس ادا کرتے ہیں اور خمس کی اس رقم سے یہ مدارس چلتے ہیں۔

جناب آیت اللہ منتظری سے ملاقات

قم کے سفر میں ہی جناب آیت اللہ منتظری سے وفد کی ملاقات ہوئی۔ جناب منتظری کو آیت اللہ العظمی کہا جاتا ہے اور وہ جناب آیت اللہ خمینی کے قائم مقام ہیں۔ ملاقات اور گفتگو سے اندازہ ہوا کہ بے حد متین اور مرنجاں مرنج قسم کی علمی شخصیت کے مالک ہیں بلکہ بعض سنی راہنماؤں نے کھلم کھلا اظہار کیا کہ ایرانی انقلاب کے راہنماؤں سے جناب آیت اللہ منتظری اہلِ تشیع اور اہلِ سنت کے درمیان رواداری اور تعلقات کے حوالہ سے سب سے زیادہ موزوں اور بردبار شخصیت ہیں۔ بہرحال ان سے ملاقات ہوئی اور مختصر گفتگو بھی ہوئی، انہوں نے معاشرہ میں علماء کے فرائض، استعماری سازشوں سے واقفیت حاصل کرنے، مظلوم طبقوں کی حمایت کرنے، اور اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان زیادہ سے زیادہ رواداری پر زور دیا۔ انہی دنوں یہ خبر اخبارات میں آرہی تھی کہ ترکی میں لڑکیوں کے کالجوں میں باپردہ داخل ہونے پر قانوناً پابندی لگادی گئی ہے، جناب آیت اللہ منتظری نے اس پر برہمی کا اظہار کیا اور کہا کہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم معاشرہ میں غیر اسلامی اقتدار کے خاتمہ کے لیے جدوجہد کریں۔

ہماری طرف سے بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا گیا اور وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے راقم الحروف نے انقلاب ایران کے بارے میں وفد کے جذبات واحساسات کا اظہار کیا۔ ہمارے وفد کے ایک محترم رکن جناب ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی نے انقلاب ایران اور پاکستان کے دینی حلقوں کے درمیان روابط کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر گفتگو کرنی چاہی مگر وقت کی کمی کے باعث بات آگے نہ بڑھ سکی۔

سیدہ فاطمہ رحمہا اللہ کے مزار پر حاضری

قم میں ہی سیدہ فاطمہؒ کے مزار پر بھی حاضری اور دعا کی سعادت حاصل ہوئی، یہ امام علی رضاؒ کی بہن ہیں جن کے بارے میں روایت ہے کہ اپنے بھائی امام علی رضاؒ سے ملاقات کے لیے مشہد جارہی تھیں، راستہ میں قم سے گزر ہوا تو خبر ملی کہ امام علی رضاؒ کا انتقال ہوگیا ہے، غم سے بیمار ہوگئیں اور یہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کا مزار اہل ایران کی عقیدتوں کا مرکز ہے اور مزار سے ملحق مسجد میں قم کے مدارس کے طلبہ اپنے اسباق کے تکرار میں مصروف رہتے ہیں۔

تہران کی امام جعفر صادقؒ یونیورسٹی میں دوپہر کا کھانا

تہران میں امام جعفر صادقؒ کے نام سے ایک دینی یونیورسٹی قائم کی گئی ہے۔ یونیورسٹی کی عمارت جدید معیار کی اعلیٰ عمارت ہے اور اس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی تعلیم کا بھی انتظام

کیا گیا ہے۔ ہمارے وفد نے یونیورسٹی کے طلبہ کے ساتھ ان کے میس میں دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر طلبہ کی طرف سے وفد کے اعزاز میں ایک مختصر استقبالیہ دیا گیا جس میں ایک طالب علم نے شستہ عربی میں اور دوسرے طالب علم نے انگریزی میں خیر مقدمی تقریر کی۔ جواب میں مولانا منظور احمد چنیوٹی نے عربی میں اور جناب محمد احسن خاکوانی ایڈووکیٹ نے انگریزی میں تقریر کی۔

شوریٰ ملی کی کارروائی کا مشاہدہ اور ارکانِ شوریٰ سے ملاقات

تہران میں ایران کی "شوریٰ ملی" یعنی قومی اسمبلی کی کارروائی دیکھنے کا موقع ملا۔ قومی اسمبلی کے ارکان عوام کے براہ راست ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں، اسپیکر جناب ہاشمی رفسنجانی خود اجلاس کی صدارت کر رہے تھے، ایرانی قومی اسمبلی کی کارروائی ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہوتی ہے، سوائے کارروائی کے اس حصہ کے جسے خود ایوان خفیہ قرار دے دے۔ وفد نے کم و بیش ایک گھنٹہ تک اجلاس کی کاروائی کا مشاہدہ کیا، مولانا منظور احمد چنیوٹی اپنے پارلیمانی تجربات کے حوالہ سے گہری دلچسپی لے رہے تھے اور انہوں نے بہت سی ایسی باتیں نوٹ کیں جو ہمارے ہاں کے پارلیمانی طریق کار سے مختلف ہیں۔ قومی اسمبلی کی گیلری میں ہر رکن کی تصویر اور ضروری کوائف آویزاں تھے جن میں اس کی تعلیم، حلقہ انتخاب، حاصل کردہ ووٹوں کی تعداد اور دوسری باتیں درج ہیں۔

اس موقع پر ایک کمیٹی روم میں قومی اسمبلی کے سنی ارکان کے ساتھ ہماری خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ایران کی قومی اسمبلی میں سنی ارکان کی تعداد چودہ ہے جو بلوچستان، کردستان اور ترکمان صحرا کے علاقوں سے منتخب ہوئے ہیں۔ اس وقت آٹھ سنی ارکان موجود تھے جو ہمارے ساتھ اس نشست میں شریک ہوئے، ان کی ترجمانی بلوچستان سے دو منتخب ارکان اسمبلی مولانا محمد اسحاق مدنی اور مولانا محمد حامد کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ:

- سنی ارکان کے لیے ایوان میں الگ نشستیں مخصوص نہیں ہیں بلکہ وہ بھی دوسرے ارکان کی طرح عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آتے ہیں اور اس وقت دو سو ستر کے ایوان میں چودہ سنی ارکان ہیں۔
- ایوان میں عورتوں کے لیے بھی الگ نشستیں مخصوص نہیں ہیں بلکہ انہیں بھی عام انتخابات میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے اور اس وقت چند خواتین عوام کے براہ راست ووٹوں سے منتخب ہو کر ایوان میں موجود ہیں۔
- البتہ غیر مسلم اقلیتوں کے لیے پانچ نشستیں مخصوص ہیں جن میں سے تین نشستیں عیسائیوں کی، ایک یہودیوں کی اور ایک پارسیوں کی نشست ہے۔

- ایران میں وحدانی طرز حکومت ہے، صوبوں میں گورنر ہیں لیکن الگ اسمبلیاں اور صوبائی وزراء نہیں ہیں۔
- ملک میں ایک ہی پبلک لاء نافذ ہے جو اثناعشری جعفری فقہ کے مطابق ہے، البتہ اہلِ سنت کو پرسنل لاء میں اپنی فقہ کے مطابق فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے اور یہ فیصلے ان کے اپنے قاضی کرتے ہیں۔

اس موقع پر کردستان سے ایرانی پارلیمنٹ کے بزرگ سنی رکن جناب حسینی نے ہم سے سوال کیا کہ کیا پاکستان میں بھی قرآن و سنت کے قوانین نافذ ہیں؟ ہمارا جواب یہ تھا کہ مکمل طور پر نہیں ہیں اور ہم اس کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ اس پر حسینی صاحب نے کہا کہ ہماری طرف سے پاکستانی علماء اور عوام کو یہ پیغام دے دیں کہ وہ اپنے ملک میں قرآن و سنت کے قوانین کے نفاذ کے لیے جدوجہد تیز کر دیں اور اس کے لیے سب مل کر محنت کریں۔

ایران عراق جنگ کے اثرات

تہران، قم، مشہد اور زاہدان میں گیارہ روزہ قیام کے دوران ہمیں ان شہروں میں عراق ایران جنگ کے براہ راست اثرات نظر نہیں آئے، البتہ ایرانی راہنماؤں کی تقاریر اور اخبارات کی خبروں میں اس کا تذکرہ کثرت سے موجود تھا۔ جنگ کے معاشرتی اثرات روزمرہ اشیا کے نرخوں میں کسی حد تک محسوس ہو رہے تھے۔ ہمارے وفد کو دماونڈ ہوٹل میں، جہاں ہمارا قیام تھا، جنگ کے بارے میں دو فلمیں دکھائی گئیں۔ ایک فلم میں یہ دکھایا گیا کہ عراقی فوجوں نے ایرانی علاقے خالی کرتے ہوئے راستہ میں بارودی سرنگیں بچھا دیں جنہیں ایرانی فوج کے گزرنے سے پہلے صاف کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ ایرانی رضاکاروں نے اپنی جانوں پر کھیل کر مقررہ وقت کے اندر ان بارودی سرنگوں کو صاف کر دیا۔ دوسری فلم ایک بچے کے بارے میں تھی جسے کمانڈر محاذ جنگ پر لے جانے کے لیے تیار نہیں تھا، اس نے فوجیوں کو پانی پلانے کے بہانے محاذ جنگ پر جانے کی اجازت حاصل کی اور دوران جنگ پانی پلاتے ہوئے زخمی ہو گیا، پھر ہسپتال میں اس نے پیاس کی شدت کے باعث دم توڑ دیا۔

تہران کی مسجد ابوذر غفاریؓ کے جلسۂ عام میں شرکت

اس کے علاوہ جنوبی تہران میں حضرت ابوذر غفاریؓ کے نام سے موسوم ایک مسجد میں عام جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس کے بارے میں بتایا گیا کہ اس میں عراق ایران جنگ میں جاں بحق ہونے والوں کے ورثاء زیادہ تعداد میں شریک ہیں۔ جلسہ کے شرکاء بالخصوص نوجوانوں کا جوش و خروش دیدنی تھا

اور اس سے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ اگر سارے ملک کے نوجوانوں کے جذبات ایسے ہی ہیں تو ان کو شکست دینا بہت ہی مشکل ہے۔ اسی جلسہ میں وفد کی طرف سے مجھے خطاب کرنے کا موقع ملا اور میں نے ایرانی انقلاب کے مذہبی پہلوؤں پر اپنے احساسات سے حاضرین کو آگاہ کیا۔

تہران کے سابق شاہی محلات

تہران میں ہمیں سابق شاہی خاندان کے وہ محلات دکھائے گئے جہاں پہلوی خاندان کے شاہ اور شاہزادے رہائش پذیر تھے۔ شاہ ایران اور اس کی والدہ کا جس محل میں قیام تھا وہ دونوں محل دیکھے، اور ولی عہد شہزادہ علی رضا کے لیے جو محل تیار ہو رہا تھا وہ بھی دیکھا۔ یہ محلات جو کبھی شاہی جاہ و جلال اور رعب و دبدبہ کا نشان تھے، اب عبرت کا عنوان بن چکے تھے۔ انقلابی لیڈروں نے ان محلات کو میوزیم کی شکل دے دی ہے اور عبرت دلانے کے لیے قرآنی آیات کے کتبے ان میں جابجا آویزاں کر دیے ہیں۔

شوریٰ نگہبان کے قانون دان ارکان سے ملاقات

تہران میں شوریٰ نگہبان کے چار قانون دان ارکان (۱) جناب علی زادہ (۲) جناب پیزنی (۳) جناب مہرپور (۴) اور جناب افتخار صاحب کے ساتھ ہمارے وفد کے ارکان (۱) مولانا چنیوٹی (۲) راجہ رب نواز ایڈووکیٹ (۳) مفتی دائم الدین (۴) محمد احسن خاکوانی ایڈووکیٹ (۵) اسد اللہ بھٹو ایڈووکیٹ (۶) اور راقم الحروف کی ایک ملاقات ہوئی جس میں ایران میں عوام کو حاصل بنیادی حقوق کے تحفظ و ضمانت میں عدالتوں کے کردار، اور قانونی نظام میں انقلاب کے بعد کی اصلاحات پر تفصیلی تبادلہ خیالات ہوا۔

مشہد اور امام مسلمؒ کا شہر نیشاپور

تہران میں چھ روزہ قیام کے بعد ہم بذریعہ ریل گاڑی مشہد روانہ ہوئے۔ ریل شام چار بجے تہران سے روانہ ہوئی اور صبح آٹھ بجے کے قریب مشہد پہنچی جبکہ فجر کی نماز ہم نے راستہ میں امام مسلمؒ کے شہر نیشاپور کے ریلوے اسٹیشن پر ادا کی۔ مشہد میں ہمارا قیام دوسرے دن دو بجے تک رہا۔ اسی دوران امام رضا رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار پر دعا کے لیے حاضری دی۔ امام رضاؒ کے نام پر نئی تعمیر شدہ یونیورسٹی دیکھی جو واقعتاً قابل دید ہے۔ یونیورسٹی کے میس میں طلبہ کے ساتھ کھانا کھایا اور شہر میں وفد کے ارکان نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق شاپنگ کی۔

مشہد میں جمعہ کا اجتماع بھی دیکھا جو خاصا بڑا اجتماع تھا، آیت اللہ شیرازی نے خطبہ جمعہ دیا۔ پہلے

خطبہ کا موضوع ازدواجی مسائل تھے اور دوسرے خطبہ میں انہوں نے قومی مسائل کا ذکر کیا۔ جناب آیت اللہ خمینی کے نمائندہ جناب آیت اللہ طبسی کے ساتھ ہماری ملاقات ہوئی اور باہمی دلچسپی کے مختلف امور پر باہمی گفتگو ہوئی۔

انقلابِ ایران کے شریک کار سُنی راہنما مولانا عبدالعزیز سے ملاقات

تہران میں قیام کے دوران معلوم ہوا کہ ایرانی بلوچستان کے بزرگ سنی عالمِ دین مولانا عبدالعزیز بیمار ہیں اور تہران میں مولانا محمد اسحاق مدنی (ممبر پارلیمنٹ) کے گھر میں رہائش پذیر ہیں۔ مولانا عبد العزیز ایران میں اہلِ سنت کے سب سے بزرگ عالمِ دین ہیں۔ انقلاب ایران کے راہنماؤں میں شامل رہے ہیں، انقلاب کے بعد ایران کی دستور ساز اسمبلی کے رکن رہے ہیں، پھر قومی اسمبلی کے ممبر بھی رہے ہیں، آج کل مولانا محمد اسحاق مدنی انہی کی سیٹ پر قومی اسمبلی کے رکن ہیں۔ مولانا موصوف سے ہماری ملاقات ہوئی تو انہیں ایران کے انقلابی راہنماؤں کے رویہ کے بارے میں بے حد شاکی پایا۔ ان کا کہنا تھا کہ ابتدا میں رویہ درست رہا اور اہلِ سنت کے ساتھ معاملات میں رواداری رہی لیکن انقلاب کے استحکام کے ساتھ ساتھ رویہ میں بھی تبدیلی آتی گئی حتیٰ کہ اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ابتدا میں صلاح مشورہ کے لیے انہیں زاہدان سے خصوصی طیارہ کے ذریعے تہران لایا جاتا تھا لیکن اب وہ خود تہران میں آکر دس دس دن بیٹھے رہتے ہیں کسی ذمہ داری سے ملاقات نہیں ہوتی، اور اگر ملاقات ہو جاتی ہے تو جو گفتگو ہوتی ہے اس کا کچھ نتیجہ نہیں نکلتا، شکایات بڑھتی جا رہی ہیں اور اعتماد کی فضا بتدریج ختم ہو رہی ہے۔ مولانا عبدالعزیز کے لہجہ کی تلخی سے ہمیں یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ معاملات سنگینی کی حدود کو چھو رہے ہیں اور اگر ان کو سنبھالا دینے کی سنجیدہ کوشش نہ کی گئی تو یہ سنگینی کسی نئی الجھن اور بحران کا باعث بن سکتی ہے۔

زاہدان کے سُنی اساتذہ وطلبہ سے ملاقات

زاہدان میں ہمارا وفد مرکزی جامع مسجد میں گیا جو مکی مسجد کے نام سے معروف ہے۔ عشاء کی نماز ہم نے وہاں ادا کی اور نمازیوں سے ملاقات کی۔ اس مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز ہیں جن کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے اور اب مولانا موصوف کی علالت کی وجہ سے ان کے داماد مولانا عبدالحمید ان کی جگہ فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

جامع مسجد کے قریب دارالعلوم زاہدان میں اساتذہ اور طلبہ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس مدرسہ کے منتظم مولانا نذیر احمد ہیں جو دارالعلوم کراچی کے فارغ التحصیل ہیں، ان کے معاون مولانا محمد قاسم بھی

دارالعلوم کراچی کے فاضل ہیں۔ زاہدان سے کم و بیش ڈیڑھ سو کلو میٹر دور سراوان میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے شاگرد مولانا محمد یوسف نے ایک بڑا دینی مدرسہ قائم کر رکھا ہے جہاں دورۂ حدیث بھی ہوتا ہے۔ مولانا محمد یوسف زاہدان آئے ہوئے تھے، ان سے ملاقات ہوئی اور مختلف مسائل پر گفتگو بھی ہوئی۔

پاکستانی وفد کی واپسی سے ایک روز قبل زاہدان کے گورنر سے وفد کی ملاقات ہوئی اور مختلف امور پر وفد کے ارکان نے ایرانی بلوچستان کے گورنر سے تبادلہ خیالات کیا۔

وفد کی سرگرمیوں کی مختصر رپورٹ کے بعد اب میں ان امور کی طرف آتا ہوں جن کا ابتدا میں ذکر کیا تھا کہ ایران جانے سے ہماری غرض کیا تھی اور وہ کون سے امور تھے جن کا جائزہ لینا ہمارا مقصد تھا۔

انقلابِ ایران ۱۹۷۹ء

فکری بنیاد

پہلی بات یہ تھی کہ کیا یہ انقلاب صرف شاہی خاندان کے خلاف عوامی نفرت کا وقتی نتیجہ تھا یا انقلاب کی کوئی فکری بنیاد بھی موجود تھی؟ ہم نے اس نقطہ نظر سے جو مشاہدہ کیا ہے اس سے واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس انقلاب کے لیے ایک عرصہ سے فکری کام ہو رہا تھا اور انقلاب کے راہنماؤں نے صرف فکری بنیادوں پر انقلاب کی جدوجہد کو استوار کیا ہے بلکہ اس کے لیے رجال کار کی مطلوبہ کھیپ مہیا کرنے کی طرف بھی ضروری توجہ دی ہے۔ ایران کے مذہبی راہنماؤں نے لادینی نظریات بالخصوص سیکولرازم کے خلاف مسلسل فکری جنگ لڑی ہے اور مغربی تہذیب و ثقافت کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کر کے اپنے عوام کو منطق اور استدلال کے ساتھ یہ باور کرایا ہے کہ مادر پدر آزاد جمہوریت، سیکولرازم، سوشلزم اور مغربی تہذیب ان کے عقائد و نظریات اور دینی مزاج سے متصادم ہے اور انہیں اپنے مذہب کی بالادستی کے لیے ان تمام چیزوں سے دستبرداری اختیار کرنا ہوگی۔

قوم میں یہ شعور بیدار کرنے کے بعد انقلاب ایران کے فکری راہنماؤں نے اہل فکر و دانش کو اپنی فکری جدوجہد کا ہدف بنایا ہے، بالخصوص دو راہنماؤں جناب آیت اللہ باقر صدر اور آیت اللہ مرتضیٰ مطہری نے انسانی زندگی کے اجتماعی مسائل پر جس طرح قلم اٹھایا ہے اور دلیل و منطق کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جدید نظریات و افکار کے تار و پود کو بکھیرا ہے اس سے ایران کا دانشور طبقہ بھی انقلاب کی طرف رخ کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ اور بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایرانی انقلاب کی پشت پر ایک مسلسل اور شعوری فکری جدوجہد کی قوت موجود ہے۔ اگر شیعہ سنی اختلافات کے حوالہ سے نہ دیکھا جائے تو

میرے نزدیک آیت اللہ باقر صدر اور آیت اللہ مرتضٰی مطہری کی فکری کاوشوں اور جدید نظریات و تہذیب کے خلاف ان کی نظریاتی جدوجہد سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دوسری بات یہ تھی کہ کیا ایران کے مذہبی حلقے اس انقلاب کے تحفظ و استحکام کے لیے ذہنی اور عملی طور پر تیار ہیں؟ اس کا جواب اثبات میں ہے اور مشاہدات بتاتے ہیں کہ اس وقت بھی ایران میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اپنے مذہب کے ساتھ شعوری اور جذباتی وابستگی کے ساتھ ساتھ نظام مملکت کے اصولوں اور طریقوں سے واقف ہیں اور قم کے مدارس کے علاوہ امام جعفر صادقؒ یونیورسٹی، امام رضا یونیورسٹی اور دیگر یونیورسٹیاں انقلاب کی نظریاتی ضرورت کے مطابق نئی نسل کو تیار کرنے میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔

معاشرہ پر اثرات

تیسرا سوال ہمارے ذہنوں میں یہ تھا کہ کیا انقلاب نے معاشرہ میں کوئی عملی تبدیلی پیدا کی ہے یا یہ محض لیبل ہے؟ اس سوال کی اہمیت ہمارے نزدیک خود ہمارے ہاں گزشتہ نو سال سے دکھائے جانے والے اسلامائزیشن کے شو کے پیش نظر زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اس لیے ہماری کوشش یہ رہی کہ اس سوال کے جواب کے لیے ہم ایرانی معاشرہ کے زیادہ قریب ہونے کی صورت اختیار کریں۔ چنانچہ اس کوشش کے نتیجہ میں جن تبدیلیوں کو ہم دیکھ سکے ہیں ان کا نقشہ کچھ اس طرح بنتا ہے:

- آزاد خیالی اور سیکولرازم کے فتنے ایران کے مذہبی حلقوں کے ہاتھوں شکست کھا چکے ہیں، اور اگر پاکستان کے دینی حلقے مجھے اس گستاخی پر معاف کریں تو اس امر کی نشاندہی اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ایران کے مذہبی حلقوں نے سیکولر حلقوں کے خلاف یہ کامیابی فتووں اور طعن و تشنیع کا بازار گرم کر کے نہیں بلکہ منطق و استدلال سے ان کی فکر کو شکست دے کر حاصل کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج انہیں اس کامیابی کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لیے جبر کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ وہ عوام کی براہ راست نمائندگی پر اعتماد کرتے ہوئے منتخب اداروں کے ذریعے حکومت کر رہے ہیں۔
- نئی نسل کے رجحانات کو کافی حد تک مذہب کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ ہمیں وہاں مذہب، انقلاب اور مذہبی اقدار کی باتیں کرنے والوں میں بوڑھوں کی بہ نسبت نوجوانوں کا تناسب زیادہ نظر آیا جو اس امر کا ثبوت ہے کہ ایران کی مذہبی قیادت نئی نسل کو اپنی ڈھب پر لانے میں کافی حد تک کامیاب رہی ہے اور یہ بات انقلاب ایران کے استحکام اور محفوظ مستقبل کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔

- یہ بھی انقلاب ایران کا کرشمہ ہے کہ ایشیا کا پیرس کہلانے والے تہران میں آج کسی خاتون کے بے حجاب چلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایرانی عورت روایتی آرائش و زیبائش سے بیگانہ ایک سادہ سی سیاہ چادر میں ملبوس ایران کے بازاروں میں دکھائی دیتی ہے، حتیٰ کہ ابتدائی سکول میں جانے والی پانچ چھ سال کی عمر کی بچیاں بھی اسی حجاب میں مستور بستے اٹھائے سکولوں کی طرف جاتی نظر آتی ہیں۔ تہران کے بعض عام شہریوں کے مطابق اس شہر میں انقلاب سے پہلے عریانی، بدکاری اور شراب خوری کے اڈے عام تھے مگر اب یہ اڈے ختم ہو چکے ہیں۔ بازاروں، ریلوے اسٹیشنوں اور ہوائی اڈوں میں پردے کی اہمیت کے بینر اور کتبے آویزاں ہیں۔ تہران ایئرپورٹ پر شہداء کے پیام کے حوالہ سے یہ کتبہ لکھا تھا کہ ”خواہرم! سیاہی حجاب تو کو بندہ تر از سرخیٔ خونِ من است“ کہ میری بہن! تیرے پردہ کی سیاہی میرے خون کی سرخی سے زیادہ مقدس ہے۔ مشہد میں امام رضاؒ کے مزار کے باہر ایک بڑا کتبہ لکھا ہوا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ ”مزار کی زیارت مستحب ہے مگر پردہ کی رعایت واجب ہے۔“
- الغرض اس ثقافتی انقلاب کے ذریعے انقلاب ایران کے لیڈروں نے ایرانی معاشرہ کو مغربی تہذیب کے غلبہ اور یورپی ثقافت کی بالادستی سے نجات دلانے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی ہے اور نہ صرف ایرانی عورت کو ایک باوقار حجاب سے بہرہ ور کر دیا ہے بلکہ عورت کو تجارتی نمائش کا عنوان بننے سے بھی نجات دلا دی ہے۔ چنانچہ ہم نے وہاں اخبارات کے ایڈیشنوں کو عورت کے جسم اور حسن کی نمائش سے عاری پایا ہے اور جنرل اسٹوروں میں پاؤڈر اور کریم کے ڈبے بیچنے کے لیے عورت کی مسکراہٹ کو سفارشی کا روپ دھارے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف نہ کرنا بخل اور ناانصافی ہوگا۔
- ہمیں ایران کے بینکوں میں جا کر ان کے نئے بینکاری کے نظام کو دیکھنے اور عدالتوں میں جا کر عدالتی نظام میں انقلاب کے بعد کی تبدیلیوں کا مشاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملا مگر مختلف ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق ایرانی بینکوں سے سود کا نظام ختم کیا جا چکا ہے اور ”مضاربت“ اور ”قرض حسنہ“ کی بنیادوں پر بینکاری کا نیا نظام کام کر رہا ہے۔ اسی طرح عدالتوں میں اہل ایران کے مذہبی معتقدات کے مطابق شرعی حدود کا نہ صرف نفاذ ہو چکا ہے بلکہ ان پر کامیابی سے عملدرآمد بھی ہو رہا ہے۔

فرقہ وارانہ مسائل کا حل

چوتھی بات جو ہم معلوم کرنا چاہتے تھے، یہ تھی کہ ایرانی انقلاب کے لیڈروں نے فرقہ وارانہ مسائل پر قابو پانے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی، بالخصوص عدالتوں میں مذہبی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں فقہی بنیادوں کے تعین کے مسئلہ پر انہوں نے کیا اصول طے کیا ہے؟ کیونکہ پاکستان میں ہمارے لیے یہ مسئلہ خاصی الجھن کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری گفتگو قومی اسمبلی کے سنی ارکان کے علاوہ شورٰی نگہبان کے چھ ارکان بالخصوص جناب آیت اللہ جنتی سے ہوئی اور ایران کے دستور کا مطالعہ کیا۔ ان راہنماؤں نے بھی ہمیں ایران کے دستور کی طرف توجہ دلائی کہ اس میں یہ مسئلہ طے کر دیا گیا ہے جس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے کہ:

> دستور کی دفعہ ۱۲ میں کہا گیا ہے کہ ”ایران کا سرکاری دین اسلام اور مذہب اثنا عشری جعفری ہے اور دستور کی یہ دفعہ ہمیشہ کے لیے ناقابل تبدیل ہے۔ دیگر اسلامی مذاہب حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور زیدی کا مکمل احترام ہو گا، ان کے پیروکار اپنی مذہبی رسومات اپنی فقہ کے مطابق انجام دینے میں آزاد ہوں گے۔ دینی تعلیم اور شخصی قوانین (نکاح، طلاق، وراثت، وصیت) میں ان کے فیصلے ان کی فقہ کے مطابق ہوں گے۔ جس علاقہ میں ان میں سے کسی مذہب کے پیروکاروں کی اکثریت ہو گی وہاں کے مقامی قوانین، شورٰی کے اختیارات کے دائرہ میں رہتے ہوئے وہ اپنے مذہب کے مطابق بنا سکیں گے بشرطیکہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے حقوق محفوظ رہیں۔“

گویا ایران میں وہاں کی آبادی کی اکثریت کی فقہ کو نہ صرف دستوری تحفظ دیا گیا ہے بلکہ دوسری فقہوں کے پیروکاروں کو پرسنل لاء، مذہبی رسومات اور مقامی قوانین میں ان کی فقہوں کے مطابق عملدرآمد کی آزادی دے کر پبلک لاء میں صرف اکثریتی فقہ کی بالادستی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ حتٰی کہ ایران کے دستور کی دفعہ ۱۱۵ کے مطابق ایران کے صدر کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ:

> ”ایران کی مذہبی اور سیاسی شخصیات میں سے ہو، ایرانی الاصل ہو، ایرانی قومیت رکھتا ہو، منتظم اور مدبر ہو، امانت و تقوٰی سے بہرہ ور ہو، اسلامی جمہوریہ ایران کی بنیادوں پر یقین رکھتا ہو، اور رسمی مذہب (جعفری اثنا عشری) کا پیروکار ہو۔“

اسی طرح ہمیں بتایا گیا کہ اگرچہ قومی اسمبلی میں ہر فقہی مذہب کے پیروکار منتخب ہو کر ممبر بن سکتے ہیں لیکن قومی اسمبلی کے اوپر بارہ افراد کی جو شورٰی نگہبان (نگران کونسل) ہے اور جو قومی اسمبلی کے فیصلوں پر نظر ثانی کر کے ان کی توثیق یا رد کرنے کی مجاز ہے، اس کی رکنیت کے لیے اثنا عشری جعفری

ہونا شرط ہے۔ کسی دوسری فقہ کا پیروکار اس کونسل کا رکن نہیں بن سکتا اور نہ ہی موجودہ بارہ ارکان میں اس وقت کوئی ہے۔

چنانچہ ان معلومات کے حصول کے بعد جب ہم نے ایرانی راہنماؤں کو اس طرف توجہ دلائی کہ پاکستان میں غالب سنی اکثریت ہوتے ہوئے بھی فقہ جعفری کو بطور پبلک لاء نافذ کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے حتیٰ کہ یہ مطالبہ نفاذِ اسلام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، تو انہوں نے اس مطالبہ کو غلط قرار دیا اور کہا کہ پاکستان کی سنی اکثریت کا یہ حق ہے کہ ملک کا پبلک لاء ان کی فقہ کے مطابق ہو اور دوسری فقہوں کے پیروکاروں کو پرسنل لاء میں آزادی دی جائے۔

اہلِ سُنت کی حیثیت

پانچواں سوال جس کا جائزہ لینا ہمارے دورۂ ایران کے اہم مقاصد میں شامل تھا، یہ تھا ایران کے اہلِ سنت کے بارے میں صورتحال معلوم کرنا کہ وہ کس حال میں ہیں اور انقلاب ایران کے بعد اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کے بارے میں کیا سوچ رکھتے ہیں؟ ہم نے اس سلسلہ میں متعدّد سنی راہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور ان سے حتی الامکان کرید کرید کر سوالات کیے۔ ان میں ایسے راہنما بھی ہیں جنہوں نے حکومت ایران کے تمام اقدامات کی حمایت کی ہے، اور وہ راہنما بھی ہیں جن کی مخالفت میں شدت اور تلخی واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ لیکن ایک بات پر سبھی متفق تھے کہ شاہ ایران کے دور سے مذہبی طور پر انقلاب کے بعد کا دور بہرحال بہتر ہے اور انقلاب سے ایرانی معاشرہ میں نظریاتی، دینی اور معاشرتی تبدیلیاں آئی ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اہلِ سنت کو درپیش مسائل و مشکلات اور ان کے حل کے سلسلہ میں ایرانی حکومت کی بے توجہی کی شکایت عام طور پر محسوس کی جا رہی ہے۔ اور یہ بے توجہی اب ان حدود کو چھو رہی ہے کہ ہمیں اہلِ سنت کے مسائل سے آگاہ کرنے میں بھی اس لیے ہچکچاہٹ محسوس کی جا رہی تھی کہ شاید ہمارے وہاں سے آجانے کے بعد یہ بات ان کے لیے نقصان کا باعث نہ بن جائے۔

ایران میں اہلِ سنت کے مسائل

- ایران کی مجموعی آبادی میں اہلِ سنت کے تناسب کا صحیح تعین ممکن نہیں ہے اس لیے کہ اب تک اس فرق کے ساتھ مردم شماری نہیں ہوئی لیکن ایک ذمہ دار سنی راہنما کے اندازے کے مطابق مجموعی آبادی میں اہلِ سنت کا تناسب پچیس فیصد ہو سکتا ہے۔ کردستان اور بلوچستان دو صوبے ایسے ہیں جہاں اہلِ سنت کی اکثریت ہے لیکن صوبائی حکومتیں نہ

ہونے کی وجہ سے یہ اکثریت بے وزن ہو کر رہ گئی ہے۔ حتیٰ کہ بلوچستان کے بعض راہنماؤں کو شکایت ہے کہ اس صوبہ میں اہلِ سنت ساٹھ فیصد سے زیادہ ہیں لیکن اعلیٰ ملازمتوں میں کوئی سنی نظر نہیں آتا، سب کے سب اعلیٰ افسران غیر سنی ہیں اور وہ بھی باہر سے بھیجے گئے ہیں۔ گویا وہاں کا مسئلہ نان سنی کے ساتھ نان لوکل کا بھی ہے جو ان کے اندر محرومی اور مایوسی کے احساس کو اجاگر کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ ایک راہنما نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا کہ ہمارے ہاں تو اینٹیں بنانے والے بھی باہر سے آتے ہیں۔ کم و بیش یہی صورتحال کردستان کی بھی بیان کی جاتی ہے۔

- اہلِ سنت کی سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ انہیں اپنے حقوق کے لیے منظم ہونے کا حق نہیں ہے۔ حالانکہ ایران کے دستور کی دفعہ ۲۶ کے مطابق انہیں تنظیم بنانے کا حق حاصل ہے لیکن کردستان کے ایک اہم سنی راہنما احمد مفتی زادہ مسلسل چار سال سے صرف اس لیے جیل میں ہیں کہ انہوں نے حقوق اہلِ سنت کے تحفظ کے لیے ایک تنظیم کا ڈھانچہ قائم کیا تھا۔ اسی طرح سراوان کے صوفی دوست محمد ایک سال سے جیل میں ہیں بلکہ اس وقت بیمار ہیں اور ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ علاوہ ازیں سرخس کے مولانا محی الدین ایک سال جیل میں رہے ہیں اور اب انہیں سات سال کے لیے جلاوطن کر دیا گیا ہے۔
- اہلِ سنت کو یہ بھی شکایت ہے کہ ان کے مذہبی معتقدات کا احترام نہیں کیا جاتا۔ بعض ایرانی راہنما مشترک اجتماعات میں اہلِ سنت کے مذہب کے خلاف تقریریں کرتے ہیں اور ان کے اکابر کے بارے میں وہ کچھ کہتے ہیں جو ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ ایک بزرگ سنی راہنما حسرت بھرے لہجے میں کہنے لگے کہ بھئی ہم غلامی کی زندگی قبول کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اپنے اکابر کی توہین کیسے سنیں، اس سے تو موت اچھی ہے۔ ایسے ہی ایک واقعہ کی نشاندہی کی گئی کہ شوریٰ نگہبان کے ممبروں میں سے کسی صاحب نے ریڈیو تقریر کرتے ہوئے جنگ جمل کے حوالہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف لڑنے والوں کو ”ائمۃ الکفر“ قرار دیا حالانکہ ان میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ جیسے اکابر شامل ہیں۔ اس پر بلوچستان سے ایرانی پارلیمنٹ کے سابق منتخب ممبر مولانا نظر محمد نے احتجاج کیا اور ایک پبلک تقریر میں اس کی مذمت کی تو انہیں گرفتار کر لیا گیا اور ابھی تک وہ نہ صرف زیر حراست ہیں بلکہ حراست کے دوران انہیں ٹی وی پر معذرت کے لیے مجبور کرنے کے باوجود انہیں رہا نہیں کیا گیا۔

- اہلِ سنت کو یہ شکوہ ہے کہ ان کی اکثریت کے صوبوں میں نہ صرف یہ کہ اعلیٰ ملازمتوں اور عہدوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ دوسرے صوبوں سے غیر سنی آبادی ان کے صوبوں میں بتدریج منتقل کر کے ان کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ ایک سنی راہنما کا اس سلسلہ میں یہ کہنا تھا کہ اگر دس سال تک یہ صورتحال اسی طرح جاری رہی تو ہماری نئی نسل بالکل جاہل رہ جائے گی اور بلوچستان اور کردستان میں ہماری اکثریت باقی نہیں رہے گی۔
- اہلِ سنت کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ان کے طلبہ کو یونیورسٹیوں میں داخلہ نہیں ملتا۔ دینی تعلیم کے لیے ان کی ضرورت کے مطابق اعلیٰ مدارس موجود نہیں ہیں اور پاکستان کے دینی مدارس میں تعلیم کے لیے انہیں جانے کی سہولت میسر نہیں ہے۔ انہیں پاسپورٹ نہیں دیا جاتا اور جو طلبہ چوری چھپے پاکستان کے مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں واپسی پر انہیں گرفتار کر لیا جاتا ہے، حالانکہ اس کے برعکس صرف قم کے دینی مدارس میں پاکستان کے ایک ہزار کے قریب طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایران کے سنی طلباء دینی تعلیم کے لیے پاکستان کے مدارس میں آنا چاہتے ہیں لیکن بے بس ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ انہیں پاکستان کے دینی مدارس میں داخلہ ملنا چاہیے اور اسی طرح پاسپورٹ پر تعلیم کے لیے پاکستان جانے کا حق ہونا چاہیے جس طرح پاکستانی طلباء کو قم جانے کا حق حاصل ہے۔

الغرض اہلِ سنت اپنے حقوق و مفادات کے سلسلہ میں بے یقینی کا شکار ہیں اور ان کی یہ بے یقینی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہم نے اپنے میزبانوں کو اس طرف توجہ دلائی ہے بلکہ ہمارے دورے کے اختتام سے قبل ہمارے تاثرات معلوم کرنے کے لیے ایک سوالنامہ ہمیں دیا گیا تھا جس کے جوابات سب نے اپنے اپنے تاثرات کے مطابق تحریر کیے۔ راقم الحروف نے اپنے جوابات میں ایران کی انقلابی قیادت کو اس مسئلہ کے حوالہ سے ان الفاظ کے ساتھ توجہ دلائی ہے کہ:

> ”ایران شیعہ اکثریت کا ملک ہے اور اہلِ سنت یہاں بعض صوبوں میں اکثریت میں ہونے کے باوجود مجموعی طور پر اقلیت میں ہیں۔ فطری طور پر عالمِ اسلام میں سنی اکثریت کے ممالک ایرانی انقلاب کو یہاں کی سنی اقلیت کے رجحانات اور جذبات کے آئینہ میں دیکھیں گے۔ اس لیے سب سے پہلے ایران کی انقلابی حکومت کو یہاں کی سنی اقلیت کو مطمئن کرنا چاہیے اور ناراض عناصر کو عملی طور پر اعتماد میں لینا چاہیے، تاکہ وہ عالمِ اسلام میں انقلاب ایران سے سنی مسلمانوں کی دوری کا باعث بننے کی بجائے اس

انقلاب کے مؤثر مبلغ بن سکیں۔"

کرم ایجنسی کے افسوسناک واقعات

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۱۴؍اگست ۱۹۸۷ء

کراچی میں بموں کے افسوسناک دھماکوں میں سینکڑوں بے گناہ شہریوں کی المناک شہادت کے بعد شمال مغربی سرحد پر واقع قبائلی علاقہ کرم ایجنسی میں ہونے والے اضطراب انگیز سانحہ نے پوری قوم کے دلوں کو کرب و اضطراب کی ناقابل برداشت کیفیت سے دوچار کر دیا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ بیرونی لابیاں پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے پوری قوت کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں۔ کرم ایجنسی کے واقعات کی کچھ تفصیلات قومی اخبارات کے ذریعے سامنے آئی ہیں لیکن حالات و واقعات کی جو تفاصیل اس علاقہ سے دیگر ذرائع سے موصول ہو رہی ہیں ان کے پیش نظر اخبارات میں پیش کی جانے والی تصویر یک طرفہ محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حالات کی واقعاتی تصویر کو بھی منظرِ عام پر لایا جائے:

- کرم ایجنسی کا یہ علاقہ آبادی کے لحاظ سے شیعہ اکثریت کا علاقہ ہے اور گزشتہ دس بارہ سال سے فرقہ وارانہ کشمکش اور خونریز فسادات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔
- گزشتہ سال سدہ کے مقام پر بموں کے دھماکوں میں سینکڑوں جانیں ضائع ہوئیں اور قیمتی عمارتیں تباہ ہو گئیں۔ ان دھماکوں میں علاقہ کے ایک شیعہ خاندان کو ملوث پایا گیا چنانچہ علاقہ کے لوگوں نے اجتماعی فیصلہ کے ساتھ اس خاندان کو علاقہ بدر کر دیا۔
- اس خاندان کے حشمت نامی ایک دہشت گرد نے ٹولہ بنا کر سلطان کلی کے علاقہ کو اپنی وارداتوں کا مرکز بنایا اور وقتاً فوقتاً سڑک بلاک کر کے گاڑیوں کو چھیننے اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ اس کی دہشت گردی اور لوٹ مار کا ہدف زیادہ تر سنی حضرات بنتے رہے، گاڑیوں اور فلائنگ کوچوں کے چھیننے کی وارداتوں کے علاوہ لوٹ مار اور اغوا کا سلسلہ بھی جاری رہا اور چند ماہ میں پچاس کے قریب افراد اغوا کر لیے گئے جن میں معروف سنی بزرگ پروفیسر عبد الغفور بھی شامل ہیں۔
- ان وارداتوں کے نتیجے میں حشمت کو افغانستان کی سرحد کے قریب ایک مقام پر کچھ لوگوں نے گاڑی سے اتار کر اغوا کر لیا اور اس کے اغوا کے ساتھ ہی اس کے ٹولہ نے سنیوں پر مسلح حملے شروع کر دیے جس کے نتیجے میں سولہ افراد شہید اور تیس سے زائد زخمی ہو گئے۔

- اس مرحلہ میں کرم ایجنسی کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ نے سلطان کلی جاکر معززین کے ذریعے ان وارداتوں کو رکوانے کی کوشش کی تو اس کی گاڑی بھی چھین لی گئی اور اسے پیدل کرم ایجنسی آنا پڑا۔
- اس کے بعد مختلف اطراف میں کھلم کھلا لڑائی شروع ہوگئی جس کی کچھ تفصیلات قومی اخبارات میں شائع ہوچکی ہے۔
- اس لڑائی کا سب سے افسوسناک اور اضطراب انگیز پہلو یہ ہے کہ وفاقی حکومت کے زیرِ انتظام قائم ''کرم ملیشیا'' نے، جس کی اکثریت شیعہ سپاہیوں پر مشتمل ہے، سرکاری احکام ماننے سے انکار کر دیا بلکہ سرکاری اسلحہ خانوں کو لوٹ کر خانہ جنگی میں شامل ہوگئی اور سنی آبادی کے خلاف منظم جنگ کا آغاز کر کے قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا۔ اس خانہ جنگی میں عظیم جانی نقصان کی سب سے زیادہ ذمہ داری ''کرم ملیشیا'' پر عائد ہوتی ہے۔
- فوج نے کرفیو کے ذریعے حالات کو ایک حد تک کنٹرول کر لیا اور کرفیو کے دوران جب امام بارگاہوں کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے روسی اسلحہ اس قدر کثیر تعداد میں برآمد ہوا جو اس علاقے میں فوج کے اپنے ذخائر سے مبینہ طور پر کئی گنا زیادہ تھا۔
- واقعات کے اصل رخ پر پردہ ڈالنے کے لیے افغان مہاجرین کے خلاف نفرت انگیز پراپیگنڈا کی مہم شروع کی گئی حالانکہ اس خانہ جنگی میں افغان مہاجرین کا کوئی اجتماعی کردار نہیں ہے اور ان کا حصہ صرف اتنا ہے کہ دہشت گرد حشمت کے ٹولے نے گاڑیاں چھیننے اور لوٹ مار کی وارداتوں کے دوران جب افغان مہاجرین کو اپنی کارروائیوں کا نشانہ بنایا تو افغان مہاجرین نے ان کا مسلح مقابلہ کیا۔ اس کے علاوہ ان واقعات میں افغان مہاجرین کا کوئی کردار نہیں ہے۔ اس دوران یہ بھی کہا گیا کہ افغان مہاجرین نے ہلہ بول کر سدہ بازار کو مسمار کر دیا ہے حالانکہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا اور سدہ بازار آج بھی پہلے کی طرح موجود ہے۔

ان حالات میں ہم حکومتِ پاکستان سے یہ مطالبہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

- کرم ایجنسی کے افسوسناک واقعات کی اعلیٰ سطحی عدالتی تحقیقات کرا کے اصل واقعات اور ان کے پس منظر کو قوم کے سامنے لایا جائے۔
- کرم ملیشیا کی مبینہ بغاوت کا فوری نوٹس لے کر اس ملیشیا کو بلا تاخیر غیر مسلح کر دیا جائے اور بغاوت اور قتل وغارت کے ذمہ دار افراد کو عبرتناک سزا دی جائے۔

- دہشت گرد حشمت اور اس کے ٹولے کے اصل پشت پناہوں کو بے نقاب کیا جائے اور علاقہ میں روسی اسلحہ کی فراوانی کے اسباب اور ذمہ دار حضرات کو منظرِ عام پر لایا جائے۔
- ان فسادات میں جاں بحق ہونے والوں کو معاوضہ دلایا جائے اور قاتلوں کو سخت سزا دی جائے۔

ہم ملک بھر کے قومی و دینی حلقوں سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ کرم ایجنسی کے مظلوم عوام کی حمایت میں روسی ہتھیاروں سے مسلح دہشت گردوں کے خلاف مؤثر آواز اٹھائیں اور پاک افغان سرحد پر واقع اس نازک اور حساس علاقے کے عوام کو انصاف اور تحفظ فراہم کرنے کی منظم اور مشترکہ کوشش کر کے بیرونی لابیوں اور دہشت گردوں کی سازشوں کو ناکام بنا دیں۔

مولانا عبد العزیزؒ

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۴ ستمبر ۱۹۸۷ء

مولانا عبد العزیزؒ ایران میں اہلِ سنت کے سب سے بڑے عالمِ دین تھے اور متعدّد مرتبہ پارلیمنٹ کے رکن رہے ہیں۔ وہ ایک عرصہ سے صاحبِ فراش تھے اور اسی سال جنوری میں ایران کے دورہ کے موقع پر مولانا منظور احمدؒ چنیوٹی اور راقم الحروف نے وفد کے دیگر ارکان کے ہمراہ تہران میں مولانا عبد العزیزؒ سے ملاقات اور ان کی بیمار پرسی کی تھی۔ مولانا مرحوم ایرانی انقلاب کے بانیوں میں سے تھے اور انقلاب کے بعد دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی رہے ہیں لیکن کچھ عرصہ بعد وہ ایرانی اہلِ سنت کے حقوق کے مسئلہ پر انقلابی راہنماؤں سے ناراض ہو گئے تھے اور وہ سنی آبادی کے حقوق و مفادات کے سلسلہ میں ایرانی انقلاب کے راہنماؤں کے رویہ سے مطمئن نہیں تھے۔

مولانا عبد العزیزؒ کی وفات سے ایران کے اہلِ سنت ایک مدبر اور جری راہ نما سے محروم ہو گئے ہیں اور ہم اس صدمہ و غم میں ایران کے تمام سنی بھائیوں سے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

الشیخ ابو النصر البیانویؒ

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۷ء

شام کے مجاہد عالمِ دین اور اسلامی محاذ شام کے سیکرٹری جنرل الشیخ محمد غیاث ابو النصر البیانوی گزشتہ

دنوں بیالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کا تعلق حلب کے ایک ممتاز علمی گھرانے سے ہے، ان کے والد محترم الشیخ احمد الدین البیانویؒ اور دادا محترم الشیخ عیسیٰ البیانویؒ اپنے وقت کے ممتاز علماء اور روحانی پیشواؤں میں شمار ہوتے تھے۔ شام میں اہلِ تشیع کے نصیری فرقہ سے تعلق رکھنے والے سربراہ حافظ الاسد کے دورِ حکومت میں علماء اور اہلِ دین کے خلاف ظلم و تشدد کا جو بازار مسلسل گرم ہے، مرحوم اس کے خلاف علماء حق کی جدوجہد کے سرکردہ راہنما تھے اور حکومت کے ظلم وجبر کے خلاف منظم جدوجہد کرنے والے اسلامی محاذ کے سیکرٹری جنرل تھے۔

شام میں اس وقت علماء حق مسلسل مصائب اور آلام کا شکار ہیں حتیٰ کہ معروف عالمِ دین الشیخ عبد الفتاح ابو غدہ اور دیگر سرکردہ علماء جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ہزاروں علماء اور دینی کارکن اب تک اسد حکومت کے مظالم کا شکار ہو کر شہید ہو چکے ہیں اور ہزاروں جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے پڑے ہیں۔ ایسے حالات میں الشیخ ابو النصر البیانویؒ جیسے مجاہد عالمِ دین کا انتقال بلاشبہ اہلِ شام کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ ہم اس غم میں شام کے اہلِ علم اور دینی حلقوں کے ساتھ شریک ہیں اور مرحوم کے لیے مغفرت اور درجات کی بلندی کی پر خلوص دعا کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ شام کے مظلوم و مقہور علماء کو ظلم اور جبر کے اس دور سے جلد نجات عطا فرمائیں اور شام میں اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کے لیے علماء شام کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

بنوری ٹاؤن کا المیہ

ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور --- ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۷ء

گزشتہ ہفتہ کراچی میں اہلِ تشیع کے چہلم کے جلوس کے موقع پر جو کچھ ہوا اس پر پورے ملک میں افسوس اور اضطراب کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ بالخصوص بنوری ٹاؤن کی جامع مسجد اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ جیسے عظیم دینی و علمی ادارے پر پولیس اور فوج کی کارروائی سے ایک نوجوان کی شہادت، نصف درجن کے قریب نوجوانوں کے زخمی ہونے اور مسجد کے قالین جل جانے کے سانحہ نے اس کرب و اضطراب کو دوچند کر دیا ہے۔ یہ سانحہ اس وجہ سے پیش آیا کہ سوادِ اعظم اہلِ سنت کے راہنما مولانا مفتی احمد الرحمان اور ان کے رفقاء گزشتہ سال تحریری طور پر طے پانے والے سمجھوتہ کے مطابق حکومت سے مطالبہ کر رہے تھے کہ ماتمی جلوس کا روٹ تبدیل کیا جائے اور معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے اسے بنوری ٹاؤن کی جامع مسجد کے سامنے سے نہ گزرنے دیا جائے۔ سوادِ اعظم اہلِ سنت کے

اس جائز مطالبہ اور اس کی منظوری پر اصرار کو حکومتِ سندھ نے اپنے وقار اور انا کا مسئلہ بنا لیا اور اس کارروائی تک نوبت پہنچا دی جس کے نتیجہ میں مسجد کے تقدس کی پامالی اور ایک نوجوان کی شہادت کے ساتھ جلوس کو فوج کی نگرانی میں زبردستی وہاں سے گزارا گیا۔

انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ایک معاہدہ جب طے پا گیا تھا اور خود حکومت کی طرف سے اس معاہدہ کی تحریر دی گئی تھی تو پھر اس کھلم کھلا خلاف ورزی اور تشدد اور طاقت کے ذریعے ایک اقلیتی جلوس کو اس طرح اکثریت پر مسلط کرنے کا آخر کیا جواز تھا؟ باخبر حلقے اس خدشہ کا اظہار کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ حکومت کے طے شدہ منصوبہ کے مطابق ہوا ہے اور اقتدار میں بیٹھے ہوئے بعض لوگ مسلسل اس کوشش میں ہیں کہ پاکستان کے عوام میں طبقاتی، گروہی، نسلی، لسانی اور فرقہ وارانہ کشمکش کو اس حد تک بڑھا دیا جائے کہ ایک نئے مارشل لاء یا بیرونی طاقتوں کی مداخلت کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہ جائے۔

سوادِ اعظم اہلِ سنت اور حکومت کے درمیان گزشتہ سال اس سلسلہ میں ہونے والے معاہدے کا متن ہم اسی شمارہ میں شائع کر رہے ہیں جس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ واقعات کی ترتیب اور حکومت کا رویہ حالات کے کس رخ کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ راقم الحروف کو اس سلسلہ میں گزشتہ ہفتے کراچی جا کر مختلف طبقوں کے راہنماؤں سے ملنے اور حالات کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ہے، اس کی تفصیلات اور کراچی، کوہاٹ، اٹک، جھنگ، چکوال، گولڑہ شریف اور دوسرے شہروں میں اس نوعیت کے واقعات کے پس منظر اور نتائج و عواقب کے بارے میں ایک مفصل تجزیاتی مضمون آئندہ شمارہ میں ان شاء اللہ العزیز قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ایرانی انقلاب کا پھیلتا ہوا دائرہ

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۱۵ جنوری ۱۹۸۸ء

شیعہ سنی تنازعہ کی تاریخ بہت پرانی ہے اور پاکستان میں بھی ایک عرصے سے ماتمی جلوسوں اور تقریبات کے حوالہ سے مختلف شہروں میں یہ تنازعہ خونریز فسادات کا باعث بنتا چلا آرہا ہے۔ لیکن پڑوسی ملک ایران میں کامیاب مذہبی انقلاب کے بعد ارد گرد کے دیگر مسلم ممالک کی طرح پاکستان میں بھی شیعہ سنی تنازعہ مذہبی اختلاف کا لبادہ اتار کر اپنے اصل سیاسی روپ میں ظاہر ہو رہا ہے۔

ایرانی انقلاب کی مذہبی قیادت نے اپنے انقلاب کا دائرہ گرد و پیش کی مسلم ریاستوں تک وسیع کرنے کے لیے ان ریاستوں میں شیعہ اقلیتوں کو مسلح و منظم کرنے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے اور اس پالیسی کا

تسلسل جنوبی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے بیشتر ممالک میں فرقہ وارانہ خانہ جنگی کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ کویت، بحرین اور خلیج کی دیگر ریاستوں میں مداخلت کے علاوہ حرم پاک میں خونریز سیاسی مظاہروں اور سعودی عرب کے ایک علاقہ میں مسلح انقلاب کی ناکام کوشش اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اور پاکستان میں فقہ جعفریہ کے نفاذ کی تحریک کے ذریعہ نفاذِ اسلام کو متنازعہ بنانے کی مہم کے علاوہ تعلیم، اوقاف اور زکوٰۃ میں الگ تشخص و امتیاز کے اظہار و قیام اور مسلح دہشت گردی کے ساتھ سنی اکثریت کو خوفزدہ کرنے کے لیے فرقہ وارانہ جارحیت کے ارتکاب کی روش بھی اسی جنون کا کرشمہ ہے۔

گزشتہ ڈیڑھ ماہ کے دوران جھنگ، لیہ، کوہاٹ، کراچی، اٹک، خیرپور ٹامیوالی، اگوکی ضلع سیالکوٹ، گولڑہ شریف، فیصل آباد اور دیگر مقامات میں ایک درجن سے زائد سنی مسلمان اس فرقہ وارانہ دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ کر جام شہادت نوش کر چکے ہیں، اور علماء اور دینی کارکنوں کے خلاف دہشت گردی کی مبینہ سازشوں کا مختلف حلقوں کی طرف سے انکشاف ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ اور ان کے رفقاء کی المناک شہادت کے پس منظر میں بھی اس برآمد شدہ فرقہ وارانہ دہشت گردی کا ذکر اب زیادہ سنجیدگی کے ساتھ ہونے لگا ہے۔

ملک کے حالات فرقہ وارانہ مسائل کو ابھارنے کے متحمل نہیں ہیں اور نہ ہی جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کی پالیسی اور روایات فرقہ وارانہ کشمکش کو ہوا دینے کے رجحان کی حامل رہی ہیں لیکن اہلِ سنت کے جائز حقوق کا تحفظ اور خونریز فرقہ وارانہ دہشت گردی کا سدباب بھی وقت کا اہم ترین تقاضا ہے جس سے کسی صورت بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اسی مقصد کے لیے ۱۱ جنوری ۱۹۸۸ء کو شیرانوالہ گیٹ لاہور میں ''قومی سنی کنونشن'' طلب کیا گیا ہے جس کا مقصد اس نازک صورتحال میں اہلِ سنت کی آئندہ جدوجہد کا لائحہ عمل اور طریق کار طے کرنا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ یہ اجتماع ملک و قوم کو اس درآمد شدہ فرقہ واریت سے نجات دلانے کے لیے ٹھوس اقدامات اور سنجیدہ لائحہ عمل پر منتج ہوگا اور علماء حق اپنی روایات کو زندہ رکھتے ہوئے دہشت گردی کے اس نئے فتنہ کا راستہ روکنے میں ضرور کامیاب ہوں گے، ان شاء اللہ العزیز۔

ایران عراق جنگ:
اسلامی اتحاد کانفرنس میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی شرکت

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور ---فروری ۱۹۸۸ء

گزشتہ ہفتہ کے دوران اسلام آباد میں ''اسلامی اتحاد کانفرنس'' کے عنوان سے منعقد ہونے والے ایک اجتماع میں ایران عراق جنگ کے حوالہ سے عراق کو جارح قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی گئی ہے۔ اس کانفرنس کا افتتاح صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے کیا جبکہ مبینہ طور پر اس اجتماع میں ایرانی حکومت کے ذمہ دار حضرات شریک ہوئے مگر دوسرے فریق عراق کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔ اس پس منظر میں جارح قرار دینے کی قرارداد انصاف کے مسلمہ اصولوں کے منافی اور جانبدارانہ ہی قرار پا سکتی ہے۔

پھر اس کانفرنس کا پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں انعقاد اور صدر پاکستان کا افتتاحی خطاب بجائے خود محل نظر ہے۔ کیونکہ پاکستان اسلامی سربراہ کانفرنس کی قائم کردہ اس امہ کمیٹی کا رکن ہے جو عراق ایران جنگ کو بند کرانے اور دونوں فریقوں میں مصالحت کرانے کے لیے قائم کی گئی ہے، اس لیے اسلام آباد میں اس قسم کی کانفرنس کا انعقاد اور عراق کو شریک کیے بغیر اسے جارح قرار دینے کی مذکورہ قرارداد ہمارے نزدیک پاکستان کی مصالحتی اور غیر جانبدارانہ حیثیت کو مشکوک بنانے کی ایک ایسی کوشش ہے جس کی ہر انصاف پسند شخص کو مذمت کرنی چاہیے۔

سانحۂ مکہ اور ایرانی راہنما کی دھمکی

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور ---۱۲ فروری ۱۹۸۸ء

ایران کے ایک وفد نے حال ہی میں پاکستان کا دورہ کیا جس کی قیادت ایران کی مجلس شوریٰ کے ڈپٹی سیکرٹری آیت اللہ محمد یزدی کر رہے تھے۔ روزنامہ جنگ لاہور ۳ فروری ۱۹۸۸ء کے مطابق جناب یزدی نے اپنے دورۂ پاکستان کے موقع پر لاہور میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے سانحۂ مکہ کے بارے میں اپنی حکومت کے مؤقف کی وضاحت کی اور اس ضمن میں یہ بھی کہا کہ

- یہ جرم بخشا نہیں جائے گا،
- ہم حج کی بھرپور تیاری کر رہے ہیں اور

- ہم پچھلے سالوں کی طرح جلوس نکالیں گے۔

جہاں تک سانحۂ مکہ کے بارے میں ایرانی حکومت کے موقف کی وضاحت کا تعلق ہے، ایرانی راہنماؤں کو اس کا پورا پورا حق حاصل ہے اور وہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں اس حق کو استعمال کرنے کا جواز رکھتے ہیں۔ لیکن ”جرم بخشا نہ جائے گا“ کے انتقامی لہجے کے ساتھ ”حج کی بھرپور تیاری“ اور ”جلوس نکالنے“ کا الٹی میٹم کسی طرح بھی گزشتہ واقعات کی وضاحت نہیں کہلا سکتا بلکہ یہ ایک کھلی دھمکی ہے جو پاکستان کی سرزمین پر دی گئی ہے۔

پاکستان کے عوام اور دینی حلقے حرمین شریفین کی مقدس سرزمین پر ایرانی عازمین کے سیاسی مظاہروں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے اور نہ ہی عالمِ اسلام کی سطح پر ان مظاہروں کو کسی درجہ میں پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ بلکہ اسے ایران کی طرف سے اپنے تشخص اور انفرادیت کے اظہار کا ایک غیر موزوں اور نامناسب طریقِ کار ہی سمجھا گیا ہے۔ اس لیے عالمِ اسلام اور پاکستان کی رائے عامہ کے جذبات کے برعکس اس ہٹ دھرمی کا پاکستان کی سرزمین پر اظہار بلاشبہ پاکستانی عوام کے جذبات کی توہین اور مہمان داری کے مسلمہ آداب کی خلاف ورزی ہے۔

ہم جناب یزدی کے اس دھمکی نما اعلان پر شدید احتجاج کرتے ہوئے حکومتِ پاکستان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس کا نوٹس لے اور اس سے بے زاری کا باضابطہ اظہار کر کے اپنی پوزیشن واضح کرے۔

گلگت کے فسادات اور حکومت کی ذمہ داری

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- جون ۱۹۸۸ء

گلگت میں رمضان المبارک کے آخر میں سنی شیعہ کشیدگی میں جو اچانک اضافہ ہوا تھا وہ بالآخر خونریز فسادات پر منتج ہوا اور سینکڑوں افراد کی جانیں ان فسادات کی نذر ہوگئیں۔ سینکڑوں جانوں کی بھینٹ وصول کرنے والے ان فرقہ وارانہ فسادات کے اسباب کیا ہیں اور کون عناصر ان کے ذمہ دار ہیں؟ اس کا جائزہ لینے کے لیے متحدہ سنی محاذ کا ایک وفد اس ہفتہ کے دوران گلگت جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں حتمی بات اس وفد کی رپورٹ کے بعد ہی کی جاسکتی ہے۔ تاہم اب تک موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق واقعات کی ترتیب کچھ اس طرح بنتی ہے۔

رمضان المبارک کے آخری عشرہ کے آغاز میں گلگت کے بعض اہم راستوں میں سڑکوں پر ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اسم گرامی کچھ ایسی بدزبانی اور مغلظات کے ساتھ لکھا ہوا پایا گیا

کہ دیکھنے والے ہر باغیرت مسلمان کا خون کھول اٹھا۔ ام المؤمنین کے اسم گرامی کے ساتھ بے ہودہ کلمات کے علاوہ سڑک پر پاؤں تلے روندے جانے کے تصور نے ہر مسلمان کو لرزہ براندام کر دیا۔ اہلِ سنت کی طرف سے حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اس قسم کی شرمناک حرکت کرنے والوں کے خلاف تحفظ ناموس صحابہؓ آرڈیننس کے تحت فوری کارروائی کی جائے اور ان ناموں کو فی الفور مٹایا جائے مگر انتظامیہ خاموش تماشائی بنی رہی اور عام روایت یہ ہے کہ شمالی علاقہ جات سے وزیراعظم جونیجو کے مشیر احمد علی شاہ اس بارے میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوئے۔

جمعۃ الوداع کے موقع پر مرکزی جامع مسجد گلگت کے خطیب مولانا عنایت اللہ نے مجبور ہو کر الٹی میٹم دیا کہ اگر عید کے روز تک اہلِ سنت کے مطالبات منظور نہ کیے گئے تو عید کے دن اہلِ سنت خود کارروائی کریں گے اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ناموس کے تحفظ کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ انتظامیہ نے اس الٹی میٹم کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا جس نے باغیر مسلمانوں کے سینوں میں سلگنے والی اضطراب کی آگ کو انتقامی شعلوں میں بدل دیا۔

اہلِ تشیع نے عید الفطر اہلِ سنت سے ایک روز قبل ادا کی اور نماز پڑھنے کے بعد گلگت ایئر پورٹ کے قریب گزرنے والی نہر کے ساتھ مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے اور مرکزی جامع مسجد اور ایئر پورٹ کے درمیان سنی آبادی کے ایک محلہ پر فائرنگ شروع کر دی جس سے ایک سنی مسلمان شہید ہوا اور اس کے ساتھ ہی اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان مسلح تصادم کا آغاز ہو گیا۔ شاہ ٹوٹ نامی ایک بستی جو سنی آبادی کے پندرہ بیس گھروں پر مشتمل تھی اہلِ تشیع نے اس کا مکمل محاصرہ کر کے اسے جلا دیا اور پوری بستی صاف کر دی۔ گلگت میں اہلِ سنت کے خلاف دہشت گرد فرقہ پرستوں کی ان مسلح ظالمانہ کارروائیوں کو دیکھ کر اردگرد علاقوں کے سنی مسلمانوں نے غیرت ایمانی کا مظاہرہ کیا اور مناور، سکھواڑ، ٹکور، جلال آباد، بھونجی، سسی، کھلتارو، داتو اور دیگر دیہات میں جوابی کارروائیاں کیں جس سے فسادات کا دائرہ گلگت کی حدود سے دیہات علاقوں تک پھیل گیا۔

اس قضیہ کا شرمناک ترین پہلو یہ ہے کہ عید کے دوسرے روز جبکہ فسادات زوروں پر تھے اہلِ تشیع کے بعض علماء نے مبینہ طور پر یہ چیلنج دے دیا کہ حضرت عائشہؓ کے خلاف جو کچھ سڑکوں پر لکھا گیا ہے وہ اس کا ثبوت کتابوں سے دینے کے لیے تیار ہیں۔ اس چیلنج کے اعلان کے بعد وہ حضرات گلگت سے ہنزہ جانے والے راستے پر واقع چائنہ پل پر کتابیں لے کر پہنچ گئے۔ یہ اعلان بھڑکتی ہوئی آگ پر مزید پٹرول ڈالنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ چائنہ پل پر بھی خونریز تصادم ہوا اور متعدّد جانیں اس میں ضائع ہو گئیں۔

اگر واقعات کی ترتیب فی الواقع انہی اطلاعات کے مطابق ہے تو یہ صورتحال انتہائی اذیت ناک، تکلیف دہ اور اضطراب انگیز ہے اور اس کی ذمہ داری ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے نام نامی کو بدزبانی اور خبث باطن کا نشانہ بنانے والے عناصر اور اس شرمناک کارروائی کو معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کرنے والی انتظامیہ پر عائد ہوتی ہے۔ حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ گلگت جیسے حساس علاقہ میں ہونے والے شیعہ سنی فسادات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کرا کے ان کے اسباب و عوامل اور محرکات کو منظر عام پر لائے اور اس المناک خونریزی کے لیے اشتعال انگیزی کا ایندھن مہیا کرنے والے شرپسند عناصر کو قرار واقعی سزا دے کر آئندہ کے لیے ایسے افسوسناک واقعات کا سدباب کرے۔

ڈیرہ اسماعیل خان کے سنگین حالات

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۸ء

......ڈیرہ اسماعیل خان صوبہ سرحد کا حساس اور اہم ڈویژن مرکز ہے۔ یہاں ایک عرصہ تک خونریز شیعہ سنی فسادات ہوتے رہے ہیں، کئی سال کی خونریزی کے بعد سنی اور شیعہ نمائندوں کی رضامندی، کمشنر اور انتظامیہ کے دیگر افسران کی موجودگی میں ایک متفقہ معاہدہ طے پایا جس کے تحت اندرون شہر جلوسوں پر پابندی لگا دی گئی۔ شیعہ فرقہ نے اس معاہدے کو تسلیم کرنے کے باوجود اس کی خلاف ورزی شروع کر رکھی ہے اور ایک بے مقصد اور بلاجواز جلوس کو ''مذہبی جلوس'' قرار دے کر خونریزی کو اپنا ہدف بنا لیا ہے۔ تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کی نئی قیادت نے اس سلسلہ میں ڈیرہ اسماعیل خان میں باقاعدہ ملک گیر جلوس نکالنے کا پروگرام دیا۔ ہم شیعہ فرقہ کی اس ہٹ دھرمی اور بے مقصد و بلاجواز جلوس نکالنے کی شدید مذمت کرتے ہیں اور حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ڈیرہ اسماعیل خان ہی نہیں پورے ملک میں ہر قسم کے مذہبی جلوسوں پر پابندی لگائی جائے، ڈیرہ اسماعیل خان کے گرفتار علماء کرام کو رہا کیا جائے اور متفقہ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے والے فریق کو قرار واقعی سزا دی جائے کیونکہ اسی صورت میں امن و امان برقرار رہ سکتا ہے۔

''شریعت بل'' اور تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۲۸ جولائی ۱۹۸۹ء

روزنامہ جنگ لاہور ۱۹ جولائی کی اشاعت کے مطابق سینٹ کی خصوصی کمیٹی نے ''شریعت بل'' کے مسودہ کی منظوری دے دی ہے اور اب اسے چند روز میں سینٹ کے سامنے آخری منظوری کے

لیے پیش کیا جائے گا۔ یہ شریعت بل قائد جمعیۃ مولانا سمیع الحق اور مولانا قاضی عبداللطیف نے سینٹ میں پیش کیا تھا جس پر سینٹ کی قائم کردہ خصوصی کمیٹی نے غور کیا اور مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ راہنماؤں سے تبادلۂ خیالات کے بعد مناسب ترامیم کے ساتھ اس کے مسودہ کی منظوری دے دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تحریک نفاذِ فقہ جعفریہ کے ایک لیڈر رسید حامد علی موسوی کا بیان بھی اخبارات میں آیا ہے جس میں انہوں نے کمیٹی کے منظور کردہ مسودہ کو ناقابل قبول قرار دیا ہے۔

تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کے لیڈروں کا مطالبہ یہ ہے کہ پرسنل لاء کی طرح پبلک لاء میں بھی فقہ جعفریہ کے متوازی نفاذ کی راہ اختیار کی جائے۔ سینٹ کی خصوصی کمیٹی نے اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا اور اخباری رپورٹ کے مطابق اپنے فیصلہ کی بنیاد اس مسلمہ اصول پر رکھی ہے کہ پبلک لاء ملک کی اکثریت کے عقائد واحکام کے مطابق ہو گا۔

ہمارے نزدیک کمیٹی کا یہ فیصلہ اصولی اور منطقی ہے کیونکہ ایک ملک میں دو پبلک لاء نافذ نہیں ہو سکتے۔ ۱۹۵۱ء میں تمام مکاتبِ فکر کے ۳۱ علماء کرام نے ۲۲ متفقہ دستوری نکات میں اس اصول کو تسلیم کیا تھا جس پر شیعہ قائدین کے دستخط موجود ہیں۔ اور خود ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد ایرانی دستور میں بھی اسی اصول کو اپنایا گیا ہے۔ اس لیے ہم شیعہ لیڈروں سے گزارش کریں گے کہ وہ ایک غیر اصولی اور غیر منطقی مطالبہ پر بے جا اصرار کر کے ”شریعت بل“ کی منظوری میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ اس کا فائدہ ملک کی لادین اور سیکولر قوتوں کے سوا کسی کو نہیں ہو گا۔

اہلِ تشیع کے ہاں
عورت کی حکمرانی کی حیثیت

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور --- ۵ جنوری ۱۹۹۰ء

...... اہل تشیع کی معروف کتاب ”مستدرک الرسائل“ میں، جو الحاج مرزا حسین نوری طبرسی کی لکھی ہوئی ہے اور قم سے طبع ہوئی ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کو جنت سے نکلنے کا حکم دیا تو حضرت حواؑ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں نے تمہیں ناقص العقل والدین بنایا ہے اور

لم اجعل منكن حاكما ولم ابعث منكن نبيا۔

(مستدرک الرسائل باب ان المراۃ لا تولی القضاء)

"میں نے تم عورتوں میں سے کوئی حاکم نہیں بنایا اور نہ تم میں سے کسی کو نبی بنا کر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

یہاں حاکم نہیں بنایا کا معنیٰ یہ ہوگا کہ حاکم بننے کی اجازت نہیں دی، اس لیے جو عورتیں کسی دور میں حاکم بن گئی ہیں ان کی حیثیت وہی ہوگی جو نبوت کا دعویٰ کرنے والی عورتوں کی ہے۔

اسی مستدرک الرسائل میں یہ روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے جناب رسول اللہؐ سے کچھ سوالات کیے، ان میں سے ایک سوال حضرت آدمؑ کی پسلی سے حضرت حواؑ کو پیدا کرنے کے بارے میں بھی تھا۔ سوال یہ تھا کہ حضرت حواؑ کو حضرت آدمؑ کے پورے وجود سے پیدا کیا گیا یا وجود کے کچھ حصہ سے بنایا گیا تو جناب سرور کائناتؐ نے فرمایا کہ

بل من بعضه ولو خلقت من كله لجاز القضاء فى النسآ كما يجوز فى الرجال۔

"بلکہ حضرت حواءؑ کو حضرت آدمؑ کے وجود کے بعض حصہ سے پیدا کیا گیا اور اگر انہیں پورے وجود سے پیدا کیا جاتا تو قضا کا منصب عورتوں کے لیے بھی اسی طرح جائز ہو جاتا جس طرح مردوں کے لیے جائز ہے۔"

اہلِ تشیع کے ہی ایک اور محقق الاستاذ الشیخ جعفر السبحانی اپنی کتاب "معالم الحکومۃ الاسلامیہ" میں، جو مکتبہ الامام امیر المومنین العامۃ اصفہان سے چھپی ہے، امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے عورتوں کے بارے میں احکام بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

ولا تولّى القضآء۔

(المیزان ج ۱۸ ص ۹۳۔ معالم الحکومۃ الاسلامیہ ص ۲۷۷)

"عورت قضا کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتی۔"

......

معروف شیعہ محقق الاستاذ الشیخ جعفر السبحانی لکھتے ہیں:

فقد اجمع علماء الامامية كلهم على عدم انعقاد القضاء للمراة وان استكملت جميع الشرائط الاخرىٰ۔ (معالم الحکومۃ الاسلامیۃ ص ۲۷۸)

"امامیہ مکتب فکر کے تمام علماء کا اس امر پر اجماع ہے کہ قضاء کا منصب عورت کے سپرد کرنا جائز نہیں ہے اگرچہ اس میں دوسری تمام شرائط پائی جاتی ہوں۔"

......

تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ: نفاذِ اسلام کی جدوجہد میں معاون یا رکاوٹ؟

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ---فروری ۱۹۹۰ء

ہفت روزہ زندگی کے ایک گزشتہ شمارہ (۱۵ تا ۲۱ دسمبر ۱۹۸۹ء) میں ”ایران اور انقلاب ایران“ پر بحث و تمحیص کے حوالہ سے کالا گوجراں سے جناب جعفر علی میر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے انقلاب ایران اور اس کے اثرات کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ راقم الحروف کو ۱۹۸۷ء میں پاکستانی علماء کرام، وکلاء، دانشوروں کے ایک وفد کے ساتھ ایران جانے اور وہاں گیارہ روزہ قیام کے دوران انقلابی راہنماؤں سے ملنے اور انقلاب کے اثرات و نتائج کا مشاہدہ کرنے کا موقع مل چکا ہے اور اس مشاہدے کے بارے میں میرے تاثرات قومی پریس کے ذریعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اسی لیے جناب جعفر علی میر کے مضمون کے اس عنوان نے مجھے چونکا دیا کہ ”ایران کے سنیوں پر شیعہ قوانین نافذ نہیں ہے“۔ کیونکہ یہ بات واقعات سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتی۔ پھر مضمون کے اس حصے نے حیرت و استعجاب کو دوچند کر دیا کہ

> ”نفاذ فقہ جعفریہ کا مطالبہ فقط اہلِ تشیع کے لیے کیا جاتا ہے اور تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کا موقف یہ ہے کہ ہر مسلک کے پیروکاروں کو ان کی اپنی فقہ کے مطابق عمل کرنے کی آزادی ہو جیسا کہ ایران میں ہے۔ وہاں اہلِ سنت کو مکمل آزادی ہے، ان کے مدارس دینیہ و مساجد موجود ہیں، پارلیمنٹ میں نمائندگی حاصل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایران کے کسی قانون کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا۔“

یوں محسوس ہوتا ہے کہ جناب جعفر علی میر صاحب ابھی تک خود ایران نہیں گئے ہیں اور اگر انہیں وہاں جانے کا موقع ملا ہے تو انہوں نے تصویر کا ایک ہی رخ دیکھنے پر اکتفاء کیا ہے اور دوسرے رخ پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی، ورنہ ان کے تاثرات اس درجہ خلاف واقعہ اور یک طرفہ نہ ہوتے۔

جہاں تک انقلاب ایران کے سماجی و سیاسی اثرات اور علاقائی و عالمی سیاست میں انقلابی حکومت کے رول کا تعلق ہے اس پر زیر نظر مضمون میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور نہ ہی عالمِ اسلام کے ساتھ ایران کی انقلابی حکومت کے تعلقات اور رویے کو زیر بحث لانا مقصود ہے۔ مگر جعفر میر صاحب کے مضمون کے عنوان اور مندرجہ بالا اقتباس کے حوالہ سے اور ایران میں اپنے گیارہ

روزہ قیام کے مشاہدات کی روشنی میں مندرجہ ذیل دو پہلوؤں پر چند ضروری گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ اصل صورت حال قارئین کے سامنے آسکے۔

- ایران میں مقیم اہلِ سنت کے ساتھ انقلابی حکومت کا رویہ کیا ہے؟
- اور پڑوسی ممالک بالخصوص پاکستان میں شیعہ سنی اختلافات کے پس منظر میں شیعہ تحریکات کے سرپرست کی حیثیت سے ایران کی انقلابی حکومت کیا کردار ادا کر رہی ہے؟

ایران کی اہلِ سُنت اقلیت کی حیثیت

جہاں تک ایران میں مقیم اہلِ سنت کا تعلق ہے، اس بارے میں سب سے پہلے ان حقائق کا ادراک ضروری ہے کہ ایران کی مجموعی آبادی میں اہلِ سنت کا تناسب پچیس فیصد سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ دو صوبوں بلوچستان اور کردستان بلکہ ایرانی ترکمانستان میں بھی اہلِ سنت کی واضح اکثریت ہے اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایران کے چاروں طرف سرحدی علاقوں میں اہلِ سنت اکثریت میں ہیں جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ صفیوں کے اقتدار سے قبل پورا ایران سنی اکثریت کا ملک تھا لیکن صفیوں نے طاقت کے زور سے لوگوں کو زبردستی شیعہ بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا اور راسخ العقیدہ سنی مسلمان ان کے ظلم و جبر کی تاب نہ لاتے ہوئے وسطی ایران سے سرحدی علاقوں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے اور اس طرح ایران کو بالجبر شیعہ ریاست بنا دیا گیا۔

مزید تفصیلات میں جائے بغیر میں ان مسائل کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کا اس وقت ایرانی اہلِ سنت کو سامنا ہے اور جن مسائل کے حل کے لیے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کسی تحریک اور منظم حمایت کا وجود نہیں ہے جس سے اس طبقہ کی مظلومیت دوچند ہو جاتی ہے۔

- تین صوبوں میں اہلِ سنت کی واضح اکثریت ہونے کے باوجود صوبائی حکومتوں کا وجود نہ ہونے کی وجہ سے اقتدار میں ان کی کسی درجہ میں بھی شرکت نہیں، بلکہ ملازمتوں میں بھی ان کا تناسب بہت کم ہے۔ گورنر اور اعلیٰ افسران مرکز کی طرف سے آتے ہیں جو غیر سنی ہونے کے علاوہ غیر مقامی بھی ہوتے ہیں اور عام ملازمتوں کے دروازے بھی مقامی سنی آبادی پر بند ہیں جس سے غیریت اور محرومیت کا احساس دن بدن بڑھ رہا ہے۔
- ملکی آبادی میں کم از کم پچیس فیصد ہونے کے باوجود قومی اسمبلی میں اہلِ سنت کی نمائندگی کا تناسب یہ ہے کہ ۱۹۸۷ء میں جب ہم ایران گئے، دو سو ستر کے ایوان میں سنی ارکان کی تعداد صرف چودہ تھی۔
- تہران میں لاکھوں کی تعداد میں سنی آباد ہیں لیکن انہیں اپنے لیے الگ مسجد بنانے کی

اجازت نہیں ہے۔ اور شیعہ سنی اتحاد کا جو پراپیگنڈا زور و شور سے کیا جاتا ہے اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سنی آبادی اپنا الگ تشخص قائم کرنے کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اس سلسلے میں ہم نے اپنے میزبانوں سے بات کی تو معلوم ہوا کہ تہران میں ایک پلاٹ اہلِ سنت کی مسجد کے لیے مخصوص کیا گیا تھا لیکن جس سنی راہنما کو یہ پلاٹ دیا گیا تھا اسے اس جرم میں جیل میں ڈال دیا گیا کہ اس نے مسجد کی تعمیر کے لیے سعودی حکومت سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ہمارے شدید اصرار اور کوشش کے باوجود ہمارے میزبان وہ پلاٹ ہمیں دکھانے پر تیار نہ ہوئے جو خود ان کے بقول اہلِ سنت کی مسجد کے لیے مخصوص کیا گیا تھا اور ابھی تک وہاں مسجد کی تعمیر کے کوئی امکانات واضح نہیں ہوئے تھے۔

- ایرانی دستور میں ہر طبقہ کو اپنے حقوق و مسائل کے لیے تنظیم سازی کا حق دیا گیا ہے لیکن یہ حق عملاً اہلِ سنت کو حاصل نہیں ہے۔ کردستان کے ایک عالم احمد مفتی زادہ صرف اس جرم میں گرفتار ہوئے کہ انہوں نے اہلِ سنت کے حقوق کے لیے ایک تنظیم قائم کرنے کی جسارت کر لی تھی جو انقلابی حکومت کے ہاں ناقابل معافی قرار پائی۔ ان کے علاوہ سراوان کے صوفی دوست محمد، سرخس کے مولانا محی الدین، اور ایران شہر سے قومی اسمبلی کے سابق رکن مولانا نظر محمد بھی اہلِ سنت کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کی پاداش میں جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے ہیں۔
- ایران کے صرف قم شہر کے مدارس میں پاکستان کے ایک ہزار سے زائد شیعہ طلبہ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں لیکن ایران کے سنی طلبہ کو پاکستان کے دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کا حق نہیں ہے۔ طلبہ کو پاسپورٹ نہیں دیا جاتا، درخواست دینے والے طلبہ سی آئی ڈی کی مستقل نگرانی کی زد میں آجاتے ہیں اور جو نوجوان کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں واپسی پر جیل کی سلاخیں ان کی منتظر ہوتی ہیں۔
- ایران کی یونیورسٹیوں میں داخلے کے سلسلہ میں سنی طلبہ سے ترجیحی سلوک روا رکھا جاتا ہے، مذہبی رجحانات کے حامل طلبہ کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے، صرف ان طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے جو مذہبی لحاظ سے قدرے آزاد ہوں اور ان کی برین واشنگ آسانی سے کی جاسکے۔
- ایران کا سرکاری مذہب اثنا عشری ہے۔ ملک کا پبلک لاء اسی فقہ کے مطابق ہے اور اس کا اطلاق سنیوں پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح باقی آبادی پر ہوتا ہے۔

ایران کا دستور اور سرکاری مذہب

اس سلسلہ میں

- ایرانی دستور کے ''اصول کلی'' میں اصل دوازدہم (بارہواں اصول) یوں درج ہے:

''دین رسمی ایران، اسلام و مذہب، جعفری اثناعشری است و ایں اصل الی الابد غیر قابل تغیر است و مذاہب دیگر اسلامی اہم از حنفی، شافعی، مالکی، حنبل و زیدی دارای احترام کامل میباشند و پیروان ایں مذاہب درانجام مراسم مذہبی طبق فقہ خود شاں آزادند و در تعلیم و تربیت دینی و احوال شخصیہ (ازدواج، طلاق، ارث، و وصیت) و دعاوی مربوط بہ آن در دادگاہہا رسمیت دارند و در ہر منطقہ کہ پیروان ہر یک ازیں مذاہب اکثریت داشتہ باشند مقدرات محلی در حدود و اختیارات شوراہا بر طبق آں مذہب خواہد بود باحفظ حقوق پیرواں سایر مذاہب۔''

ترجمہ: ''ایران کا سرکاری دین اسلام اور سرکاری مذہب جعفری اثناعشری ہے اور یہ اصل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناقابل تبدیل ہے۔ دیگر اسلامی مذاہب مثلاً حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور زیدی پوری طرح قابل احترام ہوں گے اور ان مذاہب کے پیروکار اپنی مذہبی رسوم کو اپنی فقہ کے مطابق بجالانے میں آزاد ہوں گے اور دینی تعلیم و تربیت اور شخصی قوانین (نکاح، طلاق، وراثت اور وصیت یعنی پرسنل لاء) اور ان سے متعلقہ دعاوی کی سماعت کا عدالتوں میں قانونی حق رکھیں گے اور جن علاقوں میں ان میں سے کسی ایک مذہب کے پیروکاروں کی اکثریت ہوگی وہاں لوکل قوانین مجالس مشاورت کے دائرہ اختیار میں رہتے ہوئے اپنے مذہب کے موافق بناسکیں گے بشرطیکہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے حقوق محفوظ ہوں۔''

- ایرانی دستور کی اصل یک صد و پانزدہم (دفعہ ۱۱۵) میں صدر مملکت کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایرانی النسل اور دیگر شرائط کا حامل ہونے کے ساتھ ایران کے سرکاری مذہب (جعفری اثناعشری) کا پیروکار ہو۔ اور اصل یک صد و بیست و یکم (دفعہ ۱۲۱) میں صدر ایران کے حلف نامہ میں اسے اس حلف کا پابند کیا گیا ہے کہ

''پاسدار مذہب رسمی و نظام جمہوری اسلامی و قانون اساسی کشور باشم۔''

ترجمہ: ''میں ریاست کے سرکاری مذہب (جعفری اثناعشری) جمہوری

اسلامی نظام اور دستور کی پاسداری کروں گا۔"

- دستور کی دفعہ ۷۲ میں مجلس شوریٰ ملی (قومی اسمبلی) کو پابند کیا گیا ہے کہ

"مجلس شوریٰ ملی نمی تواند قوانینی وضع کند کہ با اصول و احکام مذہب رسمی کشور یا قانون اساسی مغایرت داشتہ باشد۔

ترجمہ: "قومی اسمبلی ملک کے دستور اور سرکاری مذہب (جعفری اثناعشری) کے منافی کوئی قانون نہیں بنا سکتی۔"

ان واضح دستوری دفعات کی روشنی میں یہ بات طے ہے کہ ایران کا سرکاری مذہب شیعہ ہے۔ صدر ایران شیعہ مذہب کی پاسداری کا پابند ہے۔ قومی اسمبلی شیعہ مذہب کے خلاف کوئی قانون نہیں بنا سکتی۔ اور ملک کا عمومی قانون (پبلک لاء) جعفری اثناعشری مذہب کے مطابق ہے جس کا اطلاق شیعہ سنی سب پر ہوتا ہے۔ اس لیے جناب جعفر علی میر کے اس ارشاد کو مبنی بر حقیقت کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ایران میں سنیوں پر شیعہ قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔

انقلابِ ایران ۱۹۷۹ء کے اثرات بیرون ممالک پر

جناب جعفر علی میر کے مضمون کے جواب میں دوسری گزارش یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ حالات و واقعات کے تسلسل نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ایرانی انقلاب کے اثرات پڑوسی ممالک بالخصوص پاکستان میں نفاذِ اسلام کی تحریکات کے حق میں مثبت نہیں رہے اور ایرانی انقلاب سے پڑوسی ممالک کی نفاذِ اسلام کی تحریکات کو وقتی طور پر جو توقعات وابستہ ہو گئی تھیں، نتائج ان کے برعکس سامنے آئے ہیں۔ راقم الحروف خود ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے ایران کی انقلابی قیادت سے واضح مذہبی اختلاف کے باوجود انقلاب ایران کا خیر مقدم کیا تھا اور اس کے حق میں خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا تھا، صرف اس خیال اور جذبہ سے کہ عقائد کے اختلاف کے باوجود بہر حال ایران کا انقلاب ایک کامیاب مذہبی انقلاب ہے جو آج کے دور میں کمیونسٹ، سیکولر، اور مغربی جمہوریت کے پرستار سیاسی حلقوں پر ایک ضرب کاری ہے اور مذہبی اختلاف کے باوجود نفاذِ اسلام کی جدوجہد میں ایران کی انقلابی قیادت کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ توقع تھی کہ انقلاب ایران کے بعد پاکستان کے شیعہ حلقے پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ نفاذِ شریعت اسلامیہ کی جدوجہد میں ہمارے معاون ہوں گے اور ان کا مذہبی جوش و خروش ہمارے لیے تقویت کا باعث ہوگا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا اور انقلاب ایران کے حوالے سے پاکستان میں جو نئی شیعہ تحریکات ابھریں انہوں نے اہلِ تشیع کے لیے الگ اور متوازی پبلک لاء کا مطالبہ کر کے نفاذِ اسلام کی جدوجہد کو نظریاتی محاذ پر سبوتاژ کر کے رکھ دیا۔

۱۹۵۱ء میں پاکستانی علماء کے ۲۲ دستوری نکات

انقلاب ایران سے قبل پاکستان کے شیعہ حلقے نفاذِ اسلام کی جدوجہد میں کسی اصولی اختلاف کے بغیر ہمارے ساتھ تھے اور انہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ ملک کا پبلک لاء ایک ہو۔ چنانچہ ۳۱ علماء کرام کے ۲۲ دستوری نکات میں مندرجہ ذیل اصول (نکتہ ۹) پر مولانا مفتی جعفر حسین اور مولانا مفتی کفایت حسین کے دستخط موجود ہیں کہ

> "مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذاہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا کرنا مناسب ہوگا کہ ان کے قاضی یہ فیصلہ کریں۔"

اس طرح سنی اور شیعہ دونوں حلقے اس امر پر متفق تھے کہ پبلک لاء ایک ہوگا اور شخصی قوانین (پرسنل لاء) میں مسلمہ اسلامی فرقوں کو اپنے اپنے مذہبی قوانین پر عمل کا حق حاصل ہوگا۔ لیکن ایرانی انقلاب کے بعد "تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ" کی بنیاد رکھ دی گئی اور مطالبہ یہ ہوا کہ پرسنل لاء میں نہیں بلکہ پورے قانونی نظام میں فقہ جعفریہ کو متوازی قانون کے طور پر نافذ کیا جائے۔ اس مطالبہ کے لیے تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کے دو گروپ کام کر رہے ہیں اور دونوں خود کو انقلاب ایران کا نمائندہ قرار دیتے ہیں۔ دونوں گروپوں نے اس بنیاد پر سینٹ میں زیر بحث "شریعت بل" کی مخالفت کی۔ اور تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کے میدان عمل میں آنے کا منطقی اور نظریاتی نتیجہ یہ سامنے آیا کہ شریعت اسلامیہ کی بالادستی اور نفاذ کا مطالبہ فرقہ وارانہ مطالبہ قرار دے دیا گیا۔

انقلابِ ایران کے بعد پاکستان میں اہلِ تشیع کے عزائم

انقلاب ایران کے بعد اس حوالہ سے پاکستان میں ابھرنے والی شیعہ جدوجہد کا یہ کردار تاریخ میں اپنے منفی نتائج کے لحاظ سے ہمیشہ ناقابل فراموش رہے گا کہ سیکولر حلقوں کو نفاذِ اسلام کی جدوجہد کے خلاف ایسا ہتھیار دے دیا گیا ہے جسے استعمال کرنے میں لادین عناصر اس سے قبل کبھی کامیاب نہیں ہو سکے تھے لیکن اب وہ اسے پوری مہارت اور کامیابی کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ اسلامی نظام کے نفاذ کی مخالفت میں سیکولر اور مفاد پرست عناصر پہلے بھی فقہی اختلافات اور فرقہ وارانہ کشمکش کا حوالہ دیا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ کس فرقے کا اسلام نافذ کیا جائے؟ لیکن علماء کے ۲۲ دستوری

نکات ان کے اس پروپیگنڈے کا مسکت جواب تھے اور دستوری مسائل پر تمام مکاتبِ فکر کے متفقہ موقف کے سامنے سیکولر حلقوں کی یہ منطق بے اثر ثابت ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے کیونکہ جب ملک میں شریعت اسلامیہ کی بالادستی اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے ساتھ ہی فقہ جعفریہ کے متوازی نظام کا مطالبہ کھڑا ہو جاتا ہے تو سیکولر عناصر کے ہاتھ میں ایک مضبوط ہتھیار آجاتا ہے کہ یہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے اور اس سے مذہبی مناقشت بڑھے گی اس لیے نفاذِ اسلام کی طرف عملی قدم بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یہ مسئلہ راقم الحروف نے ۱۹۸۷ء میں اپنے دورۂ ایران کے موقع پر معروف انقلابی راہنما جناب آیت اللہ جنتی کے سامنے پاکستانی وفد کی موجودگی میں پیش کیا تھا اور انہیں اس مشکل سے آگاہ کیا تھا کہ فقہ جعفریہ کے پبلک لاء کے طور پر متوازی نفاذ کے مطالبہ نے سیکولر حلقوں کے مقابلہ میں نظریاتی محاذ پر ہمیں کمزور کر دیا ہے۔ وفد کے ارکان گواہ ہیں کہ جناب آیت اللہ جنتی نے ہمارے موقف کو درست قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ پبلک لاء ایک ہی ہو سکتا ہے جو اکثریتی آبادی کی فقہ کے مطابق ہونا چاہیے، البتہ پرسنل لاء میں آپ اہلِ تشیع کو آزادی دیں۔ ہم نے عرض کیا کہ پرسنل لاء میں اہلِ تشیع کے جداگانہ حق سے ہم نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی انکار نہیں کیا۔

آج بھی صورتحال یہ ہے کہ ہم پرسنل لاء میں اہلِ تشیع کا یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں اپنے مذہبی قوانین پر عمل کرنے کی آزادی ہونی چاہیے لیکن پبلک لاء ایک ہی ہو سکتا ہے۔ یہ دنیا بھر کا مسلمہ اصول ہے اور خود ایرانی دستور میں بھی اس اصول کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لیے اہلِ تشیع کو اپنی اس جدوجہد اور موقف پر بہرحال نظر ثانی کرنی چاہیے کیونکہ اس کا فائدہ ملک کی لادین اور سیکولر قوتوں کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

انصاف کا تقاضہ

آخر میں جناب جعفر علی میر اور ان کے رفقاء سے عرض کروں گا کہ اہلِ سنت کے موقف میں کوئی ابہام، تضاد، یا ناانصافی نہیں ہے، وہ اپنے لیے وہی حقوق مانگتے ہیں جو ایران میں شیعہ اکثریت کو دستوری طور پر حاصل ہیں اور ان کا یہ مطالبہ بالکل حقیقت پسندانہ اور مبنی بر انصاف ہے کہ

- پاکستان کو سنی اسٹیٹ قرار دیا جائے۔
- صدر اور وزیر اعظم کے لیے سنی ہونا شرط قرار دیا جائے۔
- ملک کا پبلک لاء اکثریتی فقہ کے مطابق ہو اور شیعہ سمیت تمام اقلیتی آبادیوں کو پرسنل لاء میں اپنے مذہب پر عمل کا حق دیا جائے۔

- قومی اسمبلی کو پابند کیا جائے کہ وہ اہلِ سنت کے مذہب کے منافی قانون سازی نہ کر سکے۔

امید ہے کہ تمام سنجیدہ شیعہ حلقے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ان مطالبات کا جائزہ لیں گے اور سیکولر حلقوں کی تقویت کا باعث بننے کی بجائے اپنے ملک کی اکثریتی آبادی کا ساتھ دیں گے۔

مولانا حق نواز جھنگوی شہیدؒ

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مارچ ۱۹۹۰ء

انجمن سپاہِ صحابہؓ پاکستان کے سرپرست اعلیٰ اور تحفظِ ناموس صحابہؓ کے بے باک نقیب مولانا حق نواز جھنگویؒ ۲۲ فروری ۱۹۹۰ء کو جھنگ صدر میں اپنی رہائش گاہ کے دروازے پر سفاک قاتل کی گولیوں کا نشانہ بن کر جام شہادت نوش کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا شہیدؒ جامعہ مدنیہ شور کوٹ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے روانگی کی تیاری کر رہے تھے جہاں انہوں نے رات کی نشست سے خطاب کرنا تھا، اچانک آٹھ بجے کے قریب کسی نے دروازے پر گھنٹی دی، مولانا جھنگویؒ باہر آئے، مبینہ طور پر دو آدمی تھے جن میں سے ایک نے مولاناؒ سے گفتگو شروع کی جبکہ دوسرے نے ریوالور سے پے در پے فائر کر دیے۔ مکان کے سامنے گراؤنڈ میں شادی کی ایک تقریب تھی، انہوں نے شور کوٹ جانے سے قبل اس شادی میں بھی شریک ہونا تھا، فائر کی آواز سے لوگوں نے سمجھا کہ شادی کی خوشی میں نوجوان فائرنگ کر رہے ہیں، یہی اشتباہ حملہ آوروں کے لیے غنیمت ثابت ہوا اور وہ موقع سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ گولیاں مولانا جھنگویؒ کے سر، گلے اور پیٹ میں لگیں، وہ وہیں گر گئے۔ انہیں گرتا دیکھ کر اردگرد کے لوگ متوجہ ہوئے، علاقہ میں کہرام مچ گیا، مولانا شہیدؒ کو فوراً ہسپتال لے جایا گیا مگر ہسپتال پہنچنے سے قبل ہی وہ عروسِ شہادت سے ہمکنار ہو گئے۔

راقم الحروف اس روز شور کوٹ میں تھا، ظہر کے بعد جامعہ مدنیہ شور کوٹ کینٹ میں سالانہ جلسہ سے خطاب کیا اور حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود مدظلہ کے ہمراہ مغرب کی نماز جامعہ عثمانیہ شور کوٹ شہر میں ادا کی۔ نماز کے بعد جامعہ عثمانیہ کے مہتمم مولانا بشیر احمد خاکی کے ساتھ ان کے دفتر میں بیٹھے تھے کہ مولانا حق نواز جھنگویؒ کا فون آیا۔ مولانا خاکی کے علاوہ انہوں نے علامہ صاحب اور راقم الحروف سے بھی بات کی۔ کم و بیش سات بجے کا وقت تھا، یہ ہماری آخری گفتگو تھی جو فون پر ہوئی۔ مولانا جھنگویؒ نے جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان کے اتحاد اور سنی کاز کی جدوجہد کو سیاسی پلیٹ فارم پر منظم کرنے کے سلسلہ میں مشاورت کے لیے گوجرانوالہ تشریف آوری کی خواہش کا اظہار کیا اور ہمارے درمیان آئندہ ہفتہ کے دوران کسی وقت مل بیٹھنے کی بات طے ہوئی۔ وہاں سے فارغ ہو کر علامہ خالد محمود صاحب اور

راقم الحروف واپسی کے لیے بس اسٹاپ پر پہنچے تو بہت سے نوجوان سپاہِ صحابہؓ کا پرچم اڑھائے مولانا حق نواز جھنگویؒ کے استقبال کے لیے ان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان نوجوانوں نے ہی جھنگ جانے والی ایک ویگن روک کر ہمیں سوار کرایا اور جب ہم جھنگ پہنچے تو یہ روح فرسا خبر اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت ہماری منتظر تھی کہ عزیمت و استقامت کی شاہراہ کا یہ بلند حوصلہ مسافر شہادت کی منزل کو پہنچ چکا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

نماز جنازہ اگلے روز جمعہ کی نماز کے بعد اسلامیہ ہائی سکول کی گراؤنڈ میں ادا کی گئی۔ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی دامت برکاتہم نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جھنگ میں کرفیو کے اعلان اور چاروں طرف باہر سے آنے والوں کو روکنے کے لیے پولیس کی ناکہ بندی کے باوجود ملک کے مختلف حصوں سے عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اخبارات کی رپورٹ کے مطابق یہ جھنگ کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ نمازِ جنازہ کے بعد مولانا حق نواز جھنگویؒ کے قائم کردہ جامعہ محمودیہ میں انہیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

جھنگ کے احباب کے مطابق چند روز قبل مولانا جھنگویؒ کو دوبئی سے ایک ٹیلی فون کال کے ذریعہ خبر دی گئی کہ انہیں قتل کرنے کی سازش ہو رہی ہے اور خفیہ ذرائع کے مطابق ۲۰ فروری سے ۲۵ فروری کے درمیان مولانا حق نواز جھنگویؒ، مولانا عبد الستار تونسویؒ اور مولانا منظور احمدؒ چنیوٹی کو قتل کرنے کے ایک منصوبہ کا انکشاف ہوا ہے۔ مولانا جھنگویؒ نے گزشتہ جمعہ کے خطبہ میں اس کا ذکر بھی کر دیا اور انتظامیہ کے نوٹس میں بات آ گئی لیکن تقدیر کے فیصلوں کو کون ٹال سکتا ہے۔

آج مولانا حق نواز جھنگویؒ ہم میں نہیں ہیں، وہ اپنے عظیم مشن کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کر کے خالقِ حقیقی کے حضور سرخرو ہو چکے ہیں۔ لیکن تحفظِ ناموس صحابہؓ کے جس مقدس مشن کی خاطر انہوں نے محنت کی اور قربانی و ایثار کی عظیم روایات کو زندہ کیا وہ مشن زندہ ہے اور جب تک یہ مشن زندہ ہے مولانا حق نواز جھنگویؒ کا نام، خدمت اور قربانی و ایثار کی روایات زندہ رہیں گی۔ ہم اس عظیم سانحہ پر انجمن سپاہِ صحابہؓ کے نوجوانوں، جھنگ کے شہریوں اور مولانا شہیدؒ کے اہلِ خاندان سے دلی تعزیت کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا شہیدؒ کے درجات بلند فرمائیں اور ان کے رفقاء، پسماندگان اور عقیدتمندوں کو صبر و حوصلہ کے ساتھ ان کا مشن جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

پاکستان میں نفاذِ اسلام:
ایک ایرانی راہنما کا تجزیہ

۱۸ مارچ ۱۹۹۰ء کو الشبان المسلمون سیالکوٹ کے زیر اہتمام اسلامک پبلک سکول، رنگ پورہ، سیالکوٹ میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی یاد میں منعقدہ تقریب سے خطاب کا ایک حصہ

...... حضراتِ محترم! شیخ الاسلام علامہ شبیر احمدؒ عثمانی کی جدوجہد کا تیسرا دور قیام پاکستان کے بعد دستور ساز اسمبلی میں ان کی جدوجہد کا دور ہے جب انہوں نے دستور ساز اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے پاکستان کی نظریاتی بنیاد کے تعین کی جنگ لڑی۔ اس حوالہ سے یہ بحث الگ گفتگو کی متقاضی ہے کہ جو ملک اسلام کے نام پر لا الہ الا اللہ کے نعرہ پر بنا اور جسے دنیا کی پہلی اسلامی نظریاتی مملکت کا عنوان دیا گیا، اس ملک کے قائم ہوتے ہی اس کی دستور ساز اسمبلی میں یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ ملک کا دستور اسلامی ہونا چاہیے یا سیکولر بنیادوں پر ملک کا نظام ترتیب دیا جائے۔ یہ سوال آخر کیسے اٹھا اور اس کا پس منظر کیا تھا؟ اس پر مستقل بحث کی ضرورت ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے ریکارڈ کا تجزیہ کیا جائے، اسے کھنگالا جائے اور اس ہاتھ کو تلاش کیا جائے جس نے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کو سیکولرازم کی بحث میں الجھا دیا۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دستور ساز اسمبلی میں نظریاتی اسلامی دستور کی مخالفت کی گئی اور مُلّاازم، پاپائیت اور تھیاکریسی کے طعنے کسے گئے۔ اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی کا عمومی رجحان بظاہر غیر مذہبی نظام کی طرف ہو چکا تھا لیکن شیخ الاسلام علامہ شبیر احمدؒ عثمانی نے اس مہم کا سامنا کیا اور تمام اعتراضات کا منطق و استدلال کے ساتھ جواب دیتے ہوئے بالآخر اسمبلی کو قائل کر لیا اور قراردادِ مقاصد منظور کرا کے پاکستان کی نظریاتی اسلامی بنیاد ہمیشہ کے لیے طے کر دی۔ قراردادِ مقاصد کی بنیاد اس بات پر ہے کہ حاکم حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہے اور پاکستان کے عوام اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین نافذ کریں گے۔ قراردادِ مقاصد کو نظر انداز کرنا اب کسی کے بس کی بات نہیں رہی اور اس قرارداد کے ذریعے علامہ شبیر احمدؒ عثمانی نے پاکستان کی اسلامی بنیاد کا ہمیشہ کے لیے تحفظ کر دیا۔

اس موقع پر ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے کہ غلطی اگرچہ خلوص سے ہو مگر اس کے نتائج بہرحال سامنے آتے ہیں۔ مجھے ۱۹۸۷ء میں ایران جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے لیڈروں سے ایرانی انقلاب

کے مراحل کے بارے میں گفتگو کا موقع ملا۔ ایک ایرانی لیڈر نے اس موقع پر مجھ سے سوال کیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ایرانی علماء نے پندرہ بیس سال کی محنت کے ساتھ انقلاب بپا کر دیا لیکن پاکستان کے علماء کرام جن کی جدوجہد دو سو سال تک آزادی کے لیے تھی اور آزادی کے بعد چالیس سال سے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے محنت کر رہے ہیں لیکن ان کی جدوجہد کے ثمرات سامنے نہیں آرہے اور انہیں ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

میں نے اس سوال کے جواب میں اپنے ذہن کے مطابق ان اسباب و عوامل کا ذکر کیا جو پاکستان میں نفاذِ اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اس پر ایرانی لیڈر نے کہا کہ جناب بات یہ نہیں بلکہ اصل قصہ یہ ہے کہ ایرانی علماء نے بادشاہت کے خلاف تنہا جنگ نہیں لڑی، اس جنگ میں ایران کے نیشنلسٹ اور کمیونسٹ حلقے بھی ان کے ساتھ تھے۔ مذہبی قیادت، کمیونسٹ تودہ پارٹی اور ڈاکٹر مصدق کی نیشنلسٹ پارٹی نے مل کر بادشاہت کو شکست دی لیکن شاہِ ایران کے ملک سے باہر چلے جانے کے بعد ایرانی علماء نے اقتدار دوسروں کے حوالے نہیں کیا بلکہ بتدریج انہیں منظر سے ہٹا کر اقتدار پر مکمل قبضہ کر لیا جس کی وجہ سے وہ انقلاب کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے اور اس پر کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جبکہ پاکستان کے قیام کے بعد وہ علماء جنہوں نے تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا وہ ضرورت سے زیادہ خلوص کا شکار ہو گئے اور مدارس و مساجد پر قناعت کرتے ہوئے انہوں نے اقتدار کا راستہ دوسرے لوگوں کے لیے صاف کر دیا۔ اب ظاہر بات ہے کہ جن لوگوں نے اقتدار پر قبضہ کیا ملک کا نظام بھی انہی کی مرضی کے مطابق ہی چلنا ہے۔

یہ ایک ایرانی لیڈر کی بات کا خلاصہ ہے جو میں نے آپ سے عرض کیا ہے۔ ممکن ہے یہ سو فیصد درست نہ ہو لیکن سو فیصد غلط بھی نہیں ہے۔ بلکہ مجھے اگر آپ اس جسارت پر معاف فرمائیں تو عرض کروں گا کہ برصغیر کی تاریخ میں دو بڑی غلطیاں ایسی ہیں جنہوں نے ہماری تاریخ کا رخ موڑ دیا اور دونوں غلطیاں خلوص کے ساتھ ہوئیں۔

- ایک غلطی احمد شاہ ابدالیؒ کی ہے جس نے پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کو شکست دے کر اقتدار انہیں مغل شہزادوں کے حوالے کر کے وطن واپس لوٹ گیا۔ وہ اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکا کہ مغل شہزادوں میں اب ہندوستان کا اقتدار سنبھالنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مغل شہزادے اقتدار نہ سنبھال سکے اور بالآخر برطانوی استعمار کو یہاں پاؤں جمانے کا موقع مل گیا۔
- دوسری بڑی غلطی پاکستان بننے کے فوراً بعد علماء سے ہوئی کہ انہوں نے اقتدار میں شرکت اور

حصہ داری پر اپنا دعویٰ نہیں جتایا حالانکہ یہ ان کا حق تھا، لیکن انہوں نے خلوص کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم نے اقتدار میں شریک نہیں ہونا بلکہ باہر رہ کر اقتدار والوں کی رہنمائی کرنی ہے۔ اس کے نتائج آج ہمارے سامنے ہیں اور خدا جانے کب تک ہمیں ان کا سامنا کرنا پڑے گا۔

الغرض علامہ شبیر احمدؒ عثمانی کی جدوجہد کا یہ دور بھی بڑا تابناک ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کر کے قراردادِ مقاصد منظور کرائی اور پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کو سیکولرازم کی بنیاد پر دستور طے کرنے سے روک دیا۔

حضراتِ گرامی قدر! شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمدؒ عثمانی کی یہ جدوجہد ہمارے ذمہ قرض ہے اور یہ قرض ہم نے بہر صورت ادا کرنا ہے۔ قراردادِ مقاصد منظور کرا کے ملک کی اسلامی نظریاتی بنیاد کا تعین علامہ عثمانی نے کیا تھا اور ملک کو صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنانا اور مکمل اسلامی نظام کا نفاذ و غلبہ ہماری ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یا الہ العالمین۔

”شریعت بل“ پر فرقہ واریت کا اعتراض

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جولائی ۱۹۹۰ء

...... شریعت بل کے ذریعہ فرقہ واریت کے فروغ کا بھی واویلا کیا جا رہا ہے حالانکہ عملاً شریعت بل کے سینٹ سے منظور ہو جانے کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے کہ مذہبی محاذ پر مولانا فضل الرحمان، مولانا شاہ احمد نورانی، پروفیسر ساجد میر اور مولانا عبدالستار خان نیازی کی جماعتیں، جو اس سے قبل شریعت بل کی مخالفت میں پیش پیش تھیں، اب اس کی حمایت کر رہی ہیں اور اہل السنۃ والجماعۃ کے تینوں مکاتبِ فکر دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث کا کوئی قابل ذکر حلقہ ایسا نہیں ہے جو شریعت بل کا اب مخالف ہو۔ اس لیے یہ کہنا حقیقت کے برعکس ہے کہ شریعت بل فرقہ وارانہ کشمکش میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ البتہ اہلِ تشیع کے بعض انتہا پسند حلقوں کی طرف سے مخالفت کی آوازیں اٹھ رہی ہیں لیکن وہ بھی بل کے مندرجات سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی وجہ سے ہیں، کیونکہ شریعت بل کی دفعہ نمبر ۲ شق (ب) میں شریعت کی تشریح و تعبیر کے طریق کار کے ضمن میں دستور کی دفعہ ۲۲۷ شق (ا) کا واضح طور پر حوالہ دیا گیا ہے جس میں پرسنل لاء میں اہلِ تشیع کے لیے ان کے فقہی مسلک کے مطابق قرآن وسنت کی تعبیر و تشریح کا حق تسلیم کیا گیا ہے، اور اسے شریعت بل میں بھی

جوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے اس لیے یہ واویلا بھی حقائق پر مبنی نہیں ہے۔......

امام مالکؒ کی طرف متعہ کے جواز کی نسبت

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جولائی ۱۹۹۰ء

سوال: متعہ کسے کہتے ہیں اور کیا اہلِ سنت کے کسی امام کے نزدیک متعہ جائز ہے؟

(عبدالحمید، لاہور)

جواب: مرد اور عورت کے درمیان عمر بھر کے لیے ازدواج کا جو عقد ہوتا ہے وہ شرعاً نکاح کہلاتا ہے اور یہ ازدواج کی شرعی شکل ہے۔ لیکن اگر اسی عقد کی مدت متعیّن کر دی جائے تو اسے متعہ کہا جاتا ہے، مثلاً یہ کہ اتنے دن، ماہ یا سال کے لیے نکاح کیا جائے۔ مدت خواہ ایک گھنٹے کی ہو یا پچاس سال کی، جب نکاح میں مدت طے کر دی جائے تو وہ متعہ بن جاتا ہے۔

جاہلیت کے دور میں متعہ بھی ازدواج کی جائز صورتوں میں شمار ہوتا تھا لیکن جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حرام قرار دے دیا اور اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اہلِ تشیع اس کے جواز کے قائل ہیں مگر اہلِ سنت کے نزدیک متعہ متفقہ طور پر حرام ہے اور کوئی امام بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔

بعض فقہاء نے حضرت امام مالکؒ کی طرف متعہ کے جواز کی نسبت کی ہے لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ خود حضرت امام مالکؒ متعہ کی حرمت کے قائل ہیں اور مؤطا امام مالک میں انہوں نے متعہ کی حرمت پر روایات بھی نقل کی ہیں۔

الاستاذ عبد الفتاح ابوغدۃ کے ساتھ ملاقات

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مارچ ۱۹۹۳ء

شام کے بزرگ عالمِ دین الاستاذ عبد الفتاح ابوغدۃ حفظہ اللہ تعالیٰ کا نام کافی عرصہ سے سن رکھا تھا اور محدث کبیر حضرت الشیخ زاہد الکوثری الحنفیؒ کے مایہ ناز شاگرد اور علمی جانشین کے طور پر ان کا غائبانہ تعارف ذہن میں محفوظ تھا۔ خاتم المحدثین حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت السید مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے حوالہ سے علامہ کوثریؒ اور الشیخ ابوغدۃ مدظلہ کا تذکرہ ایک مدت سے علمی مجالس میں سننے میں آرہا تھا اور ملاقات کا اشتیاق تھا۔ کئی بار خواہش ہوئی کہ لندن کا سفر براستہ دمشق ہو جائے تو شاید ملاقات و زیارت کی کوئی صورت نکل آئے مگر ہر کام کا ایک وقت قدرت الٰہی کی طرف سے

مقرر ہے اس لیے ایسی کوئی شکل عمل میں نہ آسکی۔

چند برسوں سے شام میں علماء اور دینی حلقوں کے خلاف ریاستی جبر کی خبریں مسلسل سننے میں آرہی ہیں، شام کے صدر حافظ الاسد کا تعلق مذہبی طور پر اہلِ تشیع کے نصیری فرقہ سے ہے جس کے عقیدہ میں حضرت علیؓ کو (معاذ اللہ) الوہیت کا درجہ حاصل ہے۔ اور سیاسی طور پر وہ بعث پارٹی کے راہ نماؤں میں شمار ہوتے ہیں جو عرب نیشنلزم کی داعی ہے اور اجتماعی زندگی کے ساتھ مذہب کے تعلق کی نفی کرتی ہے۔ گویا سیاسی اصطلاح میں وہ سیکولر ہیں اس لیے شام میں علماء اور دینی حلقوں کی سرگرمیوں کو برداشت کرنا ان کے فکر اور پروگرام کے خلاف ہے۔ چنانچہ شام کے دینی حلقوں بالخصوص اہلِ سنت حافظ الاسد کی نظر عتاب کا مدت سے نشانہ ہیں، سینکڑوں افراد جام شہادت نوش کر چکے ہیں، ہزاروں لوگ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہیں اور ایک دور میں ''حماہ'' نامی بستی مذہبی حلقوں کا مرکز ہونے کے جرم میں بلڈوزروں کے ساتھ مسمار کی جاچکی ہے۔

گزشتہ سال معلوم ہوا کہ شامی حکومت کے اس جبر و تشدد کے خلاف دینی حلقوں کی جدوجہد کی قیادت الاستاذ ابوغدۃ کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس وقت سعودی عرب میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، پھر یہ علم میں آیا کہ الاستاذ ابوغدۃ شام کی اخوان المسلمون کے مرشد عام کی ذمہ داریاں بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان باتوں سے نہ صرف یہ کہ ملاقات و زیارت کے اشتیاق میں اضافہ ہوا بلکہ اشتیاق سے بڑھ کر یہ ملاقات فرائض کے دائرہ میں داخل ہوگئی۔ اس لیے لندن سے پاکستان واپسی کے موقع پر سعودی عرب کے سفر کے اہداف میں یہ ملاقات بھی شامل تھی۔ سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں ایک ہفتہ کے قیام کے دوران جمعیۃ علماء اسلام ریاض کے امیر مولانا شبیر احمد صاحب کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ الشیخ ابوغدۃ ریاض میں ہی قیام پذیر ہیں اور وہ ان سے رابطہ کر کے ملاقات کا اہتمام کریں گے۔ چنانچہ محترم مولانا شبیر احمد صاحب کی مساعی سے ۲۸ جنوری کو اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کا سامان فراہم ہوا، فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ یہ ملاقات ریاض کے محلہ ''الربوۃ'' میں الاستاذ ابوغدۃ حفظہ اللہ تعالیٰ کی قیام گاہ پر مغرب کے بعد ہوئی اور اس میں مولانا شبیر احمد موصوف کے علاوہ جمعیۃ علماء اسلام ریاض کے سرپرست مولانا قاری تقی الاسلام اور نائب امیر اول مولانا قاری جمیل الرحمان سلیم بھی شریک تھے۔

الاستاذ ابوغدۃ مدظلہ العالی جس محبت و شفقت اور تواضع وانکساری کے ساتھ پیش آئے وہ اہل علم کی روایتی شان ہے اور ان کی کرم فرمائی اور ذرہ نوازی نے اسلاف کی یاد تازہ کردی، فجزا اللہ احسن الجزاء۔ ان سے ''ورلڈ اسلامک فورم'' کے پروگرام اور مقاصد کے حوالے سے مسلم ممالک میں کام

کرنے والی دینی تحریکات کے درمیان مشاورت اور مسلسل رابطہ کی ضرورت پر گفتگو ہوئی اور انہوں نے اس سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے ۱۸ جولائی کو لندن میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی دعوت قبول فرمائی۔ ہماری طرح حضرت الشیخ مدظلہ بھی اسی امر کے شاکی ہیں کہ عالم اسلام کے مذہبی حلقوں، علماء کرام اور دینی تحریکات کی جدوجہد کی ترجیحات درست نہیں ہیں، فکری اور نظریاتی کام کا فقدان ہے، اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا ذوق کم ہوتا جا رہا ہے اور باہمی ارتباط و مشاورت کی ضرورت کا احساس موجود نہیں ہے۔ حضرت الشیخ مدظلہ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ مسلم حکومتیں اپنی پالیسیوں اور عمل میں آزاد نہیں ہیں اس لیے دینی تحریکات کو ان پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنی راہیں خود تلاش کرنی چاہیں۔

الغرض حضرت الاستاذ عبدالفتاح ابوغدۃ حفظہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ ملاقات بے حد مفید اور حوصلہ افزا رہی اور ہم اسے ورلڈ اسلامک فورم کے عملی کام میں بابرکت پیشرفت اور نیک فال سمجھتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت حضرت الشیخ مدظلہ کو صحت و عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھیں اور ہمیں ان سے اور ان جیسی دیگر علمی و دینی شخصیت سے استفادہ کے مواقع اور توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

مسئلہ کشمیر: چین اور ایران کا طرزِ عمل

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ---اپریل ۱۹۹۴ء

جنیوا کے انسانی حقوق کمیشن میں کشمیر کے حوالے سے پاکستان کی قرارداد کی واپسی ان دنوں قوم حلقوں میں زیر بحث ہے۔ یہ قرارداد مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج کے مظالم اور انسانی حقوق کی پامالی کی مذمت کے لیے پیش کی گئی تھی لیکن ووٹنگ سے قبل چین اور ایران کے کہنے پر واپس لے لی گئی۔ حکومتی حلقوں کا کہنا ہے کہ قرارداد کا مقصد مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنا تھا جو ووٹنگ کے بغیر حاصل ہو گیا ہے اور چین اور ایران جیسے دوست ممالک کے مشورہ کو نظر انداز کرنا مشکل تھا اس لیے قرارداد موخر کر دی گئی۔ جبکہ اپوزیشن کے راہنماؤں کا کہنا ہے کہ حکومت نے قرارداد واپس لے کر مسئلہ کشمیر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور ان مجاہدین کشمیر کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے جو اس وقت مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج کے ظلم و تشدد کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔ حکومتی حلقوں اور اپوزیشن کی اس کشمکش سے قطع نظر بین الاقوامی پریس کا یہ تجزیہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرارداد کے لیے جو محنت ضروری تھی پاکستان کی وزارت خارجہ اس کا اہتمام نہیں کر سکی حتیٰ کہ

قرارداد کی حمایت میں مسلم ممالک سے روابط اور انہیں قائل کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی گئی جس کی وجہ سے انسانی حقوق کمیشن میں قرارداد کی منظوری کے امکانات مخدوش تھے اور پاکستان نے شکست سے بچنے کے لیے قرارداد کو واپس لینے یا موخر کرنے میں عافیت سمجھی ہے۔

بہرحال جو ہوا اس کے اسباب کچھ بھی ہوں اس سے مجاہدین کشمیر کو نقصان پہنچا ہے، پاکستان کی ساکھ مجروح ہوئی ہے اور بھارت کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ اسے اپنی سفارتی فتح قرار دے کر پاکستان کو اپنی شرائط پر دوبارہ مذاکرات کی دعوے دے رہا ہے۔ اور اس بات میں بھی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ پاکستان کی وزارت خارجہ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہی ہے جس کا نوٹس قومی سطح پر لیا جانا ضروری ہے۔

اس مرحلہ پر چین اور ایران کا طرز عمل بھی سنجیدہ غور و فکر اور تجزیہ کا متقاضی ہے کہ یہ دونوں ملک مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے موقف کے ہمیشہ حامی رہے ہیں اور ان کی حمایت پاکستان اور کشمیری حریت پسندوں کے لیے تقویت کا باعث رہی ہے، لیکن اب انسانی حقوق کمیشن میں پیش کردہ قرارداد بھی انہی کے کہنے پر پاکستان کو واپس لینا پڑی ہے۔ اس کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے پاکستان کو واضح شکست سے بچانے کے لیے قرارداد واپس لینے کا مشورہ دیا ہو لیکن ہم اس مسئلہ کے ایک اور پہلو کو سامنے لانا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جب سے امریکی حلقوں کی طرف سے کشمیر یا اس کے ایک بڑے حصے کو خود مختار ملک کی حیثیت دینے کی تجویز سنجیدگی کے ساتھ سامنے آئی ہے اور کشمیر میں رائے شماری کے لیے بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کے علاوہ خود مختاری کا تھرڈ آپشن شامل کرنے پر زور دیا جا رہا ہے اس وقت سے یہ خدشات بڑھتے جا رہے ہیں کہ امریکہ دراصل خود مختار کشمیر کو اپنے فوجی اڈے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے جس کا مقصد چین کے متوقع عالمی کردار سے نمٹنا ہے۔

اس صورتحال میں اگر مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے چین کے طرز عمل میں تبدیلی آتی ہے تو اسے اس کے قومی مفادات سے الگ کر کے دیکھنا مناسب نہیں ہو گا۔ ایران کی صورتحال بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ ان حالات میں جبکہ ایک طرف مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین اور نہتے کشمیری عوام پر بھارتی افواج کے مظالم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے بین الاقوامی اور علاقائی طور پر دوست ممالک کی ترجیحات میں واضح تبدیلیاں دکھائی دے رہی ہیں، وزارت خارجہ کی سست روی اور مسئلہ سے نمٹنے کے لیے روایتی طرز عمل پر قناعت انتہائی تکلیف دہ بات ہے۔ اور اس سے زیادہ اذیت ناک بات یہ ہے کہ حکومتی پارٹیوں اور اپوزیشن نے مسئلہ کی نزاکت کا احساس کرنے اور مسئلہ کشمیر پر مشترکہ قومی موقف اختیار کرنے کی بجائے اس نازک قومی مسئلہ کو باہمی کشمکش اور ایک

دوسرے کو نیچا دکھانے کا ذریعہ بنالیا ہے۔

ہم حکومت اور اپوزیشن سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کریں اور مل بیٹھ کر مسئلہ کشمیر پر مشترکہ موقف اور پالیسی اختیار کریں تاکہ اہل پاکستان آزادیٔ کشمیر کے سلسلہ میں اپنی قومی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کر سکیں۔

سنی شیعہ کشمکش کے اسباب و عوامل

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- دسمبر ۱۹۹۴ء

تحریکِ جعفریہؒ پاکستان اور سپاہِ صحابہؓ پاکستان کے درمیان کشمکش نے مسلح تصادم کی جو صورت اختیار کر لی ہے، اس سے ملک کا ہر ذی شعور شہری پریشان ہے۔ دونوں جانب سے سینکڑوں افراد اب تک اس مسلح تصادم کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ اور ارباب اختیار فرقہ واریت کے خاتمہ کے عنوان سے اس کشمکش پر قابو پانے کا بار بار عزم ظاہر کرتے ہیں، مگر اس کی جڑیں معاشرہ میں اس قدر گہرائی تک اتر چکی ہیں کہ بیخ کنی کے لیے ان تک رسائی مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس کشیدگی کے اسباب و عوامل کا کھلے دل و دماغ کے ساتھ تجزیہ کیا جائے اور سنجیدہ عمومی بحث و مباحثہ کے ذریعہ اس کے محرکات کا کھوج لگا کر اس مقام تک پہنچا جائے جہاں سے اس کشمکش کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ تاکہ ان کو بند کرنے کی کوئی صورت نکالی جا سکے۔

عقائد و نظریات کا اختلاف

یہ کشمکش اور تصادم جو عملاً سپاہ صحابہؓ پاکستان اور تحریک جعفریہؒ پاکستان کے درمیان ہے، دراصل شیعہ سنی کشمکش کا شدت پسندانہ اظہار ہے۔ اور شیعہ سنی کشمکش کی تاریخ بہت پرانی ہے جس کا آغاز پہلی صدی ہجری کے اختتام سے قبل ابتدائی شکل میں ہو گیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اس نے ملت اسلامیہ میں عقائد و نظریات کے لحاظ سے دو واضح متحارب گروہوں کی صورت اختیار کر لی۔ قارئین کی معلومات کے لیے دونوں گروہوں کے اعتقادات میں چند بنیادی فرق واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

- اہلِ سنت کے نزدیک موجودہ قرآن کریم ہی اصلی اور مکمل قرآن کریم ہے جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفاء راشدینؓ نے مرتب شکل میں امت کو دیا تھا۔ اس میں کسی قسم کا کوئی ردوبدل نہیں ہوا۔ اہلِ تشیع کے نزدیک یہ قرآن کریم مکمل نہیں ہے بلکہ ان کے بقول اس میں ردوبدل ہوا ہے۔ جبکہ اصل قرآن کریم امام غائب کے پاس ہے جو اپنے

وقت پر اسے لے کر ظاہر ہوں گے، اس وقت تک مصلحتاً موجودہ قرآن کریم کو ہی بطور قرآن پڑھنا اور پیش کرنا بامر مجبوری درست ہے۔

- اہلِ سنت کے نزدیک جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپؐ کا ساتھ دینے والے سب لوگ صحابہ کرامؓ ہیں۔ ان میں مہاجرین، انصار اور اہل بیت سمیت تمام طبقات شامل ہیں۔ یہ سب لوگ اہل ایمان ہیں، سب کے ساتھ عقیدت و محبت رکھنا ضروری ہے اور سب کے سب ہدایت کا ذریعہ اور معیار ہیں۔ جبکہ اہلِ تشیع کے نزدیک اہل بیتؓ کے سوا باقی لوگ لائق اعتبار نہیں ہیں، بلکہ انہیں اہل ایمان میں شامل کرنا بھی درست نہیں ہے۔ اور اہل بیتؓ سے مراد بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور کنبہ کے سب افراد نہیں بلکہ صرف حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کی اولاد ہے۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر ازواج مطہرات اور اولاد اہلِ تشیع کے نزدیک اہل بیت میں شامل نہیں ہے۔
- اہلِ سنت کے نزدیک قرآن کریم کے بعد سنت رسولؐ دین کا دوسرا بڑا ماخذ اور سرچشمہ ہے۔ اور سنت سے مراد وہ تمام روایات و احادیث ہیں جو صحابہ کرامؓ کے کسی بھی فرد سے صحیح سند کے ساتھ منقول ہیں۔ جبکہ اہلِ تشیع بھی سنت رسولؐ کو دین کا ماخذ مانتے ہیں، مگر ان کے نزدیک حدیث و سنت صرف وہی ہے جو اہل بیتؓ سے منقول ہے۔ اور ان کے علاوہ مہاجرینؓ، انصارؓ، ازواج مطہراتؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ سے منقول روایات اہلِ تشیع کے نزدیک سنت میں شامل نہیں ہیں۔
- اہلِ سنت کے نزدیک جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ وحی کا سلسلہ بند ہو چکا ہے، اس لیے کوئی شخصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسی نہیں ہے جس کی رائے میں خطا کا احتمال نہ ہو۔ اور کسی دلیل اور بنیاد کے بغیر اس کی بات بہر صورت واجب العمل ہو۔ جبکہ اہلِ تشیع کے نزدیک اہل بیتؓ کے ۱۲ امام معصوم عن الخطا ہیں اور ان کی رائے اور قول کو وہی حیثیت حاصل ہے جو پیغمبر کی وحی کو حاصل ہوتی ہے۔
- اہلِ سنت کے نزدیک خلفاء راشدین کی واقعاتی ترتیب ہی اصلی اور جائز ترتیب ہے۔ یعنی پہلے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ، دوسرے حضرت عمرؓ، تیسرے حضرت عثمانؓ، اور چوتھے حضرت علیؓ ہیں۔ اور ان کے درمیان فضیلت و رتبہ کی ترتیب بھی یہی ہے۔ جبکہ اہلِ تشیع کے نزدیک جناب نبی اکرم کے بعد خلافت حضرت علیؓ کا حق تھا جو انہیں نہیں دیا گیا۔

اس لیے پہلے تین خلفاء کی خلافت جائز نہیں ہے بلکہ ان کی حیثیت غاصبین اور ظالمین کی ہے۔

چنانچہ ان واضح اور بنیادی اختلافات کے ہوتے ہوئے دونوں میں سے کسی کے لیے بھی دوسرے فریق کو بطور مسلمان قبول کرنا ممکن نہیں تھا۔ اور اس کا واضح اظہار دونوں فریقوں کی بنیادی کتابوں اور اساسی تعلیمات میں موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی حد تک تعلقات اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان صدیوں سے قائم چلے آرہے ہیں جو حالات کی ضرورت کی تحت بسا اوقات مشترکہ معاملات میں باہمی تعاون کی صورت بھی اختیار کر جاتے ہیں۔

دینی تحریکات میں اہل تشیع کی شرکت

اس پس منظر میں وطن عزیز پاکستان میں شیعہ سنی تعلقات کا جائزہ لیا جائے تو ماضی کے حوالہ سے ان میں حوصلہ افزائی کا پہلو نمایاں دکھائی دیتا ہے اور بہت سی دینی تحریکات میں سنی اور شیعہ قائدین ایک پلیٹ فارم پر جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں:

- تحریک آزادی میں مجلس احرار اسلام کی جدوجہد ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ، مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ، اور صاحبزادہ سید فیض الحسنؒ کے ساتھ مولانا مظہر علی اظہر بھی صف اول کے لیڈروں میں شامل ہیں جو شیعہ تھے اور ایک عرصہ تک احرار کے سیکرٹری جنرل رہے ہیں۔
- تحریک پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح کا شیعہ ہونا کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مگر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبد الحامد بدایونیؒ، اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ جیسے اکابر علماء نے ان کی قیادت میں قیام پاکستان کی جنگ لڑی ہے۔
- تحریکِ ختمِ نبوت میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا سید ابوالحسناتؒ، مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ، اور مولانا خواجہ خان محمد کے ساتھ سید مظفر علی شمسی اور علامہ غضنفر کراروی جیسے شیعہ راہنماؤں کی محنت بھی شامل ہے۔
- قیام پاکستان کے بعد اسلامی دستور کے لیے ۲۲ دستوری نکات مرتب کرنے والے ۳۱ سرکردہ علماء کرام میں علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبد الحامد بدایونیؒ، مولانا محمد داؤد غزنویؒ، اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ساتھ ممتاز شیعہ راہنما حافظ کفایت حسن اور مولانا مفتی جعفر حسین بھی شریک تھے۔

اس لیے یہ بات پورے شرح صدر کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اعتقادی اختلافات کی شدت اور سنگینی کے باوجود پاکستان میں اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور مشترکہ معاملات میں باہمی تعاون کچھ عرصہ پہلے تک قائم رہی ہے۔ اور اہلِ سنت نے اپنی واضح اکثریت کے ہوتے ہوئے بھی اہلِ تشیع کو قومی معاملات میں شریک کرنے حتیٰ کہ دینی تحریکات کی قیادت کی صف میں شامل کرنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ لیکن اب یہ فضا قائم نہیں رہی اور جہاں قومی سطح پر فرقہ وارانہ کشیدگی کے مسلح تصادم کی صورت اختیار کر جانے کی شکل میں اس کے نقصانات سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں، وہاں تحریک نفاذِ اسلام کے ایک نظریاتی کارکن کی حیثیت سے میں اپنے اس دکھ کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سے نفاذِ اسلام کی جدوجہد کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ اور اسلامی جمہوریہ پاکستان میں، جہاں سیکولر حلقوں کو کبھی نفاذِ شریعت کے مطالبہ کو فرقہ وارانہ قرار دینے میں کامیابی نہیں ہوئی تھی، ”شریعت بل“ کے بارے میں تحریک جعفریہ کے جداگانہ موقف کے باعث نفاذِ شریعت کو فرقہ واریت کا باعث قرار دینے کا ہتھیار سیکولر حلقوں کے ہاتھ میں ایسا مضبوطی کے ساتھ آیا ہے کہ بے چارے شریعت بل کے سرعام پرخچے اڑ گئے۔

محاذ آرائی اور تشدد کی حالیہ فضا کے اسباب و عوامل

سوال یہ ہے کہ باہمی برداشت اور مشترکہ معاملات میں تعاون کی یہ فضا آخر تبدیل کیسے ہوئی؟ اور وہ کون سے عوامل ہیں جنہوں نے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے راہنماؤں کو تحریک پاکستان، تحریکِ ختمِ نبوت، مجلس احرار اسلام اور ۲۲ نکات کی ترتیب و تدوین کی فضا سے نکال کر ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا ہے؟ اس سوال کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لینا ضروری ہے۔ اور اب وقت آگیا ہے کہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع دونوں کے سنجیدہ راہنما ان عوامل کا سنجیدگی سے تجزیہ کریں۔ اور تحریک جعفریہؒ اور سپاہ صحابہؓ کے مسلح تصادم کو ملک گیر سطح پر شیعہ سنی خانہ جنگی کی صورت اختیار کرنے سے روکنے کے لیے اپنے علم و دانش کو استعمال میں لائیں۔ اسی جذبہ اور درد دل کے ساتھ شیعہ سنی کشمکش کے موجودہ شدت پسندانہ اظہار کے اسباب و عوامل کے بارے میں ہم اپنا نقطہ نظر پیش کر رہے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک حالات کو شدت اور سنگینی کے اس مقام تک لے جانے میں تین باتوں کا دخل سب سے زیادہ ہے۔ اور بدقسمتی سے تینوں باتوں کی ذمہ داری بنیادی طور پر اہلِ تشیع پر عائد ہوتی ہے۔

(۱) قومی معاملات میں جداگانہ شیعہ تشخص کا مطالبہ

ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ اہلِ تشیع نے قومی معاملات میں جداگانہ موقف، مطالبات اور

حقوق کی جدوجہد شروع کی اور تعلیمی اداروں میں اپنے لیے جداگانہ نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ قانونی نظام میں اپنی فقہ کے الگ نفاذ کا مطالبہ کر دیا۔ یہ دونوں مطالبات نہ صرف یہ کہ غیر منطقی اور غیر حقیقت پسندانہ تھے بلکہ ان مطالبات نے شیعہ اور سنی آبادی کے درمیان دوئی اور منافرت کی ایک واضح لکیر کھینچ دی۔ جس کے نتائج و ثمرات آج ہمارے سامنے ہیں۔ جہاں تک نصاب تعلیم کا تعلق ہے، اہلِ تشیع کی یہ شکایت بجا تھی کہ چونکہ سکولوں میں اسلامیات کا نصاب ملک کی اکثریت اہلِ سنت کے معتقدات کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے، اس لیے ان کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ لیکن اس کا آسان حل یہ تھا کہ اسلامیات کا یہ نصاب شیعہ طلبہ کے لیے اختیاری قرار دے دیا جاتا اور اہلِ تشیع اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا اہتمام اپنی مذہبی درسگاہوں میں کرتے۔ لیکن اس پر اکتفا نہ کیا گیا اور سکولوں میں دو الگ الگ نصابوں کی بیک وقت تعلیم ضروری سمجھی گئی جس سے تعلیمی اداروں سے ہی اعتقادی محاذ آرائی کا آغاز ہو گیا۔ اسی طرح فقہ جعفریہ کے متوازی نفاذ کے مطالبہ نے بھی صورت حال خراب کی۔ جہاں تک پرسنل لاء اور شخصی قوانین کا تعلق ہے، اہلِ سنت نے کبھی اہلِ تشیع کے اس حق سے انکار نہیں کیا کہ ان کے شخصی معاملات ان کی فقہ کے مطابق ہوں۔ یہ ایک مسلمہ حق ہے جس کا اعتراف علماء کے ۲۲ نکات میں بھی کیا گیا ہے اور موجودہ دستور میں بھی انہیں یہ حق حاصل ہے۔ لیکن پوری کی پوری فقہ جعفریہ کے نفاذ کا مطالبہ عملاً ملک کے پبلک لاء میں دو متوازی نظاموں کے نظام کا مطالبہ ہے جو مسلمہ اصولوں کے منافی ہے۔ اور خود ایران میں بھی، جہاں شیعہ اکثریت ہے اور ولایت فقیہ کی مذہبی حکومت ہے، یہ طریق کار اختیار نہیں کیا گیا۔ ایرانی دستور کے مطابق ملک کا سرکاری مذہب اور پبلک لاء اکثریتی فقہ اثنا عشری جعفریہ کے مطابق ہے، اور اہلِ سنت کو صرف پرسنل لاء میں اپنی فقہ پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے۔ مگر پاکستان میں اہلِ تشیع نے ایران سے الگ معیار اختیار کیا اور فقہ جعفریہ کے متوازی نظام کا مطالبہ کر کے جہاں سیکولر حلقوں کو موقع دیا کہ وہ نفاذِ شریعت کو فرقہ وارانہ مسئلہ قرار دے کر اس کے خلاف مہم چلائیں، وہاں شیعہ اور سنی کے الگ الگ ہونے کے تصور کو اور زیادہ پختہ کر دیا۔

(۲) حضرات صحابہ کرامؓ پر تبرّا

شیعہ سنی کشیدگی میں اضافہ کا دوسرا بڑا سبب شیعہ لٹریچر اور شیعہ مقررین کے خطابات میں حضرات صحابہ کرامؓ کے بارے میں توہین آمیز اور گستاخانہ جذبات کا برملا اظہار ہے۔ ازواج مطہراتؓ، خلفاء راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے بارے میں اہلِ تشیع کے عقائد جو بھی ہوں، یہ ان کا اپنا معاملہ ہے۔ لیکن ایک ایسے معاشرہ میں جس کی اکثریت ان بزرگوں سے والہانہ عقیدت و محبت رکھتی ہو، ان

کے بارے میں مخالفانہ جذبات کا اظہار ایک الگ مسئلہ ہے۔ پاکستان میں ایک محتاط اندازے کے مطابق اہلِ سنت کی تعداد ۹۵ فیصد ہے، اور وہ ازواج مطہراتؓ، خلفاء راشدینؓ، اور اہل بیت عظامؑ سمیت تمام صحابہ کرامؓ کے ساتھ محبت و عقیدت اور ان کے احترام کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اس حقیقت کے ادراک کے باوجود یہ بھی حقائق ہیں کہ اہلِ تشیع کے ذمہ دار حضرات کی کھلی بندوں تقسیم ہونے والی کتابوں اور رسالوں میں ان قابل احترام ہستیوں کے بارے میں گستاخانہ مواد موجود ہوتا ہے۔ بہت سے شیعہ مقررین کھلے خطابات میں ان بزرگوں کے بارے میں توہین آمیز باتیں کہہ جاتے ہیں اور درجنوں ایسے واقعات ہو چکے ہیں جن میں صحابہ کرامؓ اور خلفاء راشدین کے پتلے کھلے عام جلا کر ان کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ صورت حال آخر کس حد تک برداشت ہو سکتی ہے؟ اہلِ سنت کی یہ مجبوری ہے کہ وہ ان باتوں کا جواب برابر کی سطح پر نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اہلِ تشیع کے اس سطح کے بزرگ یعنی حضرات ائمہ اہل بیتؓ خود اہلِ سنت کے بھی قابل احترام بزرگ ہیں اور ان کے خلاف کوئی بات کہنا اہلِ سنت کے نزدیک اسی طرح ناقابل برداشت جرم ہے جیسے حضرات صحابہ کرامؓ کی توہین ناقابل برداشت ہے۔ اس لیے اہلِ سنت کی طرف سے ان باتوں کا ردعمل کئی گنا زیادہ شدت اختیار کر کے اپنے سامنے کے اہلِ تشیع کے مقابل آجاتا ہے۔ جو بہرحال کشیدگی اور اشتعال میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

(۳) اہلِ تشیع کے ماتمی جلوس

شیعہ سنی کشیدگی میں اضافہ کا تیسرا بڑا سبب اہلِ تشیع کے ماتمی جلوس ہیں جو اہلِ تشیع کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتے ہیں، مگر اہلِ سنت انہیں جائز نہیں سمجھتے۔ جہاں تک امام حسینؓ اور خانوادہ نبوت کی کربلا میں شہادت اور ان کی مظلومیت کا تعلق ہے، اہلِ سنت کے جذبات بھی اس معاملہ میں اہلِ تشیع سے کم نہیں ہیں اور وہ اپنے جذبات غم، صدمہ اور محبت کا اپنے انداز میں اظہار کرتے ہیں۔ لیکن غم کے اظہار کا جو طریقہ ماتمی جلوسوں کی صورت میں اہلِ تشیع کی طرف سے رواج پا گیا ہے وہ اہلِ سنت کے نزدیک نہ صرف یہ کہ درست نہیں بلکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے منافی ہے۔ اہلِ سنت کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اہلِ تشیع اپنے جذبات غم کا اظہار اپنے طریقے سے کریں، بشرطیکہ وہ ان کے گھروں کی چار دیواری اور عبادت گاہوں میں محدود ہو۔ اور اس کا دائرہ اہلِ سنت کے گھروں اور آبادی تک وسیع نہ کیا جائے۔ سوال یہ نہیں کہ اہلِ تشیع کو اپنے مذہب کے مطابق ماتم کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ وہ تو طے شدہ حق ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کا دائرہ کار اہلِ تشیع تک محدود رہنا چاہیے اور ان لوگوں تک وسیع نہیں ہونا چاہیے جو اسے جائز

نہیں سمجھتے۔ کیونکہ کوئی بھی ایسا اجتماع یا جلوس ان لوگوں کے درمیان لے آیا جائے جو مذہبی طور پر اسے جائز نہ سمجھتے ہوں، بہرحال کشیدگی پیدا کرتا ہے اور اس کشیدگی کے المناک مظاہرے کئی بار ہم اپنے ملک کے بازاروں اور سڑکوں پر دیکھ چکے ہیں۔

یہ ہیں وہ چند بنیادی اسباب جنہوں نے پاکستان میں شیعہ سنی تعلقات کو باہمی برداشت اور تعاون کی فضا سے نکال کر محاذ آرائی اور مسلح تصادم کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ ہم سپاہ صحابہؓ پاکستان کی پالیسی اور طریق کار سے متفق نہیں ہیں اور اس کا اظہار سپاہ صحابہؓ کے قائدین کے ساتھ روبرو گفتگو کے علاوہ پبلک بیانات میں بھی کئی بار کر چکے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک سپاہ صحابہؓ اس ردعمل کا نام ہے جو اہلِ تشیع کے مذکورہ بالا طرز عمل کے نتیجہ میں فطری طور پر نمودار ہوا ہے۔ اور ری ایکشن کی شدت اور تلخی کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہوں، اس کی ذمہ داری بہرحال اس "عمل" پر عائد ہوتی ہے جو اس ردعمل کو جنم دیتا ہے۔

مستقبل کے امکانات

اسباب وعوامل کے تجزیہ کے بعد ضروری ہے کہ شیعہ سنی تعلقات کے مستقبل کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کر دی جائیں۔ ہمارے نزدیک شیعہ سنی تعلقات کو مستقبل میں منفی شاہراہ پر گامزن رکھنے یا مثبت رخ دینے کا اختیار بھی اہلِ تشیع کے سنجیدہ راہنماؤں کے پاس ہے۔ اگر شیعہ قیادت یہ سمجھتی ہے کہ بڑھتی ہوئی کشیدگی کو بریک لگانا ضروری ہے اور باہمی برداشت اور تعاون کی سابقہ فضا کی بحالی ملک وقوم اور خود شیعہ آبادی کے لیے مفید ہے تو ابھی اس کے دروازے بند نہیں ہوئے۔ اور اس منزل گم گشتہ کے حصول کے لیے سنجیدگی کے ساتھ پیش رفت کی جا سکتی ہے۔ بلکہ ذاتی طور پر خود ہمارا جی چاہتا ہے کہ تحریک نفاذِ شریعت اور تحریکِ ختم نبوت میں اہلِ تشیع کا سابقہ رول بحال ہو۔ لیکن اس کے لیے شیعہ قیادت کو جداگانہ فقہ کے نفاذ اور ہر چھوٹی بڑی بات میں جداگانہ تشخص کے اظہار کا راستہ ترک کر کے علماء کے ۲۲ متفقہ دستوری نکات کی پوزیشن پر قومی دھارے میں واپس آنا ہوگا۔ ناموس صحابہؓ کے تحفظ اور ماتمی جلسوں کے بارے میں اہلِ سنت کے قیادت کے ساتھ اعتماد کی فضا بحال کرنا ہوگی۔ اور اہلِ سنت کے مذہبی جذبات کے احترام کا عملاً یقین دلانا ہوگا۔ اور اگر شیعہ قیادت اس پوزیشن پر واپسی کو مشکل خیال کرتی ہے اور قومی دھارے سے الگ جداگانہ تشخص، موقف اور مطالبات کی راہ پر چلتے رہنا اس کے نزدیک ناگزیر امر ہے تو اس کے منطقی تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے ایسا کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ مگر اہلِ سنت اس پوزیشن میں بھی اہلِ تشیع کے ساتھ تعلقات کار کا از سر نو تعین کرنے کے لیے تیار ہوں گے جس کے لیے ہمارے نزدیک سب سے بہتر معیار ایرانی دستور

ہے۔اور ہم اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے راہنماؤں کے سامنے یہ تجویز پیش کریں گے کہ:

- آئندہ مردم شماری شیعہ سنی بنیادوں پر کرا کے دونوں کی آبادی کا صحیح تناسب معلوم کر لیا جائے تاکہ باہمی حقوق کا تعین عملاً ممکن ہو جائے۔
- ایران کے دستور میں اکثریت اور اقلیت کے لیے جو دائرہ مقرر کیا گیا ہے، اسے معیار تسلیم کر کے پاکستان میں دستوری ترامیم کے ذریعہ اسے مکمل طور پر نافذ کر دیا جائے۔
- آبادی کے صحیح تناسب کے مردم شماری کے ذریعہ تعین کے بعد فوج اور سول کی ملازمتوں اور اسمبلیوں کی نمائندگی کے لیے اسی بنیاد پر تناسب طے کر دیا جائے تاکہ کوئی فریق دوسرے کے حقوق پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

ہمیں امید ہے کہ ملک کے سنجیدہ اہل دانش ان تجاویز کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لے کر بڑھتی ہوئی شیعہ سنی کشمکش کی روک تھام کے لیے موثر کردار ادا کریں گے۔

کھاریاں فائرنگ کیس:
ارباب حل و عقد کی خدمت میں عرضداشت

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ---اپریل ۱۹۹۵ء

مکرمی !السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی؟

گزارش ہے کہ ملک میں سنی شیعہ کشیدگی میں مسلسل اضافہ اور دونوں طرف سے قیمتی افراد کے روز مرہ قتلِ عام نے ہر ذی شعور شہری کو پریشان اور مضطرب کر دیا ہے۔ اس مسلح تصادم کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے جو ملکی سالمیت اور قومی وحدت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس کشیدگی کی روک تھام کے لیے حقیقت پسندانہ بنیاد پر عملی اقدامات کیے جائیں۔ اس سلسلہ میں میری تجویز یہ ہے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج صاحبان پر مشتمل ایک عدالتی تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جائے جو کھلی تحقیقات کے ذریعے سنی شیعہ کشیدگی میں حالیہ برسوں میں اضافہ اور اس کے مسلح تصادم کی صورت اختیار کر جانے کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کرے۔ اور ان اسباب و عوامل کو دور کر کے اس کشیدگی و اشتعال کی روک تھام کے لیے قومی سطح پر متفقہ عملی کارروائی کا اہتمام کیا جائے۔

اسی سلسلہ میں ایک اہم واقعہ کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ۲۵ نومبر ۱۹۹۴ء کو لاہور

میں تحریک جعفریہ کی عظمت اسلام کانفرنس میں شرکت کے بعد واپس جانے والی ایک بس پر کھاریاں کے قریب فائرنگ ہوئی جس میں متعدّد افراد جاں بحق ہو گئے۔ یہ ایک انتہائی افسوسناک سانحہ ہے لیکن اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس کیس میں ضلع جہلم اور ضلع گجرات سے جمعیۃ علمائے اسلام، سپاہ صحابہؓ اور تحریک خدام اہلِ سنت کے ذمہ دار راہنماؤں مولانا قاری خبیب احمد عمر، مولانا قاری محمد اختر، مولانا عبد الغفور قاسمی، حافظ خالد محمود اور ان کے دیگر رفقاء کو مبینہ طور پر بلاوجہ ملوث کر دیا گیا ہے جن کے بارے میں جہلم کے عام شہریوں کا تاثر یہ ہے کہ چونکہ گورنر پنجاب چودھری الطاف حسین کا تعلق جہلم شہر سے ہے اور چونکہ ان حضرات کا شمار چودھری صاحب موصوف کے سیاسی مخالفین میں ہوتا ہے اس لیے انہیں سیاسی دباؤ اور انتقام کے طور پر اس کیس میں ملوث کرایا گیا ہے۔ جیسا کہ بعد میں سامنے آنے والے متعدّد شواہد نے اس کی تصدیق بھی کر دی ہے۔

کھاریاں بس فائرنگ کیس کے سلسلہ میں بعد میں گرفتار ہونے والے ایک گروہ نے پولیس کے ریکارڈ کے مطابق اعتراف جرم بھی کر لیا ہے لیکن اس کے باوجود مذکورہ بالا حضرات ابھی تک زیر حراست ہیں اور انہیں مقدمہ میں گنہگار ٹھہرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جبکہ مقدمہ کی تفتیش میں گرفتار شدگان کو انصاف کے معروف تقاضوں سے محروم رکھنے کے لیے مبینہ طور پر گورنر پنجاب انتظامیہ و پولیس پر اثرانداز ہو رہے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس صورتحال کا فوری طور پر نوٹس لیا جائے۔ اس سلسلہ میں میری تجویز یہ ہے کہ ہائی کورٹ کے کسی جج کے ذریعے اس کیس کی کھلی تحقیقات کرائی جائے اور گورنر پنجاب کے خلاف جہلم کے شہریوں کے الزامات کی غیر جانبدارانہ انکوائری کے ذریعے اصل حقائق کو منظر عام پر لا کر انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں۔

آنجناب سے گزارش ہے کہ اس سلسلہ میں اپنا اثر و رسوخ بھرپور طور پر استعمال میں لا کر گجرات اور جہلم کے شریف شہریوں کو انصاف دلانے میں تعاون فرمائیں۔

شکریہ، والسلام: ابو عمار زاہد الراشدی
خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ

پاکستان کے دینی حلقے:
ایک بی بی سی پروگرام کی تفصیل

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ---اا اگست ۱۹۹۵ء

مغربی ذرائع ابلاغ ان دنوں عالمِ اسلام اور مسلمانوں کی جو تصویر دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ ملت اسلامیہ کے اہل علم و دانش کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ بالخصوص پاکستان کے دینی حلقوں کو جس انداز میں عالمی رائے عامہ کے سامنے متعارف کرایا جا رہا ہے اس کا پوری سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں ہم قارئین کی خدمت میں معروف برطانوی نشریاتی ادارے بی بی سی ۲ کے نشر کردہ ایک پروگرام کا خاکہ پیش کر رہے ہیں جس میں مختلف مذہبی پہلوؤں کے حوالے سے پاکستان کے دینی حلقوں کی تصویرکشی کی گئی ہے۔ یہ پروگرام سال رواں کے دوران ”ایسٹ“ کے نام سے کئی حصوں میں نشر ہوا ہے اور لندن میں ہمارے ایک محترم دوست نے اس کے پہلے دو حصے ریکارڈ کر رکھے ہیں اور انہی کے ہاں ہم نے یہ پروگرام دیکھے ہیں۔ پروگرام کے پہلے حصہ کے نشر ہونے کی تاریخ ریکارڈ میں نہیں آسکی البتہ دوسرے حصہ کے نشر ہونے کی تاریخ ۱۸ اپریل ریکارڈ پر موجود ہے۔

جھنگ کی سُنی شیعہ کشمکش

پروگرام کا آغاز جھنگ سے کیا گیا ہے جس میں بعض عورتوں کو گندم کی کٹائی اور چھٹائی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جھنگ ایک پسماندہ علاقہ ہے جہاں شیعہ سنی کشیدگی کا ایک طویل پس منظر موجود ہے۔ اس کے بعد بی بی سی کا کیمرہ مین ہمیں سیدھا مولانا حق نواز جھنگوی شہیدؒ اور مولانا ایثار القاسمی شہیدؒ کی قبروں پر لے جاتا ہے، ان کی قبروں کی تختیوں کو نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے، پھر اچانک ایک جلسہ کا منظر سامنے آجاتا ہے جس سے مولانا اعظم طارق خطاب کر رہے ہیں۔ پروگرام پیش کرنے والا مولانا موصوف کا بحیثیت ایم این اے تعارف کراتا ہے اور مولانا کے خطاب کے بعض حصے سنائے جاتے ہیں جن میں جناب آیت اللہ خمینی کی بعض عبارات کا حوالہ دے کر شیعہ کی تکفیر پر زور دیا گیا ہے اور ”کافر کافر شیعہ کافر“ کے پر جوش نعرے سنائے جاتے ہیں۔

دینی مدارس کا ناگفتہ بہ تصور

اس کے بعد کیمرہ مین ہمیں ایک دینی درسگاہ میں لے گیا ہے جو اپنی عمارت اور گردو پیش کے پس منظر میں کسی پسماندہ علاقے کی درسگاہ نظر آرہی ہے۔ درسگاہ کے ایک کمرے میں بہت سے چھوٹے بڑے طالب علم سوئے ہوئے ہیں جو اذان کی آواز سن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور وضو خانہ کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ان میں سے متعدّد طلبہ کے پاؤں میں زنجیریں ہیں اور وہ اسی حالت میں زنجیریں سنبھالتے ہوئے وضو کر رہے ہیں۔ پھر انہیں نماز پڑھتے ہوئے دکھایا گیا ہے، اتنے میں ایک غریب خاتون کیمرے کے سامنے آجاتی ہے جو اس مدرسہ میں پڑھنے والے بچے کو ملنے آئی ہے۔ اس بچے کو اپنی ماں سے مدرسہ سے باہر ایک کھلی جگہ میں ملتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ماں سے پوچھا گیا ہے کہ اس نے اپنے بچے کو اس مدرسہ میں کیوں بھیجا ہے؟ وہ جواب دیتی ہے کہ قرآن کریم حفظ کرانے کے لیے۔ دوسرا سوال ہوا کہ بچے کو کسی سکول میں کیوں نہیں بھیجا؟ ماں حسرت سے جواب دیتی ہے کہ مجبوری ہے کیونکہ اس کا باپ بیکار ہے اور گیارہ سال سے بیمار ہے اس لیے مجبوراً بچے کو اس درسگاہ میں بھیجا گیا ہے۔

اب کیمرہ مین ہمیں پھر درسگاہ کے اندر لے جاتا ہے جہاں بہت سے بچے استاذ کے سامنے بیٹھے سبق یاد کر رہے ہیں اور ایک بچہ بلند آواز سے سورۃ الرحمان کی تلاوت کر رہا ہے۔ پروگرام ریکارڈ کرنے والا بی بی سی کا نمائندہ مدرسہ کے منتظم سے انٹرویو کر رہا ہے اور اس بات کی وضاحت چاہتا ہے کہ بچوں کو زنجیروں سے کیوں باندھا گیا ہے؟ مدرسہ کے منتظم کا جواب یہ ہے کہ درجہ کتب میں تو ہمارے ہاں اس طرح کی سختی نہیں ہے وہاں طلبہ آزادی کے ساتھ پڑھتے ہیں لیکن حفظ قرآن کے شعبہ میں ہمیں سختی کرنا پڑتی ہے کیونکہ سختی کے بغیر بچے قرآن کریم یاد نہیں کر سکتے۔ زنجیروں سے باندھنے کے بارے میں درسگاہ کے منتظم کا کہنا ہے کہ ہم نے گزشتہ سال اساتذہ کی میٹنگ میں طے کیا تھا کہ کسی طالب علم کو زنجیر سے نہیں باندھا جائے گا لیکن جو بچے بھاگ جاتے ہیں اور والدین انہیں زبردستی پڑھانا چاہتے ہیں وہ اپنے بچوں کو زنجیروں کے ساتھ باندھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مدرسہ کے منتظم سے اس انٹرویو کے بعد درسگاہ کے طلبہ کو ایک ساتھ زمین پر بیٹھے کھانا کھاتے دکھایا گیا ہے اور وہ منظر بلاشبہ ایسا ہے جسے دیکھ کر مغربی دنیا کا کوئی شخص نفرت سے منہ پھیر لینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔

اب یہاں سے اچانک ہم ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں دینی مدرسہ کے طلبہ کو اسلحہ کی ٹریننگ لیتے دکھایا گیا ہے۔ ایک طالب علم کے ہاتھ میں رائفل ہے جسے وہ صاف کر رہا ہے۔ پروگرام پیش کرنے والا بتاتا ہے کہ ان طلبہ نے افغانستان میں اسلحہ کی ٹریننگ حاصل کی ہے اور کشمیر میں بھی اب یہ دہشت

گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہیں۔ اب سپاہ صحابہؓ کا ایک دفتر سامنے آجاتا ہے جس کے باہر مسلح گن مینوں کا پہرہ ہے اور اندر مولانا اعظم طارق اپنے رفقاء سمیت بیٹھے ہیں جن سے بی بی سی کا نمائندہ انٹرویو کر رہا ہے۔ انٹرویو کا بنیادی سوال یہ ہے کہ سپاہ صحابہؓ کے لیڈر شیعہ کے خلاف اس قدر اشتعال انگیز تقریریں کیوں کرتے ہیں؟ مولانا کا جواب یہ ہے کہ ہمارے اشتعال کے نتیجے میں دشمن اب دفاع پر مجبور ہو گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہماری کوشش یہ ہے کہ پاکستان اور دیگر مسلم ممالک میں شیعہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اس کے بعد مولانا اعظم طارق کو پھر ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے دکھایا گیا، پھر ایک جھلک زنجیروں سے جکڑے ہوئے طلبہ کی سامنے آتی ہے اور کسی ہسپتال میں شیعہ سنی تصادم کے نتیجے میں زخمی ہونے والوں کے زخم دکھا کر پروگرام کا پہلا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔

توہینِ رسالت کا ایک مقدمہ اور اس کے کردار

پروگرام کے دوسرے حصے کا آغاز سلامت مسیح اور رحمت مسیح سے ہوتا ہے جو ضلع گوجرانوالہ کے مشہور زمانہ توہین رسالتؐ کیس کے ملزم ہیں۔ انہیں حوالات میں دکھایا گیا ہے اور وہیں ان سے انٹرویو ہوتا ہے۔ رحمت مسیح کہتا ہے کہ عدالت میں گواہوں نے اس کے بارے میں جھوٹ بولا ہے، اصل قصہ یہ ہے کہ ماسٹر عنایت اللہ جو قریب کے اسکول میں پڑھاتا ہے اس نے مسیحی بچوں کو اپنی کلاس میں پڑھانے سے انکار کر دیا تھا جس پر میں نے اسے وہاں سے تبدیل کرانے کی کوشش کی۔ اس پر ماسٹر عنایت نے مجھے دھمکی دی کہ میں تم سے نمٹوں گا اور یہ کیس ماسٹر عنایت نے اسی دشمنی میں ہمارے خلاف بنوایا ہے۔ اس کے نزدیک اصل کہانی یہ ہے کہ ہم گاؤں کے چودھریوں کے ماتحت نہیں رہتے تھے اور ان کے لڑکوں کے کام نہیں کرتے تھے اس لیے ہمیں اس جھوٹے کیس میں پھنسایا گیا ہے۔

اس انٹرویو کے بعد تحریک تحفظ ناموس رسالتؐ کے کارکنوں کو سروں پر پٹیاں باندھے مظاہرہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اسی دوران سلامت مسیح اور رحمت مسیح کو سیشن کورٹ میں پیش ہونے کے لیے جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے، عاصمہ جہانگیر ایڈووکیٹ مسلح پولیس کے پہرے میں ان ملزموں کو عدالت کی طرف لے جا رہی ہیں۔ دونوں ملزم ایک دوسرے کو صبر اور حوصلہ کی تلقین کر رہے ہیں۔ دوسرے منظر میں سیشن کورٹ سے سزائے موت کا فیصلہ سن کر ملزم باہر آرہے ہیں، ایک دوسرے سے گلے لگ کر رو رہے ہیں اور پھر انہیں پولیس کی بند گاڑی میں سوار کر کے روانہ کر دیا گیا ہے۔

اب بی بی سی کا نمائندہ ہمیں ہیومن رائٹس کمیشن پاکستان کے چیئرمین ریٹائرڈ جسٹس دراب پٹیل کے ہاں لے گیا ہے جنہوں نے اپنے مخصوص انداز میں توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کے قانون کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ اس کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کو ایک طیارے سے اترتے دکھایا گیا ہے اور

تبصرہ کرنے والا کہتا ہے کہ پاکستان میں مذہبی قوانین کا سلسلہ جنرل محمد ضیاء الحق نے شروع کیا تھا۔ پھر ہم ہیومن رائٹس کمیشن کی سیکرٹری جنرل عاصمہ جہانگیر ایڈووکیٹ کے دفتر میں پہنچ جاتے ہیں جو عملہ سمیت سلامت مسیح کیس میں سیشن کورٹ کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرنے کی تیاری میں لگی ہوئی ہیں۔ اس دوران ان سے انٹرویو بھی ہوتا ہے اور وہ توہین رسالتؐ کی سزا کے قانون کے خلاف اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتی ہیں۔

اس کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں اسلام آباد میں سلمان رشدی کے خلاف ہونے والے مظاہرہ کی جھلکیاں سامنے آجاتی ہیں۔ پھر وفاقی شرعی عدالت کا صدر دروازہ اور اس کے باہر لگا ہوا بورڈ دکھایا جاتا ہے، اس تبصرہ کے ساتھ کہ توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کے قانون کے نفاذ کا فیصلہ اسی شرعی عدالت نے کیا تھا۔ اس کے بعد اسلام آباد میں ہونے والے ایک اور مظاہرہ کی جھلکی دکھائی دیتی ہے جو غالباً جماعت اہلِ سنت کی طرف سے راولپنڈی میں کیا جانے والا مظاہرہ ہے۔ پھر ہم عاصمہ جہانگیر ایڈووکیٹ کے آفس میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کی رفیقہ کار حنا جیلانی ایڈووکیٹ سے انٹرویو ہوتا ہے۔ اس کے بعد نشریہ کے مطابق کیمرہ مین سیدھا جھنگ پہنچ جاتا ہے اور مسجد حق نواز شہیدؒ کے باہر گن مینوں کو پہرہ دیتے ہوئے دکھاتا ہے اور پھر مولانا اعظم طارق سے انٹرویو لیا جاتا ہے جس میں وہ توہین رسالت کیس میں سلامت مسیح اور رحمت مسیح کو سیشن کورٹ کی طرف سے دیے جانے والی سزائے موت کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر یہ سزا نہ دی جاتی تو لوگ ملزموں کے گھروں کو جلا دیتے اور ساری بستی نذر آتش کر دیتے۔

پھر ہم سیدھے رتہ دوہتڑ گاؤں میں پہنچتے ہیں جہاں سلامت مسیح اور رحمت مسیح کے گھروں کو تالے لگے ہوئے نظر آتے ہیں، بستی ویرانی کا منظر پیش کر رہی ہے، اس کی دیواروں پر ''گستاخ نبیؐ کو پھانسی دو'' کے نعرے درج ہیں۔ ایک طرف کچھ مکان آباد ہیں جن سے باہر کچھ عورتیں جمع ہیں جو مسلمانوں کے مطالبات اور سیشن کورٹ کے فیصلے کے خلاف مخصوص انداز میں اظہار جذبات کر رہی ہیں۔ ایک عورت مسلمانوں کو خوب جلی کٹی سنا رہی ہے، ایک بوڑھا خدا کی مرضی کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے، پھر بتاتا ہے کہ رحمت مسیح اور سلامت مسیح کے خاندان اس بستی سے جا چکے ہیں مگر لوگ اب بھی ان کا پتہ معلوم کرنے کے لیے یہاں آتے ہیں تاکہ انہیں تلاش کر کے خاندان کے افراد کو مار سکیں۔

مسئلہ ختم نبوت اور قادیانیت

اب عیسائیوں کا ایک مذہبی جلوس سامنے آجاتا ہے جو ایک پادری کی قیادت میں مقامی گرجا گھر کی طرف جا رہا ہے اور پھر پروگرام پیش کرنے والے صاحب ہمیں یہ کہتے ہوئے ربوہ لے جاتے ہیں کہ

توہین رسالتؐ کے سلسلہ میں زیادہ مقدمات احمدیوں کے خلاف ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی تصویر دکھائی جاتی ہے اور ان کے ایک قول کا بینر سامنے آتا ہے جس میں انہوں نے اس جملہ کو الہامی قرار دیا ہے کہ ''میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچا دوں گا''۔ ربوہ کی ایک عبادت گاہ میں ان کا مربی تقریر کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ مسیح بن مریمؑ فوت ہو چکے ہیں۔ پھر ۱۹۷۴ء کی آئینی ترمیم کا حوالہ دیا جاتا ہے جس میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا ہے اور ۱۹۸۴ء کے صدارتی آرڈیننس کا ذکر ہوتا ہے جس کے تحت اسلام کا نام اور اس کے شعائر کے استعمال سے قادیانیوں کو قانوناً روک دیا گیا ہے۔ پھر ہمیں قادیانیوں کے آرگن ''الفضل'' کے دفتر لے جایا گیا ہے جہاں اس کے ایڈیٹر نسیم سیفی ''الفضل'' کی کاپیاں جوڑتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ پھر وہ انٹرویو دیتے نظر آتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ہمیں کہا جاتا ہے کہ تم مسلمان نہیں ہو، ہم اگر مسلمان نہیں تو پھر اور کیا ہیں؟ اب قادیانیوں کو ایک عبادت گاہ میں نماز پڑھتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

اس کے بعد ہم تحریک تحفظ ناموس رسالتؐ کے ایک اجلاس میں پہنچ جاتے ہیں جس میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء بیٹھے ہیں، پھر ایک قادیانی وکیل دکھایا جاتا ہے اور چند قادیانیوں کو کمرہ کے سامنے لایا جاتا ہے جن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ان کے خلاف مقدمات درج ہیں۔ اب ہم سیدھے سندھ پہنچتے ہیں جہاں ایک بستی میں قادیانیوں کے خلاف کام کرنے والے مقامی علماء سے سوال و جواب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی راہنما مولانا احمد میاں حمادی سے ایک مجلس میں انٹرویو ہوتا ہے جو بتاتے ہیں کہ ہم قادیانیوں کو آئین و قانون کا پابند دیکھنا چاہتے ہیں اور اسی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اگر وہ آئین و قانون کے مطابق رہیں تو ہمارا ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔

اب ایک دفعہ پھر ہم ربوہ میں ہیں، وہی نسیم سیفی صاحب کا دفتر ہے وہ الفضل کی کاپی جوڑ رہے ہیں اور الفضل پر حکومت کی طرف سے پابندی کا ذکر کرتے ہوئے امتناع قادیانیت کے صدارتی آرڈیننس کا حوالہ دیتے ہیں۔ ربوہ کا ایک بازار دکھایا جاتا ہے جہاں لوگوں کی آمد و رفت ہے، تانگے چل رہے ہیں اور ایک مسجد سے باہر نسیم سیفی اپنے ہاتھ میں ایک آیف آئی آر لہرا کر بتا رہے ہیں کہ اس میں ربوہ کی پوری آبادی کو ملزم ٹھہرایا گیا ہے اور اس کے تحت پولیس کسی بھی شخص کو کسی بھی وقت گرفتار کر سکتی ہے۔ اس کے بعد ربوہ کے قبرستان میں ہمیں لے جایا جاتا ہے جس میں قادیانی امت کے تیسرے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود کی قبر کی لوح دکھائی جاتی ہے اور نسیم سیفی صاحب قبروں پر کچھ پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اب ہمیں اسکرین پر پاکستان کے پاسپورٹ کے فارم کا ایک حصہ دکھایا جاتا ہے جس میں

مسلمانوں کے لیے مرزا غلام احمد قادیانی کو جھوٹا قرار دینے کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ربوہ سے ہم گوجرانوالہ پہنچتے ہیں جہاں کے ایک محلہ کھیالی میں گزشتہ سال ایک حافظ قرآن فاروق کو چند شرپسندوں کی شرارت پر قرآن کریم کا گستاخ قرار دے کر شہید کر دیا گیا تھا۔ کیمرہ مین حافظ فاروق کا گھر دکھاتا ہے، پولیس چوکی کی حوالات کو سامنے لاتا ہے جہاں سے مشتعل ہجوم حافظ فاروق کو پولیس سے چھڑا کر لے گیا تھا، وہ روڈ دکھایا گیا ہے جہاں حافظ فاروق کو گھسیٹا گیا اور پھر سنگسار کر دیا گیا۔ حافظ فاروق کی اہلیہ اور خواہر نسبتی کا انٹرویو نشر کیا گیا ہے اور خواتین کو ان سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

اب ہم پر سپاہ صحابہؓ کے گیسٹ ہاؤس کے سامنے ہیں جہاں گن مین کھڑے ہیں اور اندر مولانا اعظم طارق قومی اسمبلی میں پیش کردہ ناموس صحابہؓ بل کی وضاحت کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کیمرہ مین ہمیں جلی ہوئی گاڑی دکھاتا ہے، ہسپتال میں زخمیوں کے پاس لے جاتا ہے اور مسجد میں بم پھٹنے کے بعد کا منظر پیش کرتا ہے اور پھر ہم ہیومن رائٹس کمیشن کے چیئرمین ریٹائرڈ جسٹس دراب پٹیل کے دفتر میں پہنچ جاتے ہیں جو اپنی گفتگو میں مسلمانوں کو تحمل اور بردباری سے کام کرنے کی تلقین کر رہے ہیں اور توہین رسالتؐ کی سزا کے قانون کے خلاف اپنے موقف اور جذبات کا اظہار کر رہے ہیں۔

لاہور ہائی کورٹ میں توہینِ رسالت کا مقدمہ

اب ہم لاہور ہائیکورٹ کے سامنے ہیں جہاں رحمت مسیح اور سلامت مسیح کو سیشن کورٹ کی طرف سے دی جانے والی سزائے موت کے فیصلہ کے خلاف اپیل کی سماعت ہو رہی ہے۔ کورٹ سے باہر نوجوانوں کا مشتعل ہجوم ہے جو ”عشق رسولؐ میں موت بھی قبول ہے“ کے پرجوش نعروں کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہے۔ ان نوجوانوں کو کھلے روڈ پر جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے اور جناب رشید مرتضیٰ ایڈووکیٹ کو نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے سامنے لایا گیا ہے۔ اتنے میں کورٹ کا فیصلہ سامنے آجاتا ہے، رحمت مسیح اور سلامت مسیح کو بری کر دیا گیا ہے اور کورٹ سے باہر نوجوانوں کا مشتعل ہجوم فیصلہ کے خلاف احتجاج کر رہا ہے۔ پھر ہم لاہور کے مرکز ختم نبوت مسجد عائشہؓ مسلم ٹاؤن میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ایک اجلاس کا منظر دکھایا گیا ہے اور صوبائی اسمبلی کے رکن پیر سید عارف حسین شاہ آف حافظ آباد بی بی سی کی ٹیم کو انٹرویو دیتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ ہم ناموس رسالتؐ پر حملہ کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے اور نہ ہی گستاخی کو انسانی حقوق میں شمار کرتے ہیں۔

اس کے بعد احتجاجی جلوس کی ایک جھلک دیکھ کر ہم پھر عاصمہ جہانگیر ایڈووکیٹ کا انٹرویو سن رہے ہیں جو مظاہرہ کرنے والوں کو بنیاد پرست اور دہشت گرد قرار دے کر بتا رہی ہیں کہ ان کی طرف سے

اسلام کے نام پر ہمیں دھمکایا جارہا ہے۔ پھر سلامت مسیح اور رحمت مسیح کو ایک گاڑی میں لے جایا جارہا ہے اس کیفیت کے ساتھ کہ وہ گاڑی کے شیشوں کے پردے آگے کر کے اپنے اور اپنے چہروں پر پردہ ڈال کر باہر کے لوگوں سے چھپنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پروگرام پیش کرنے والا بتارہا ہے کہ ان کے قتل کا فتویٰ صادر ہو چکا ہے اس لیے انہیں چھپا کر لے جایا جارہا ہے اور پھر یہ کہہ کر پروگرام کا یہ حصہ مکمل کر دیا جاتا ہے کہ ”اور قانون میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔“

قارئین محترم! یہ ہے اس سال بی بی سی ۲ سے ”ایسٹ“ کے عنوان سے نشر ہونے والے پروگرام کے پہلے دو حصوں کا خاکہ جس میں پاکستان کے دینی حلقوں، مدارس اور جماعتوں کی تصویر عالمی رائے عامہ کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ اس میں حقیقت اور افسانے کا تناسب کیا ہے اور مختلف واقعات کے حصے بخرے کر کے انہیں از سر نو ایک خاص ترتیب کے ساتھ سامنے لانے کے پیچھے کیا مقاصد کارفرما ہیں؟ اس کا فیصلہ آپ خود کر لیں لیکن ایک بات ہم اس موقع پر عرض کرنا چاہیں گے کہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اصل حالات سے بے خبر مغربی رائے عامہ اس نوعیت کے مسلسل پروگرام دیکھ کر اگر مسلمانوں کے دینی حلقوں کے بارے میں منفی تاثرات قائم کرتی ہے تو اس میں اس کا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں ہے۔ یہ منظر جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر دیکھے گا وہ منفی تاثرات سے خود کو نہیں بچا سکے گا۔ یہ صورتحال دینی جماعتوں اور ان کی قیادتوں کے لیے لمحہ فکریہ ہی نہیں ایک کھلا چیلنج بھی ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے مذہبی راہنما اس چیلنج کا صحیح طور پر ادراک کرتے ہوئے عملی میدان میں اس کا سامنا کر سکیں۔

ایران کے اہلِ سُنت علماء کی حالت زار

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ---اپریل ۱۹۹۶ء

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۷ مارچ ۱۹۹۶ء کے مطابق ایران کے دو سُنی علماء مولانا عبد المالک اور مولانا عبد الناصر، جو کراچی میں گزشتہ آٹھ برس سے جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، قتل کر دیے گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے قاتلوں کا پتہ نہیں چل سکا اور ان کی لاشیں تدفین کے لیے ایران روانہ کر دی گئی ہیں۔

اول الذکر مولانا عبد المالک مرحوم ایران کے بزرگ سنی عالم دین حضرت مولانا عبد العزیزؒ کے فرزند ہیں۔ مولانا عبد العزیزؒ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے شاگردوں میں سے تھے، ایرانی بلوچستان کے صدر مقام زاہدان کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب تھے اور ایران کے علمائے اہل سنت کے

مسلّمہ قائد تھے، بادشاہت کے خلاف انقلاب میں ایرانی علماء کے ساتھ صفِ اول میں تھے، انقلابی کونسل اور مجلسِ دستور ساز کے رکن رہے ہیں۔ راقم الحروف کو حضرت مولانا عبدالعزیز مرحوم سے دو بار ملاقات کا موقع ملا ہے۔ ایک بار کراچی میں (غالباً ۱۹۷۸ء میں) ملاقات ہوئی اور دوسری بار ۱۹۸۷ء میں تہران میں ان کی زیارت نصیب ہوئی جب پاکستان کے علماء اور دانشوروں کے ایک وفد کے ہمراہ ایران کے محکمہ اوقاف کی دعوت پر ایران کا دورہ کرنے والوں میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔

مولانا مرحوم اس وقت ایران کے انقلابی راہنماؤں سے الگ ہو چکے تھے اور ناراض اور معتوب حضرات میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انہیں شکایت تھی کہ ہم بادشاہت کے خلاف انقلاب میں شیعہ علماء کے ساتھ شریک رہے ہیں لیکن انقلاب کے استحکام کے بعد ہمیں نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور انقلابی کونسل اور مجلسِ دستور ساز میں ہمارے ساتھ جو وعدے کیے گئے تھے، وہ بھلا دیے گئے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ایران میں اہل سنت کو دستور میں تسلیم شدہ حقوق نہیں دیے جا رہے، مطالبہ کرنے والے علماء گرفتار کر لیے جاتے ہیں، اہل سنت کو ان کی اکثریت کے صوبوں میں بھی غیر سنی اور غیر مقامی حکام سے سابقہ درپیش ہے، طلبہ کو اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلہ نہیں ملتا، اور پاکستان کے تعلیمی اداروں میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند ایرانی طلبہ کو پاسپورٹ نہیں دیا جاتا، جبکہ اس سال صرف قم کے دینی مدارس میں ایک ہزار سے زائد پاکستانی طلبہ مذہبی تعلیم حاصل کر رہے تھے، اہل سنت کے علماء اور دینی حلقوں پر ریاستی جبر کا خوف ہر وقت مسلط رہتا ہے اور خفیہ ایجنسیاں مسلسل ان کا تعاقب کرتی ہیں۔

ستم کی بات یہ ہے کہ انسانی حقوق کے ٹھیکیدار ادارے اور مسلمانوں کی عالمی تنظیمیں اس صورتحال پر خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں اور ایران کے مظلوم سُنی مسلمانوں کے جائز حقوق کے لیے کوئی آواز اٹھانے کو تیار نہیں ہے۔ جبکہ ایرانی سنیوں کی بے بسی کی حالت یہ ہے کہ تہران میں کم و بیش دس لاکھ سنیوں کی آبادی کو پورے شہر میں ایک مسجد بنانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اور دو سال قبل مشہد کے کوچہ خامنائی میں اہل سنت کی ''مسجد فیض'' بلڈوزروں کے ساتھ مسمار کر دی گئی ہے۔ یہ مسجد راقم الحروف نے ۱۹۸۷ء میں دیکھی تھی اور اس میں اپنے وفد کے بعض ارکان کے ہمراہ نمازِ فجر بھی ادا کی تھی لیکن اب اس مسجد کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔

اس پس منظر میں ایران کے سینکڑوں سنی علماء ریاستی جبر کے ہاتھوں بے بس ہو کر مختلف ممالک میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن مولانا عبدالمالکؒ اور مولانا عبدالناصرؒ کی مظلومانہ شہادت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی خاموش جلاوطنی بھی بعض حلقوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے اور ان کا

تعاقب مسلسل جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان شہیدوں کے درجات بلند فرمائیں، انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں، اور ایران کے مظلوم اور بے بس علماء اہل سنت کی دستگیری فرماتے ہوئے اپنے جائز حقوق کے لیے ان کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار فرمائیں، آمین یا الٰہ العالمین۔

مولانا ضیاء الرحمان فاروقی شہیدؒ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ---فروری ۱۹۹۷ء

سپاہ صحابہؓ پاکستان کے سربراہ مولانا ضیاء الرحمان فاروقی گزشتہ روز لاہور سیشن کورٹ کے احاطہ میں بم کے خوفناک دھماکہ میں جام شہادت نوش کر گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ اپنے نائب مولانا اعظم طارق کے ہمراہ ایک مقدمہ کی پیشی کے سلسلہ میں سیشن کورٹ میں موجود تھے کہ اچانک بم کا دھماکہ ہوا جس میں مولانا ضیاء الرحمان فاروقی سمیت دو درجن سے زائد افراد جاں بحق جبکہ مولانا اعظم طارق سمیت ایک سو کے لگ بھگ افراد زخمی ہو گئے۔

مولانا ضیاء الرحمان فاروقی شہیدؒ کا تعلق سمندری ضلع فیصل آباد سے تھا اور وہ مجلس احرار اسلام کے راہنما مولانا محمد علی جانبازؒ کے فرزند تھے۔ انہوں نے دینی تعلیم میں سند فراغت دارالعلوم کبیر والہ سے حاصل کی جبکہ پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کی۔ وہ ایک عرصہ تک جمعیۃ طلباء اسلام اور جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ وابستہ رہے جبکہ سپاہ صحابہؓ قائم ہونے پر اس کے بانی مولانا حق نواز جھنگویؒ کے ساتھ شریک ہو گئے اور ان کی شہادت کے بعد ان کی جگہ سپاہ صحابہ پاکستان کے سرپرست اعلیٰ چن لیے گئے۔

فاروقی شہیدؒ بے باک خطیب، سرگرم کارکن اور ممتاز مصنف تھے۔ انہوں نے تحریر و تقریر کے ذریعہ ملک میں نفاذِ اسلام، تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس صحابہؓ کی جدوجہد میں مسلسل اور سرگرم کردار ادا کیا اور متعدّد بار قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے۔ حتیٰ کہ شہادت کے وقت بھی وہ زیر حراست تھے اور عدالت میں پیشی کے لیے انہیں مولانا اعظم طارق کے ہمراہ جیل سے لایا گیا تھا۔ ہم اس جانکاہ صدمہ میں مولانا فاروقی شہیدؒ اور دیگر شہداء کے خاندانوں کے ساتھ شریک غم ہیں اور دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دیں اور زخمیوں کو صحت کاملہ وعاجلہ عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

اس کے ساتھ ہی ہم ملک بھر میں سنی شیعہ تصادم کے بڑھتے ہوئے رجحانات، بم دھماکوں، مساجد اور دیگر عبادت گاہوں میں فائرنگ کے واقعات اور دونوں طرف سے سینکڑوں افراد کی ہلاکت

سے پیدا شدہ صورتحال پر تشویش کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں جس سے ملک کا ہر باشعور شہری پریشان اور مضطرب ہے اور مذہبی امن مسلسل خطرے میں پڑتا جارہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس مسلح تصادم اور روز افزوں کشیدگی کے حقیقی اسباب و عوامل کی نشاندہی اور ان سے نمٹنے کی ٹھوس جدوجہد ضروری ہے اور حکومت کو اس بارے میں کسی قسم کی مصلحت اندیشی اور غفلت سے کام لینے کی بجائے شہریوں کی جان ومال کے تحفظ اور امن عامہ کی خاطر ہنگامی بنیادوں پر سنجیدہ اقدامات کرنے چاہئیں۔ اس سلسلہ میں ہماری تجویز یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں اعلیٰ سطحی کمیشن مقرر کیا جائے جس میں حکومت اور فریقین کے ذمہ دار نمائندے شامل ہوں۔ یہ کمیشن ملک میں سنی شیعہ کشیدگی کے اسباب و عوامل کی نشاندہی اور انہیں دور کرنے کے لیے عملی اقدامات تجویز کرے جن پر سختی کے ساتھ عملدرآمد کرایا جائے۔

ہمیں امید ہے کہ حکومت اس تجویز کا سنجیدگی سے جائزہ لے گی اور فرقہ وارانہ امن بحال کرنے کے لیے اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے میں مزید کوتاہی روا نہیں رکھے گی۔

امن فارمولا یا مطالبات کا ون وے ٹریفک

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مئی ۱۹۹۷ء

ہمارے ہاں یہ روایت بن گئی ہے کہ ہر سال محرم الحرام کے آغاز سے ایک ماہ قبل ہی ضلعی سطح پر امن کمیٹیوں کے اجلاس شروع ہوجاتے ہیں اور بیشتر اضلاع کے حُکام کو یہ فکر لاحق ہوجاتی ہے کہ کسی طرح محرم الحرام آرام سے گزر جائے اور ان کے ضلع میں سُنی شیعہ کشیدگی کسی فساد یا خونریزی کا باعث نہ بن جائے۔

محرم الحرام میں امنِ عامہ کو یہ خطرہ بطور خاص اس لیے درپیش ہوتا ہے کہ اہلِ تشیع نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر شہدائے کربلا کی یاد منانے کے لیے عزاداری، ماتم اور جلوس کا جو سلسلہ اختیار کر رکھا ہے اور جسے وہ عبادت کہتے ہیں (اس) کے بارے میں ان کا اصرار ہوتا ہے کہ یہ کھلے بندوں ہو، گلیوں بازاروں اور سڑکوں میں ہو، اور ان کا ماتمی جلوس ان لوگوں کے گھروں کے سامنے سے بھی ضرور گزرے جو اس طریقہ کو پسند نہیں کرتے اور اپنے مذہبی معتقدات کی رو سے اسے جائز نہیں سمجھتے۔

جہاں تک حضرت امام حسینؓ اور خانوادۂ نبوت کا تعلق ہے، جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کے ساتھ محبت و عقیدت رکھنے والا ہر گروہ ان کی آلؓ واصحابؓ کے ساتھ یکساں عقیدت

رکھتا ہے، اپنی مجالس میں ان کا تذکرہ کرتا ہے، ان کی قربانیوں پر خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے، اور ان کے ساتھ نسبت کو باعثِ سعادت سمجھتا ہے۔ لیکن ماتم، سینہ کوبی اور عزاداری کا مروّجہ طریقہ اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک شرعاً درست نہیں، اور یہی اختلاف بہت سے مقامات پر تنازعہ کا باعث بنتا ہے جو بسا اوقات فساد اور خونریزی تک جا پہنچتا ہے، اور اس کے امکانات کو روکنے کے لیے بیشتر اضلاع میں ضلعی حُکام کی توانائیاں اور صلاحیتیں کم وبیش ڈیڑھ دو ماہ تک اسی مقصد کے لیے صرف ہوتی رہتی ہیں۔

اصول کی بات یہ ہے کہ اگر اہلِ تشیع اپنے اس طریقہ کو ضروری اور عبادت سمجھتے ہیں تو یہ ان کا مذہبی حق ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کا دائرہ ان کے گھروں اور عبادت گاہوں کی چار دیواری تک محدود رہنا ضروری ہے، پبلک مقامات اور اس طریقہ کو جائز نہ سمجھنے والوں کے گھروں، دکانوں اور عبادت گاہوں کے سامنے اس کی نمائش کا شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً کسی طرح بھی کوئی جواز نہیں ہے۔ اور اسی اصول کو مسلسل نظر انداز کرنے کی وجہ سے فسادات کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جارہا ہے۔

اس پس منظر میں روزنامہ جنگ لاہور کی ۱۱ اپریل ۱۹۹۷ء کی اشاعت میں یہ خبر نظر سے گزری کہ تحریکِ جعفریہ پاکستان کے ایک وفد نے پاکستان کے وزیر داخلہ چوہدری شجاعت حسین سے ملاقات کر کے محرم الحرام میں امن قائم رکھنے کے لیے چودہ نکاتی فارمولا پیش کیا ہے، تو خبر کو اس خیال سے توجہ کے ساتھ پڑھا کہ اہلِ تشیع کی اس نمائندہ جماعت کی قیادت نے امن کے قیام وتحفظ کے لیے ضرور متوازن تجاویز پیش کی ہوں گی۔ لیکن تفصیلی خبر پڑھ کر مایوسی ہوئی کیونکہ ”امن فارمولا“ کے نام سے پیش کی جانے والی یہ عرضداشت مطالبات کا ”ون وے ٹریفک“ نکلی جس میں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات کے حصول اور مخالفین پر پابندیوں اور قدغنوں کے مطالبات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مثلاً اس میں:

1. ایک نکتہ یہ ہے کہ ملک بھر میں تمام جلوسوں کی برآمدگی یقینی بنائی جائے۔
2. دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جلوسوں میں لاؤڈ اسپیکر کی اجازت دی جائے۔
3. تیسرا نکتہ یہ ہے کہ ہمارے نظر بند اور گرفتار رہا کیے جائیں اور مزید گرفتاریاں نہ کی جائیں۔
4. چوتھا نکتہ یہ ہے کہ علماء اور ذاکرین پر پابندیاں نہ لگائی جائیں،
5. اور پانچواں نکتہ یہ ہے کہ تھانے کی سطح پر علماء، کونسلروں اور معززین کی کمیٹیاں بنائی جائیں جو ان جلوسوں کی نگرانی کریں۔ باقی نکات بھی اسی نوعیت کے مطالبات پر مشتمل ہیں۔
6. اور لطف کی بات یہ ہے کہ ایک نکتہ میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا ہے کہ یکم محرم الحرام کو کسی اور گروہ کو جلوس نکالنے کی اجازت نہ دی جائے، جس کا مطلب یہ ہے کہ سپاہ صحابہؓ پاکستان

نے کچھ عرصہ سے یکم محرم الحرام کو ”یومِ فاروقِ اعظمؓ“ کے عنوان سے جلوسوں اور مظاہروں کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس پر پابندی لگائی جائے۔

”یومِ فاروقِ اعظمؓ“ کے عنوان سے ان جلوسوں کو ہم بھی شرعًا درست نہیں سمجھتے اور اس سلسلہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم سپاہ صحابہؓ کی قیادت کے نام مطبوعہ مکتوب میں اپنے موقف کی وضاحت کر چکے ہیں۔ لیکن اس حوالہ سے ہم تحریکِ جعفریہ کی قیادت کی ”انصاف پسندی“ کی داد دینا چاہتے ہیں کہ اپنے لیے تمام مراعات اور کھلی چھوٹ کا مطالبہ کرتے ہوئے وہ اپنے مخالفین کو ایک دن بھی جلوس نکالنے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم تحریکِ جعفریہ پاکستان کے قائدین سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ انہوں نے وزیر داخلہ کو جو عرضداشت پیش کی ہے وہ ”امن فارمولا“ نہیں بلکہ ”یکطرفہ مطالبات“ کی فہرست ہے جس سے امن کے امکانات میں نہیں بلکہ فساد اور خونریزی کے مواقع میں اضافہ ہوگا۔ اس لیے اگر وہ فی الواقع امن کے خواہاں ہیں تو یکطرفہ ٹریفک کے اس طرز عمل پر نظر ثانی کریں، مسلّمہ قانونی اور اخلاقی اصول کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی عبادات اور رسوم کو عبادت گاہوں اور گھروں کی چار دیواری کے دائرہ میں محدود کریں، اور مذہبی جلوسوں کو اپنے مخالفین کے گھروں، دکانوں اور دینی مراکز کے سامنے سے گزارنے کی ضد چھوڑ دیں۔ اس کے سوا امن کے قیام کا کوئی راستہ نہیں ہے اور امن کی یہ چابی صرف اور صرف اہل تشیع کے ہاتھ میں ہے۔

مذہبی راہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریاں

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ---اگست ۱۹۹۷ء

کچھ عرصہ سے ملک کے مختلف حصوں میں مذہبی راہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریاں تسلسل کے ساتھ جاری ہیں اور بظاہر اس کی وجہ یہ بتائی جا رہی ہے کہ سنی شیعہ تصادم کو روکنے اور دہشت گردی پر قابو پانے کے لیے ایسا کیا جا رہا ہے۔ لیکن واقفین حال کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ مذہبی طبقہ کو مرعوب کرنے اور خوفزدہ رکھنے کے لیے ہو رہا ہے کیونکہ حکومت پر امریکہ اور دیگر مغربی حکومتوں کا مسلسل دباؤ ہے کہ مذہبی قوتوں کو ایک حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے اور انہیں عملی سرگرمیوں میں مؤثر حصہ لینے کے قابل نہ رہنے دیا جائے، اور حکومت ان مغربی حکومتوں کو خوش کرنے کی غرض سے علماء کرام اور دینی کارکنوں کی وسیع تر گرفتاریوں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔

جہاں تک سنی شیعہ تصادم کے واقعات اور دہشت گردی کی بڑھتی ہوئی وارداتوں کا تعلق ہے

حکومت کے ذمہ دار حضرات بارہا تسلیم کر چکے ہیں کہ یہ بیرونی ایجنسیوں کی کارستانی ہے۔ لیکن حکومت ان بیرونی ایجنسیوں کا راستہ روکنے کی بجائے سارا غصہ دینی مدارس کے علماء اور غریب مولویوں پر نکال رہی ہے۔ اور اگر ان دونوں باتوں کو ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ ایک عالمی سازش کے تحت فرقہ وارانہ اختلافات کو تشدد کی شاہراہ پر ڈالا گیا ہے تاکہ اس کی آڑ میں اس مذہبی عنصر کو بے بس کرنے کی کاروائی کی جا سکے جو گزشتہ دو صدیوں سے قومی سیاست میں سرگرم کردار ادا کرتا چلا آرہا ہے، اور آج بھی عالمی استعمار اور اس کے گماشتوں کو چیلنج کرنے کی کسی حد تک صلاحیت رکھتا ہے۔

- ہم حکومت کے کارپردازوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اس بیرونی ہاتھ کو پکڑیں جو خود ان کے بقول ملک میں دہشت گردی اور فرقہ وارانہ تصادم کو ہوا دے رہا ہے، اور غریب مولویوں کی پکڑ دھکڑ کر کے ''نگ'' پورے کرنے کی کوشش نہ کریں۔
- اور علماء کرام سے ہماری استدعا ہے کہ وہ اس ساری صورتحال کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لیں اور قومی زندگی میں اپنے اجتماعی دینی کردار کو عالمی سازش کا شکار ہونے سے بچائیں۔

انسدادِ دہشت گردی کا قانون اور مذہبی حلقے

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ---ستمبر ۱۹۹۷ء

گزشتہ دنوں پاکستان کی قومی اسمبلی نے انسدادِ دہشت گردی کا قانون منظور کر لیا ہے جس کے تحت حکومت کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ کسی بھی علاقہ کو دہشت گردی سے متاثرہ قرار دے کر خصوصی اقدامات کر سکتی ہے، جن میں پولیس کا بلا وارنٹ گھروں میں داخل ہونا، تلاشی لینا اور بعض مواقع پر گولی مار دینے کا اختیار بھی شامل ہے۔ جبکہ فرقہ واریت پھیلانے اور دہشت گردی کی ترغیب دینے پر سات سال سے سزائے موت تک کی سزا مقرر کر دی گئی ہے۔

ملک کی مختلف دینی و سیاسی جماعتوں نے اس قانون کو ''کالا قانون'' قرار دے کر اس کی مخالفت کی ہے اور اس خدشہ کا اظہار کیا ہے کہ

- اس قانون کو سیاسی انتقام کے لیے استعمال کیا جائے گا،
- اس سے پولیس کی من مانی اور جبر و تشدد میں اضافہ ہو گا،
- اور عام شہری کے لیے خوف و ہراس کی فضا اور زیادہ ابر آلود ہو جائے گی۔

انسدادِ دہشت گردی کے اس قانون کے نفاذ کا جواز یہ پیش کیا جا رہا ہے کہ ملک میں فرقہ وارانہ تشدد اور قتل و غارت میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس پر قابو پانے کے لیے یہ سخت قانون ناگزیر ہو گیا ہے۔ لیکن اس فرقہ وارانہ تصادم اور دہشت گردی کے فروغ میں بیرونی قوتوں اور ایجنسیوں کے دخیل ہونے کے بارے میں خود حکومتی حلقوں کے اب تک اعلانات کو سامنے رکھا جائے تو یہ سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ ایک منظم سازش کے تحت فرقہ وارانہ مسلم تصادم کی فضا پیدا کی گئی ہے، اور فرقہ وارانہ قتل و غارت کا دائرہ بتدریج وسیع کیا جاتا رہا ہے، تاکہ اس قانون کے نفاذ کی راہ ہموار کی جا سکے۔

چنانچہ اس کے نتیجے میں یہ قانون نافذ ہو چکا ہے اور باخبر حلقوں کا کہنا ہے کہ اس قانون کو مذہبی حلقوں کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے، اور انہیں ایک متعیّن دائرے میں محدود رکھنے کے اس پروگرام پر عملدرآمد کے لیے ایک کارآمد ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے گا، جس پروگرام کا کچھ عرصہ سے عالمی سطح پر مسلسل اظہار کیا جا رہا ہے۔

ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ حکومت کے ذمہ دار افراد فرقہ وارانہ تشدد اور دہشت گردی کے بارے میں تسلسل کے ساتھ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس میں بیرونی طاقتیں اور ایجنسیاں ملوث ہیں، لیکن حکومت ان کا راستہ روکنے کی بجائے ملک کے مذہبی حلقوں کو خوف و ہراس میں رکھنے کے قوانین بنا رہی ہے۔ اور ایسے اقدامات کیے جا رہے ہیں جن کا مقصد دینی مراکز کی خود مختاری اور مذہبی حلقوں کی آزادی کو محدود اور کنٹرول کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے اس خدشہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب کچھ ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ہو رہا ہے اور مذہبی حلقوں کو ایک خاص حصار میں محصور کر دینے کے لیے عالمی پروگرام پر بہر حال عمل کرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے۔

اس پس منظر میں ہم ملک کی مذہبی جماعتوں اور دینی شخصیات سے یہ گزارش کریں گے کہ وہ اس صورتحال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں اور اپنے تحفظات و ترجیحات اور اہداف و مقاصد کے حوالے سے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنے کی کوشش کریں۔

”تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ“ سے ”تحریکِ جعفریہ“

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۱۹۹۸ء

روزنامہ نوائے وقت اسلام آباد نے ۱۲ فروری ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں تحریک جعفریہ پاکستان کے سربراہ ساجد علی نقوی صاحب کا ایک مفصل انٹرویو شائع کیا ہے جس میں انہوں نے دیگر باتوں کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ ہمارے بارے میں یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ ہم پاکستان میں فقہ جعفریہ کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں، کیونکہ ہمارا یہ موقف نہیں ہے اور ہم نے اسی لیے اپنی جماعت کا نام ”تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ“ سے تبدیل کر کے ”تحریک جعفریہ“ رکھ لیا ہے۔

نقوی صاحب دراصل پاکستان میں اہلِ تشیع کے جداگانہ تشخص اور حیثیت کے لیے شیعہ جماعتوں کے مسلسل مطالبات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تلخ صورتحال کی ذمہ داری سے پیچھے چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں لیکن اب شاید ایسا ممکن نہیں رہا، کیونکہ شیعہ علیحدگی پسندی اور اس کے اسی درجہ کے شدت پسندانہ ردعمل کی فصل نہ صرف پک چکی ہے بلکہ پوری قوم اس کے تلخ ثمرات سمیٹنے پر مجبور ہے۔

سید محمد دہلوی صاحبؒ اور مولانا محمد علی جالندھریؒ

نقوی صاحب اس میدان میں نوواردہیں اس لیے شاید ان کے علم میں نہ ہو البتہ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مرحوم صدر ایوب خان کے دور میں سید محمد دہلوی صاحبؒ کی سربراہی میں جداگانہ شیعہ حقوق کے لیے ملک بھر میں ایک مہم چلی تھی جس میں اہل تشیع کے لیے تعلیمی نصاب، اوقاف اور دیگر امور میں علیحدہ انتظامات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کے ردعمل میں اہل سنت کی مختلف جماعتوں کی ایک کانفرنس لاہور کے باغ بیرونی موچی دروازہ میں منعقد ہوئی تھی، اور اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے تحریکِ ختمِ نبوت کے راہنما حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ نے اہل تشیع کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اجتماعی دھارے سے علیحدگی کا راستہ اختیار نہ کریں کیونکہ اس کے نتائج کو سمیٹنا ان کے بس میں نہیں ہوگا۔ اس موقع پر انہوں نے فرمایا تھا کہ

> ”عجیب بات ہے کہ قادیانیوں کو ہم الگ کرنا چاہتے ہیں مگر وہ الگ ہونے کو تیار نہیں ہیں، اور تمہیں ہم ساتھ رکھنا چاہتے ہیں مگر تم علیحدگی کے لیے بے تاب نظر آتے

ہو۔“

اس موقع پر مولانا جالندھریؒ نے یہ بھی کہا تھا کہ

”علیحدگی صرف الفاظ کا نام نہیں، اس کے کچھ منطقی نتائج بھی ہیں جو بہر حال قبول کرنا ہوں گے۔ اگر علیحدگی چاہتے ہو تو وہ صرف نصاب اور اوقاف تک محدود نہیں رہے گی بلکہ علیحدگی کی یہ تقسیم زندگی کے ہر شعبے میں ہوگی، پھر آبادی کا تناسب شمار ہوگا اور اسمبلیوں کی سیٹوں سے لے کر فوج اور سول کی ملازمتوں کے کوٹے تک ہر چیز تقسیم ہو جائے گی۔“

ممکن ہے مولانا جالندھریؒ کے الفاظ یہ نہ ہوں مگر موچی دروازے کی سُنی کانفرنس میں ان کے مفصل خطاب کا خلاصہ یہی ہے جو ہم نے عرض کر دیا ہے۔

جداگانہ شیعہ تشخص کے مطالبات

اس مرد درویش کی پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی اور جداگانہ شیعہ مطالبات کی بات بدستور آگے بڑھتی رہی،

- حتٰی کہ سکولوں میں دینیات کا نصاب سنی شیعہ بنیادوں پر الگ الگ ہو گیا،
- اور کلمہ تک الگ کر دیا گیا تاکہ نئی نسل میں باہم مل بیٹھنے کا کوئی ایک نکتہ اشتراک بھی باقی نہ رہے۔
- پھر انقلابِ ایران (۱۹۷۹ء) کے بعد بات اور آگے بڑھی، تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کے نام پر مستقل جماعت کا قیام ضروری سمجھا گیا اور فقہ جعفریہ کے نفاذ کے نعرہ پر اسلام آباد میں وفاقی سیکرٹریٹ کا محاصرہ کیا گیا۔
- اسی بنیاد پر اہلِ تشیع نے سینٹ میں مولانا سمیع الحق اور مولانا قاضی عبداللطیف کے پیش کردہ ”شریعت بل“ کی مخالفت کی اور اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کو دو متحارب قوتوں کے طور پر آمنے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔

سپاہ صحابہؓ کا شدت پسندانہ طرز عمل

ہمیں سپاہ صحابہؓ کے طریق کار سے کبھی اتفاق نہیں رہا اور ہر موقع پر ہم نے اس کا برملا اظہار کیا ہے۔ حتٰی کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم نے کئی سال قبل سپاہ صحابہؓ کے راہنماؤں کے نام مطبوعہ مکتوب میں شدت پسندانہ طرز عمل کو نقصان دہ قرار دیتے ہوئے انہیں

اس پر نظر ثانی کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ''سپاہ صحابہؓ پاکستان'' ایک ردعمل کا نام ہے جو جداگانہ شیعہ تشخص کی مسلسل محنت کے نتیجے میں نمودار ہوا اور جسے فطری طور پر کسی نہ کسی شکل میں بہر حال سامنے آنا ہی تھا۔

اس بنا پر ہم جناب ساجد علی نقوی سے گزارش کریں گے کہ اپنی جدوجہد کے تلخ نتائج کو ''تن آور درخت'' کی شکل میں سامنے دیکھ کر اب آنکھیں بند کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، حقائق کو تسلیم کریں اور تاریخ کے ریکارڈ کو درست رہنے دیں۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے اپنی جماعت کا نام تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کی بجائے تحریک جعفریہ رکھ لیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کے نام سے جماعت کے قیام کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟ اور کیا محض نام کی تبدیلی سے گزشتہ حقائق و واقعات کا تسلسل تاریخ کے اوراق سے محو ہو جائے گا؟

جبکہ ایک معروضی حقیقت یہ بھی ہے کہ نام صرف ایک دھڑے نے تبدیل کیا ہے اور تحریکِ نفاذ فقہ جعفریہ کا دوسرا دھڑا جناب حامد علی موسوی کی قیادت میں اسی پرانے نام کے ساتھ بدستور سرگرمِ عمل ہے۔

آج سنی شیعہ مسلح تصادم نے جو شکل اختیار کر لی ہے وہ ہر باشعور شخص کے لیے تکلیف دہ اور پریشان کن ہے، دونوں طرف سے سینکڑوں افراد اس کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں، بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی ہیں، اور متعدّد ملکی اور بین الاقوامی ایجنسیاں اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مبینہ طور پر اپنا ''لچ'' تل رہی ہیں۔ لیکن جہاں تک اس کی ذمہ داری کا تعلق ہے، شیعہ لیڈر شپ محض نام کی تبدیلی یا تجاہلِ عارفانہ کے اظہار کے ساتھ اس سے دامن نہیں چھڑا سکتی کیونکہ تاریخی حقائق کا تسلسل آج بھی جناب ساجد علی نقوی اور ان کے رفقاء سے یہی کہنے پر مجبور ہے کہ

اے بادِ صبا ایں ہم آوردہ تست

سنی شیعہ کشیدگی کی آڑ میں!

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳۰ مارچ ۱۹۹۸ء

ہم ایک عرصہ سے اس بات پر مسلسل زور دے رہے ہیں کہ دہشت گردی کے اسباب و عوامل، اور فرقہ وارانہ کشیدگی میں اشتعال و خانہ جنگی کا عنصر شامل ہونے کے محرکات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لیے عدالت عظمیٰ کے کسی جج کی سربراہی میں عدالتی انکوائری کمیشن تشکیل دیا جانا چاہیے جس میں فریقین اور حکومت کے ذمہ دار افراد بھی شامل ہوں، اور وہ کمیشن

صورت حال کا جائزہ لے کر اسباب و عوامل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اصلاح احوال کے لیے اقدامات بھی تجویز کرے۔

اس دہشت گردی اور اشتعال انگیز فرقہ واریت کے ہاتھوں عبادت گاہوں کا امن تباہ ہوگیا ہے، سینکڑوں افراد جن میں اعلیٰ درجہ کی علمی شخصیات بھی شامل ہیں اس کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں، اور اس میں رکاوٹ کے سردست کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے۔ یہ اشتعال انگیزی ابتدا میں سنی شیعہ حوالہ سے شروع ہوئی جس میں تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ اور سپاہ صحابہ پاکستان متحارب فریقوں کی صورت میں سامنے آئیں، پھر ان میں سپاہ محمد اور لشکر جھنگوی کے نام آئے، دونوں انتہا پسند گروپ نکلے اور مزید آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس دوران اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ اور عناصر بھی متحرک ہوگئے ور باہم قتل وقتال کا معاملہ وسیع تر ہوتا گیا۔

مسلح تصادم کے خارجی محرکات

ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس سنی شیعہ کشمکش اور مسلح تصادم میں خارجی محرکات زیادہ دخل انداز اور حاوی ہوتے جارہے ہیں۔ اب حالات اس نقطہ کے قریب پہنچ چکے ہیں جہاں دونوں اصل فریق ”بے بس آلۂ کار“ کے طور پر خارجی محرکات کے ہاتھوں استعمال ہونے کے سوا کوئی کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔ ان خارجی عوامل میں بین الاقوامی ایجنسیوں کا حوالہ تو خود حکومت کے ذمہ دار حضرات بھی دے رہے ہیں، لیکن ان کے علاوہ کچھ مقامی نوعیت کے عوامل بھی ہیں جن کے شواہد دھیرے دھیرے سامنے آرہے ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ سوسائٹی کے ایسے غنڈہ عناصر کی اچھی خاصی تعداد نے، جن کا پیشہ ہی غنڈہ گردی ہے، ان دونوں کیمپوں کو پناہ گاہ بنالیا ہے اور ان کی چھتریوں تلے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل میں انہیں بدستور آسانی محسوس ہو رہی ہے۔ ان کے علاوہ ذاتی انتقام اور خاندانی جھگڑوں کے لیے بھی اس ”شیلٹر“ کو استعمال کیا گیا ہے۔ ان سب عوامل نے مل کر فرقہ واریت کو ایک مہیب دیو کی شکل دے ڈالی ہے جسے قابو میں لانے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی۔ اس ضمن میں دو تین واقعات کا تذکرہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن سے ان عناصر کا چہرہ پہچاننے میں مدد مل سکتی ہے جو سنی شیعہ کشیدگی کی آگ کو ایندھن فراہم کرنے میں مصروف ہیں۔

دارالعلوم کورنگی کراچی کا واقعہ

ایک واقعہ تو ملک کے معروف عالمِ دین حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مہتمم دارالعلوم کورنگی

کراچی نے کچھ عرصہ قبل جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد میں ”استحکام پاکستان کانفرنس“ سے خطاب کرتے ہوئے بیان کیا۔ واقعہ یوں ہے کہ رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ ایک گاڑی دارالعلوم کورنگی کراچی کے سامنے سے گزری اور گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے دارالعلوم کے مین گیٹ پر فائرنگ کر دی جس سے ایک طالب علم شدید زخمی ہوگیا۔ اس کے تقریباً نصف گھنٹہ بعد ایک امام بارگاہ پر فائرنگ ہوئی جس سے غالباً ایک شخص جاں بحق ہوا، یہ فائرنگ بھی ایک گزرتی ہوئی گاڑی سے ہوئی تھی۔ جب پولیس نے اس گاڑی کو ٹریس کیا تو وہ ایک ہی گاڑی تھی جس کے سواروں نے دونوں جگہ فائرنگ کی تھی۔

لاہور کینٹ کے علاقہ کماہاں کا واقعہ

دوسرا واقعہ لاہور کا ہے اور اس سال عید الفطر کے دو تین روز بعد کا ہے۔ لاہور کینٹ کے علاقہ میں ”کماہاں“ نامی ایک گاؤں ہے جہاں ”مدرسہ ختم نبوت“ کے نام سے سنی دینی درسگاہ تعمیر ہو رہی ہے اور اس میں تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ مدرسہ کے بانی اور منتظم قاری غلام سرور رشیدی ایک باہمت اور مستعد نوجوان تھے جنہوں نے محنت کر کے اس درسگاہ کو آباد کیا اور اس کی تعمیر میں مصروف تھے۔ ان کا تعلق دیوبند مسلک سے تھا اور وہ عید الفطر کے دو روز بعد قتل ہوگئے۔ قریب میں ایک شیعہ کارخانہ دار سے ان کا کسی بات پر تنازعہ بھی تھا۔ اور اگر قاتل موقع پر نہ پکڑا جاتا اور جائے وقوعہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ قتل اس شیعہ کارخانہ دار پر پڑنا لازمی تھا۔ اور پھر اس علاقہ میں سنی شیعہ تصادم کی جو لہر اٹھتی اس کے نتائج کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مگر خدا کی قدرت کہ قاتل موقع پر پکڑا گیا جو خود قاری غلام سرور رشیدی شہید کا اپنا نائب تھا اور مدرسہ کے انتظام میں ان کا معاون تھا۔ اس نے قاری صاحب کو جس وقت گولی ماری اس وقت عید کی چھٹیوں کی وجہ سے مدرسہ میں صرف تین افراد موجود تھے۔ ایک شہید قاری صاحب، دوسرا وہ قاتل نائب، اور تیسرا ایک نوجوان طالب علم۔ اس شخص نے قاری صاحب کو، جو چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی، اچانک گولی ماردی جو سیدھی دل پر لگی۔ آواز سن کر دوسرے کمرے سے نوجوان طالب علم آگیا۔ قاتل نے اس کو بھی گولی مارنا چاہی مگر فائر مس ہوگیا، وہ نوجوان ہوشیار اور باہمت تھا، اس نے چھلانگ لگا کر قاتل کو بازوؤں میں جکڑ لیا اور شور مچادیا جس پر ارد گرد سے لوگ جمع ہوئے اور قاتل کو پکڑ لیا۔ ورنہ ایک دینی درسگاہ کے منتظم اور طالب علم کا قتل قریب کے شیعہ کارخانہ دار پر پڑتا اور یہ نائب خود کسی مناسب طریقہ سے ظاہر ہو کر مدرسہ کا منتظم اور کیس کا مدعی بن جاتا۔

چنیوٹ کی ایک امام بار گاہ کا واقعہ

تیسرا واقعہ چنیوٹ کا ہے۔ مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کی آبائی رہائش گاہ والی گلی میں ان کے مکان کے بالکل قریب "دربار شاہ ملنگ" کے نام سے ایک چھوٹی سی امام بار گاہ ہے، جبکہ محلہ میں شیعہ آبادی صرف دو چار گھروں پر مشتمل ہے۔ اس امام بار گاہ کے ساتھ کچھ خالی جگہ بھی ہے جہاں ایک بہت بڑا شیعہ مرکز بنانے کے لیے کویت کے کسی شخص نے کروڑوں روپے کی رقم فراہم کر دی۔ مولانا چنیوٹی اس میں رکاوٹ بن گئے کہ محلہ میں ان کے گھر کے بالکل سامنے اور مسجد کے بالکل قریب اتنا بڑا شیعہ مرکز مستقل جھگڑے کا باعث ہوگا۔ اس لیے یہ مرکز اگر ضروری ہو تو باہر کسی کھلی جگہ بنایا جائے اور محلہ کے پرامن ماحول کو خراب نہ کیا جائے۔ اس پر تنازعہ ہوا، کشیدگی خاصی بڑھی، ضلعی انتظامیہ کو درمیان میں آنا پڑا، اور بالآخر مولانا چنیوٹی اپنا موقف منوانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس پس منظر میں ۲۲ فروری کو "دربار شاہ ملنگ" کا متولی قتل ہو گیا۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہ قتل مولانا منظور احمد چنیوٹی کے کھاتے میں پڑنا تھا، اور سچی بات ہے کہ جب مجھے اس واقعہ کا علم ہوا تو بے حد پریشانی ہوئی کہ مولانا چنیوٹی بہت بڑی آزمائش میں آ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض شیعہ لیڈروں نے پریس کانفرنس کر کے مولانا منظور احمد چنیوٹی، ان کے بیٹے مولانا الیاس چنیوٹی، اور رفیق کار مولانا عبد الوارث کو اس قتل کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ان کی گرفتاری کا مطالبہ بھی کر دیا۔ مگر مولانا منظور احمد چنیوٹی کی کوئی نیکی کام آ گئی اور قاتل موقع پر پکڑا گیا جو خود شیعہ ہے اور اس کا مقتول کے ساتھ اسی دربار کی تولیت کا جھگڑا چل رہا تھا۔ اس نے متولی کو قتل کر کے بھاگنے کی کوشش کی مگر محلہ داروں نے گھیر لیا اور اسے پکڑ کر ہتھیار سمیت پولیس کے حوالے کر دیا۔ پنجاب کے ایک بڑے انتظامی افسر نے خود مولانا چنیوٹی سے کہا کہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ قاتل موقع پر پکڑا گیا ہے ورنہ یہ پھندا آپ کے گلے میں فٹ ہونا تھا۔

ان واقعات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سنی شیعہ کشیدگی کی آڑ میں ملک میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اس لیے ہم ایک بار پھر وزیر اعظم پاکستان سے گزارش کریں گے کہ ان حالات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کے لیے "اعلیٰ سطحی عدالتی انکوائری کمیشن" کے قیام میں تاخیر نہ کی جائے۔

سنی شیعہ اختلافات اور امامِ مسجدِ نبویؐ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۳۰ اپریل ۱۹۹۸ء

...... مدینہ منورہ کے محترم عالم دین اور مسجد نبوی علیٰ صاحبہا التحیۃ والسلام کے امام الشیخ علی عبد الرحمن الحذیفی کے ایک خطبہ جمعہ کی آڈیو کیسٹ سننے کا اتفاق ہوا تو خوشگوار حیرت ہوئی کہ انہوں نے بعض اہم

اور نازک مسائل پر عالمِ اسلام کے دینی حلقوں کی بے باک ترجمانی کا راستہ اختیار کیا ہے اور روایتی طریق کار سے ہٹ کر عالمِ اسلام کے زندہ مسائل کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ یہ کیسٹ مدینہ منورہ سے آنے والے ایک دوست نے ہمیں مرحمت فرمائی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ الشیخ علی الحذیفی نے یہ خطبہ ذیقعد ۱۴۱۸ھ کے پہلے جمعۃ المبارک کو مسجد نبوی میں ارشاد فرمایا۔ جبکہ ایران کے سابق صدر جناب رفسنجانی بھی مدینہ منورہ کے دورے پر آئے ہوئے تھے اور جمعۃ المبارک کے اجتماع میں شریک تھے۔ مگر مذکورہ روایت کے مطابق وہ خطبہ کے دوران ہی اٹھ کر اپنے محافظین کے ہمراہ واپس چلے گئے۔......

انہوں نے سنی شیعہ اختلافات کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ یہ اختلافات بنیادی ہیں، کیونکہ قرآن کریم کا محفوظ ہونا، صحابہ کرامؓ کا مومن ہونا، اور بالخصوص خلفاء ثلاثہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا اہل ایمان کا سرخیل ہونا ہمارے عقائد وایمان کا حصہ ہے۔ اور ام المومنین حضرت عائشہؓ کی پاک دامنی پر قرآن کریم نے شہادت دی ہے۔ اس لیے ان بزرگوں پر طعن کرنے والوں کے ساتھ ہم جمع نہیں ہوسکتے اور ایسا کرنا دینی حمیت کے منافی ہوگا۔

انہوں نے کہا کہ عالمی طاقتوں کا بنیادی مقصد ہمارے عقائد وایمان کو کمزور کرنا اور ہمیں ان سے محروم کرنا ہے۔ اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے عقائد کی حفاظت کریں اور ایمان کو مضبوط بنائیں۔ کیونکہ ایمان ہی کی قوت ہے جو ہمارے کام آئے گی اور اسی قوت کی وجہ سے ہم کفر کی یلغار کا مقابلہ کرسکیں گے۔......

سپاہ صحابہؓ کا موقف اور انصاف کے معروف تقاضے

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء

ماہ رواں کے آغاز میں سپاہ صحابہؓ کے کارکنوں نے اسلام آباد میں جو مظاہرہ کیا اس کے حوالہ سے خبر آئی تھی کہ وزیراعلیٰ پنجاب وفاقی وزیر داخلہ کی موجودگی میں سپاہ صحابہؓ کے رہنماؤں سے مذاکرات کریں گے اور اس کے لیے تاریخ کا اعلان بھی ہوگیا تھا۔ وہ تاریخ گزرے ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے مگر ابھی تک مذاکرات کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے جبکہ اس کے بعد سپاہ صحابہؓ پاکستان کے سربراہ مولانا علی شیر حیدری کو تین سال قید کی سزا سنائی جاچکی ہے اور سپاہ صحابہؓ کی قیادت نئے سرے سے مظاہروں کے پروگرام بنارہی ہے۔

سپاہ صحابہؓ پاکستان کا موقف

سپاہ صحابہؓ پاکستان کے قائدین کے مقدمات کی پیروی کرنے والی ٹیم ان دنوں مختلف رہنماؤں سے ملاقاتیں کر رہی ہے، یہ حضرات گوجرانوالہ بھی آئے اور راقم الحروف سے ملے، انہوں نے اس سلسلہ میں جو موقف بیان کیا اس سے قارئین کو آگاہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سپاہ صحابہؓ کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے اور ملک بھر میں ان کے رہنماؤں اور کارکنوں کو بلاوجہ مقدمات میں الجھایا جا رہا ہے جو ان کے بقول اکثر انتقامی طور پر درج کیے گئے ہیں اور ان مقدمات کی آڑ میں انہیں یکطرفہ طور پر انتقامی کاروائی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں پنجاب کے وزیراعلیٰ شہباز شریف کا بطور خاص ذکر کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کی ذاتی دلچسپی کے نتیجے میں انہی کی راہنمائی میں ہو رہا ہے۔ اس دعوے کے لیے ان کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح کے مقدمات سپاہ صحابہؓ کے رہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف درج ہیں اسی طرح کے مقدمات ان کی روایتی حریف جماعت تحریک جعفریہ کے رہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف بھی موجود ہیں لیکن ان مقدمات پر کاروائی صرف سپاہ صحابہؓ کے ارکان کے خلاف ہو رہی ہے۔ وہ اس کی مثال یہ دیتے ہیں کہ جس نوعیت کے مقدمات میں سپاہ صحابہؓ کے مرکزی رہنما اور صوبائی اسمبلی کے رکن مولانا اعظم طارق مسلسل زیر حراست ہیں اور حکومت انہیں ایک ممتاز مذہبی رہنما اور عوام کے منتخب نمائندے کے طور پر کوئی ریلیف دینے کے لیے تیار نہیں ہے اسی نوعیت کے مقدمات تحریک جعفریہ کے سربراہ علامہ ساجد نقوی کے خلاف بھی مختلف تھانوں میں ریکارڈ پر موجود ہیں لیکن وہ نہ صرف آزاد ہیں بلکہ وزیراعظم کے پہلو میں بیٹھتے ہیں۔ سپاہ صحابہؓ کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ یہ سراسر جانبداری ہے اور یکطرفہ ریاستی جبر ہے جس کا مقصد سپاہ صحابہؓ کو ہر حالت میں کچل دینے کے سوا کچھ نہیں ہے اور اس طرح ان کے انسانی حقوق اور شہری آزادیاں مسلسل پامال ہو رہی ہیں جس پر تمام انصاف پسند لوگوں کو آواز بلند کرنی چاہیے۔

یہ ضروری نہیں کہ اس موقف سے میں بھی مکمل اتفاق کرتا ہوں لیکن اس موقف کو سننا اور اسے انصاف کے معروف اصولوں پر پرکھنا نہ صرف حکومت بلکہ ملک کے ہر شہری کی ذمہ داری ہے اور اس حوالہ سے ہماری تجویز ایک عرصہ سے قومی پریس کے ریکارڈ پر ہے کہ ان معاملات کا عدالتی سطح پر جائزہ لینا ضروری ہے اور اس کے لیے سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں ایک عدالتی کمیشن کا تقرر عمل میں لایا جانا چاہیے۔

وزیراعظم کے نام خط اور اس کا جواب

اس سلسلہ میں عید الاضحیٰ سے ایک ہفتہ قبل راقم الحروف نے وزیراعظم کو مندرجہ ذیل عریضہ ارسال کیا تھا۔

”آنجناب کو ملک کے ایک اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلا رہا ہوں جس کا تعلق بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور فرقہ واریت سے ہے اور جس نے عبادت گاہوں تک کا امن تہہ و بالا کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اس مسئلہ سے نمٹنے کے لیے ابھی تک روایتی طریق کار پر عمل کیا جا رہا ہے کہ اگر شیعہ افراد دہشت گردی کا شکار ہوں تو سنی علماء اور کارکنوں کو گرفتار کر لیا جاتا ہے لیکن اگر قتل ہونے والے سنی ہوں تو علاقے کے شیعہ کارکنوں کی شامت آجاتی ہے، یہ طرز عمل انتہائی فرسودہ اور غیر منصفانہ ہے جس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لیے میں یہ تجویز پیش کر رہا ہوں کہ:

- سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں عدالتی انکوائری کمیشن قائم کیا جائے جو فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ اور دہشت گردی کے اسباب و محرکات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ملک بھر میں اس حوالہ سے درج مقدمات پر نظر ثانی کرے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے کیے جا سکیں۔
- اس کے متبادل دوسری تجویز یہ ہے کہ حکومت فوری طور پر سہ فریقی کانفرنس طلب کرے جس میں متحارب فریقوں کے ذمہ دار رہنماؤں کے ساتھ حکومت کے ذمہ دار افراد بیٹھیں اور اس مسئلہ کا معقول حل نکالا جائے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی گزارش ہے کہ مولانا علی شیر حیدری اور مولانا محمد اعظم طارق سمیت ان سب علماء کرام اور کارکنوں کو بلا تاخیر رہا کر دیا جائے جو کسی عدالتی کاروائی کے بغیر محض انتقامی پالیسیوں کا شکار ہیں اور ملک بھر کی مختلف جیلوں میں بند ہیں۔ عید الاضحیٰ سے پہلے اس کے لیے آنجناب ذاتی اور فوری توجہ فرماتے ہوئے ان حضرات کی رہائی کے احکامات صادر فرمائیں تاکہ یہ لوگ عید اپنے گھروں میں کر سکیں۔“

اس عریضہ کا جواب مئی کے پہلے ہفتہ میں وزیراعظم کے آفس کی طرف سے یہ موصول ہوا:

”عزت مآب جناب وزیراعظم صاحب کے نام آپ کا خط موصول ہوا۔ نیک تمناؤں اور گراں قدر خیالات و احساسات کے لیے وہ آپ کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ پاکستان کی تعمیر و ترقی کے لیے عوام کے خیالات و آراء پر مبنی

تجاویز سے کماحقہ استفادہ کریں تاکہ ملکی پالیسیوں کو ان کی خواہشات کے مطابق ڈھالا جا سکے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمیں عوام کی توقعات پر پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے۔“

وزیراعظم آفس کی جانب سے موصول ہونے والے اس جواب میں راقم الحروف کے عریضہ میں پیش کی گئی تجاویز کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا کہ وزیراعظم کا نقطۂ نظر ان کے بارے میں کیا ہے اور وہ ان کے حوالہ سے کیا پیش رفت کر رہے ہیں؟ حالانکہ اصولاً اور اخلاقاً اس بارے میں جوابی خط میں کچھ نہ کچھ ضرور ذکر ہونا چاہیے تھا۔

اعلیٰ سطحی عدالتی کمیشن کے قیام کی ضرورت

خیر اس سے قطع نظر اس گزارش کا اعادہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ اور اسباب و عوامل اور ملک بھر میں سنی اور شیعہ راہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف درج مقدمات کا اعلیٰ سطح پر جائزہ لینا اب ناگزیر ہو گیا ہے اور یہ ”اعلیٰ سطحی عدالتی کمیشن“ کے قیام کی صورت میں ہی ممکن ہے۔

ان دو مسائل کے ساتھ ایک اور مسئلہ کا اضافہ بھی ضروری ہے کہ محرم الحرام میں امن قائم رکھنے کا سوال ہر سال انتظامیہ کے لیے دردِ سر بن جاتا ہے، عید الاضحیٰ گزرتے ہی متعلقہ اضلاع میں انتظامیہ اس سلسلہ میں سرگرمیوں کا آغاز کر دیتی ہے جو کم و بیش ایک ماہ تک مسلسل جاری رہتی ہیں۔ اور اس دوران ہفتہ عشرہ کا وقفہ ایسا بھی آتا ہے کہ بہت سے اضلاع کے حکام اور سرکاری شعبے معمول کا کوئی کام وقت پر نہیں کر پاتے اور یوں انتظامی مشینری معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے اور اس کے اسباب کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا اور انہیں دور کر کے ملک کی انتظامی مشینری کو اس مستقل دردِ سر سے نجات دلانا ضروری ہے۔ اس لیے ہم وزیراعظم پاکستان سے ایک بار پھر استدعا کریں گے کہ وہ اس سلسلہ میں انصاف پسندی کے معروف تقاضے پورے کرنے اور حقیقت پسندی کا راستہ اختیار کرنے کا حوصلہ کر ہی ڈالیں کیونکہ حقیقی اور پائیدار امن کا راستہ اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔

سپاہ صحابہؓ کے مظاہرے اور مطالبات

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جون ۱۹۹۸ء

روزنامہ جنگ لاہور ۱۴ مئی ۱۹۹۸ء کے مطابق سپاہ صحابہؓ کے قائم مقام سربراہ خلیفہ عبد القیوم نے اپنے قائدین کی رہائی کے لیے ملک بھر میں دوبارہ مظاہرے شروع کرنے اور ۶ جون کو مسجد شہداء لاہور میں کل پاکستان احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے۔

محرم الحرام کے آغاز میں سپاہ صحابہؓ کے کارکنوں نے وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں پارلیمنٹ کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا تھا اور اس موقع پر حکومت کے ذمہ دار حضرات کے ساتھ گفتگو میں یہ طے پایا تھا کہ وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف وفاقی وزیر داخلہ کی موجودگی میں سپاہ صحابہؓ کے مرکزی راہنماؤں سے مذاکرات کریں گے اور ان کی شکایات کا جائزہ لیں گے۔ ان مذاکرات کے لیے اخبارات میں ایک تاریخ کا بھی اعلان ہوا تھا جو گزر چکی ہے، مگر مذاکرات کے کہیں دور دور تک آثار دکھائی نہیں دیتے۔

سپاہ صحابہؓ کے راہنماؤں کے ایک وفد نے گزشتہ روز گوجرانوالہ میں راقم الحروف سے بھی ملاقات کی اور اپنے موقف اور مطالبات سے آگاہ کیا، جس کے مطابق انہیں شکایت یہ ہے کہ انہیں یکطرفہ طور پر ریاستی جبر اور انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور یہ سب کچھ پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی راہنمائی میں ان کی ذاتی دلچسپی کے باعث ہو رہا ہے۔ سپاہ صحابہؓ کے راہنماؤں کا کہنا ہے کہ جس نوعیت کے مقدمات ان کے خلاف درج ہیں، ان کے مخالف فریق کے خلاف بھی اسی قسم کے مقدمات ملک بھر میں موجود ہیں، لیکن کارروائی صرف سپاہ صحابہؓ کے رہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف ہو رہی ہے۔ ان کے بقول سپاہ صحابہؓ کے راہنما اور صوبائی اسمبلی کے رکن مولانا محمد اعظم طارق جس نوعیت کے مقدمات میں ایک عرصہ سے زیر حراست ہیں، تحریکِ جعفریہ کے سربراہ علامہ ساجد علی نقوی کے خلاف اسی نوعیت کے مقدمات مختلف تھانوں میں ریکارڈ پر موجود ہیں، مگر وہ نہ صرف آزاد ہیں بلکہ بہت سے اجلاسوں میں وزیر اعظم پاکستان کے پہلو میں بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ سپاہ صحابہؓ کے راہنماؤں کا کہنا ہے کہ ان کے کارکنوں کے خلاف ملک بھر میں درج مقدمات میں سے بیشتر انتقامی اور معاندانہ ہیں، اس لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرے اور سپاہ صحابہؓ کو ہر حال میں کچل دینے کی پالیسی تبدیل کر کے انصاف کے تقاضے پورے کرے۔

سپاہ صحابہؓ کے مذکورہ موقف کے حوالے سے ہماری گزارش ہے کہ اس کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اور اس کا معروف طریقہ یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں ایک عدالتی کمیشن قائم کیا جائے جو سُنی شیعہ کشیدگی میں اضافے کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ملک بھر میں سپاہ صحابہؓ اور تحریکِ جعفریہ کے راہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف درج مقدمات کا جائزہ لے اور محض مخالفت اور ضد کی بنیاد پر درج کیے گئے مقدمات کو خارج کر کے دونوں فریقوں کو انصاف مہیا کیا جائے۔ اگر حکومت ایسا نہیں کرتی تو سپاہ صحابہؓ کی قیادت کے اس الزام کو رد کرنا مشکل ہو جائے گا کہ حکومت طے شدہ پالیسی کے تحت سپاہ صحابہؓ کے راہنماؤں اور کارکنوں کو انتقامی کارروائیوں کا

نشانہ بنا رہی ہے۔

باغِ فدک اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ جون ۱۹۹۸ء

......فدک نامی باغ غزوہ خیبر میں مسلمانوں کی فتح کے بعد بطور غنیمت مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تھا، بہت بڑا باغ تھا اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عام سپاہیوں میں تقسیم کرنے کی بجائے بیت المال کی تحویل میں رہنے دیا تھا اور اس کی پیداوار آپؐ کی ازواج مطہرات اور اہل خاندان کے اخراجات کے لیے مخصوص کر دی تھی۔ جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد آپ کی دختر حضرت سیدہ فاطمہؓ نے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مطالبہ کیا کہ یہ باغ میرے والد محترمؐ کی ملکیت ہے، اس لیے بطور وراثت انہیں دے دیا جائے۔ مگر حضرت صدیق اکبرؓ کا موقف یہ تھا کہ یہ باغ حضورؐ کی نہیں بلکہ بیت المال کی ملکیت تھا اور اس کی پیداوار آپؐ کے خاندان کے اخراجات کے لیے مخصوص کی گئی تھی، اس لیے اسے بطور وراثت حضرت فاطمہؓ کو نہیں دیا جا سکتا، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا ایک فرد بھی جب تک زندہ ہے اس کے اخراجات اسی باغ کی پیداوار سے دیے جاتے رہیں گے۔ چنانچہ خلفاء راشدینؓ کے دور میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا۔

یہ باغ فدک اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان چلے آنے والے اختلافات میں سے ایک بڑا اختلافی مسئلہ بھی بنا ہوا ہے جس پر دونوں طرف سے بیسیوں کتابیں لکھی گئی ہیں اور کئی مباحثے اور مناظرے ہو چکے ہیں، مگر اس اختلافی بحث و مباحثہ سے قطع نظر عملاً ایسا ہوا کہ بنو امیہ کی حکومت کے دور میں حکمران خاندان کے لوگوں نے جہاں بیت المال کی دیگر اشیاء پر قبضہ جما لیا وہاں یہ باغ بھی شاہی خاندان کی تحویل میں آ گیا تھا اور وراثت میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی ملکیت میں منتقل ہو گیا۔ خلافت سنبھالنے تک ان کے ذاتی اور گھریلو اخراجات کی کفالت اسی باغ کی پیداوار سے ہوتی تھی، لیکن خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد جب انہوں نے بیت المال (قومی خزانے) کے اثاثوں پر قابض لوگوں سے یہ اثاثے واپس لینے کے لیے زرعی اور مالی اصلاحات کا اعلان کیا تو سب سے پہلے باغ فدک بیت المال کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ

> ”جس باغ پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حقِ ملکیت تسلیم نہیں ہوا تھا اسے اپنے قبضہ میں رکھنے کا مجھے کیا حق ہے“۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس باغ پر خود قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ انہیں وراثت میں ملا تھا، اس لیے

ملک کی تبدیلی کے ساتھ احکام کی تبدیلی کے جس فقہی ضابطے کا آج حوالہ دیا جا رہا ہے وہ ان کا بھی اسی طرح ساتھ دے رہا تھا جس طرح اس سے آج کے جاگیرداروں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن ان کے سامنے اجتماعی مفاد تھا، ملک کا نظام تھا اور اصلاحات کے ناگزیر تقاضے تھے، اس لیے انہوں نے کسی تامل کے بغیر باغ بیت المال کو واپس کر دیا اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے باقی زندگی فقر و فاقہ اور تنگی ترشی کے ساتھ گزار دی۔

اس لیے ہم گزارش کریں گے کہ اصلاحات کے باب میں تو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے اسوہ کو ہی سامنے رکھا جائے کیونکہ جب ہم انہیں "عمر ثانی" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ان کے دور خلافت کو خلافت راشدہؓ کا تتمہ قرار دیتے ہیں تو اجتماعی نظام میں اصلاحات کے لیے ان کی پیروی میں بھی ہمیں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔......

ایرانی سفیر کے طالبان حکومت سے چار مطالبات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۷ ستمبر ۱۹۹۸ء

پاکستان میں ایران کے سفیر جناب مہدی اخوند زادہ نے امریکی عزائم کو پاکستان، ایران اور افغانستان کے لیے یکساں طور پر خطرناک قرار دیتے ہوئے تینوں ممالک پر زور دیا ہے کہ وہ مشترکہ حکمت عملی اختیار کریں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے پاکستان اور ایران کے درمیان باہمی مفاہمت و تعاون کی ضرورت و اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے افغانستان میں طالبان کی حکومت کے ساتھ بہتر تعلقات کے لیے چار تجاویز پیش کی ہیں۔

ہمیں سفیر محترم کی ان تینوں باتوں سے اتفاق ہے۔ اول یہ کہ فی الواقع امریکی عزائم ان تینوں ممالک کے لیے یکساں خطرہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، دوم یہ کہ تینوں ممالک کو اس سلسلہ میں مشترکہ حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے، اور سوم یہ کہ پاکستان اور ایران کے درمیان اس بارے میں زیادہ سے زیادہ باہمی مفاہمت اور تعاون کی ضرورت ہے۔ مگر طالبان کی حکومت کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے انہوں نے جو مطالبات اور تجاویز پیش کی ہیں وہ ہمارے نزدیک بحث طلب ہیں اور ہم اس سلسلہ میں کچھ معروضات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱)ایرانی سفارتکاروں کو رہا کیا جائے

مثلاً ایران کے سفیر محترم نے پہلا مطالبہ یہ کیا ہے کہ طالبان کی حکومت ان ایرانی سفارت کاروں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دے جوان کے بقول مزار شریف پر قبضہ کے موقع پر گرفتار کیے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں جہاں تک ہماری معلومات ہیں طالبان کی حکومت کا موقف یہ ہے کہ مزار شریف پر قبضہ کے موقع پر ایرانی قونصل خانے میں کوئی شخص موجود نہیں تھا اور نہ ہی وہاں سے کسی کو گرفتار کیا گیا ہے۔ تاہم دوسرے مقامات سے کچھ ایرانی شہری حراست میں لیے گئے ہیں اور ان کے ساتھ اسلحہ کی ایک بڑی مقدار بھی تحویل میں لی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ طالبان کے خلاف جنگ میں ان کے مخالف شمالی اتحاد کے ساتھی تھے اور وہ جنگی قیدی ہیں۔ ہم سفارت کاروں کی غیر مشروط رہائی کے مطالبہ کی تائید کرتے ہیں لیکن اگر طالبان کا یہ موقف درست ہے تو جنگی قیدیوں کو سفارت کار قرار دے کر ان کی غیر مشروط رہائی کا مطالبہ کرنا سفیر محترم کو زیب نہیں دیتا اور نہ ہی اس کی حمایت کی جا سکتی ہے۔

(۲)شمالی اتحاد کو حکومت میں شریک کیا جائے

جناب مہدی اخوند زادہ نے طالبان کی حکومت سے دوسرا مطالبہ یہ کیا ہے کہ شمالی اتحاد کی جماعتوں کو افغانستان کی حکومت میں شریک کیا جائے۔ یہ در اصل اس مطالبہ کا اعادہ ہے جو دنیا کی مختلف حکومتوں کی طرف سے افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت کے قیام کے عنوان سے ایک عرصہ سے کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ مطالبہ بھی قرین انصاف نہیں ہے۔ اول اس لیے کہ شمالی اتحاد میں شامل انہی جماعتوں کی باہمی خانہ جنگی اور اس کے نتیجے میں وسیع پیمانے پر قتل و غارت اور بدامنی کے ردعمل میں ہی طالبان کی تحریک اٹھی تھی۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ طالبان نے ان جماعتوں کی پیدا کردہ بدامنی اور غارت گری سے نجات دلا کر افغان عوام کو امن فراہم کیا ہے۔ اس لیے اگر طالبان ان کی جماعتوں کو اپنے ساتھ اقتدار میں شریک کر لیتے ہیں تو خود ان کے اپنے وجود کا جواز ختم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اس دعوے کی اخلاقی بنیادوں سے محروم ہو جاتے ہیں کہ وہ ان لیڈروں کی اقتدار کی جنگ سے افغان عوام کو نجات دلانے کے لیے میدان میں آئے ہیں۔ دوم اس لیے کہ اب تو میدان جنگ میں بات بہت آگے بڑھ چکی ہے اور شمالی اتحاد کے لیڈر سمٹ سمٹا کر ایک محدود خطہ میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس لیے انہیں اقتدار میں شریک کرنے کی تجویز ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص حکومت ایران سے مطالبہ کرے کہ چونکہ مسعود رجائی کی خلق پارٹی اور آیت اللہ شریعت مدار کے حامی علماء بھی ایرانی عوام ہی

کے ایک معتد بہ حصے کی نمائندگی کرتے ہیں اس لیے ایران میں وسیع البنیاد حکومت کے قیام کے لیے انہیں بھی اقتدار میں شریک کیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ ایران کے سفیر محترم اس تجویز پر لاحول ولا قوۃ پڑھنے کے سوا کوئی اور تبصرہ نہیں کر سکیں گے۔

(۳) داخلی معاملات میں متوازن طرز عمل اختیار کیا جائے

ایرانی سفیر کا تیسرا مطالبہ یہ ہے کہ طالبان کی حکومت افغانستان کے داخلی معاملات میں ان کے بقول سخت گیر اور انتہا پسندانہ طرز عمل کو ختم کر کے متوازن پالیسیاں اختیار کرے۔ طالبان کی داخلی پالیسیوں کے بارے میں اس سے پہلے بھی بعض ایرانی لیڈروں کا یہ تبصرہ سامنے آ چکا ہے کہ طالبان اسلام کی انتہا پسندانہ تعبیر پیش کر رہے ہیں اور اسلام کی تصویر کو خراب کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی توجہ طلب ہے اس لیے کہ خود ایران کے مذہبی رہنماؤں نے اپنے ملک میں اسلام کی جس تعبیر کو اختیار کیا ہے وہ عالم اسلام کے اجتماعی رجحانات سے مطابقت نہیں رکھتی اور اس کی بنیاد ایران کی اکثریتی آبادی کے فقہی مذہب اثنا عشری پر ہے۔ حتیٰ کہ ایرانی دستور کی بنیاد ”ولایت فقیہ“ کے جس فلسفے پر ہے وہ خالصتاً فرقہ وارانہ اور انتہا پسندانہ ہے جو موجودہ عالمی رجحانات تو کجا، ملت اسلامیہ کی اکثریت کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہے۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود چونکہ وہ ایرانی باشندوں کی اکثریت کے فقہی مذہب کی رو سے ضروری ہے اس لیے اس پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ اور ایرانی قوم کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا ہے کہ وہ اسلام کی تعبیر اور اسلامی قوانین کے نفاذ میں اپنے اکثریتی مذہب کو بنیاد بنائے، وہ خواہ ان کے علاوہ مسلمانوں کے کسی گروہ کے لیے بھی قابل قبول نہ ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ اسی اصول پر ایرانی لیڈروں کو افغان عوام کا بھی یہ حق تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ اپنے ملک میں اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ میں اسی تعبیر کو اختیار کریں جو ان کی اکثریتی آبادی کے فقہی مذہب سے مطابقت رکھتی ہے۔ اور جس طرح ایران میں دینی معاملات کو طے کرنے میں وہاں کی اکثریتی آبادی کے فقہی مذہب کے علماء فائنل اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں اسی طرح افغانستان میں بھی افغان علماء کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ اپنے فقہی اصولوں کے مطابق دینی اصول و احکام طے کریں۔ اس میں کوئی الجھاؤ کی بات نہیں اور یہ بالکل سادہ اور منطقی اصول ہے کہ ہر مسلم ملک میں اسلامی احکام و قوانین کی تعبیر و تشریح وہاں کی اکثریتی فقہی مذہب کے مطابق ہو اور اس میں اسی فقہ کے علماء کو اتھارٹی تسلیم کیا جائے۔

جہاں تک اسلام کی نیک نامی یا بدنامی کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مقابلے کا میدان ہے، اگر طالبان کی حکومت اپنے دعوؤں کے مطابق افغان عوام کو امن اور خوشحالی کی منزل سے ہمکنار کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہی وقتی طور پر بدنامی کا

باعث بننے والی سخت پالیسیاں اپنے نتائج کے لحاظ سے باقی دنیا کے لیے بھی قابل تقلید بن سکتی ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ طالبان اپنے دعووں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تو تاریخ کے عجائب گھر میں ابھی بہت سے خانے خالی ہیں کسی ایک میں وہ بھی فٹ ہوجائیں گے۔ لیکن اس کا فیصلہ ہونے میں ابھی کچھ وقت درکار ہے جس کا سب کو حوصلے کے ساتھ انتظار کرنا چاہیے۔

(۴) بین الاقوامی ضابطوں کو قبول کیا جائے

جناب مہدی اخوند زادہ نے طالبان کی حکومت سے چوتھا مطالبہ یہ کیا ہے کہ وہ بین الاقوامی اصولوں اور ضابطوں کو قبول کریں اور ان کی پابندی کریں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں ایرانی سفیر کے اس مطالبے پر سب سے زیادہ تعجب ہوا ہے کیونکہ ایک نظریاتی مذہبی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے ان سے کسی بھی درجے میں اس مطالبے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس لیے کہ وہ مروجہ بین الاقوامی اصولوں اور ضابطوں کے فریم ورک کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی بنیاد مغرب کے سیکولر فلسفے اور اقوام متحدہ کے چارٹر پر ہے جسے اسلامی تعلیمات قبول نہیں کرتیں۔ اور کسی بھی ملک میں اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کا دعویٰ رکھنے والی حکومت کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ موجودہ بین الاقوامی ضابطوں اور اصولوں کی پابندی قبول کرتے ہوئے اسلام کی مکمل عملداری کے پروگرام پر عمل کر سکے۔ اور اگر کوئی مسلم حکومت اس کا دعویٰ رکھتی ہے تو وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ضرور منافقت کر رہی ہے۔ اب تو اس سلسلہ میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا کہ موجودہ عالمی اسٹرکچر اور اسلام آمنے سامنے کھڑے ہیں اور اگلی صدی کی قیادت سنبھالنے کے لیے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ ان میں مفاہمت و مصالحت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اور اب یہ فیصلہ میدان میں ہی ہوگا کہ اگلی صدی میں انسانی سوسائٹی کی قیادت اسلام اور موجودہ عالمی نظام میں سے کس نے کرنی ہے۔ اس لیے اگر اس فضا میں کوئی شخص کسی اسلامی حکومت یا تحریک کو مروجہ بین الاقوامی ضابطوں اور اصولوں کی پابندی کی تلقین کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ میدان جنگ میں اسلام کو کفر کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا مشورہ دے رہا ہو۔

جناب مہدی اخوندزادہ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک کی اسلامی تحریکات کی طالبان کے ساتھ دلچسپی اور ہمدردی صرف اس وجہ سے ہے کہ طالبان کی حکومت اپنے ملک میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کی دعوے دار ہے اور اس کی راہ میں رکاوٹ بننے والے بین الاقوامی ضابطوں اور قوانین کو قبول نہیں کر رہی۔ گزشتہ سال لندن میں چند اسلامی تحریکات کے ایک اجلاس میں ایک ممتاز عرب دانشور نے کہا کہ ہم تو صرف اس بات کو دیکھ رہے ہیں کہ طالبان موجودہ عالمی سسٹم کے فریم

ورک کو قبول کر کے اسلام کو اس کے تابع کرتے ہیں یا اسلام کو اس کے مقابل ایک مستقل سسٹم کے طور پر پیش کر کے ایک نئے عالمی دور کا نقطۂ آغاز بنتے ہیں۔ کیونکہ یہی اصل ٹرننگ پوائنٹ ہے جہاں سے اسلام کی طرف انسانی معاشرہ کی واپسی کا سفر شروع ہوگا۔ اور کیا بعید کہ قدرت نے یہ سعادت طالبان کے حصے میں ہی لکھ رکھی ہو۔

اس لیے ہم جناب مہدی اخوند زادہ اور ایرانی حکومت کے ذمہ دار حضرات سے گزارش کریں گے کہ وہ معروضی حقائق کو نظر انداز نہ کریں اور طالبان کی اسلامی حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی بجائے اسے سپورٹ کریں۔ اور اس خطہ بلکہ پورے عالمِ اسلام میں امریکہ کے خطرناک عزائم کو ناکام بنانے کے لیے فرقہ وارانہ ترجیحات اور تحفظات سے بالاتر ہو کر باہمی تعاون کو فروغ دیں، کیونکہ موجودہ عالمی تناظر میں امریکہ کو شکست دینے اور اس کے اسلام دشمن عزائم کو خاک میں ملانے کا واحد راستہ یہی ہے۔

اسلام کا نظامِ حکومت اور رائے عامہ

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۱ نومبر ۱۹۹۸ء

روزنامہ اوصاف کے مدیر محترم نے مالاکنڈ ڈویژن کی تحریک نفاذِ شریعت کے سربراہ مولانا صوفی محمد کے اس بیان کو اپنے ایک ادارتی شذرہ میں موضوع بحث بنایا ہے جس میں انہوں نے جمہوریت کو مغرب کی مسلط کردہ لعنت قرار دیتے ہوئے اس سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت کا مروجہ نظام جس میں علامہ اقبالؒ کے نزدیک "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے" مغرب ہی کا عطیہ ہے اور یہ نظام اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت اب اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ تاریخ کو پیچھے مڑ کر جمہوری نظام کے نفع و نقصان کے تناسب کا اندازہ کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے اور اس کے مداح بھی کبھی کبھی اس کی فریب کاریوں کا تذکرہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس سے قطع نظر ہم آج کی محفل میں جمہوریت اور اسلام کے حوالے سے ایک "کنفیوژن" کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو بسا اوقات ادھوری بات کی وجہ سے عام ذہنوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور روزنامہ اوصاف کے مدیر محترم نے بھی غالباً اسی کنفیوژن کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"جمہوریت" اپنے لغوی معنوں میں

سوال یہ ہے کہ اگر اسلام جمہوری طرز حکومت کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کے اپنے نظام میں حکومت

کی تشکیل کا اصول کیا ہے؟ اور اگر اسلام حکومت کی تشکیل اور اسے چلانے میں رائے عامہ کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور عام لوگوں کے ساتھ مشاورت کو ضروری قرار دیتا ہے تو اسے جمہوریت قرار دینے میں کیا مضائقہ ہے؟

جہاں تک اسلام کے نظام مشاورت کو جمہوریت قرار دینے سے گریز کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ بہت سے مسلم دانشوروں کا موقف یہ ہے کہ ''جمہوریت'' اپنے لغوی معنوں کے لحاظ سے اسلام کے لیے کوئی ناپسندیدہ یا اجنبی چیز نہیں ہے اور مروجہ جمہوریت کی پیدائش سے صدیوں پہلے مسلم علماء اور محققین کی تصانیف میں ''جمہور'' کی اصطلاح مسلسل استعمال ہوتی چلی آرہی ہے۔ لیکن جب سے یہ لفظ اپنے لغوی مفہوم سے آگے بڑھ کر ایک مخصوص نظام کے لیے متعیّن ہوگیا ہے اور اس کے زبان پر یا تحریر میں آتے ہی ایک مخصوص سسٹم کا تصور ذہنوں میں آنے لگا ہے تو اس کے بعد اس لفظ کے لغوی معنوں کا کوئی اعتبار نہیں رہا۔ اور یہ معاملہ صرف اس لفظ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جو لفظ بھی اپنے لغوی معنوں میں عام رہنے کی بجائے کسی مخصوص مفہوم اور اصطلاح کے لیے متعیّن ہوجاتا ہے تو پھر اس کے بعد اس کے لغوی مفہوم کا اعتبار باقی نہیں رہتا۔ خود لفظ ''اسلام'' کو دیکھ لیجیے، یہ لفظ اپنے لغوی مفہوم کے لحاظ سے دنیا کے کسی بھی مذہب کے پیروکاروں کے لیے ناقابل قبول نہیں ہے۔ لیکن جب سے ''اسلام'' کا لفظ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے لیے بولا جانے لگا ہے اور دین محمدؐ کے لیے مخصوص ہوگیا ہے تب سے دنیا کے کسی اور مذہب کا کوئی پیروکار اسے اپنے لیے استعمال کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، اور یہ ایک اصولی بات ہے۔ اس لیے اگر مسلم علماء اور دانشور اسلام کے سیاسی نظام کے لیے ''جمہوریت'' کی اصطلاح کو پسند نہیں کرتے تو ان کا یہ طرز عمل بلاوجہ نہیں ہے کیونکہ اب یہ لفظ ایک متعیّن نظام کے لیے خاص ہوگیا ہے۔ اور آپ جب بھی ''جمہوریت'' کا لفظ بولیں گے تو عام ذہن کسی توقف کے بغیر مغربی نظام سیاست کی طرف مڑ جائے گا اور اس نظام سے ہٹ کر آپ اس لفظ کی جو تشریح بھی کرنا چاہیں گے خود جمہوریت کا لفظ اسے قبول نہیں کرے گا۔

نظامِ حکومت کی تشکیل میں رائے عامہ کی اہمیت

لیکن اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے ''جمہوریت'' کی نفی کرنے والے حضرات بھی عام طور پر ادھوری بات کہتے ہیں جس سے کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ یہ بات تو کہہ دیتے ہیں کہ مغربی جمہوریت کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ یہ وضاحت نہیں کرتے کہ خود اسلام میں حکومت کی تشکیل کا اصول کیا ہے اور حکومت کے قیام اور اسے

چلانے میں رائے عامہ کو کیا مقام حاصل ہے؟ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک دو اصولی باتیں قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

پہلی بات یہ کہ اسلام میں سیاسی نظام کے لیے ’’خلافت‘‘ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا حاکم حکومت کا نظام چلانے میں جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتا ہے اور آنحضرتؐ کی لائی ہوئی تعلیمات کا پابند ہے اسی لیے اسے خلیفہ کہا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خلیفہ کا تقرر کون کرے گا؟ اس سلسلہ میں امت میں دو واضح مکتبِ فکر پائے جاتے ہیں، اہلِ تشیع اور اہلِ سنت۔

اہلِ تشیع کا امامت کا تصور

اہلِ تشیع کے بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا، اسی وجہ سے اہلِ تشیع کی اذان میں حضرت علیؓ کے لیے وصی رسول اللہ یعنی رسول اللہؐ کے نامزد کردہ اور خلیفۃ بلا فصل کے الفاظ شامل ہوتے ہیں جو دراصل ان کے سیاسی نظام اور فلسفے کا اعلان ہوتا ہے۔ اہلِ تشیع کے نزدیک حضرت علیؓ کے بعد یہ سلسلہ جسے وہ ’’امامت‘‘ سے تعبیر کرتے ہیں ان کی اولاد میں مسلسل چلتا رہا تو ان کے بارہویں امام غائب ہو گئے تھے اور قیامت سے پہلے ان کا ظہور ہوگا جبکہ درمیان کا عرصہ امام کے غائب ہونے کا زمانہ کہلاتا ہے اور اس دوران ’’ولایت فقیہ‘‘ کا درجہ ہے جس کے تحت کوئی مذہبی شخصیت امام غائب کی نمائندگی کرتے ہوئے امت کی حکمران ہوتی ہے۔ چنانچہ ایران کے دستور کے مطابق یہ حیثیت پہلے جناب خمینی کو حاصل تھی اور اب اس مقام پر جناب خامنہ ای فائز ہیں جو امام غائب کے نمائندہ ہیں اور انہی کے اختیارات سے بہرہ ور ہیں۔ اہلِ تشیع کے نزدیک چونکہ امام کا تقرب من جانب اللہ ہوتا ہے اس لیے وہ امام معصوم ہوتا ہے اور شریعت کی تعبیر و تشریح میں اسے فائنل اتھارٹی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

اہلِ سنت کا خلافت کا تصور

دوسرا مکتبِ فکر اہلِ سنت کا ہے جن کا موقف ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں واضح اشارات دے دیے تھے لیکن نامزد کسی کو نہیں کیا تھا، آپؐ نے خلیفہ کا انتخاب امت کی عمومی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ عملاً بھی ایسا ہی ہوا کہ رسول اللہؐ کے وصال کے بعد عامۃ الناس کی رائے سے حضرت ابوبکرؓ کو حکمران چنا گیا۔ اس لیے علم عقائد و کلام کے ائمہ جب اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے مذاہب کا فرق بیان

کرتے ہیں تو تین باتوں کا بطور خاص تذکرہ کرتے ہیں۔

1. ایک یہ کہ اہلِ سنت کے ہاں یہ نظام ”خلافت“ کہلاتا ہے جبکہ اہلِ تشیع اسے ”امامت“ سے تعبیر کرتے ہیں۔
2. دوسرا فرق یہ ہے کہ اہلِ سنت کے نزدیک خلافت کا قیام عامۃ الناس کی رائے سے عمل میں آتا ہے جبکہ اہلِ تشیع کے ہاں امامت موروثی ہے اور نامزدگی کے ذریعہ اس کا تعین ہوتا ہے۔
3. اور تیسرا فرق یہ ہے کہ اہلِ سنت کے ہاں خلیفہ کو معصومیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا، وہ قرآن وسنت کی تصریحات کا پابند ہوتا ہے اور نئے پیش آمدہ معاملات میں متعلقہ حضرات کے ساتھ مشاورت اس کے فرائض میں شامل ہوتی ہے۔ جبکہ اہلِ تشیع کے نزدیک امام ”معصوم“ ہوتا ہے اور شریعت کی تعبیر میں اس کی رائے حتمی ہوتی ہے۔

نظامِ حکومت کے نظم میں رائے عامہ کی اہمیت

اس کے بعد مملکت کا نظام چلانے کا معاملہ ہے، اس میں بھی یہی بات واضح ہے کہ قرآن و سنت کے صریح اور منصوص مسائل میں کسی کی رائے کا کوئی دخل نہیں اور اسے ہر حکومت ہر حالت میں بجا لانے کی پابند ہے۔ البتہ اس کے بعد دو قسم کے مسائل رہ جاتے ہیں۔ ایک وہ مسائل ہیں جن کا تعلق قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح سے ہے، ان کے بارے میں اہل علم کے ساتھ مشاورت اور ان کی راہنمائی ضروری ہے۔ اور دوسرے وہ مسائل جو عام لوگوں کے حقوق و معاملات اور روزمرہ پیش آمدہ امور سے متعلق ہیں، ان کے بارے میں عام لوگوں کو صلاح مشورہ میں شریک کرنا اور ان کی رائے پر فیصلہ دینا سنت نبویؐ بھی ہے اور خلفاء راشدینؓ کی سنت بھی ہے۔ حتیٰ کہ جناب نبی اکرمؐ نے تو غزوۂ احد پر خود اپنی رائے کے خلاف شرکاء مجلس کی رائے پر فیصلہ کر دیا تھا جس سے رائے عامہ کی اہمیت اور حیثیت کا سنت نبویؐ کی روشنی میں بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جناب رسول اللہ نے روزمرہ مسائل اور عام لوگوں کے حقوق و معاملات پر ان کے ساتھ براہ راست بھی مشورہ کیا ہے اور بالواسطہ بھی ہزاروں لوگوں کو مشاورت کے نظام میں شریک کیا ہے، جبکہ غزوہ حنین کے بعد قیدیوں کی واپسی کے مسئلہ پر مسلمانوں کے بارہ ہزار افراد پر مشتمل لشکر سے ان کی رائے ان کے نمائندہ ”عرفاء“ کے ذریعہ معلوم کر کے نبی اکرمؐ نے عوامی نمائندگی کے اصول کی توثیق فرمادی تھی۔

نظامِ حکومت کے راہنما اصول

چنانچہ اگر علماء کرام جمہوریت سے بیزاری کے ساتھ یہ بھی فرما دیا کریں کہ اسلامی نظام میں اہلِ سنت کے نقطۂ نظر کے مطابق:

1. حکومت کی تشکیل عوام کی رائے سے ہوتی ہے۔
2. حکومت اور عوام قرآن و سنت کے منصوص اور صریح احکام کے یکساں پابند ہوتے ہیں۔
3. قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح سے متعلقہ امور اہل علم کے مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔
4. عوام کے حقوق و معاملات اور روز مرہ پیش آمدہ امور کا فیصلہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں براہ راست یا بالواسطہ نمائندگی کی صورت میں عام لوگوں کی رائے سے ہوتا ہے۔

تو اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی کنفیوژن لوگوں کے ذہنوں میں پیدا نہیں ہوگا بلکہ اسلام کے سیاسی نظام کا ایک واضح نقشہ لوگوں کے سامنے آجائے گا اور وہ زیادہ اعتماد اور شرح صدر کے ساتھ اسلامی نظام کے حق میں آواز بلند کریں گے۔

اسلام میں عامۃ الناس کی رائے

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۷ مارچ ۱۹۹۹ء

جمہوریت اور ووٹ کے بارے میں میرے ایک مضمون پر محمد مشتاق احمد صاحب نے روزنامہ اوصاف میں شائع شدہ مراسلے میں تنقید کی ہے اور اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ میں جمہوریت کو کفر بھی قرار دے رہا ہوں اور ووٹ کے مروجہ سسٹم کی حمایت بھی کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ نے کبھی ووٹ کا طریقہ اختیار نہیں کیا اس لیے آج بھی عوامی ووٹ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لیے چند گزارشات پیش خدمت ہیں۔

مغربی جمہوریت

جہاں تک جمہوریت کو کفر قرار دینے کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جمہوریت کا یہ بنیادی فلسفہ سراسر کفر ہے کہ:

1. سوسائٹی اپنی حکمران خود ہے،
2. سوسائٹی کی اکثریت اپنے لیے جو قانون بھی طے کر لے وہی حرف آخر ہے، اور

3. وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات پر عمل اختیاری چیز ہے کہ سوسائٹی ان میں سے جس حکم کو چاہے قبول کرلے اور جسے چاہے نظر انداز کردے۔

اسلام میں رائے عامہ کی حیثیت اور دائرہ کار

مگر وحی الٰہی کے دائرے میں اور آسمانی تعلیمات کی حدود کو قبول کرتے ہوئے سوسائٹی اپنی حکومت کی تشکیل اور روزمرہ امور طے کرنے کے لیے باہمی مشاورت کی بنیاد پر ووٹ کا طریقہ اختیار کرتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بلکہ آج کے دور میں ان معاملات میں جن میں شریعت اسلامیہ 'عوامی رائے'' کے حق کو تسلیم کرتی ہے، عام لوگوں کی رائے معلوم کرنے کا صحیح اور منظم طریقہ ووٹ ہی ہے، بشرطیکہ وہ صحیح طریقہ سے استعمال کیا جائے۔

خلیفہ اولؓ کا انتخاب عوامی رائے سے

یہ کہنا کہ اسلام میں عامۃ الناس کی رائے کوئی حیثیت نہیں رکھتی، قطعی طور پر غلط بات ہے۔ بلکہ اسلامی حکومت کی تشکیل کی اصل اساس ''عوامی رائے'' ہے جس کی بنیاد پر حضرت ابوبکرؓ کو پہلا خلیفہ چنا گیا۔ اور خلافت پر بحث کرنے والے تقریباً تمام اصحاب علم اس بات کو بطور اصول تسلیم کرتے ہیں کہ خلیفۂ اول کا انتخاب رائے عامہ کی بنیاد پر ہوا تھا۔ اس بارے میں دو واضح نقطۂ نظر چلے آرہے ہیں۔ ایک یہ کہ جناب نبی اکرمؐ نے حضرت علیؓ کو اپنا خلیفہ نامزد کردیا تھا، یہ نقطۂ نظر اہلِ تشیع کا ہے۔ دوسرا یہ کہ نبی اکرمؐ نے خلیفہ کا انتخاب امت کی عمومی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا اور رائے عامہ پر اعتماد کیا تھا۔ یہ نقطۂ نظر اہلِ سنت کا ہے اور خلیفۂ اول کے انتخاب کی واقعاتی صورت بھی یہی ہے۔ اس لیے اہلِ سنت کے ہاں یہ اصول طے شدہ ہے کہ خلیفہ کے انتخاب میں عوام کے اعتماد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

خلیفہ دومؓ اور عوامی رائے

اس سلسلہ میں بخاری شریف کی ایک روایت کی طرف اپنے سابقہ مضمون میں بھی اشارہ کیا تھا اور اس طویل روایت کی تھوڑی سی تفصیل مزید عرض کر دیتا ہوں۔ امام بخاریؒ نے یہ روایت ''کتاب المحاربین من اہل الکفر والردۃ'' میں نقل کی ہے اور اس کے راوی حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ نے جو آخری حج کیا اس میں ان کے سامنے منیٰ میں کسی صاحب کی یہ بات نقل کی گئی کہ اگر حضرت عمرؓ کا انتقال ہوگیا تو وہ فلاں صاحب کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرکے اس کا اعلان کردیں گے۔ اور جس طرح حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر ہونے والی اچانک بیعت تسلیم ہوگئی تھی اسی طرح ان کی اس بیعت کو بھی بالآخر قبول کرلیا جائے گا۔ حضرت عمر بن

الخطابؓ نے اس بات پر سخت غصے کا اظہار کیا اور فرمایا کہ وہ آج شام عام لوگوں کے اجتماع سے خطاب کریں گے اور انہیں ایسے لوگوں کے بارے میں خبردار کریں گے جو یریدون ان یغصبوھم امورھم لوگوں سے ان کے اختیارات غصب کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے مشورہ دیا کہ امیرالمومنین! یہاں دنیا بھر سے طرح طرح کے لوگ آئے ہوئے ہیں، آپ کی بات سن کر کوئی کچھ سمجھے گا اور کوئی اس سے کچھ نتیجہ اخذ کرے گا۔ جبکہ یہ بات انتہائی اہم ہے اس لیے زیادہ مناسب رہے گا کہ یہ بات دارالحکومت مدینہ منورہ جاکر کی جائے۔ امیرالمومنین نے مشورہ قبول کر لیا اور جب اس سفر سے مدینہ منورہ واپس پہنچے تو پہلے جمعۃ المبارک کا خطبہ اسی موضوع پر ارشاد فرمایا جس میں دیگر بعض اہم امور کے ساتھ ساتھ خلیفہ کے انتخاب کے مسئلہ پر تفصیلی گفتگو فرمائی۔

حضرت عمرؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت اگرچہ اچانک ہوئی تھی لیکن اسے دو وجہ سے قبول کر لیا گیا تھا۔ ایک اس لیے کہ اس وقت حضرت ابوبکرؓ سے بہتر کوئی شخصیت ہمارے درمیان موجود نہ تھی۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ انصار مدینہؓ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اپنے طور پر جمع ہو کر انصار میں سے امیر منتخب کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگر انہیں اس فیصلے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا موقع مل جاتا تو باقی مسلمانوں کے لیے اسے قبول کرنا یا رد کرنا مشکل ہو جاتا اور معاملہ بہت زیادہ بگڑ جاتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہماری رہنمائی فرمائی اور ہم نے صورتحال کو قابو میں کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے خطبہ میں سقیفہ بنی ساعدہ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اب کوئی شخص یہ بات ذہن میں نہ لائے کہ وہ اسی طرح کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسے باقی مسلمانوں سے قبول کرالے گا۔ پھر امیرالمومنینؓ نے فرمایا کہ

> ”جس شخص نے بھی مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت کی تو اس کی بات ہرگز قبول نہ کی جائے۔“

میں نے حضرت عمرؓ کے طویل خطبہ سے صرف ایک دو متعلقہ امور کا ذکر کیا ہے جس میں وہ خلیفہ کی بیعت کو مسلمانوں کے مشورہ کے ساتھ مشروط کر رہے ہیں اور مسلمانوں کی مشاورت کے بغیر کی جانے والی بیعت کو انہوں نے عام لوگوں کے اختیارات غصب کرنے سے تعبیر کیا ہے۔

عوامی مشاورت کی ضرورت

اس حوالہ سے ایک اور نکتہ پر غور کر لیجیے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر بیعت سے پہلے خلیفہ کے انتخاب پر عمومی بحث و مباحثہ ہوا بلکہ مہاجرینؓ اور انصارؓ کے درمیان جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس موقع پر مہاجرینؓ، انصارؓ اور خاندان نبوتؐ تینوں نے اپنے الگ الگ سیاسی تشخص کا اظہار کیا اور الگ

الگ رائے پیش کی۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود حضرت عمرؓ اس سارے عمل کو ''اچانک'' قرار دے رہے ہیں اور اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ اس وقت کے حالات میں یہی ممکن تھا۔ اس لیے اسے آئندہ کے لیے مثال نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے وقت صحابہ کرامؓ کے مختلف طبقات کے درمیان جو بحث و مباحثہ ہوا اور جس کی بنیاد پر جمہور علماء امت خلیفۂ اول کی بیعت کو ''عامۃ الناس'' کی بیعت قرار دے رہے ہیں، حضرت عمرؓ کے نزدیک وہ بھی ناکافی تھا۔ اور اصل ضرورت اس سے کہیں زیادہ ''عوامی مشاورت'' کی تھی جو ہنگامی حالات کی وجہ سے اس وقت قابل عمل نہیں تھی۔ اور اسی حوالہ سے حضرت عمرؓ آئندہ کے لیے خبردار کر رہے ہیں کہ کوئی شخص مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر خلیفہ کے انتخاب کی بات نہ کرے۔

اس لیے محمد مشتاق احمد صاحب سے عرض ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ بن الخطاب ایک اسلامی حکومت کی تشکیل کے لیے مسلمانوں کی عمومی مشاورت کو ضروری قرار دے رہے ہیں جس کا دائرہ انہوں نے اس خطبہ میں ''الناس'' اور ''المسلمون'' بیان فرمایا ہے۔ جبکہ آج کے دور میں عام لوگوں اور مسلمانوں کی عمومی رائے معلوم کرنے کا طریقہ ''ووٹ'' ہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ ان کے ذہن میں ہو تو وہ ارشاد فرما دیں۔ مگر طریقہ ایسا ہو کہ حکومت کی تشکیل اور حاکم کے انتخاب میں ''الناس'' اور ''المسلمون'' کی رائے کا فی الواقع اظہار ہوتا ہو۔

سنی شیعہ کشیدگی کے اسباب پر ایک نظر

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۵ اپریل ۱۹۹۹ء

سنی شیعہ کشیدگی اور باہمی قتل و قتال کی افسوسناک صورتحال کے اسباب و عوامل کا جائزہ لینے کے لیے تنظیم اسلامی پاکستان کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی سربراہی میں علماء کمیٹی نے کام شروع کر دیا ہے اور اس کے پہلے باضابطہ اجلاس کے بعد ابتدائی سفارشات کی جو شکل سامنے آئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف کمیٹی اپنے کام میں سنجیدہ ہے بلکہ کمیٹی قائم کرنے والے حضرات بھی اس سلسلہ میں کوئی عملی پیش رفت چاہتے ہیں۔

وزیر اعظم کی کمیٹی اور ملی یکجہتی کونسل

یہ کمیٹی وزیر اعظم پاکستان نے قائم کی ہے اور اس میں سنی شیعہ کشیدگی کے موجودہ راؤنڈ کے دو متحارب گروہوں تحریک جعفریہ اور سپاہ صحابہؓ کے سربراہوں کے علاوہ مختلف دینی مکاتبِ فکر کے ذمہ

دار حضرات شامل ہیں۔ اگرچہ ملی یکجہتی کونسل کے سیکرٹری جنرل مولانا سمیع الحق نے ملتان میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اس کمیٹی پر اعتراض کیا ہے کہ یہ کمیٹی جماعتوں کی نمائندہ نہیں ہے اس لیے ان کے بقول یہ کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکے گی اور ان کے خیال میں ملی یکجہتی کونسل کو دوبارہ متحرک کرنے کی ضرورت ہے لیکن مولانا موصوف کا یہ اعتراض بوجوہ درست نہیں ہے:

- اولاً اس لیے کہ ملی یکجہتی کونسل اس مسئلہ میں ہاتھ ڈال کر ناکام ہو چکی ہے اور اسے یہ گتھی سلجھانے کا کوئی راستہ نہیں ملا اس لیے اس سلسلہ میں دوبارہ اسے متحرک کرنے کی بات ”آزمودہ را آزمودن“ والا قصہ ثابت ہوگا۔
- ثانیاً اس لیے کہ سنی شیعہ کشیدگی کے حالیہ راؤنڈ میں اصل فریق دو ہی ہیں: سپاہ صحابہ اور تحریک جعفریہ، اس لیے جب دونوں کے سربراہ کمیٹی میں شریک ہیں تو حالات کو کنٹرول کرنے کے لیے اس کمیٹی کی کوششیں ہی کارگر ہو سکیں گی۔
- ثالثاً اس لیے کہ کمیٹی میں اگرچہ بہت سی جماعتوں کو نمائندگی حاصل نہیں ہے لیکن اس کمیٹی میں شامل شخصیات مذہبی مکاتبِ فکر کی علمی اور دینی نمائندگی کے لحاظ سے بہر حال مؤثر ہیں۔
- رابعاً اس لیے کہ یہ مسئلہ جماعتوں کا نہیں بلکہ مذہبی مکاتبِ فکر کا ہے ورنہ جمعیۃ علماء اسلام کے دونوں دھڑوں کی قیادت کو اس کشمکش سے لاتعلق رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کشیدگی کے مسلسل بڑھتے چلے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جمعیۃ علماء اسلام کے دونوں دھڑوں کی قیادت نے اسے اپنا مسئلہ نہیں سمجھا اور کشمکش کو آگے بڑھنے کے لیے ”فری ہینڈ“ دے دیا ورنہ صورتحال شاید اتنی زیادہ خراب نہ ہوتی اور اسے کہیں نہ کہیں بریک ضرور لگ جاتی۔

اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کمیٹی میں نمائندگی نہ پانے والی جماعتوں کو، خواہ وہ کسی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہوں، اسے ایشو نہیں بنانا چاہیے اور ملی یکجہتی کونسل کی آڑ میں کوئی متوازی محاذ کھڑا کرنے کی بجائے اس کمیٹی کے ساتھ تعاون کی کوئی راہ نکالنی چاہیے ورنہ امید کا یہ پہلو بھی مایوسی کی تاریکیوں کی نذر ہو جائے گا اور اس کے بعد شاید جلد کوئی امید افزا صورتحال سامنے نہ آسکے۔

ان تمہیدی گزارشات کے بعد نفسِ مسئلہ کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی ہے کیونکہ جب مسئلہ کشیدگی کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کا ہے تو پھر دیانت و امانت کا تقاضہ ہے کہ قومی بحث و مباحثہ کے دوران اس سلسلہ میں جو باتیں بھی محسوس ہو رہی ہوں اسے

سامنے لایا جائے اور معاملہ کے ہر پہلو کی اچھی طرح چھان پھٹک کی جائے تاکہ کوئی کانٹا ایسا باقی نہ رہ جائے جو اس موقع پر چنا نہ جا سکے اور بعد میں کسی وقت الجھن کا باعث بن جائے۔ اس جذبہ اور احساس کے ساتھ سنی شیعہ کشیدگی کے اسباب و محرکات کے بارے میں کچھ گزارشات قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

باہمی تعاون و اشتراک کا دور

سنی شیعہ کشمکش اور کشیدگی کا پس منظر تو تاریخی اور قدیمی ہے کہ قرآن کریم، خلفاء راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کے بارے میں دونوں گروہوں کے عقائد و نظریات میں اتنا واضح فرق موجود ہے کہ اس فرق کی موجودگی میں دونوں میں سے کسی ایک کا بھی دوسرے فریق کو مذہبی طور پر قبول کرنا خود اپنے مذہب کے اصولوں کو رد کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس لیے یہ معاملہ سرے سے خارج از بحث ہے کہ مذہبی عقائد کے حوالہ سے دونوں میں مفاہمت کی کوئی صورت نکل سکے اور اس ضمن میں اگر کوئی کوشش کی گئی تو وہ کارِ لاحاصل کے سوا کوئی مقام حاصل نہیں کر سکے گی۔ البتہ اس فرق کو تسلیم کرتے ہوئے دونوں کے درمیان حدِ فاصل کے اعتراف کے ساتھ باہمی تعلقات کار اور مشترکہ معاملات میں شرکت پر گفتگو ہو سکتی ہے اور اس وقت اسی نکتہ پر گفتگو کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ماضی میں تحریکِ آزادی، تحریکِ پاکستان اور اس کے علاوہ نفاذِ اسلام، ختم نبوت اور دیگر قومی و دینی تحریکات میں دونوں فریق مشترکہ جدوجہد میں شریک ہوتے رہے ہیں اور ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے باہمی تعاون کی راہ پر چلتے رہے ہیں۔ اس لیے ان اسباب کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے جنہوں نے اس صورتحال میں بگاڑ پیدا کیا ہے، بہت سے معاملات میں باہمی تعاون و اشتراک کرنے والے دو گروہوں کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا ہے اور باہمی تصادم کی یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ ملک کے ایک بڑے حصے میں آج کسی مسجد میں پانچ وقت کی نماز کی باجماعت ادائیگی بھی مسجد کے دروازے بند کرنے اور مسلح پہرہ دار کھڑا کرنے کے سوا ممکن نہیں رہی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کشیدگی میں بہت سے دیگر عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں اور پاکستان میں امن و امان کو خراب کرنے میں دلچسپی رکھنے والی بعض بین الاقوامی ایجنسیوں کے علاوہ مقامی سطح پر غنڈہ عناصر اور قانون شکنی کے عادی بے شمار افراد نے اس کشمکش کے شیڈ میں پناہ لے رکھی ہے لیکن اس سب کچھ کے باوجود بنیادی عنصر وہی سنی شیعہ کشیدگی ہے اور حالات کو خراب کرنے کے خواہشمند خواہ کہیں سے آئیں انہیں خام مال یہیں سے فراہم ہو رہا ہے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان اسباب و عوامل اور محرکات کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور ان وجوہ کو تلاش کیا

جائے جن کے باعث باہمی تعاون واشتراک کی وہ فضا یکسر ختم ہو گئی ہے جو اب سے صرف دس برس پہلے تک نہ صرف موجود تھی بلکہ دینی تحریکات میں اس کے فوائد بھی حاصل ہو رہے تھے۔

اس سلسلہ میں اگر ایک دو ذاتی واقعات بھی ریکارڈ پر لے آؤں تو شاید نامناسب نہ ہو۔

مولانا مفتی جعفر حسین کا خیر مقدم

صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے ابتدائی دور کی بات ہے کہ راقم الحروف مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں باغ جناح کی جانب اپنے کمرہ کی کھڑکی کھول کر اس کے ساتھ بیٹھا تھا کہ گلی سے مولانا مفتی جعفر حسین صاحب چند ساتھیوں کے ہمراہ گزرے۔ مفتی صاحب اہلِ تشیع کے قومی سطح پر بہت بڑے عالم تھے اور تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ پاکستان کے بانی و سربراہ تھے، انہوں نے گلی سے گزرتے ہوئے مجھے دیکھا تو جامع مسجد کی سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں آگئے اور میں نے اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا اور احترام سے بٹھایا۔ مفتی صاحب کہنے لگے کہ میں ماضی کی یاد تازہ کرنے کے لیے اوپر آگیا ہوں، میں اس کمرہ میں چار سال تک پڑھتا رہا ہوں اور حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ میرے استاذ ہیں۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھے اور اپنے دورِ طالب علمی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اب سوچتا ہوں کہ دس پندرہ برس میں صورتحال کس قدر بدل گئی ہے کہ ان باتوں کا اب تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ایک شیعہ اے ایس آئی کی وضع داری

اسی طرح میں اپنی پہلی گرفتاری کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جو ایک شیعہ اے ایس آئی کے ہاتھوں ہوئی اور اس وضعداری اور احترام کے ساتھ کہ اب شاید کسی کو اس کہانی پر یقین ہی نہ آئے۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان نے جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں ملک گیر کنونشن کیا جس کی پاداش میں مسجد نور کو سرکاری تحویل میں لینے کا اعلان ہوا۔ اس کے خلاف ایک تحریک چلی، سینکڑوں کارکنوں کی گرفتاریاں ہوئیں اور حکومت مسجد کا قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس تحریک سے قطع نظر کنونشن کے مقررین کے خلاف ۱۶ ایم پی او کے تحت تین مقدمات درج ہوئے جن میں مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ، مولانا مفتی محمودؒ، مولانا عبیداللہ انورؒ، مولانا محمد شاہ امروٹیؒ اور مولانا ایوب جان بنوریؒ سمیت تیس سے زائد سرکردہ علماء کرام شامل تھے اور میرا نام بھی ان میں شامل تھا۔ جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ نے ان کیسوں میں قبل از گرفتاری ضمانتیں نہ کرانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس لیے میں بھی پابند تھا کہ ضمانت نہ کراؤں جبکہ میں مقامی طور پر رہنے والا تھا اور ہر وقت پولیس چوکی گھنٹہ گھر کی نظروں میں تھا۔ پولیس چوکی کے اے ایس آئی غضنفر شاہ نے جو شیعہ تھا خود مجھے جامع

مسجد میں آکر کہا کہ آپ کے خلاف مقدمہ ہے اس لیے آپ ضمانت کرالیں۔ میں نے جواب دیا کہ ہم نے ضمانت نہ کرانے کا فیصلہ کیا ہے، وہ خاموشی سے واپس چلا گیا۔ ہفتہ عشرہ کے بعد پھر آیا اور ضمانت کا تقاضہ دہرایا، میں نے وہی جواب دہرایا اور وہ پھر واپس چلا گیا۔

اس سے کچھ روز بعد کی بات ہے کہ راقم الحروف اور جمعیۃ علماء اسلام کے راہنما ڈاکٹر غلام محمد صاحب جی ٹی روڈ پر جا رہے تھے کہ وہی اے ایس آئی سامنے سے آ رہا تھا۔ اس نے ملتے ہی پوچھا کہ مولوی صاحب ضمانت نہیں کرائی؟ میں نے جواب دیا، نہیں۔ اس نے کہا کہ آئیں پھر چلیں (یعنی آپ کو گرفتار کر رہا ہوں)۔ ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے اس سے کہا کہ اللہ کے بندے تین روز کے بعد عید ہے اس لیے عید کے بعد چلیں گے۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے عید کی چھٹیاں ختم ہوتے ہی آپ پولیس چوکی میں آجائیں۔ اس وقت تھانہ باغبانپورہ نہیں ہوا کرتا تھا اور وہاں چوکی پولیس گھنٹہ گھر ہوا کرتی تھی۔ عید کی چھٹیاں گزرنے کے بعد میں اور ڈاکٹر غلام محمد صاحب حسبِ وعدہ چوکی پہنچے، اس شیعہ اے ایس آئی نے میری گرفتاری ڈالی اور کہا کہ مولوی صاحب! مجھے آپ کو رات حوالات میں رکھتے ہوئے شرم آتی ہے، آپ گھر چلے جائیں اور صبح ۹ بجے سٹی مجسٹریٹ اقبال بوسن کی عدالت میں آجائیں میں وہاں سے ریمانڈ لے کر آپ کو جیل میں چھوڑ آؤں گا۔ چنانچہ میں چوکی پولیس میں گرفتاری ڈلوا کر گھر چلا گیا، دوسرے روز ڈاکٹر غلام محمد صاحب کے ساتھ وعدہ کے مطابق سٹی مجسٹریٹ کی عدالت کے سامنے پہنچا تو مذکورہ اے ایس آئی ندارد۔ انتظار طویل ہوتا چلا گیا اور جب ایک بج گیا تو مجھے تشویش ہوئی۔ ایمانداری کی بات ہے کہ یہ تشویش اپنے بارے میں نہیں بلکہ اس اے ایس آئی کے بارے میں تھی کہ اس نے کل سے میری گرفتاری ڈال رکھی ہے اور اگر وہ آج عدالت کے وقت میں نہ پہنچا تو اس غریب کا کیا بنے گا؟ ہم نے چوکی پولیس میں فون کر کے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ کلر آبادی میں کوئی قتل ہو گیا ہے اور وہ اے ایس آئی تفتیش کے لیے گیا ہوا ہے۔ ہم نے چوکی محرر کو صورتحال بتائی کہ ہم تو اس کے انتظار میں کچہری میں کھڑے ہیں۔ چوکی والوں نے اسے کسی طرح اطلاع کرائی اور وہ بے چارہ بائیسکل پر بھاگم بھاگ دو بجے سے پہلے سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں پہنچا۔ ریمانڈ لیتے ہوئے سٹی مجسٹریٹ نے اے ایس آئی سے پوچھا کہ ملزم کو ہتھکڑی کیوں نہیں لگائی؟ اس نے جواب دیا کہ سر! یہ ملزم ہتھکڑی والا ہے؟ سٹی مجسٹریٹ نے پوچھا کہ اگر ملزم فرار ہو گیا تو؟ اے ایس آئی نے جواب دیا کہ سر! میں ذمہ دار ہوں۔

یہ واقعہ دسمبر ۱۹۷۵ء کا ہے اور ابھی صرف پون صدی گزری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب والی کمیٹی کو اپنا کام ضرور مکمل کرنا چاہیے اور

ان اسباب و عوامل کو ضرور بے نقاب ہونا چاہیے جنہوں نے باہمی رابطہ و مفاہمت کی اچھی خاصی فضا میں تلخی کا زہر گھول دیا ہے۔

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ---١٦ اپریل ١٩٩٩ء

گزشتہ مضمون میں سنی شیعہ کشیدگی کے حوالہ سے ابتدائی معروضات پیش کی تھیں، آج کی صحبت میں اس کشیدگی کے اسباب و محرکات کے بارے میں چند گزارشات پیش کی جا رہی ہیں۔

تعبیرات کا نہیں، اعتقادات کا اختلاف

اصولی طور پر یہ بات ہم عرض کر چکے ہیں کہ مذہبی مفاہمت تو دونوں گروہوں میں ممکن ہی نہیں ہے کہ قرآن کریم، خلافت و امامت، خلفاء راشدینؓ، صحابہ کرامؓ اور دیگر بعض اہم بنیادی امور میں دونوں کے معتقدات ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ اور یہ اختلاف اہلِ سنت کے دائرہ میں شامل گروہوں مثلاً دیوبندی اور بریلوی کی طرح تعبیرات کا نہیں بلکہ اصولی اور اعتقادی اختلاف ہے اس لیے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ البتہ اعتقادات و روایات کے بنیادی اختلافات کے باوجود اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان باہمی تعلقات کار اور مشترکہ امور میں تعاون و رابطہ کی جو فضا دس پندرہ برس پہلے تک موجود تھی وہ اب قائم نہیں ہے اور اسی سے کشیدگی بڑھی ہے، اس کے اسباب کو ضرور تلاش کرنا چاہیے۔

سُنی شیعہ کشمکش کے اسباب

وطنِ عزیز پاکستان میں اہلِ سنت اور اہلِ تشیع میں مختلف مقامات پر ماضی میں دو باتوں پر جھگڑا ہوتا رہا ہے۔

(۱) صحابہ کرامؓ پر تبرّا

ایک اس بات پر کہ بعض غیر محتاط شیعہ مقررین اپنی مجالس اور اصحاب قلم اپنی تصانیف میں حضرات صحابہ کرامؓ بالخصوص حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے بارے میں گستاخانہ لہجہ اختیار کر لیتے تھے جس سے اہلِ سنت میں ردعمل ہوتا تھا اور بعض جگہ نوبت فسادات تک پہنچ جاتی تھی۔ ماضی میں کچھ مقامات پر ایسا بھی ہوا ہے کہ اہلِ تشیع نے حضرت عمرؓ اور حضرت معاویہؓ کے پتلے جلائے اور اپنے ماتمی جلوسوں کی گزرگاہ میں حضرت عمرؓ کا نام لکھا دیکھ کر اس کی بے حرمتی کی جس سے فسادات تک بات جا پہنچی۔

(۲)عزاداری کے جلوس

دوسرے نمبر پر اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان جھگڑے کی بنیاد عزاداری کے جلوس بنتے رہے ہیں کہ بہت سے مقامات پر اہلِ سنت کو اعتراض اور شکایت ہوئی کہ عزاداری اور ماتم کے جلوس اہلِ تشیع کے ہاں عبادت ہوں گے مگر ہم تو انہیں جائز نہیں سمجھتے اس لیے یہ جلوس اہلِ تشیع کی عبادت گاہوں تک محدود رہنے چاہئیں اور جن علاقوں میں اہلِ سنت کی اکثریت ہے ان میں ان جلوسوں کو لے جانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ بعض جگہ اہلِ تشیع اس اعتراض اور شکایت کو نظرانداز کر کے جلوس ہر حال میں متنازعہ مقامات سے گزارنے پر اصرار کرتے ہیں جس پر جھگڑا پیدا ہوتا ہے اور کشیدگی بڑھ جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے گوجرانوالہ کی ضلعی امن کمیٹی میں، جس کا میں بھی رکن ہوں، ایک محلہ کے اہلِ تشیع کی درخواست آئی کہ وہ وہاں علم کا جلوس ایک گلی سے لے کر گزرنا چاہتے ہیں۔ گلی والوں کو اس پر اعتراض تھا جبکہ درخواست کنندہ کا موقف یہ تھا کہ چونکہ اس نے نذر مانی ہوئی ہے کہ وہ علم کا جلوس اسی گلی سے گزارے گا اس لیے یہ اس کا مذہبی فریضہ ہے اور مذہبی فریضہ کی ادائیگی اس کا حق ہے۔ اس پر میں نے یہ عرض کیا کہ بھائی یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، کل اگر میں نذر مان لوں کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو میں سید کاظم علی شاہ صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر مدحِ صحابہؓ کا جلسہ کروں گا تو کیا انتظامیہ مجھے اس نذر کی بنیاد پر یہ جلسہ کرنے کی اجازت دے گی؟ سید کاظم علی شاہ صاحب ممتاز مسلم لیگی رہنما ہیں، شیعہ ہیں اور ہمارے بہت مہربان دوست ہیں، وہ بھی اس میٹنگ میں موجود تھے۔ اگرچہ انہوں نے بے تکلفی اور وضعداری سے یہ کہا کہ مولانا آپ میرے گھر میں جلسہ کر لیں۔ لیکن جوبات میں ضلعی انتظامیہ کے افسران کو سمجھانا چاہتا تھا وہ ان کے ذہن میں آ گئی اور صورتحال کو کنٹرول کر لیا گیا۔

اب سے بیس پچیس برس پہلے تک اہلِ سنت اور اہلِ تشیع میں کشیدگی کا باعث یہی دو مسئلے بنتے تھے اور کچھ مقامات پر فسادات کی نوبت بھی آ جاتی تھی لیکن یہ مسئلہ ملک گیر حیثیت اختیار نہیں کرتا تھا اور مختلف تدابیر سے ان پر کنٹرول ہو جایا کرتا تھا۔

(۳)جداگانہ مذہبی تشخص کے مطالبات

اس کے بعد بات یوں کچھ آگے بڑھی کہ اہلِ تشیع نے جداگانہ مذہبی تشخص کے اظہار کے ساتھ اوقاف، تعلیم اور دیگر معاملات میں جداگانہ حیثیت کے تعین کے مطالبات شروع کر دیے۔ ممتاز

شیعہ لیڈر رسید محمد دہلوی صاحب کی سربراہی میں شیعہ مطالبات کمیٹی نے اسلامیات میں شیعہ طلبہ کے الگ نصاب تعلیم اور شیعہ اوقاف کے جداگانہ انتظام کا مطالبہ کر دیا جس سے سنی شیعہ تنازعہ کے مسائل میں ایک اور مسئلہ کا اضافہ ہوگیا۔ اس پر خاصی کشمکش ہوئی اور اس طرح اہلِ تشیع نے اجتماعی دھارے سے الگ سفر کا آغاز کر دیا۔ اس وقت بہت سے سنی رہنماؤں نے شیعہ قیادت سے کہا کہ وہ جس سفر کا آغاز کر رہے ہیں وہ بہت غلط منزل تک انہیں لے جائے گا مگر ”رموز مملکت خویش خسرواں دانند“ کے مصداق شیعہ قیادت نے اس قسم کے کسی مشورے پر کان دھرنا مناسب نہ سمجھا اور بات مسلسل آگے بڑھتی رہی۔

(۴) انقلابِ ایران کے اثرات

اس کشیدگی میں اضافے کا چوتھا عنصر اس وقت شامل ہوا جب انقلاب ایران کے بعد پاکستان میں تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تحریک کے قائدین نے خود کو ایرانی انقلاب کے نمائندہ کے طور پر پیش کیا، ملک میں فقہ جعفریہ کے نفاذ کا مطالبہ کیا اور اس مقصد کے لیے اسلام آباد میں ملک کے وفاقی سیکرٹریٹ کا دو روز تک مسلسل محاصرہ کیے رکھا۔ حالانکہ اس مطالبہ کا قطعی کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ پرسنل لاء میں اہلِ تشیع کے جداگانہ حقوق اور ان کے نکاح، طلاق اور وراثت کے معاملات ان کے مذہب کے مطابق نمٹائے جانے کے اصول سے اہلِ سنت نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی انکار نہیں کیا۔ جبکہ پبلک لاء میں سنی اکثریت پر فقہ جعفریہ کے نفاذ کا مطالبہ یا کم از کم متوازی طور پر دوہرے پبلک لاء کے نفاذ پر اصرار قطعی طور پر ایک بے جواز بات تھی جس کا ذکر راقم الحروف نے ۱۹۸۷ء میں ایران کے دورہ کے موقع پر ممتاز پاکستانی علماء کرام اور دانشوروں کی موجودگی میں مقتدر ایرانی راہنما جناب آیت اللہ جنتی کے سامنے کیا اور انہوں نے میری اس گزارش سے اتفاق کیا کہ پاکستان میں پبلک لاء کے طور پر فقہ جعفریہ کے نفاذ کا مطالبہ درست نہیں۔

سُنی ردِعمل

معاملات جب اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ فقہ جعفریہ کے متوازی نفاذ کے مطالبہ کے لیے وفاقی سیکرٹریٹ کا گھیراؤ ہونے لگا تو اس کا ردعمل ظاہر ہونا ایک فطری بات تھی چنانچہ اسی کے ردعمل میں سپاہ صحابہؓ وجود میں آئی اور پھر اشتعال کے یہ سب عوامل جمع ہوئے تو ملک میں سنی شیعہ کشمکش نے باہمی تصادم کی وہ صورت اختیار کر لی جس کے تلخ نتائج کا ہم آج سامنا کر رہے ہیں۔

سپاہ صحابہؓ کے اشتعال انگیز طرز عمل بالخصوص ”کافر کافر“ کے عمومی نعرہ سے ہم نے کبھی اتفاق

نہیں کیا۔ میرے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم نے اس سلسلہ میں سپاہ صحابہؓ کے قائدین کے نام ایک کھلا خط لکھا جو ملک بھر میں کئی سال قبل تقسیم ہو چکا ہے۔ راقم الحروف نے سپاہ صحابہؓ کے کم و بیش سبھی قائدین سے اس مسئلہ پر بات کی ہے، خود مولانا حق نواز جھنگوی شہیدؒ کے ساتھ اس سلسلہ میں میری گفتگو چل رہی تھی اور وہ میرے موقف سے اصولی اتفاق کرتے ہوئے اس کی عملی صورتوں پر تجاویز مانگ رہے تھے۔ حتیٰ کہ جس روز وہ شہید ہوئے ان کی شہادت سے ایک گھنٹہ قبل فون پر میری ان سے گفتگو ہوئی اور آنے والا بدھ انہی امور پر تفصیلی بات چیت کے لیے طے ہوا مگر اس کے ایک گھنٹہ بعد وہ جام شہادت نوش کر گئے۔ دوسری طرف تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کے سربراہ علامہ عارف الحسینی سے بھی میری ملاقات ہوئی جس کے لیے خود انہوں نے خواہش کا اظہار کیا اور گوجرانوالہ کے ممتاز شیعہ راہنما جناب صفدر ترابی مجھے لے کر وزیرآباد گئے جہاں علامہ عارف الحسینی آئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی، گفتگو ہوئی اور میں نے عرض کیا کہ جناب اس کشیدگی کو کم کرنے کے لیے آپ کو تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام کے ۲۲ متفقہ دستوری نکات کی پوزیشن پر واپس آنا ہوگا، انہوں نے بھی اصولی طور پر اس سے اتفاق کیا مگر بات پھر اس کے بعد آگے نہ بڑھ سکی۔ سپاہ صحابہؓ کے بارے میں بات ہو رہی تھی کہ ہمیں ان کے طریق کار سے کبھی اتفاق نہیں رہا لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سپاہ صحابہؓ ایک ردعمل کا نام ہے جو مذکورہ بالا اسباب و عوامل کے نتیجے میں رونما ہوا اس لیے ایکشن کو کنٹرول کیے بغیر صرف ری ایکشن پر قابو پانے کی کوئی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوئی اور نہ اب ہو سکتی ہے۔

اس پس منظر میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی سربراہی میں وزیراعظم پاکستان کی قائم کردہ علماء کمیٹی نے کشیدگی کے اسباب و عوامل کی نشاندہی اور صورتحال کی اصلاح کے لیے تجاویز مرتب کرنے کا کام شروع کیا ہے تو ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہوئے گزارش کرتے ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد اب تک سنی شیعہ کشیدگی میں مرحلہ وار اضافہ کے پورے پراسیس کا جائزہ لیا جائے اور فریقین کے ان مطالبات پر بھی غور کر لیا جائے جو اس کشیدگی میں اضافہ کا باعث بنے ہیں۔ اگر واقعتاً کشیدگی پر قابو پانا ہے تو دونوں فریقوں کے سرکردہ رہنماؤں کو اپنے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرنا ہوگی اور سرکاری حکام کو بھی معروضی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ اور ٹھوس اقدامات کرنا ہوں گے ورنہ بصورت دیگر اگر مقصد صرف وقت گزارنا ہے تو وہ پہلے بھی گزر تا رہا ہے اور اب بھی گزر ہی جائے گا اس کے لیے کمیٹی کے تکلف کی کیا ضرورت ہے؟

حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر دین کی تکمیل؟

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مئی ۱۹۹۹ء

ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد وہاں کی مذہبی قیادت مسلسل اس بات کا تاثر دینے کی کوشش کر رہی ہے کہ اہل تشیع کو جن انتہا پسندانہ عقائد کا حامل ٹھہرایا جاتا ہے، ایران کے انقلابی مذہبی راہنما اس سے بری ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ وہ اعتدال پسندانہ مذہبی عقائد ورجحانات رکھتے ہیں بلکہ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان اتحاد اور مفاہمت کے بھی علمبردار ہیں۔

چنانچہ ۱۹۸۷ء میں راقم الحروف کو پاکستانی علماء اور دانشوروں کے ایک وفد کے ہمراہ ایران کی وزارتِ مذہبی امور کی دعوت پر تہران جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں ہمارے لیے ایک محفل بطور خاص اس امر کے اظہار کے لیے سجائی گئی کہ قرآن کریم پر ایمان کا اظہار کیا جائے، اور اس الزام کے ازالہ کی کوشش کی جائے کہ اہل تشیع قرآن کریم کو تحریف شدہ قرار دیتے ہیں۔ اس محفل میں مقتدر ایرانی راہنما جناب آیت اللہ خزعلی نے قرآن کریم پر ایمان اور اس کے غیر محرف ہونے پر مفصل خطاب کیا۔ جس پر ہمارے وفد میں شامل مولانا منظور احمد چنیوٹی کے ساتھ ان کا ہلکا پھلکا مناظرہ بھی ہو گیا۔

مگر ان تمام کوششوں کے باوجود اپنے مذہبی عقائد ورجحانات کو چھپانے میں اسے (ایرانی قیادت کو) کبھی کامیابی نہیں ہوئی، کیونکہ دل کی بات کسی نہ کسی طرح سامنے آ ہی جاتی ہے اور اسے زیادہ دیر تک مخفی رکھنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال چند روز قبل تہران میں ہونے والے ایک مذہبی اجتماع کے حوالے سے سامنے آئی ہے۔ روزنامہ پاکستان لاہور نے ۶ اپریل ۱۹۹۹ء کی اشاعت میں ”عید غدیر“ کے عنوان سے تہران میں منعقد ہونے والے ایک مذہبی اجتماع کی تصویر شائع کی ہے جس کا منظر یہ ہے کہ ایران کے مذہبی پیشوا جناب آیت اللہ خامنہ ای اجتماع سے خطاب کر رہے ہیں، جبکہ اسٹیج پر ایران کے موجودہ صدر جناب محمد خاتمی اور سابق صدر جناب ہاشمی رفسنجانی کے ہمراہ قومی اسمبلی کے اسپیکر اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بھی بیٹھے ہیں، اور ایران کی اس اعلیٰ ترین قیادت کے سروں پر ایک بینر لٹک رہا ہے جس کی عبارت یہ ہے:

"الحمد للہ الذی جعل کمال دینه و تمام نعمته بولایة امیر المومنین علی بن ابی طالب علیه السلام۔"

یہ دراصل قرآن کریم کی اس معروف آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ میں نے آج تمہارے لیے دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے۔ یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہونے اور وحیٔ الٰہی مکمل ہونے کی خوشخبری

ہے۔ اور اس امر کا اعلان ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جس وحی کا آغاز ہوا تھا، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ مکمل ہوگئی ہے اور آسمانی ہدایات کی نعمت پوری ہوگئی ہے۔ مگر مذکورہ بینر کی عبارت یہ کہہ رہی ہے کہ وحی کی تکمیل اور دین کی نعمت کا اتمام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں بلکہ اس کی تکمیل اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ولایت کے ساتھ ہوئی ہے۔

ہم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ولایت کے قائل ہیں، انہیں امام الاولیاء مانتے ہیں اور ان کے ساتھ محبت و عقیدت کو جزوِ ایمان سمجھتے ہیں۔ لیکن وحیٔ الٰہی اور دین کی تکمیل کے ساتھ ان کی ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ وحی اور دین کی تکمیل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے ساتھ ہوگئی ہے۔ اور اس کے بعد کسی بھی اور بزرگ یا شخصیت کی طرف اس کو منسوب کرنا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و ختم نبوت کو نعوذ باللہ نامکمل قرار دینے کے مترادف ہے۔ اور اسی سے ایران کی مذہبی قیادت کی ان کوششوں کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے جو وہ خود کو اعتدال پسند ظاہر کرنے اور عالم اسلام کی قیادت کے لیے آگے لانے کے لیے کر رہی ہے۔

سنی شیعہ کشیدگی اور جناب ظفر حسین نقوی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۴ مئی ۱۹۹۹ء

راقم الحروف نے ”سنی شیعہ کشیدگی کے اسباب پر ایک نظر“ کے عنوان سے کچھ گزارشات پیش کی تھیں جن میں اس کشیدگی میں اضافہ کا باعث بننے والے کچھ عوامل کا تذکرہ کیا تھا اور اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وزیراعظم پاکستان نے اس حوالہ سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی سربراہی میں جو کمیٹی قائم کی ہے اس کمیٹی کو اپنا کام جاری رکھنا چاہیے اور کمیٹی کے شرکاء کو چاہیے کہ وہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معروضی حالات کا بے لاگ جائزہ لیں، سنی شیعہ کشیدگی میں مسلسل اضافہ کے مرحلہ وار پراسیس کا تجزیہ کریں، اور اس کے اسباب و عوامل کی نشاندہی میں کسی مصلحت کا شکار نہ ہوں۔ اس مضمون پر جناب ظفر حسین نقوی صاحب نے روزنامہ اوصاف میں اظہار خیال کیا ہے، ان کے ارشادات کے بارے میں کچھ معروضات پیش کر رہا ہوں۔ نقوی صاحب نے اپنے مضمون میں فرمایا ہے کہ اہلِ تشیع قرآن پاک پر ایمان رکھتے ہیں، صحابہ کرامؓ کا احترام کرتے ہیں، سب اہلِ سنت کو مسلمان سمجھتے ہیں، اور اہلِ سنت کی مساجد کے تقدس کے قائل ہیں اس لیے انہیں اس بات کا ملزم گردانا درست نہیں ہے کہ ان کے طرز عمل کی وجہ سے کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں نقوی صاحب محترم سے گزارش ہے کہ راقم الحروف نے اپنے مضمون میں ان میں

سے کسی بات پر بھی بحث نہیں کی اور نہ ہی کسی پر دلائل دیے ہیں جس پر نقوی صاحب کو اپنی پوزیشن کی وضاحت اور اس کے لیے دلائل پیش کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو، بلکہ میں نے تو صرف واقعات کے حوالہ سے سنی شیعہ کشیدگی کے اسباب کا ذکر کیا ہے۔

- عزاداری کے جلوسوں کو متنازعہ راستوں سے گزارنے پر اصرار فسادات کا باعث بنتا آرہا ہے۔
- اکابر صحابہؓ کے بارے میں بعض مقررین کے گستاخانہ لب و لہجہ نے مختلف اوقات میں اشتعال کی آگ بھڑکائی ہے۔
- شیعہ نصاب تعلیم اور اوقاف کی علیحدگی کے مطالبات نے اہلِ تشیع کا راستہ اجتماعی دھارے سے الگ کیا ہے اور فقہ جعفریہ کے متوازی نفاذ کی تحریک نے یہ بات انتہاء کو پہنچا دی ہے جس کے رد عمل نے "سپاہ صحابہؓ" کو جنم دیا ہے اور صورتحال یہاں تک پہنچ گئی ہے۔

مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ ظفر حسین نقوی صاحب جیسے بہت سے سنجیدہ اہلِ تشیع اشتعال انگیزی کو پسند نہیں کرتے اور صحابہ کرامؓ کی شان میں گستاخی کے روادار نہیں ہیں۔ لیکن ایسے دوستوں کی طرف سے بیزاری اور براءت کے اعلان سے وہ واقعات تو صفحہ وجود سے محو نہیں ہو جائیں گے جو رونما ہو چکے ہیں اور جن کی وجہ سے کئی بار اشتعال اور کشیدگی کے شعلے بھڑکے ہیں۔ میں کسی بات کے جواز یا عدم جواز پر بحث نہیں کر رہا بلکہ یہ گزارش کر رہا ہوں کہ یہ واقعات ہیں جو کشیدگی کا باعث بنتے چلے آرہے ہیں اور آئندہ کشیدگی کو روکنے کے لیے اس قسم کے واقعات کی روک تھام ضروری ہے۔

بہتر ہوتا کہ نقوی صاحب غیر متعلقہ بحث میں الجھنے کی بجائے ان واقعات سے انکار کرتے اور مجھ سے مطالبہ کرتے کہ میں ان واقعات کا ریکارڈ پیش کروں جن کو سنی شیعہ کشیدگی میں اضافے کا باعث قرار دے رہا ہوں۔ اور اب بھی اگر نقوی صاحب یہ اصولی مطالبہ کریں تو میرے لیے یہ ضروری ہو جائے گا کہ گزشتہ نصف صدی کے ریکارڈ کی چھان بین کر کے ان اہم واقعات کی نشاندہی کروں جو کشیدگی اور اشتعال کا باعث بنے ہیں، اگر نقوی صاحب اس کو مناسب سمجھتے ہیں تو میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں۔

البتہ ظفر حسین نقوی صاحب کی ایک بات قابل توجہ ہے جو انہوں نے میرے اس اصولی موقف کے جواب میں ارشاد فرمائی ہے کہ

"اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان عقائد اور اصول کے حوالہ سے بنیادی

اختلافات موجود ہیں اس لیے ان میں مذہبی مفاہمت ممکن نہیں ہے"۔

اس پر نقوی صاحب نے کہا ہے کہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع میں کوئی ایسا بنیادی اختلاف نہیں ہے جو مذہبی مفاہمت میں رکاوٹ بنتا ہو، اس کے لیے نقوی صاحب موصوف نے قرآن کریم پر اہلِ تشیع کے ایمان اور صحابہ کرامؓ کے احترام کے حوالہ سے کچھ وضاحتی ارشادات بھی فرمائے ہیں۔ مگر میں بصد ادب گزارش کروں گا کہ ظفر حسین نقوی صاحب کا یہ موقف نہ معروضی حقائق سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ ہی اہلِ تشیع کے عقائد اور اصول کی ان کتابوں کی تصریحات پر پورا اترتا ہے جو اہلِ تشیع کے ہاں "مسلّمہ مآخذ" کا درجہ رکھتی ہیں اور جن کی بنیاد پر اہلِ تشیع کے جمہور اہل علم اپنے عقائد و احکام کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر میں ان کتابوں اور ان کی تصریحات کی بحث میں الجھنے کی بجائے بطور مثال ایک تازہ ترین واقعہ کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں جس سے نقوی صاحب میرے موقف کو باآسانی سمجھ پائیں گے۔

روزنامہ پاکستان لاہور نے ۱۶ اپریل ۱۹۹۹ء کو تہران میں ہونے والی ایک مذہبی تقریب کا فوٹو شائع کیا ہے جس کا منظر یہ ہے کہ ایران کے مذہبی پیشوا جناب آیت اللہ خامنہ ای "عید غدیر" کے موقع پر ایک جلسہ سے خطاب کر رہے ہیں اور ان کے ساتھ اسٹیج پر ایران کے صدر محترم جناب محمد خاتمی، سابق صدر جناب ہاشمی رفسنجانی، پارلیمنٹ کے اسپیکر جناب علی اکبر ناطق نوری، اور ایرانی عدلیہ کے سربراہ آیت اللہ محمد یزیدی تشریف فرما ہیں۔ جبکہ ایران کی اس اعلیٰ ترین قیادت کے سروں پر ایک بینر لٹک رہا ہے جس کی یہ عبارت صاف طور پر پڑھی جا رہی ہے کہ

> الحمد لله الذی جعل کمال دینه و تمام نعمته بولایته امیر المومنین علی بن ابی طالب علیه السلام جس کا مطلب یہ ہے کہ "سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے اپنے دین کی تکمیل اور اپنی نعمت کا اتمام حضرت علیؓ کی ولایت کے ساتھ کر دیا۔"

یہ جملہ قرآن کریم کی سورہ المائدہ کی آیت نمبر ۳ کے حوالہ سے ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خطاب کر کے فرمایا ہے الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی کہ آج کے دن میں نے تمہارے لیے اپنا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے۔ یعنی جس وحی کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا تھا وہ مکمل ہو گئی ہے اور حضرات انبیاء کرامؑ کے ذریعہ نسل انسانی کی راہنمائی کے لیے آنے والے دین کی نعمت تمام ہو گئی ہے۔

اس آیت کریمہ کے بارے میں جمہور اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ یہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے کیونکہ انہی کے ذریعہ دین مکمل ہوا ہے اور انہی پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوا

ہے۔ اب اگر دین کی تکمیل کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ولایت کے ساتھ مختص کیا جائے تو جناب نبی اکرمؐ پر نازل ہونے والی وحی مکمل قرار نہیں پاتی اور ختم نبوت کے عقیدہ کے ساتھ ساتھ حضرت محمدؐ کے بعد وحی کے بند ہو جانے کا عقیدہ بھی مشکوک ٹھہرتا ہے۔ جہاں تک حضرت علیؓ کی ولایت کا تعلق ہے ہم اہلِ سنت اس کے قائل ہیں بلکہ انہیں امام الاولیاء مانتے ہیں اور ان کے ساتھ عقیدت و محبت ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ مگر دین کی تکمیل اور وحی کے ساتھ حضرت علیؓ کی ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وحی صرف حضرت محمد رسول اللہؐ پر نازل ہوتی تھی اور انہی پر دین مکمل ہوا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر وحی نازل نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی دین کی تکمیل سے ان کا کوئی واسطہ ہے۔

یہ ایک اصولی اور بنیادی مسئلہ ہے جس کا تعلق ختم نبوت سے ہے، تکمیل دین سے ہے، اور جناب نبی اکرمؐ کی وحی و تعلیمات کی حتمی حیثیت سے ہے۔ اور مذکورہ بالا تصویر کے مطابق اس میں جمہور اہل اسلام کے اجماعی عقیدہ سے الگ موقف کا اظہار کسی غیر ذمہ دار واعظ کے ذریعہ نہیں ہو رہا بلکہ ایران کی اعلیٰ ترین مذہبی قیادت "ولایتِ فقیہہ" اور مقتدر حکمرانوں کی طرف سے سامنے آرہا ہے۔ اس لیے یہ کہہ دینا اس قدر آسان نہیں ہے کہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے اور یہ صرف چند مخصوص گروہوں کی پیدا کردہ صورتحال ہے۔

ان گزارشات کے ساتھ ظفر حسین نقوی صاحب اور ان کے ہمنوا شیعہ دوستوں سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت بلاوجہ عقائد کی بحث میں نہ پڑیں ورنہ یہ قصہ لمبا ہو جائے گا، البتہ کشیدگی کے اسباب کو دور یا کم کرنے کی ضرورت موجود ہے اور اس کے لیے ہم ہر طرح حاضر ہیں۔

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۶ مئی ۱۹۹۹ء

جناب ظفر حسین نقوی نے عنوان بالا پر میری گزارشات کے حوالہ سے ایک بار پھر قلم اٹھایا ہے اور میری درخواست کے برعکس پھر انہی مسائل کو زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے جن سے میں صرف اس لیے بچنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ان مسائل پر از سر نو بحث و مباحثہ کا دروازہ کھلنے سے کشیدگی بڑھے گی اور اس کا نقصان ہوگا۔ قارئین گواہ ہیں کہ میں نے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان مذہبی اختلافات اور پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی کا باعث بننے والے عوامل کو الگ الگ موضوعات قرار دیتے ہوئے ابتدا میں گزارش کی تھی کہ:

- جہاں تک مذہبی اختلافات کا تعلق ہے وہ اصولی اور بنیادی ہیں ان پر مفاہمت ممکن نہیں

ہے اور نہ ہی ان پر بحث و مباحثہ کا کوئی فائدہ ہے۔

- البتہ پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ کا باعث بننے والے اسباب و عوامل کا تجزیہ کرنا ضروری ہے کیونکہ ان اسباب و عوامل کو دور کیے بغیر اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے انتہا پسند گروہوں کے درمیان پائی جانے والی موجودہ تصادم کی کیفیت کو کنٹرول کرنا مشکل ہو گا۔

مگر نقوی صاحب محترم اس طرف آنے کو تیار نہیں اور انہوں نے سنی شیعہ کشمکش کے پاکستان کی حد تک واقعاتی پس منظر کو موضوعِ بحث بنانے سے صاف انکار کر دیا ہے اور ایمان بالقرآن اور امامت کے اصولی مسائل پر گفتگو کا راستہ اختیار کیا ہے۔ مثلاً میں نے گزشتہ مضمون میں تہران کے ایک مذہبی اجتماع کے بینر کا حوالہ دیا تھا کہ اس کے حوالہ سے اختلافات کی اصولی حیثیت بدستور موجود ہے، مگر نقوی صاحب آیتِ تکمیلِ دین کے شانِ نزول کی بحث میں پڑ گئے ہیں کہ دین کی تکمیل کا اعلان کرنے والی آیتِ قرآنی فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی اور اہلِ سنت کے فلاں فلاں بزرگوں نے بھی اس شانِ نزول کو تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ اس ساری تگ و دو کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ شانِ نزول کوئی بھی ہو نتیجہ تو ایک ہی ہے جس کا اعتراف خود نقوی صاحب نے اس مضمون میں کیا ہے کہ اہلِ تشیع حضرت علیؓ کی امامت پر یقین رکھتے ہیں اور پھر نقوی صاحب نے اس عقیدہ امامت کی وضاحت کی کوشش بھی فرمائی ہے۔ اس بات کا ذکر میں نے سابقہ مضمون میں اشارتاً کر دیا تھا کہ اہلِ تشیع جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ کی امامت کے قائل ہیں جو ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصوص ہے، ان کے نزدیک امام معصوم ہوتا ہے اور اس کی مذہبی ہدایات کو اس معنیٰ میں وحی کا درجہ حاصل ہوتا ہے کہ اسے کسی اور دلیل سے چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ اہلِ سنت کے نزدیک وحی، معصومیت اور آسمانی ہدایات جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو چکی ہیں، آپؐ کے بعد کسی کو معصومیت کا درجہ حاصل نہیں ہے اور آپؐ کے بعد امامت نہیں بلکہ خلافت کا نظام ہے جو منصوص نہیں ہے بلکہ خلیفہ کا انتخاب امت کی صوابدید پر ہے۔ اب یہ ایک اصولی اور بنیادی اختلاف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دین کے اجتماعی نظام اور امت کے جماعتی نظم کی اصولی بنیاد کے حوالہ سے ہے۔ میں اس پر بحث نہیں کر رہا کہ ان میں سے کون سا درست ہے اور کون سا درست نہیں ہے اور نہ ہی کسی ایک کے حق میں دلائل دے رہا ہوں، بلکہ صرف یہ ذکر کر رہا ہوں کہ یہ اختلاف موجود ہے اور اصولی ہے۔ خدا جانے میری یہ گزارش نقوی صاحب کے ذہن تک کیوں رسائی حاصل نہیں کر سکی اور وہ کنفیوژن کا شکار ہو گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ امامت کے حوالہ سے اصولی اختلاف کو تسلیم بھی کر رہے ہیں اور میری گزارش کی تردید بھی ضروری سمجھ رہے ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم پر ایمان کا معاملہ ہے، میں نے صرف یہ کہا ہے کہ اس پر اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان اصولی اختلاف ہے، اس سے زیادہ میں نے کچھ عرض نہیں کیا۔ مگر نقوی صاحب محترم اس مسئلہ میں بھی تفصیلات میں جانے پر مصر ہیں اور مناظرہ و مباحثہ کا اسلوب اختیار کر رہے ہیں۔ میں صرف اختلاف کے وجود کی بات کر رہا ہوں جبکہ وہ اس کے دلائل کی طرف دامن کھینچ رہے ہیں۔ مگر میں اب بھی اس موقف پر قائم ہوں کہ اختلافات پر مباحثہ کا فائدہ نہیں ہے اور اس سے کشیدگی کم کرنے کی بجائے اس میں اضافہ ہوگا۔

البتہ اس حوالہ سے ایک واقعہ عرض کر دیتا ہوں کہ ۱۹۸۷ء میں پاکستان کے علمائے کرام اور دانشوروں کا ایک وفد ایران کی وزارت مذہبی امور کی دعوت پر ایران گیا جس میں راقم الحروف اور مولانا منظور احمد چنیوٹی بھی تھے۔ اس گیارہ روزہ دورے کے موقع پر تہران میں ایک تقریب بطور خاص قرآن کریم کے حوالہ سے منعقد ہوئی جس کے مہمان خصوصی مقتدر ایرانی رہنما جناب آیت اللہ خزعلی تھے۔ تقریب میں دو بچوں نے قرآن کریم کی تلاوت کی اور مہمان خصوصی نے ہمیں ان کوششوں سے آگاہ کیا جو ایرانی حکومت ملک میں قرآن کریم کی تعلیم کے فروغ کے بارے میں کر رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ ہمارے بارے میں کہا جاتا ہے کہ موجودہ قرآن کریم پر ہمارا ایمان نہیں ہے مگر یہ بات غلط ہے، ہم قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں، یہ کہہ کر جناب آیت اللہ خزعلی نے جیب سے قرآن کریم کا نسخہ نکالا اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر کہا

"ما ایمان داریم کہ این قرآن حق است نہ یک حرف کم نہ یک حرف زیاد"۔ یعنی ہم ایمان رکھتے ہیں کہ یہ قرآن کریم حق ہے نہ اس میں کوئی حرف کم ہے اور نہ زیادہ ہے۔

اس پر مولانا منظور احمد چنیوٹی نے سوال کیا کہ ہمیں آپ کی زبان سے یہ بات سن کر خوشی ہو رہی ہے مگر سوال یہ ہے کہ آپ کی بنیادی کتابوں میں قرآن کریم کے تحریف شدہ ہونے کے بارے میں جو روایات ہیں ان کا کیا بنے گا؟ خزعلی صاحب نے جواب دیا کہ ان روایات کے ساتھ ہم وہی سلوک کرتے ہیں جو حضرات اہلِ سنت امام سیوطیؒ کی بیان کردہ ان روایات کے ساتھ روا رکھتے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کی اتنے ہزار آیات تھیں مگر اب موجودہ قرآن کریم میں آیات کی وہ تعداد نہیں ہے۔ چنیوٹی صاحب نے اس پر کہا کہ معاملہ اس طرح نہیں ہے کیونکہ امام سیوطیؒ کی روایات کا اہلِ سنت کے اہل علم کے ہاں وہ درجہ نہیں ہے اور وہ بھی ایک دو روایات ہیں، مگر اہلِ تشیع کے ہاں تو حدیث کی مرکزی کتابوں "صحاح اربعہ" میں دو ہزار روایات ہیں جن میں قرآن کریم کو تحریف شدہ قرار دیا گیا ہے، اس لیے ان دونوں باتوں کو برابر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خزعلی صاحب نے جواب میں کہا کہ کچھ

بھی ہو امام جعفر صادقؒ کا قول ہے کہ جو روایت قرآن کریم کے خلاف ہو اسے دیوار پر مار دو، اس لیے ہم ان سب روایات کو دیوار پر مارتے ہیں۔ مولانا چنیوٹی نے اس کے بعد کہا کہ ہم آپ کے اس ارشاد پر بہت خوش ہیں مگر ایک نکتہ کی اور وضاحت کر دیں کہ اہلِ سنت کے نزدیک جو شخص قرآن کریم کو تحریف شدہ مانتا ہے وہ مسلمان نہیں ہے، آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ جناب آیت اللہ خزعلی نے اس کے جواب میں مسکراہٹ آمیز خاموشی اختیار کر لی اور بات اسی پر ختم ہو گئی۔

یہ واقعہ صرف اس لیے عرض کیا ہے کہ مسائل و اختلافات کا وجود بہر حال قائم ہے اور ان پر بحث میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ضرورت ان اسباب و عوامل کی نشاندہی اور سدباب کی ہے جو پاکستان میں گزشتہ نصف صدی کے دوران کشیدگی میں اضافہ کا باعث بنے ہیں، ان کے بارے میں لیپا پوتی سے کام لینے سے بات نہیں بنے گی، حقائق و واقعات کو تسلیم کرنا ہو گا اور کشیدگی کے عوامل کو حقیقت پسندی کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کرنا ہو گی، اس کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں ہے۔

سنی شیعہ تنازعہ کے بارے میں کمیٹی

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جون ۱۹۹۹ء

وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف نے گزشتہ دنوں سنی شیعہ کشمکش اور تصادم کے اسباب و عوامل کا جائزہ لینے کے لیے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی سربراہی میں ایک کمیٹی قائم کی تھی جس میں تحریک جعفریہ اور سپاہ صحابہؓ کے سربراہوں سمیت تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام شامل ہیں۔ اس کمیٹی نے محرم سے قبل اپنے کام کا آغاز کیا اور ایک اجلاس میں یہ دو تجویزیں طے کیں کہ

1. صحابہ کرامؓ اور اہل بیت عظامؓ کی شان میں گستاخی کے جرم میں تین سال قید کی مروجہ سزا کو بڑھا کر چودہ سال کر دیا جائے،
2. اور کسی فرقہ کو کافر قرار دینے کو وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے ساتھ مشروط کر دیا جائے۔

ان تجاویز پر بات آگے بڑھ رہی تھی کہ کمیٹی کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد کے بارے میں کچھ راہنماؤں کے مخالفانہ بیانات کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے کمیٹی کی سربراہی اور رکنیت سے استعفٰی دے دیا اور کچھ عرصہ کے لیے خاموشی چھا گئی۔ اب بعض اخباری اطلاعات سے معلوم ہوا کہ یہ کمیٹی دوبارہ متحرک ہو گئی ہے اور وزیر اعظم نے جامعہ اشرفیہ لاہور کے نائب مہتمم مولانا عبد الرحمٰن اشرفی کو کمیٹی کا نیا سربراہ مقرر کیا ہے جنہوں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا ہے۔

جہاں تک کمیٹی کے کام کا تعلق ہے ہم ایک عرصہ سے حکومت سے گزارش کرتے آرہے ہیں کہ سنی شیعہ کشمکش میں اضافہ اور مسلح تصادم کے اسباب و عوامل کا اعلیٰ سطح پر جائزہ لیا جائے اور ان کی روک تھام کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔ ہماری تجویز یہ تھی کہ سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں اعلیٰ سطحی عدالتی کمیشن تشکیل دیا جائے جو اس کشیدگی اور کشمکش میں اضافہ کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کرے، اور پھر کسی رو رعایت کے بغیر ان اسباب و عوامل کے سدباب کے لیے مؤثر قدم اٹھایا جائے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک مسئلہ کا اصل حل اب بھی وہی ہے، تاہم یہ غنیمت ہے کہ حکومت کو اس ضرورت کا کسی درجہ میں احساس تو ہوا جس کے نتیجہ میں مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام پر مشتمل یہ کمیٹی وجود میں آئی ہے۔

ہم اس کمیٹی کے سربراہ اور ارکان سے گزارش کریں گے کہ وہ کمیٹیوں کے روایتی طریق کار سے ہٹ کر سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ کا جائزہ لیں، کیونکہ دونوں طرف کے بہت سے افراد کی جانیں تلف ہو چکی ہیں، مساجد اور عبادت گاہوں کا امن مخدوش ہو کر رہ گیا ہے، اور اس کشمکش سے فائدہ اٹھانے کے لیے بہت سے ملک دشمن اور قانون شکن عناصر مسلسل متحرک ہیں۔ اس لیے ہمیں امید ہے کہ معزز علماء اور دینی راہنماؤں کی یہ کمیٹی ملک کو اس فرقہ وارانہ تصادم سے نجات دلانے کے لیے کوئی مؤثر لائحہ عمل تجویز کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

متعہ اور پاکستان لاء کمیشن

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۷ جون ۱۹۹۹ء

پاکستان لاء کمیشن کی تجاویز و سفارشات میں سے ایک سفارش یعنی چائلڈ لیبر کی کم از کم عمر ۱۵ سال مقرر کرنے کے بارے میں گزشتہ مضمون میں کچھ گزارشات پیش کی تھیں۔ آج کی صحبت میں کمیشن کی ایک اور تجویز کے حوالہ سے کچھ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے جو "متعہ" کے بارے میں ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ طلاق یافتہ عورت کو متعہ کا حق دینے کے سلسلہ میں مختلف فقہی مکاتبِ فکر کی آرا کا جائزہ لیا جائے اور اس کو عملی شکل دینے کے بارے میں غور کیا جائے۔

"متعہ" کا لفظی معنیٰ فائدہ اٹھانے کے ہیں اور قرآن کریم میں احکام کے باب میں یہ لفظ جن الگ الگ معنوں میں استعمال ہوا ہے انہیں فقہاء کرام نے متعۃ الحج، متعۃ النکاح اور متعۃ الطلاق کی تین اصطلاحات کی صورت میں پیش کیا ہے۔

متعۃ الحج

متعۃ الحج کا معنٰی ہے کہ ایک شخص حج کے مہینے شروع ہونے یعنی یکم شوال کے بعد مکہ مکرمہ پہنچا اور عمرہ ادا کر کے احرام کھول دیا۔ پھر اسی سفر میں اس نے نئے احرام کے ساتھ حج کیا تو وہ شخص متمتّع کہلائے گا۔ کیونکہ اس نے ایک سفر میں حج کے ساتھ ساتھ عمرہ کا فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ لیکن اگر عمرہ کا احرام کھولے بغیر اسی احرام میں حج بھی کر لیا تو وہ شخص قارن کہلائے گا۔ "تمتع" اور "قِران" دونوں ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تمتع میں عمرہ الگ احرام سے ہوتا ہے اور ایام حج میں الگ احرام باندھا جاتا ہے، جبکہ قران میں عمرہ اور حج ایک ہی احرام کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں شکرانے کا ایک دم واجب ہوتا ہے جسے دم تمتع اور دم قران کہتے ہیں۔ یعنی قربانی کے دن منٰی میں ایک جانور ذبح کرنا ہوتا ہے جو تمتع یا قران کے شکرانے کی نیت سے ذبح کیا جاتا ہے۔ یہ جانور ذبح کیے بغیر حاجی احرام کی پابندیوں سے فارغ نہیں ہوتا۔

ہمارے حاجی صاحبان کی غالب اکثریت ایسی ہے جو مسئلہ سے بے خبر ہونے کی وجہ سے منٰی میں قربانی کی نیت سے جانور ذبح کرتے ہیں لیکن تمتع یا قران کرنے کے باوجود اس کے شکرانے کے طور پر جانور قربان نہیں کرتے۔ اس لیے وہ احرام کی شرعی پابندیوں سے فارغ نہیں ہوتے اور گناہگار ہوتے ہیں۔ جبکہ قربانی الگ چیز ہے اور تمتع یا قران کا دم اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔

متعۃ النکاح

متعۃ النکاح متعیّن وقت کے لیے کیا جاتا ہے اور یہ جاہلیت کے زمانے میں رائج نکاح کی مختلف صورتوں میں سے ایک ہے۔ معروف محقق السید سابق نے "فقہ السنۃ" میں دور جاہلیت میں مرد اور عورت کے جنسی ملاپ کی جائز سمجھی جانے والی جو صورتیں بیان کی ہیں وہ مندرجہ ذیل آٹھ شکلیں بنتی ہیں:

1. کسی مرد کے کسی عورت کے ساتھ خفیہ تعلقات جاہلی سوسائٹی میں جائز تصور ہوتے تھے۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ مرد اور عورت کے تعلقات کا اظہار بری بات ہے، اگر یہ تعلقات خفیہ ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس صورت کو قرآن کریم نے متخذاتِ اخدان سے تعبیر کیا ہے۔
2. کوئی بھی دو مرد آپس میں بیویوں کا تبادلہ کر سکتے تھے اور یہ اس معاشرہ میں جائز سمجھا جاتا تھا۔

3. دس سے کم افراد ایک عورت کے ساتھ باری باری جنسی تعلق قائم کرتے تھے۔ اور اگر بچہ پیدا ہوتا تو وہ عورت ان سب کو جمع کر کے بچہ ان میں سے کسی ایک سے منسوب کر دیتی تھی اور اس شخص کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔
4. بعض عورتیں اپنے دروازے پر خاص قسم کا پرچم گاڑ دیتی تھیں جو اس بات کی علامت ہوتا تھا کہ کوئی بھی شخص جنسی بھوک مٹانے کے لیے وہاں آسکتا ہے، چنانچہ لوگ آتے رہتے تھے۔ اور اگر بچہ پیدا ہو جاتا تو اس دوران آنے والے افراد کو جمع کیا جاتا تھا اور قیافہ و علامات کے ذریعہ باپ کا تعین کر کے بچے کی ذمہ داری اسے سونپ دی جاتی تھی۔
5. کسی خاص قبیلہ، سردار، یا بہادر شخص کا تخم حاصل کرنے کے لیے خاوند خود اپنی بیوی کو متعیّنہ وقت کے لیے اس کے پاس بھیج دیتا تھا جو حمل ٹھہرنے کے بعد واپس آجاتی تھی اور ایسے بچے پر فخر کیا جاتا تھا۔
6. متعیّنہ وقت یعنی چند گھنٹوں، دنوں، مہینوں یا سالوں کے لیے باقاعدہ نکاح کیا جاتا تھا جو مقررہ وقت ختم ہونے پر خود بخود ختم ہو جاتا تھا۔ اسے نکاح متعہ کہتے ہیں۔
7. مرد اور عورت کا عمر بھر کے لیے کسی وقت کی تحدید کے بغیر نکاح ہوتا تھا جو آج بھی شرعی نکاح کے طور پر رائج ہے۔
8. بیوی کے علاوہ مملوکہ لونڈی کے ساتھ جنسی تعلق کی بھی اجازت تھی۔

یہ سب صورتیں دور جاہلیت کے عرف اور سوسائٹی میں مرد و عورت کے جنسی تعلق کی جائز صورتیں شمار ہوتی تھیں۔ ان میں سے دو صورتوں کو قرآن کریم نے باقی رکھا اور باقی تمام شکلوں کو ممنوع قرار دے دیا۔ چنانچہ سورۃ المومنون کی آیات نمبر ۵،۶ اور ۷ میں اہل ایمان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

> ”وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے بارے میں ان پر کچھ ملامت نہیں ہے۔ البتہ ان کے علاوہ جس نے کسی اور عورت کا قصد کیا تو ایسے لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔“

گویا اپنی بیوی اور لونڈی کے علاوہ کسی عورت سے جنسی تعلق کی باقی تمام صورتوں کو قرآن کریم نے ممنوع قرار دے دیا اور شریعت کی نظر میں وہ حرام کاری کی صورتیں شمار ہوتی ہیں۔ لونڈی کے بارے میں شرعی حکم اور آج کے دور میں اس کے امکانات کے حوالہ سے کسی مستقل مضمون میں گزارشات پیش کی جائیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

البتہ باقاعدہ بیوی اور نکاح کے بارے میں اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے ایک بنیادی اختلاف کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ نکاح کی جس شکل کو قرآن کریم نے جائز قرار دے کر باقی رکھا ہے اس میں ''نکاح متعہ''یعنی متعیّنہ وقت کے لیے کیا جانے والا نکاح شامل ہے یا نہیں ؟

اہلِ سنت کے نزدیک ''متعہ'' نکاح کی جائز صورت نہیں ہے اور مستند روایات کے مطابق جناب نبی اکرمؐ نے غزوۂ خیبر کے موقع پر اسے ممنوع قرار دے دیا تھا اور اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ چنانچہ وقت مقرر کر کے کیا جانے والا نکاح اہلِ سنت کے ہاں زنا شمار ہوتا ہے۔

جبکہ اہلِ تشیع کا موقف یہ ہے کہ ''متعہ'' کا جواز اب بھی موجود ہے اور اسے منسوخ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ وہ قرآن کریم میں جائز قرار دی جانے والی بیوی میں متعہ والی عورت کو بھی شمار سمجھتے ہیں۔

متعۃ الطلاق

متعۃ الطلاق کا مطلب یہ ہے کہ جس عورت کو طلاق ہو جائے اسے اس کا خاوند اپنی حیثیت کے مطابق لباس کا ایک جوڑا دے۔ یہ بھی فقہی اصطلاح میں متعہ کہلاتا ہے۔ طلاق یافتہ عورت کو لباس کا جوڑا دینا احناف کے ہاں ایک صورت میں واجب ہے جب کہ نکاح میں مہر کا تعین نہیں ہوا اور میاں بیوی کے ملاپ سے پہلے طلاق ہو گئی۔ ایسی صورت میں چونکہ مہر واجب نہیں ہے تو اس کے بدل کے طور پر ایک جوڑا خاوند کے ذمہ واجب ہے کہ وہ اپنی طلاق یافتہ بیوی کو ایک جوڑا دے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۶ میں ہے کہ:

> ''تم پر کوئی حرج نہیں کہ اگر تم عورت کو چھونے سے پہلے یا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دو اور ان کو متعہ (یعنی لباس کا جوڑا) دو۔ خوشحال شخص پر اس کے حساب سے اور تنگ دست پر اس کے حساب سے ہے۔''

مگر اس ایک صورت کے سوا باقی تمام صورتوں میں جن میں مہر مکمل یا نصف واجب ہوتا ہے، احناف کے نزدیک یہ متعہ واجب نہیں ہے۔ البتہ مستحب ہے کہ خاوند اگر مہر کے ساتھ جوڑا بھی دے دے تو زیادہ بہتر ہے۔ مگر باقی فقہاء کے نزدیک طلاق کی تمام صورتوں میں متعہ دینا واجب ہے۔

پاکستان لاء کمیشن کی تجویز

یہ متعہ کی تین الگ الگ صورتیں ہیں جو ہم نے فقہی اصطلاحات کی روشنی میں بیان کی ہیں۔ اب پاکستان لاء کمیشن کی تجویز پر ایک بار پھر نظر ڈال لیجیے۔ متعۃ الحج تو اس کے موضوع سے خارج ہے۔ اس لیے باقی دو صورتوں یعنی متعۃ النکاح اور متعۃ الطلاق میں سے ہی کسی ایک پر اس تجویز کو محمول کیا جا

سکتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ پاکستان لاء کمیشن کی مراد اس سے متعۃ النکاح ہو کیونکہ یہ ایک نئے فتنے کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہو گا۔

1. اولاً اس لیے کہ پاکستان اہلِ سنت کی غالب اکثریت کا ملک ہے اور اہلِ سنت کے تمام فقہی مذاہب کے نزدیک نکاح متعہ قطعی طور پر حرام ہے۔
2. ثانیاً اس لیے کہ اگرچہ اہلِ تشیع اس کے جواز کے قائل ہیں مگر اس کے تلخ نتائج ان کی قیادت کی نظر سے بھی مخفی نہیں ہیں۔ چنانچہ آیت اللہ خمینی نے ایران میں برسر اقتدار آنے کے بعد متعہ کی بعض صورتوں کو ممنوع قرار دے دیا تھا، ان کے بعد جناب رفسنجانی نے دوبارہ ان میں لچک پیدا کی ہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۸۷ء میں ایران کے دورے کے موقع پر ایک وفد کے ہمراہ راقم الحروف نے مشہد میں جناب آیت اللہ شیرازی کا جمعہ کا خطبہ خود سنا جس میں انہوں نے متعہ پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ اصولاً یہ جائز ہے مگر جس طرح لونڈی کی شرعی شرائط آج کے دور میں نہیں پائی جاتیں اسی طرح متعہ کی سب شرائط بھی آج کے دور میں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے آج عملاً متعہ کی اجازت نہیں ہے۔
3. اور ثالثاً اگر آج کے ماحول میں تھوڑے سے معاوضہ پر مقرر وقت کے لیے کسی عورت کے ساتھ جنسی تعلق کا جواز قانوناً فراہم کر دیا جائے تو حرام کاری اور زنا کے بہت سے دروازے خود بخود کھل جائیں گے۔ اور اس کے رسیا لوگوں کو اور کسی ”شیلٹر“ کی تلاش کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

ہاں اگر پاکستان لاء کمیشن کی متعہ سے مراد طلاق یافتہ عورت کو خاوند کی طرف سے دیا جانے والا لباس کا جوڑا ہے تو پھر بات الگ ہے، جبکہ تجویز کے سیاق وسباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس پر مسلّمہ فقہی اصولوں کے دائرہ میں رہتے ہوئے غور وفکر کی گنجائش موجود ہے۔ فقہائے احناف ہر طلاق یافتہ عورت کو یہ جوڑا دینے کے استحباب کے تو پہلے ہی قائل ہیں۔ اگر کسی اجتماعی اور عمومی مصلحت کی خاطر اس استحباب کو وجوب کا درجہ دے دیا جائے تو شاید انہیں بھی اس پر کوئی خاص اعتراض نہ ہو۔

مذہبی قوتوں کو آپس میں لڑانے کا امریکی منصوبہ

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ---۱۶ اکتوبر ۱۹۹۹ء

دہشت گردی کی موجودہ لہر کے بارے میں وفاقی وزیر داخلہ کے اس بیان کے بعد صورتحال کچھ کچھ واضح ہوتی جا رہی ہے کہ یہ بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' اور دیگر بین الاقوامی ایجنسیوں کی کارستانی ہے جس کا مقصد پاکستان کے داخلی امن کو تباہ کر کے جنوبی ایشیا کی معروضی صورتحال میں اس کی مشکلات میں اضافہ کرنا ہے۔ اس دہشت گردی میں بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہوئی ہیں، خود ہمارے شہر گوجرانوالہ میں تحریک جعفریہ کے ڈویژنل صدر اور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے سینئر نائب صدر اعجاز حسین رسول نگری کا قتل ایک شریف شہری اور امن پسند راہنما کا قتل ہے جس کا مجھے ذاتی طور پر بہت افسوس ہے۔ اعجاز رسول نگری مرحوم شیعہ رہنما تھے مگر ان لوگوں میں سے تھے جو مسائل کو الجھانے کی بجائے سلجھانے میں دلچسپی رکھتے ہیں، ضلعی امن کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے وہ امن کی بحالی کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے، اہلِ تشیع کی وکالت پورے اعتماد کے ساتھ کرتے تھے لیکن مخالفین کی بات بھی حوصلہ کے ساتھ سننے کے عادی تھے، میرے ساتھ ان کے اچھے مراسم تھے جب ملتے احترام سے ملتے اور مشترکہ مسائل پر تعاون کی راہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کے علاوہ ملک کے دیگر شہروں میں شیعہ اور سنی رہنماؤں کا قتل بہت افسوسناک ہے اور ملک کے ہر باشعور شہری نے اس کی مذمت کی ہے۔

مگر اس قتل عام کی آڑ میں ملک کے مختلف حصوں میں پولیس نے جس وسیع تر ایکشن کا مظاہرہ کیا ہے وہ بھی کم افسوسناک نہیں ہے۔ گوجرانوالہ میں بڑے دینی مدارس مدرسہ نصرۃ العلوم، مدرسہ اشرف العلوم، جامعہ قاسمیہ، جامعہ حقانیہ، ریحان المدارس اور مدرسہ فیضان سرفراز پر چھاپے مارے گئے اور مولانا محمد نعیم اللہ اشرفی، حافظ محمد ریاض خان سواتی، حافظ محمد عرباض خان سواتی اور دیگر حضرات کو گرفتار کیا گیا اور ایک محتاط اندازے کے مطابق ضلع گوجرانوالہ میں جن علماء اور دینی کارکنوں کو حراست میں لیا گیا یا انہیں حراست میں لینے کی کوشش کی جا رہی ہے ان کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سپاہ صحابہؓ کے کارکن بھی ہیں، جمعیۃ علماء اسلام کے دونوں دھڑوں سے تعلق رکھنے والے علماء کرام بھی ہیں، پاکستان شریعت کونسل کے ارکان بھی ہیں اور ایسے حضرات بھی ہیں جن کا کسی دینی جماعت کے ساتھ کوئی باضابطہ تعلق نہیں ہے۔ مگر پولیس کسی جماعت کی تفریق کیے بغیر ہر اس دیوبندی

عالم اور کارکن پر نظر رکھے ہوئے ہے جو کسی نہ کسی حوالہ سے اپنے علاقہ میں متحرک ہے اور ہر وہ دینی مدرسہ پولیس ایکشن کی زد میں ہے جہاں طلبہ کی ایک معقول تعداد دینی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ ان مدارس سے طلبہ کے نام پتے اور کوائف طلب کیے جا رہے ہیں اور مدارس کے خلاف پولیس کی کارروائی کے انداز سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ سب کچھ ہوا ہی اس لیے ہے کہ اس کی آڑ میں دینی مدارس کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کی کوئی صورت نکالی جائے۔

آج سے آٹھ برس قبل امریکہ کی قومی سلامتی کونسل کے حوالہ سے عالمِ اسلام کے بارے میں ایک امریکی پلان کی کچھ تفصیلات سامنے آئی تھیں جو مبینہ طور پر وائس آف امریکہ نے ۱۶ مارچ ۱۹۹۱ء کو نشر کیا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ پاکستان کے معروف دانشور اور قومی اسمبلی کے مسلم لیگی رکن پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری نے کیا تھا اور روزنامہ جنگ نے ۲۵ جولائی ۱۹۹۲ء کو اسے شائع کیا ہے۔ اس میں واضح طور پر جن اہداف کا اعلان کیا گیا ہے ان میں یہ بات شامل ہے کہ مذہبی قوتوں کو آپس میں لڑانے کی منصوبہ بندی کی جائے، اسلامی سوچ رکھنے والے دانشوروں کو اقتدار اور میڈیا سے دور رکھا جائے، عام مسلمانوں کو ان سے دور اور متنفر کرنے کی کوشش کی جائے اور مذہبی جماعتوں کے باہمی جھگڑوں اور تنازعات کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ یہ بات اگر کسی امریکی پلان کا باضابطہ حصہ نہ ہو تب بھی امریکہ عالمِ اسلام میں دینی قوتوں کو کچلنے، اسلامی نظام کی راہ روکنے اور اپنی بالادستی کو مستحکم کرنے کے لیے جو عزائم رکھتا ہے ان کی تکمیل کے لیے مذہبی قوتوں کا باہم دست و گریبان ہونا ضروری ہے کیونکہ عالمِ اسلام میں امریکی عزائم اور بالادستی کو اگر کوئی قوت چیلنج کر سکتی ہے تو وہ صرف مذہبی قوت ہے، باقی کم و بیش سارے طبقے امریکی بالادستی کے سامنے سرنڈر ہو چکے ہیں۔ اس لیے یہ امریکہ کی ضرورت ہے کہ شیعہ اور سنی آپس میں ایک دوسرے کا خون بہائیں، دیوبندی اور بریلوی آمنے سامنے محاذ آرا ہوں اور اہل حدیث اور حنفی ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں۔

اس پس منظر میں اب تک کے حالات کے پیشِ نظر جو خدشات محسوس ہو رہے ہیں وہ یہ ہیں کہ فرقہ وارانہ دہشت گردی کے نام سے اس باہمی قتل و قتال کا دائرہ وسیع کیا جائے اور اس کے لیے اگلے دو ماہ بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اکتوبر اور نومبر میں دینی حلقوں کے بڑے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں۔ مریدکے میں اہل حدیث مکتبِ فکر کی لشکر طیبہ، ملتان میں بریلوی مکتبِ فکر کی دعوت اسلامی، رائے ونڈ میں دیوبندی مکتبِ فکر سے منسوب تبلیغی جماعت اور دیگر دینی جماعتوں کے اجتماعات تسلسل کے ساتھ ان دو مہینوں میں ہو رہے ہیں۔ چند سال قبل انہی اجتماعات کو دیکھ کر ایک مغربی صحافی نے لکھا تھا کہ ”وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پاکستان میں بنیاد پرست اتنی بڑی تعداد میں رہتے ہیں“۔ اس

لیے امریکہ کی مجبوری ہے کہ وہ اگر جنوبی ایشیا میں اپنے ایجنڈے کو آگے بڑھانا چاہتا ہے تو ان اجتماعات کی قوت کو آپس میں الجھا دے اور خاص طور پر دیوبندی حلقہ کے گرد مختلف قسم کی سازشوں کا حصار سخت کرتا جائے جسے نہ امریکہ بلکہ تمام مغربی قوتیں جنوبی ایشیا میں اپنا اصل حریف سمجھتی ہیں۔

اس لیے ہم ملک بھر کی دینی قوتوں سے بالعموم اور دیوبندی مکتبِ فکر کی جماعتوں سے بالخصوص عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اس سازش کو پہچانیں اور عالمی استعمار کے اس مقصد کو سمجھیں کہ وہ انہیں مختلف محاذوں پر الجھا کر ان کی توجہ خود سے ہٹانا چاہتا ہے تاکہ وہ پاکستان پر دباؤ ڈال کر اسے اپنے ایجنڈے پر چلنے کے لیے آمادہ کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی ملک کے حکمران طبقات مثلاً فوج اور بیوروکریسی کے علاوہ جاگیردار اور صنعتکار طبقوں کے ان افراد سے بھی ہم یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں جو پاکستان کی سالمیت، قومی خود مختاری اور اسلامی اقدار کے تحفظ سے دلچسپی رکھتے ہیں کہ اب امریکی یلغار کے راستہ میں آپ کی آخری دفاعی لائن یہی مذہبی طبقہ ہے، دینی جماعتیں ہیں، دینی مدارس ہیں اور مختلف مکاتب کے سنجیدہ علمی حلقے ہیں۔ اس دفاعی لائن کو خود اپنے ہاتھوں سے کمزور نہ کریں بلکہ اسے توڑنے کی عالمی سازشوں کا ادراک حاصل کر کے ان کا سدباب کریں ورنہ اس کے بعد کچھ بھی نہیں بچے گا۔ یہ بات حکمران طبقات کے ہر ہر فرد کو یاد رکھنی چاہیے کہ دینی حلقے تو اپنا مذہبی فریضہ سمجھ کر عالمی استعمار کے خلاف صف آرا ہیں، وہ موت کی وادی سے گزر کر بھی سرخرو رہیں گے اور تاریخ ان کا نام ہمیشہ احترام سے لے گی مگر ان کے خون کی قیمت پر استعمار سے زندگی اور اس کی سہولتوں کی بھیک مانگنے والے زندہ رہ کر بھی ذلت و رسوائی سے اپنا دامن نہیں بچا سکیں گے۔

جہادی تربیتی مراکز
اور تحریکِ جعفریہ پاکستان

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۵ مارچ ۲۰۰۰ء

افغانستان میں جہادی تربیت کے عسکری کیمپوں کے بارے میں ایک کالم میں ہم نے گزارش کی تھی کہ ان کی بندش کا مطالبہ درست نہیں ہے کیونکہ کشمیر، فلسطین، بوسنیا، کوسوو، چیچنیا، مورو، اراکان اور دیگر علاقوں میں مسلمان مجاہدین آزادی اور اپنے اسلامی تشخص کے تحفظ کے لیے جو جنگ لڑ رہے ہیں اس جنگ کا تربیتی سرچشمہ یہی کیمپ ہیں اور ان کیمپوں کے بند ہونے کا براہ راست نقصان ان جہادی تحریکات کو ہو گا اس لیے امریکہ ان کیمپوں کی بندش کا مطالبہ کر رہا ہے لہٰذا ان کیمپوں کی بندش

کا مطلب دنیا بھر کی جہادی تحریکات کو ایک بہت بڑے سہارے سے محروم کر دینا ہوگا۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ ہو سکتا ہے ان کیمپوں سے تربیت حاصل کرنے والے کچھ افراد نے پاکستان میں اس تربیت کا غلط استعمال بھی کیا ہو جس سے ملک میں دہشت گردی کو فروغ حاصل ہوا ہے اور لاقانونیت میں اضافہ ہوا ہے لیکن ایسے افراد کا تناسب بہت کم ہے اس لیے ان کی روک تھام کے لیے کوئی اور بندوبست ہونا چاہیے اور چند فیصد لوگوں کے غلط کردار کی وجہ سے سرے سے ان کیمپوں کو بند کرنے کا مطالبہ کر کے امریکی ایجنڈے کو آگے نہیں بڑھانا چاہیے۔

اس پر تحریک جعفریہ پاکستان کے مولانا اظہار بخاری صاحب کا درج ذیل خط موصول ہوا ہے:

”محترم جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب۔

السلام علیکم، مزاج گرامی!

گزشتہ دنوں (۲۸ فروری ۲۰۰۰ء) روزنامہ اوصاف میں آپ کا کالم ”وزیر داخلہ سے دو اہم گزارشات“ کے عنوان سے پڑھا جس میں آپ نے اسلحہ کی نمائش پر پابندی اور افغانستان میں موجود دہشت گردی کے کیمپوں کے حوالے سے اپنا موقف واضح کیا ہے۔ اول الذکر مسئلہ پر آپ کی تجاویز سے ہم کافی حد تک اتفاق کرتے ہیں لیکن آخر الذکر مسئلہ کے ضمن میں نہ صرف اختلاف رکھتے ہیں بلکہ حقائق کی روشنی میں اس کی وضاحت بھی آپ کو ارسال کر رہے ہیں تاکہ آپ سمیت ہر انصاف پسند اور باشعور شہری حقیقت حال سے آگاہ ہو سکے۔

وطن عزیز میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کا آغاز ایک مخصوص شدت پسند گروہ کی فتویٰ سازی اور غلیظ نعرہ بازی کی وجہ سے ہوا جس میں ان ملاؤں نے ایک خاص ایجنڈے کے تحت سادہ لوح اور جذباتی نوجوانوں کو شیعہ عوام کے قتل عام پر اکسایا جس کا انجام ”لشکر جھنگوی“ کی تشکیل تک پہنچا، آج یہی گروہ دہشت و وحشت کا سرخیل ہے۔

اسلامی جہاد پر عالم اسلام کے تمام مکاتبِ فکر نہ صرف متحد و متفق ہیں بلکہ اسے اصول دین میں شمار کرتے ہیں۔ مسلک اہل بیت میں جہاد انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ آج پوری دنیا میں تمام مکاتب و مسالک کے پیروکار اپنے دائرہ میں جہاد کے ذریعے امریکہ، روس، اسرائیل، ہندوستان اور دیگر استعماری طاقتوں کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ اور حیدر کرار کی جرأت و بہادری سے الہام حاصل کرتے ہوئے دشمنان اسلام پر

اسلام کا سکہ جما رہے ہیں۔

گزشتہ دہائی میں نام نہاد سپر پاور روس کے خلاف افغانستان کے محاذ پر مختلف جہادی قوتیں نمودار ہوئیں اور پھر متحد ہونے کے بعد منتشر ہوئیں۔ یہاں ہم جہادی قوتوں کے باہمی اختلافات سے قطع نظر جہاد کے اس طریقہ کے نقصانات پر بات کریں گے جس کی وجہ سے امت مسلمہ باہمی نزاع کی کیفیت سے دوچار ہوئی۔ افغانستان سے روسی افواج کے انخلا کے بعد جہادی قوتیں کشمیر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ تقریباً اسی دور میں یا پھر تھوڑے ہی عرصے بعد پاکستان میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کے واقعات کا آغاز ہوا۔ ان واقعات کے ملزمان اور مجرمان گرفتار ہوتے رہے اور انہوں نے فرقہ وارانہ دہشت گردی کی سرپرستی کرنے والوں، فرقہ وارانہ دہشت گردی کی وجوہات، اسباب فرقہ وارانہ دہشت گردی کے مراکز، سرکاری سرپرستی اور ایجنسیوں کے کردار کے بارے میں حیران کن اور ہوشربا انکشافات کیے۔ اس کے علاوہ وزیراعظم سے لے کر ایک تھانے کے ایس ایچ او تک تمام نے وقتاً فوقتاً فرقہ وارانہ دہشت گردی کے اسباب و مضمرات اور حقائق کو بے نقاب کیا۔

انہی حقائق میں سے ایک حقیقت یہ بھی سامنے آئی کہ افغانستان میں موجود جہادی تربیتی کیمپوں میں پاکستان کے شیعہ سنی عوام کو قتل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے اور مخصوص نظریات کے حامل افراد نوجوانوں کے ذہن زہر آلود کر کے انہیں جنونی بنا کر لوگوں کے قتل کے لیے تیار کرتے ہیں اور یہ نوجوان گروہوں، لشکروں اور گینگز کی شکل میں پاکستان میں داخل ہوتے ہیں اور منظم منصوبہ بندی کے تحت فرقہ وارانہ دہشت گردی کے واقعات کرتے ہیں۔ دو تین ماہ قبل معروف اشتہاری دہشت گرد راحیل نے گرفتاری کے بعد جو انکشافات کیے تھے وہ دیگر اخبارات کی طرح آپ کے اخبار اوصاف میں بھی جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئے جس میں اس نے کھلے عام کہا کہ ہم ایک فرقہ کے پیروکار کو قتل کرنا واجب سمجھتے ہیں اور ہمارے مراکز افغانستان میں موجود ہیں نیز ہمارے تربیتی کیمپ لشکر جھنگوی کے کمانڈر اب بھی چلا رہے ہیں۔

گزشتہ دور حکومت میں وزیراعظم نواز شریف، وزیر داخلہ چوہدری شجاعت حسین اور وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کے واضح بیانات اور آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کے دورہ افغانستان نے ہماری طرف سے کئی سالوں سے پیش کیے جانے والے

موقف کی تائید کر دی جس میں ہم نے کہا کہ دہشت گردی کے سرچشمے افغانستان میں موجود ہیں۔ آج بھی جنرل پرویز مشرف اور وزیر داخلہ جنرل معین الدین حیدر نے ان کیمپوں کے بارے میں تشویش ظاہر کر کے نہ صرف ہمارے موقف پر مہر تصدیق ثبت کی ہے بلکہ وطن عزیز کی خیر خواہی کرتے ہوئے اور امن و امان کے قیام کے لیے ان کیمپوں کے خاتمے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس سے یہ مقصد لینا کہ حکومت یا تحریک جعفریہ جہاد کی حامی نہیں قطعاً درست نہیں ہے۔

جہاد کی حمایت پاک فوج اور اس کے ادارے سے بڑھ کر کس نے کی ہے؟ یہ آپ اور ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی بھی مخلص و محب وطن پاکستانی اور مسلمان جہاد کا مخالف نہیں ہو سکتا۔ البتہ جہاد کی آڑ میں عبادت گاہوں تک میں مسلمانوں کے قتل عام اور باہمی کشت و خون کرنے والے فرقہ پرست جنونیوں کی کارروائیوں سے ہر مسلمان پریشان ہے۔ افغانستان میں دہشت گردی کے تربیتی کیمپوں کی موجودگی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ پاکستان میں دہشت و بربریت کی علامت سمجھا جانے والا شخص اور دہشت گردوں کا سرغنہ ریاض بسرا اور اس کے ساتھی کابل کے نواح میں موجود ہیں اور بقول عوامی اخبارات اور دہشت گردوں کے انکشافات کے وہ دہشت گردوں کے کیمپ بھی چلا رہا ہے اور امارت اسلامی افغانستان اس طرف کوئی توجہ نہیں دے رہی بلکہ حکومت پاکستان اور پاکستانی عوام کے مطالبے پر پس و پیش اختیار کر رہی ہے۔

آپ جیسے بالغ نظر اور وسیع القلب شخص کی طرف سے اس طرح کا موقف تعجب خیز ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ارض وطن پر مسلمانوں کی وحدت و یکجہتی کے فروغ، فرقہ وارانہ دہشت گردی کے ناسوروں کے خاتمے، امن و امان کے قیام، اسلامی مسالک و مکاتب کے اتحاد کی خاطر اپنے نقطۂ نظر میں اصلاح کریں گے اور ہمارے نقطۂ نظر کو اپنے کالم میں جگہ دے کر اس طرح کے سنگین مسائل کے حوالے سے عوام میں پائی جانے والی تشویش کا خاتمہ کریں گے۔ ہم آپ کے عملی اور تحریری تعاون (بذریعہ اوصاف) کے منتظر ہیں۔

نیک خواہشات کے ساتھ

والسلام، سید اظہار بخاری

انچارج میڈیا سیل تحریک جعفریہ پاکستان"

ہمیں واقعتاً اس سے قبل یہ معلوم نہیں تھا کہ افغانستان میں عسکری تربیت کے مراکز کی بندش کے سلسلہ میں امریکہ کے ساتھ تحریک جعفریہ پاکستان بھی شریک ہے اور ہمارا خیال تھا کہ تحریک جعفریہ شاید ہماری طرح اس عسکری تربیت کے غلط استعمال کی روک تھام پر زور دے رہی ہے۔ مگر اس خط سے واضح ہوا ہے کہ تحریک جعفریہ ان کیمپوں کی مکمل بندش چاہتی ہے اور یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ان کیمپوں کو بند کرانے کے لیے جنرل ضیاء الدین بٹ نے آئی ایس آئی کے سربراہ کی حیثیت سے افغانستان کا جو دورہ کیا تھا اسے تحریک جعفریہ کی حمایت حاصل تھی۔

خط قارئین نے پڑھ لیا ہے، ہم اس پر کوئی تفصیلی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ان کالموں میں ہم اس مسئلہ پر وضاحت کے ساتھ اظہار خیال کر چکے ہیں۔ البتہ بطور یاددہانی دو امور کا اعادہ اس خط سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے کر رہے ہیں:

1. ایک یہ کہ واقعات کی ترتیب یہ نہیں ہے جو اس مکتوب میں ظاہر کی گئی ہے بلکہ اصل ترتیب یہ ہے کہ ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد پاکستان میں تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے انقلاب ایران کی نمائندگی کے دعوے کے ساتھ پاکستان میں فقہ جعفریہ کے متوازی نفاذ کا مطالبہ کیا اور اس مقصد کے لیے اسلام آباد کے سول سیکرٹریٹ کا محاصرہ کیا گیا۔ اس کے بعد اس کے ردعمل کے طور پر سپاہ صحابہؓ وجود میں آئی اور اس نے تشدد کے جواب میں تشدد کی پالیسی اختیار کی اور دونوں طرف کے تشدد میں روز بروز اضافہ کی وجہ سے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے ان کالموں میں تشدد اور جواب تشدد دونوں کو ہمیشہ غلط قرار دیا ہے اور آج بھی دونوں کو غلط کہتے ہیں۔

2. دوسری گزارش یہ ہے کہ سید اظہار بخاری صاحب نے اپنے مکتوب میں شیعہ رہنماؤں اور کارکنوں کے قتل عام کا ذکر کیا ہے جو بلاشبہ اور افسوسناک اور انتہائی افسوسناک ہے لیکن وہ دوسری طرف کا ذکر اس طرح گول کر گئے ہیں جیسے ان کے مخالف کیمپ میں سرے سے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حالانکہ اس دوران اہلِ سنت کے مذہبی رہنماؤں اور کارکنوں کے قتل کا تناسب بھی کچھ کم نہیں ہے۔ چونکہ دونوں طرف ہونے والے واقعات قارئین کے سامنے ہیں اس لیے اس کے ذکر کو مزید بڑھا کر ہم تلخ یادوں کو پھر سے تازہ نہیں کرنا چاہتے مگر ایک سادہ سا سوال ہے کہ اگر شیعہ رہنماؤں اور کارکنوں کو قتل کرنے والے ”دہشت گردوں“ نے افغانستان کے کیمپوں میں ٹریننگ حاصل کی ہے تو سنی رہنماؤں اور کارکنوں کا وسیع

پیمانے پر قتل عام کرنے والے ”دہشت گردوں“ کے تربیتی مراکز کہاں ہیں؟ اور اگر ان کیمپوں کا سراغ مل جائے تو کیا تحریک جعفریہ پاکستان ان کی بندش کا مطالبہ کرنے میں بھی اسی مستعدی اور سرگرمی کا مظاہرہ کرے گی؟

ہمارے خیال میں اس قسم کی یکطرفہ سوچ نے معاملات کو یہاں تک پہنچایا ہے ورنہ اگر دونوں فریق معروضی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے انصاف کے مسلمہ تقاضوں کو نظرانداز نہ کریں تو صورتحال اب بھی قابو میں آسکتی ہے۔ ہم ملک کے سنجیدہ حلقوں کی اس خواہش کے ساتھ متفق اور اس کے مؤید ہیں کہ جہادی تربیت کے مراکز میں ٹریننگ حاصل کرنے والوں کو ملک کے داخلی معاملات بالخصوص فرقہ وارانہ کشیدگی میں ملوث نہیں ہونا چاہیے اور اس کے سدباب اور روک تھام کے لیے پاکستان، افغانستان اور ایران کی حکومتوں کے درمیان باضابطہ طور پر جو معقول سسٹم طے کیا جا سکتا ہے ہم اس کا خیر مقدم کریں گے بشرطیکہ یہ نظام یکطرفہ نہ ہو بلکہ دونوں طرف کے ”دہشت گردوں“ کا راستہ روکنے والا ہو۔ لیکن اپنے اس موقف پر ہم آج بھی قائم ہیں کہ دہشت گردی کی روک تھام کے نام پر سرے سے ان کیمپوں کی بندش کا مطالبہ خالصتاً امریکی ایجنڈا ہے اور ہم دنیا بھر کی جہادی تحریکات سے بے وفائی کرتے ہوئے اس امریکی ایجنڈے کو آگے بڑھانے والی کسی کارروائی یا تجویز کی حمایت نہیں کر سکتے۔

جہادی تربیتی کیمپ: وزیر داخلہ کے نام کھلا خط

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۸ اپریل ۲۰۰۰ء

بعد از سلام مسنون!

گزارش ہے کہ گزشتہ روز ایک قومی اخبار نے آنجناب کے حوالہ سے خبر شائع کی ہے کہ ”امریکہ کی طرف سے پاکستان سے دہشت گردی کی روک تھام کے لیے اقدامات کرنے کے مطالبہ پر لندن میں اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے وزیر داخلہ نے صحافیوں کو بتایا کہ انہوں نے طالبان کی حکومت پر واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنی سرزمین پر موجود تمام تربیتی کیمپ بند کر دے جہاں پر پاکستان کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مسلح تربیت حاصل کرتے ہیں“۔ وزیر داخلہ معین الدین حیدر نے کہا ہے کہ ”انہوں نے سپاہ صحابہؓ اور سپاہ محمدؐ پر بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ قتل و غارت گری بند کر دیں اور اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو حکومت ان کے خلاف سختی سے نمٹے گی“۔

میں اس سلسلہ میں آنجناب کی توجہ چند حقائق کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، امید ہے کہ آپ ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے۔ افغانستان میں موجود عسکری تربیت کے کیمپوں اور طالبان کی اسلامی حکومت کے بارے میں ایک عرصہ سے عالمی سطح پر اس تاثر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ان کیمپوں میں دہشت گردی کی تربیت دی جارہی ہے اور طالبان حکومت اس دہشت گردی کی سرپرستی کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان میں سنی شیعہ کشمکش اور باہمی قتل وغارت کے عنصر کو شامل کر کے اس تاثر کو یہ رخ دیا جارہا ہے کہ پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل وغارت کرنے والے سب لوگ انہی کیمپوں میں تربیت پاتے ہیں اس لیے پاکستان میں فرقہ وارانہ امن کے قیام کے لیے یہ ضروری ہے کہ افغانستان کے ان جہادی تربیتی مراکز کو بند کر دیا جائے۔

یہ تاثر انتہائی گمراہ کن ہے جو مغربی میڈیا اور مغرب کی سیکولر لابیاں منظم طور پر پھیلا رہی ہیں اور امریکہ اس میں قائدانہ کردار ادا کر رہا ہے جس نے جنوبی ایشیا میں اپنے استحصالی اور استعمار پسندانہ عزائم کو بروئے کار لانے کے لیے یہ تکنیک اختیار کی ہے اور میں آنجناب سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حالات کا اصل منظر یہ نہیں ہے جو ورلڈ میڈیا کے ذریعے پیش کیا جارہا ہے۔ اور آپ جیسے سنجیدہ حضرات نے بھی اگر اس کی تائید شروع کر دی ہے، اس سے یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ امریکہ جنوبی اور وسطی ایشیا کے حوالہ سے اپنے ایجنڈے کے لیے اس خطہ کے حکمران طبقہ کو اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور جنوبی ایشیا کے دورہ سے صدر کلنٹن کے خالی ہاتھ واپس جانے کا تاثر امریکی ذرائع ابلاغ کی طرف سے طے شدہ پالیسی کے تحت اندرون خانہ طے ہونے والے معاملات پر پردہ ڈالنے کے لیے دیا جارہا ہے۔

جناب والا! امریکہ اس خطہ میں جو کچھ چاہتا ہے وہ یقیناً آپ سے مخفی نہیں ہوگا، میں یاددہانی کے طور پر بعض اہم امور کا ذکر اس عریضہ میں مناسب سمجھتا ہوں:

- امارت اسلامی افغانستان کی حکومت نے مغربی ثقافت اور اقوام متحدہ کے منشور کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی بنیاد پر خالص اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کا جو عزم کر رکھا ہے وہ امریکہ کے لیے قابل قبول نہیں ہے اور امریکہ طالبان پر دباؤ ڈال کر انہیں ”وسیع البنیاد حکومت“ کے نام پر ایک ایسی مشترکہ حکومت کا حصہ بننے پر مجبور کرنا چاہتا ہے جو دنیا کی بہت سی دیگر مسلم حکومتوں کی طرح ”اسلام اسلام“ کا راگ تو الاپتی رہے مگر افغانستان میں اقوام متحدہ کے منشور کے نفاذ اور مغربی ثقافت اور کلچر کے فروغ میں رکاوٹ نہ بنے۔

- اس خطہ کی معیشت پر پہلے سے حاصل بالادستی کو امریکہ ''آزادانہ تجارت'' اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے مکمل اجارہ داری اور کنٹرول میں تبدیل کرنا چاہتا ہے اور چین سمیت کسی بھی دوسری قوت کے اس میں در آنے کے امکانات کو مکمل طور پر ختم کر دینا چاہتا ہے۔
- امریکہ چین کے خلاف بھارت کی سربراہی میں متحدہ محاذ کے قیام میں اسلامی جمہوریہ پاکستان اور امارت اسلامی افغانستان کو رکاوٹ سمجھتا ہے اور ان رکاوٹوں کو اس قدر کمزور کر دینا چاہتا ہے کہ وہ امریکہ یا بھارت کے کسی بھی اقدام کی راہ میں کسی درجہ میں بھی حائل نہ ہو سکیں۔
- امریکہ اور بھارت کو مشترکہ طور پر پریشانی یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی مسلح افواج کے خلاف جو مجاہدین سالہا سال سے نبرد آزما ہیں اور جن کی جدوجہد اور قربانیوں کی وجہ سے مسئلہ کشمیر ایک بار پھر عالمی ایجنڈے میں اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے ان مجاہدین نے افغانستان کے انہی تربیتی مراکز میں ٹریننگ حاصل کی ہے اور ان تربیتی مراکز کو بند کرائے بغیر کشمیری مجاہدین کی سپلائی لائن کو کاٹا نہیں جا سکتا اور نہ ہی مسئلہ کشمیر کی اہمیت کو کم کیا جا سکتا ہے۔
- امریکہ کو یہ بھی پریشانی ہے کہ افغانستان میں جو تربیتی مراکز خود اس کے تعاون سے قائم ہوئے تھے اور جن مراکز نے افغان قوم کو روسی افواج کے مقابلہ میں صف آرا کر کے سوویت یونین کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا تھا ان مراکز سے دنیا بھر کے دیگر مسلم مجاہدین نے بھی عسکری تربیت حاصل کر لی ہے اور بوسنیا، کوسوو، فلسطین، کشمیر، چیچنیا، مورو، اراکان اور صومالیہ وغیرہ میں اسلام کی سربلندی کے نام سے صف آرا ہو چکے ہیں جس سے دینی حلقے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہے ہیں جس سے مسلم دنیا میں جہاد کا وہ عمل اور جذبہ ایک بار پھر عالمی سطح پر منظم ہو رہا ہے جسے ختم کرنے کے لیے مغربی طاقتیں دو صدیوں سے اپنے تمام وسائل کے ساتھ مصروف کار رہی ہیں مگر ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود فلسطین سے انڈونیشیا تک اور چیچنیا سے صومالیہ تک پوری دنیائے اسلامی میں پھر سے جہاد کے نعرے پورے جوش و خروش کے ساتھ گونج رہے ہیں۔ اور اسی وجہ سے امریکہ افغانستان کے ان تربیتی مراکز کو جلد از جلد بند کرانے کے لیے بے چین ہے۔

جناب وزیر داخلہ! جہاں تک پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ اور فرقہ وارانہ قتل و غارت گری کا تعلق ہے یہ بلاشبہ انتہائی افسوسناک بلکہ شرمناک ہے اور اس کی روک تھام کے لیے حکومت

پاکستان اور تمام تر قومی حلقوں کو سنجیدگی کے ساتھ پیش رفت کرنی چاہیے۔ لیکن اس فرقہ وارانہ قتل و غارت کا ذمہ دار افغانستان کے تربیتی کیمپوں کو ٹھہرانا اور اس کی آڑ میں طالبان حکومت سے ان مراکز کی بندش کا مطالبہ کرنا سراسر ناانصافی اور ظلم ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ ان کیمپوں سے تربیت پانے والے کچھ افراد پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت میں ملوث ہوئے ہوں گے لیکن یہ ہر ادارے میں ہوتا ہے۔ اگر پاکستان کی جیلوں اور مقدمات کے ریکارڈ کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لے لیا جائے کہ ملک بھر میں قتل و غارت کرنے والے افراد نے اسلحہ چلانے کی ٹریننگ کہاں کہاں حاصل کی ہے تو ان میں یقیناً ایسے افراد نکل آئیں گے جنہوں نے اسلحہ کی تربیت پاک فوج اور پولیس کے تربیتی مراکز میں حاصل کی ہوگی۔ لیکن کوئی بھی باہوش شخص محض اس بنا پر پاک فوج اور پولیس کے تربیتی مراکز کو ملک میں بدامنی اور قتل کا ذمہ دار قرار نہیں دے گا اس لیے کہ چند افراد کی انفرادی کارروائیوں کو اداروں اور مراکز کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاتا۔ اسی طرح افغانستان کے تربیتی مراکز کو بھی پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا باعث اور ذمہ دار قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔

پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ اور فرقہ وارانہ قتل و غارت کے اصل عوامل اور سرچشمے کچھ اور ہیں اور اگر آپ ان اسباب و عوامل کی نشاندہی اور سدباب میں سنجیدہ ہیں تو میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں اعلیٰ سطحی عدالتی کمیشن قائم کیا جائے جو آزادانہ انکوائری کے ذریعے سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ کے اسباب و عوامل اور فرقہ وارانہ قتل و غارت کے سرچشموں کی نشاندہی کرے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس آزادانہ اعلیٰ سطحی عدالتی انکوائری کے ذریعے پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کے فروغ میں افغانستان کے تربیتی مراکز کا کوئی کردار سامنے آیا تو اس کے سدباب اور روک تھام کے لیے ہر اقدام کی حمایت کی جائے گی مگر محض امریکی رپورٹوں کی بنیاد پر افغانستان کے تربیتی مراکز کو پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا ذمہ دار قرار دے کر ان کی بندش کے لیے طالبان حکومت پر کسی بھی قسم کے دباؤ کی پالیسی کو ہم جہاد کے خلاف امریکی مہم کا حصہ سمجھتے ہیں اور اس کی کسی درجہ میں تائید کے لیے تیار نہیں ہیں۔

جناب معین الدین حیدر! میں آپ کو چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کے وہ ریمارکس یاد دلانا چاہتا ہوں جو انہوں نے جنوری ۲۰۰۰ء کے وسط میں امریکی سینٹروں کے دورۂ پاکستان کے موقع پر ان سے گفتگو کے دوران دیے تھے اور جنہیں ایک قومی اخبار نے ان الفاظ میں رپورٹ کیا تھا کہ

> ”چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کے وفد کو دوٹوک الفاظ میں بتادیا ہے کہ پاکستان جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگا سکتا اور نہ ہی مسلمانوں کو جہاد سے

روکا جاسکتا ہے جیسے روس کے خلاف جہاد کو نہیں روکا جاسکا تھا۔ اعلیٰ عسکری ذرائع کے مطابق جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جہاد مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے، امریکہ کو دہشت گردی اور جہاد میں بنیادی فرق کو سمجھنا ہوگا۔ ان اعلیٰ عسکری ذرائع کے بقول جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینٹروں کو بتایا کہ پاکستان نے دہشت گردی اور ہائی جیکنگ کی ہمیشہ مذمت کی ہے اور کرتا رہے گا تاہم جہاں تک جہاد کا تعلق ہے یہ اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے۔ دنیا میں مسلمان جہاں بھی جہاد کرتے ہیں وہ دراصل اپنا مذہبی فریضہ نبھاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جہادی تنظیمیں صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں سرگرم عمل ہیں اور یہ تنظیمیں کشمیر ہو یا چیچنیا جہاں بھی جہاد کر رہی ہیں اسے روکا نہیں جاسکتا۔“

جناب وزیر داخلہ! جہاد اور دہشت گردی کے حوالے سے ہمارا موقف بھی یہی ہے اور ہم اس پر بدستور قائم ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف آپ کے ہر منصفانہ اقدام کی حمایت کریں گے مگر دہشت گردی کے خلاف کارروائی کے نام پر جہاد کے عمل، جہادی تحریکات اور جہادی تربیتی مراکز کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی پاکستان کے دینی حلقوں کے لیے قطعی طور پر قابل قبول نہیں ہوگی۔ امید ہے کہ آنجناب بھی اپنی پالیسی ترجیحات میں ”جہاد“ اور ”دہشت گردی“ کے اس بنیادی فرق کو ملحوظ رکھ کر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کریں گے۔

پاکستان، افغانستان اور ایران کی کنفیڈریشن کی تجویز

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۸ اپریل ۲۰۰۰ء

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے گزشتہ روز لاہور میں منعقدہ ایک تقریب میں اپنے دورۂ افغانستان کے تاثرات بیان کرتے ہوئے تجویز پیش کی ہے کہ پاکستان، افغانستان اور ایران پر مشتمل کنفیڈریشن قائم کی جائے اور تینوں ملک اپنے وسائل یکجا کر کے عالمِ اسلام کے وسیع تر اتحاد کی طرف پیش رفت کا آغاز کریں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے طالبان کی اسلامی حکومت کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ طالبان نے افغانستان میں مثالی امن قائم کیا ہے اور وہ انتہائی مشکلات اور تکالیف کے باوجود پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں جس کا ہمیں احساس تک نہیں ہے، اس لیے ان کی تجویز یہ ہے کہ پاکستان میں عوامی سطح پر

افغانستان کی حکومت اور عوام کے ساتھ تعاون کے لیے ''افغان فنڈ'' قائم کیا جائے اور طالبان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا جائے۔ اس سے قبل تنظیم اسلامی پاکستان کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد بھی پاکستان اور افغانستان پر مشتمل کنفیڈریشن قائم کرنے کی تجویز پیش کر چکے ہیں مگر ان کی تجویز میں ایران کا ذکر نہیں تھا جبکہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے پاکستان اور افغانستان کی اس مجوزہ کنفیڈریشن میں ایران کو شامل کرنے کی تجویز بھی دی ہے۔

جہادِ افغانستان اور وسطی ایشیا سے روس کی پسپائی

جہادِ افغانستان کے نتیجے میں وسطی ایشیا سے روسی استعمار کی پسپائی کے بعد وسطی اور جنوبی ایشیا کے مستقبل کے سیاسی نقشے کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے اور ہر طبقہ کے اہل دانش اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس سلسلہ میں اظہار خیال کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ دہلی سے شائع ہونے والے ایک تحقیقی مقالہ نے صورتحال کے اس رخ کی نشاندہی کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ بھارت کے انتہا پسند ہندوؤں میں وسطی ایشیا، افغانستان اور پاکستان کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں اس خطہ میں مغل ایمپائر دوبارہ زندہ تو نہیں ہو رہا؟ تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر خود راقم الحروف کا وجدان بھی یہی کہتا ہے کہ ایک طرف پاکستان، افغانستان اور وسطی ایشیا میں بڑھتے ہوئے روابط اور دوسری طرف جنوبی ہند میں ہندو انتہا پسندی کی روز افزوں منظم ہوتی ہوئی جذباتی تحریکات سے یوں لگتا ہے جیسے ہم پانی پت کی چوتھی اور آخری لڑائی کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں جو غالباً وہی لڑائی ہوگی جسے بعض احادیث کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''غزوۂ ہند'' سے تعبیر کیا ہے اور جس کے بارے میں بعض اللہ والوں کی پیشین گوئیاں تاریخ کے ریکارڈ میں موجود ہیں کہ یہ فیصلہ کن اور آخری جنگ ہوگی جس کے بعد اس خطہ میں اسلام کا پرچم ایک بار پھر پوری آب و تاب کے ساتھ لہرائے گا اور مشرقِ وسطیٰ اور مشرق بعید کی اسلامی قوتوں کے درمیان جنوبی ایشیا کی یہ پٹی جو خلیج کے طور پر حائل دکھائی دیتی ہے مکمل طور پر کاٹ دی جائے گی۔

اس لیے تاریخی عمل کے ایک منطقی مرحلہ کے طور پر پاکستان اور افغانستان کے درمیان ایک ایسا تعلق ناگزیر دکھائی دیتا ہے جو دونوں کو ایک متحد قوت کی شکل دے دے اور دونوں کی قوت و وسائل اور توانائیاں یکجا ہو کر ایک بار پھر اسی طرح جنوبی ہند کی انتہا پسند اور جنونی ہندو قوت کے سامنے متحد ہو کر صف بندی کریں جس طرح مرہٹوں کی خوفناک یلغار کے مقابلہ میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دعوت پر والیٔ افغانستان احمد شاہ ابدالیؒ نے پانی پت کے میدان میں معرکہ بپا کر کے مرہٹوں کی قوت کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ مگر اس میں ایران کی شرکت کی بات تاریخی پس منظر کے حوالہ سے ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اور ہم

اس کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔

ترکی کی خلافتِ عثمانیہ اور ایران کے صفوی حکمران

ماضی کا ریکارڈ یہ کہتا ہے کہ ایران کے صفوی حکمرانوں نے جہاں ایک طرف ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کے خلاف معرکہ کارزار ہر دور میں سرگرم رکھا وہاں وہ وسطی ایشیا میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے اور متحدہ ہندوستان کی مسلم حکومت کو خلافتِ عثمانیہ سے کاٹ کر رکھنے کی پالیسی پر بھی مسلسل عمل پیرا رہے، اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ دہلی پر ان افغانوں کی حکومت قائم نہ ہونے پائے جو مذہبی طور پر اہل السنۃ والجماعۃ کے خالص رجحانات کے حامل تھے۔ چنانچہ افغانوں کے مقابلہ میں مغل حکمران ہر دور میں ایران کے صفوی بادشاہوں کے منظورِ نظر رہے اور بابر بادشاہ کو نہ صرف سمرقند کے قبضہ میں صفیوں کا تعاون حاصل رہا بلکہ شیر شاہ سوری کے ہاتھوں بابر کی شکست کو اس کے بیٹے ہمایوں کے ذریعے دوبارہ شکست میں تبدیل کرنے میں بھی صفوی بادشاہت نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ جبکہ شیر شاہ سوری کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اہلِ سنت کے عقائد اور رجحانات کا حامل تھا اور اس کے شاہی سکہ پر ایک طرف اس کا نام بطور بادشاہ درج تھا اور دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے اسمائے گرامی کندہ تھے جو شیر شاہ سوری کی حکومت کے مذہبی رجحانات کی نشاندہی کر رہے تھے۔

افغانوں اور مغلوں کی کشمکش

تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر میرا مطالعہ یہ کہتا ہے کہ اگر شیر شاہ سوری کے جانشینوں کو ہمایوں کے ہاتھوں شکست نہ ہوتی اور افغان حکومت کی جگہ دہلی میں مغل حکومت قائم نہ ہوتی تو برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش میں اسلام ایک اسلامی نظریاتی حکومت کے طور پر سامنے آتا، اور اس خطہ کا نہ صرف خلافتِ عثمانیہ کے ساتھ باقاعدہ تعلق قائم ہو جاتا بلکہ دعوت و تبلیغ کے مسلسل ماحول کی وجہ سے یہ صورتحال یقیناً نہ سامنے آتی کہ انگریزوں کے ہاتھوں مغل حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی اس خطہ میں ہندوؤں ہی کی اکثریت باقی رہتی۔ مگر افغانوں کے مقابلہ میں مغلوں کا مزاج نسبتاً سیکولر تھا جنہوں نے مذہب کی بجائے علاقائی کلچر کے فروغ کو ترجیح دی اور اسلامی حکومت کی راہ ہموار کرنے کی بجائے مسلم حکومت کے ٹائٹل پر قناعت کرتے ہوئے پورے جنوبی ایشیا میں اسلام کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا۔ شیر شاہ سوری کی حکومت کے خاتمہ میں یقیناً اس کے جانشینوں کی نااہلی کا بڑا دخل تھا مگر اس میں سب سے اہم کردار ایران کے صفوی حکمرانوں کا رہا ہے۔ اور اس کے بعد بھی

دہلی کے معاملات میں ان کی مداخلت کا یہ حال تھا کہ اورنگزیب عالمگیر کی اسلامی حکومت کو کامیاب ہوتا دیکھ کر اس کے بیٹوں اور اہل خاندان کو ورغلانے اور پھر دہلی پر نادر شاہ کے حملہ، وحشیانہ قتل عامہ اور لوٹ مار کے مراحل طے کر جانے میں بھی ایرانی حکمرانوں کو کوئی عار محسوس نہیں ہوئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دلی پر جب تک مسلمان حکومت رہی اسے ایرانیوں کی مداخلت کا ہمیشہ سامنا رہا۔

چنانچہ جب میرے جیسا طالب علم اس تاریخ کو پڑھتا ہے تو اسے یہ سن کر ہی پریشانی ہونے لگتی ہے کہ کیا پاکستان اور افغانستان کی حکومتیں ایک بار پھر اسی دور میں واپس چلی جائیں گی اور ہمارے مقدر میں کیا کوئی اور نادر شاہ بھی تاریخ نے اپنے دامن میں چھپا رکھا ہے؟ اس لیے محترم ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے بصد ادب و احترام گزارش ہے کہ عالمِ اسلام کے اتحاد کے لیے ان کا جذبہ اپنی جگہ قابل قدر ہے اور بلاشبہ یہ ان کے عظیم باپ علامہ محمد اقبالؒ کی خواہش اور آرزو بلکہ ہر باشعور اور حساس مسلمان کی تمنا ہے، مگر اس کے لیے تجاویز کا خاکہ مرتب کرتے ہوئے زمینی حقائق اور تاریخی پس منظر کو نظر انداز نہ کریں۔ کیونکہ ماضی کے تلخ تجربات سے آنکھیں بند کر لی جائیں تو مستقبل کے نقشے میں صحیح رنگ بھرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

شوریٰ سے ولایتِ فقیہ تک

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مئی ۲۰۰۰ء

مشہور عرب دانشور اور محقق الاستاذ احمد الکاتب نے اہلِ تشیع کے سیاسی افکار و نظریات کا تاریخی اور علمی تجزیہ کرتے ہوئے ’’تطور الفکر السیاسی الشیعی من الشوریٰ الی ولایۃ الفقیہ‘‘ کے عنوان سے ایک ضخیم تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے جس میں اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ اہلِ بیت کرام رضوان اللہ اجمعین کے بزرگوں نے عمومی شوریٰ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے قرنِ اول میں جو سیاسی فکر پیش کیا تھا، وہ کس طرح رفتہ رفتہ اہلِ بیت کے دائرہ میں محدود، معصوم اور منصوص امامت کی شکل اختیار کر گیا اور اب اس نے ایران میں ولایتِ فقیہ کی دستوری حیثیت حاصل کر لی۔ یہ کتاب

51 Robert Owen House London SW66JB

نے چند برس بیشتر شائع کی تھی اور راقم الحروف کی شدید خواہش تھی کہ کوئی ادارہ اس کے اردو ترجمہ اور اس کی اشاعت کا اہتمام کر دے تو یہ اہلِ علم کے کام کی چیز ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ دار الشوریٰ لندن نے ہی اس کا اہتمام کر دیا ہے اور یہ ترجمہ ساڑھے چھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل خوبصورت اور معیاری کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام اور اہلِ تشیع کے سیاسی موقف سے

دلچسپی رکھنے والے اربابِ علم و دانش کے لیے یہ گراں قدر تحفہ ہے......

شام میں علمائے اہل سنت کی رہائی

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ---ستمبر ۲۰۰۰ء

ہفت روزہ الہلال اسلام آباد نے ۴ اگست ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں خبر دی ہے کہ شام کے صدر حافظ الاسد کی وفات کے بعد ان کے بیٹے بشیر الاسد نے صدارت سنبھالتے ہی ان سینکڑوں علماء اور دینی کارکنوں کی رہائی کا حکم دیا ہے جنہیں اٹھارہ سال قبل اہل سنت کے خلاف ایک بڑے ایکشن کے بعد گرفتار کر لیا گیا تھا اور وہ اس وقت سے مسلسل زیر حراست تھے۔ ان میں ''اخوان المسلمون'' کے ممتاز راہنما صباح کریمی اور ''احیائے اسلام'' کے ابو عبید اللہ بھی شامل ہیں۔

شام کے آنجہانی صدر حافظ الاسد کا تعلق اہل تشیع کے نصیری فرقہ سے تھا جن کے عقائد میں نعوذ باللہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خدائی کا درجہ دینا شامل ہے، اور سیاسی طور پر وہ انتہا پسند قوم پرست بعث پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے طویل دورِ حکومت میں شام کے علمائے اہل سنت اور اسلامی تحریکات کو انتہائی صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا۔ حتیٰ کہ ۱۹۸۲ء میں ایک بڑے فوجی آپریشن میں اہل سنت کے مرکز ''حماہ'' کو بلڈوزروں سے مسمار کر دیا گیا۔ یہ تاریخی بستی جس کی طرف بہت سے علماء کی نسبت ''حموی'' کے نام سے کتابوں میں مذکور ہے، حلب کے قریب تھی۔ مگر اب اس بستی کا نام و نشان تک موجود نہیں ہے اور وہ چٹیل میدان کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اس آپریشن میں سینکڑوں علماء اور دینی کارکن شہید ہوئے اور ہزاروں کو پابند سلاسل کر دیا گیا۔ جبکہ بہت سے علماء نے جلاوطنی اختیار کر لی جن میں ہمارے شیخ و استاذ اور اپنے دور میں عرب دنیا کے سب سے بڑے حنفی عالم الشیخ الاستاذ عبد الفتاح ابو غدۃؒ بھی شامل ہیں، جو شام کی اخوان المسلمون کے سربراہ تھے مگر جلاوطن ہو کر سعودی عرب چلے گئے اور ان کا انتقال بھی ریاض میں ہوا۔ انہی میں ہمارے محترم دوست الشیخ عمر بکری محمد بھی ہیں جن کا تعلق حلب سے ہے، شافعی المذہب ہیں اور جلاوطن ہو کر لندن میں ''المہاجرون'' نامی ایک پرجوش جماعت کی قیادت کر رہے ہیں۔

حافظ الاسد کے بیٹے اور شام کے نئے صدر بشیر الاسد کے عقائد اور سیاسی وابستگی کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات نہیں ہیں مگر ان کا یہ اقدام ہمارے لیے ایک گونہ خوشی اور اطمینان کا باعث ہے جس سے اٹھارہ سال سے مسلسل ریاستی جبر کا شکار ہونے والے سُنی علماء اور کارکنوں کو رہائی ملی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت شام کے علمائے اہل سنت کے مصائب و مشکلات کو دور فرمائیں اور

انہیں پوری آزادی اور وقار کے ساتھ اپنے وطن میں دین و مذہب کی خدمات سرانجام دینے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

کیا اسلامی نظام صرف مولویوں کا مسئلہ ہے؟

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۴ نومبر ۲۰۰۰ء

وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر نے یہ کہہ کر اسلامی نظام اور اس کی علمبردار دینی قوتوں کے خلاف ایک بار پھر وہی گھسی پٹی دلیلیں دہرائی ہیں جو اس سے قبل پچاس سال سے ہم سن رہے ہیں کہ

> "الگ الگ جھنڈے اٹھا کر مذہبی جماعتیں ملک میں کون سا اسلام نافذ کرنا چاہتی ہیں اور اگر دینی جماعتیں واقعی موزوں، مفید اور مناسب طور پر یہ کام کر رہی ہیں تو وہ اب تک کے الیکشنوں میں اچھے نتائج کیوں نہیں دکھا پائیں؟"

۱۹۵۱ء میں ۲۲ دستوری نکات پر مکاتبِ فکر کا اتفاق

یہ بات پاکستان کے قیام کے بعد ہی سیکولر حلقوں نے کہنا شروع کر دی تھی کہ ملک میں مختلف دینی مکاتب فکر ہیں اور اسلام کی الگ الگ تعبیر و تشریح کر رہے ہیں، اس لیے یہاں کون سا اسلام نافذ کیا جائے گا؟ لیکن تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام نے تحریک پاکستان کے عظیم راہنما علامہ سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت اسلامی نظام کی ۲۲ متفقہ دستوری بنیادیں طے کر کے اس بات کو رد کر دیا تھا اور قوم کو یہ بتا دیا تھا کہ مختلف مکاتب فکر اور فقہی مذاہب میں فروعات، جزئیات اور تعبیرات میں جو اختلافات موجود ہیں ان کا اسلامی نظام (کے نفاذ) سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اسلامی نظام کے اصولوں، طریق کار اور احکام و قوانین کے ضوابط پر وہ سب متفق ہیں۔ اس اتفاق و اجماع میں اہل السنۃ والجماعۃ اور اہل تشیع دونوں شامل تھے۔ اہل سنت کے تمام مکاتب فکر دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور جماعت اسلامی کے اکابر شریک تھے اور کوئی مسلمہ مذہبی مکاتب فکر اس سے باہر نہیں تھا۔ اس لیے یہ دلیل اسی وقت دم توڑ گئی تھی کہ ملک میں کون سا اسلام نافذ کیا جائے اور کس مذہبی مکتب فکر کی تعبیر و تشریح کو نفاذ اسلام کی بنیاد بنایا جائے؟

جناب معین الدین حیدر کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ان دستوری نکات اور خاکہ پر آج بھی ملک کے تمام مکاتب فکر متحد ہیں اور کسی مذہبی فرقہ کو ان سے کوئی اختلاف نہیں ہے اس لیے اگر وزیر داخلہ اور ان کے رفقاء ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے اصولوں سے متفق ہیں تو انہیں "کون سا

اسلام‘‘ کی بے جارٹ چھوڑ کر تمام مکاتب فکر کے متفقہ ۲۲ دستوری نکات کو دستور پاکستان میں سمو کر ان کی بنیاد پر نفاذ اسلام کا آغاز کر دینا چاہیے۔

۱۹۷۳ء کی اسلامی دفعات پر مکاتبِ فکر کا اتفاق

پھر یہ دلیل اس وقت بھی دہرائی گئی تھی جب ۱۹۷۳ء کے دستور کے لیے دستور ساز اسمبلی میں بحث ہو رہی تھی اور دستور ساز اسمبلی میں مولانا مفتی محمودؒ، مولانا عبد الحقؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا عبد المصطفٰی ازہریؒ، مولانا محمد ذاکر اور پروفیسر غفور احمد سمیت تمام بڑے مکاتب فکر کے نمائندے موجود تھے۔ اس وقت حکمران کیمپ کی طرف سے چیلنج کیا گیا تھا کہ یہ علماء تو مسلمان کی قانونی تعریف پر متفق نہیں ہو سکتے اس لیے اسلامی نظام کی متفقہ تعبیر کہاں سے لائی جائے گی مگر ان علماء کرام نے دستور ساز اسمبلی میں نہ صرف مسلمان کی متفقہ تعریف پیش کی بلکہ دستور میں اسلامی نکات کی شمولیت کے لیے متحد ہو کر پارلیمانی جنگ لڑی جس کے نتیجے میں حکمران کیمپ کو اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دینا پڑا اور ملک کے تمام قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھال دینے کی ضمانت دینا پڑی۔ اسمبلی میں موجود علماء کے اس موقف کو اسمبلی سے باہر کے تمام علماء کرام اور مکاتب فکر کی تائید حاصل تھی اور پوری قوم اس پر متفق تھی لیکن دستوری ضمانت کے باوجود ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا وعدہ ابھی تک پورا نہیں ہوا اور قوم بدستور انتظار میں ہے۔

وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر سے گزارش ہے کہ اسی دستور نے اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی ہے جس میں نہ صرف تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام شامل ہیں بلکہ عصری قانونی نظام کے نمائندے بھی موجود ہیں۔ اس کونسل نے ملک کے قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے جو مسودات مرتب کیے ہیں اور جو سفارشات پیش کی ہیں ان پر تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کا اجماع اور اتفاق ہے۔ اور ۲۲ دستوری نکات کی اصولی اور آئینی دستاویز کے بعد ملکی قوانین کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ جامع اور مکمل رپورٹ دوسری بڑی دستاویز ہے جو متفقہ ہے جس سے ملک کے کسی مسلمہ مذہبی مکتب فکر کو اختلاف نہیں اور اس میں تمام مروجہ قوانین کے بارے میں تفصیلی تجزیہ اور سفارشات موجود ہیں۔ اس لیے جب دستور اور قانون دونوں معاملات میں قائم مذہبی جماعتوں کا اتحاد موجود ہے اور ریکارڈ پر ہے تو ہمارے وزیر داخلہ محترم علماء کرام سے اور کس قسم کے اتحاد کا تقاضا کر رہے ہیں اور انہیں مذہبی جماعتوں کے الگ الگ جھنڈوں میں کون سا ایسا اختلاف نظر آ رہا ہے جو اسلامی نظام کے نفاذ میں رکاوٹ بن سکتا ہو؟

عوامی حمایت کی کسوٹی

وزیر داخلہ صاحب نے دوسری بات یہ کی ہے کہ اگر مذہبی جماعتیں مفید ہیں تو انہیں الیکشن میں عوامی حمایت حاصل کیوں نہیں ہوتی؟ ہمارا ان سے سوال یہ ہے کہ اگر عوامی حمایت ہی واحد معیار ہے اور انہوں نے سارے فیصلے اس کی کسوٹی پر پرکھ کر کرنے ہیں تو ان کے پاس بھاری عوامی مینڈیٹ رکھنے والی حکومت اور قومی اسمبلی کو توڑنے کا کیا جواز ہے؟ بے شک عوام نے مولویوں کی حمایت نہیں کی تھی مگر اس اسمبلی کو تو ووٹ دیے تھے، اسے توڑ کر جناب معین الدین حیدر وزارت داخلہ کا قلمدان کس اصول کے تحت سنبھالے ہوئے ہیں؟ ہماری گزارش کا یہ مطلب نہیں کہ ہم موجودہ حکومت کے قانونی اور اخلاقی جواز کو چیلنج کر رہے ہیں بلکہ ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ حکومت کا وجود اور اس میں جناب معین الدین حیدر کا وزارت داخلہ کے منصب کو سنبھالنا اس بات کی دلیل ہے کہ قومی معاملات میں عوامی حمایت اور ووٹنگ پاور واحد معیار نہیں ہے بلکہ اس کے ہوتے ہوئے بھی بعض دیگر امور کی طرف دیکھنا اور انہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے اور بسا اوقات قومی مفاد کے دیگر معاملات عوامی حمایت اور ووٹنگ پاور سے زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں حتیٰ کہ ان کی خاطر عوامی ووٹوں سے منتخب ہونے والی اسمبلیوں اور حکومتوں کو برطرف کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام کے نفاذ کا معاملہ بھی ان اہم ترین قومی امور اور ملی معاملات میں سے ہے جنہیں صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا پرچم اٹھانے والی جماعتوں کو الیکشن میں ووٹ نہیں ملتے۔ یہ ہمارے ایمان کا معاملہ ہے، پاکستان کی نظریاتی بنیاد کا مسئلہ ہے اور ملکی بقا و استحکام کا تقاضا ہے اور اسے اسی حوالہ سے دیکھنا ہوگا۔ ہم مانتے ہیں کہ دینی جماعتوں میں اختلافات موجود ہیں جو اسلامی دستور اور قوانین کے کسی مسئلہ یا ان کے نفاذ کے طریق کار پر نہیں ہیں بلکہ غیر متعلقہ امور اور قیادت کی ترجیحات پر ہیں، اور ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دینی جماعتوں اور ان کی قیادتوں کی یہ باہمی معاصرت اور ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچ کر آگے بڑھنے کی کشمکش نفاذ اسلام کی جدوجہد کے لیے سخت نقصان دہ ہے اور اسی وجہ سے انہیں انتخابات میں عوامی حمایت حاصل نہیں ہوتی۔ ورنہ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی دینی قوتیں متحد ہوئی ہیں عوام نے ان کے پرچم تلے مجتمع ہونے میں کبھی دیر نہیں لگائی۔

نفاذِ اسلام صرف مذہبی جماعتوں کی ذمہ داری ہے؟

لیکن اس سب سے قطع نظر ہم جناب معین الدین حیدر سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ الگ الگ

جھنڈے اٹھانے والی مذہبی جماعتوں کو ایک طرف رہنے دیں، انہیں آپس میں لڑنے جھگڑنے دیں، انہیں بھول جائیں اور صرف یہ دیکھیں کہ اسلام ہماری ملی ضرورت اور قومی تقاضا ہے۔ آپ خود مسلمان ہیں، قرآن و سنت پر ایمان رکھتے ہیں اور اسلامی نظام و قوانین کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، اس لیے جب آپ کے پاس اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت جیسے دستوری اداروں کے مرتب کردہ اسلامی قوانین کے مسودات موجود ہیں تو پھر آپ کو انتظار کس بات کا ہے؟ آپ انہیں نافذ کیوں نہیں کر دیتے اور دنیا کو یہ کیوں نہیں بتا دیتے کہ یہ مذہبی جماعتیں تو خود کو اس کا اہل ثابت نہیں کر سکیں مگر ہم نے پاکستان میں اسلامی نافذ کر دیا ہے اور نوآبادیاتی دور کے استحصالی نظام سے ملک کی جان چھڑا کر قرآن و سنت کے عادلانہ قوانین و احکام کی عملداری قائم کر دی ہے۔ اور اگر وزیر داخلہ صاحب ناراض نہ ہوں تو ڈرتے ڈرتے ان سے یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا اسلامی نظام صرف مولویوں اور مذہبی جماعتوں کا مسئلہ ہے، آپ کا مسئلہ نہیں ہے؟ اور اگر یہ آپ کا مسئلہ بھی ہے تو پھر بال کو مولویوں کی کورٹ میں پھینک کر آپ خود کو ہر ذمہ داری سے بری الذمہ ظاہر کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟

حق نواز کی پھانسی اور مذہبی انتہا پسندی

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۶ مارچ ۲۰۰۱ء

لاہور میں ایران کے خانہ فرہنگ کے ڈائریکٹر آقائے صادق گنجی کے قتل کے جرم میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے مطابق جھنگ کے مذہبی کارکن حق نواز کو میانوالی جیل میں پھانسی دے دی گئی ہے اور اسے اس کی وصیت کے مطابق جامعہ محمودیہ جھنگ میں سپاہ صحابہؓ پاکستان کے بانی مولانا حق نواز شہیدؒ کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس پھانسی کو رکوانے کے لیے سپاہ صحابہؓ کے راہنماؤں نے ہر ممکن کوشش کی اور بعض دیگر دینی حلقوں نے بھی اس سلسلہ میں ان سے تعاون کیا لیکن ایسی کوئی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی اور پھانسی کا یہ عمل پروگرام کے مطابق تکمیل تک پہنچ گیا ہے۔

پھانسی سے چند روز قبل ملک بھر میں سپاہ صحابہؓ کے ساتھ تعلق رکھنے والے سینکڑوں علماء کرام اور کارکنوں کو گرفتار کیا گیا جو بدستور زیر حراست ہیں جبکہ پھانسی کے بعد بھی سپاہ صحابہؓ کے مظاہروں اور علماء و کارکنوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہے اور بعض پرتشدد واقعات میں کئی اور جانیں بھی اس پھانسی کی نذر ہوگئی ہیں۔ حکومت کا موقف یہ ہے کہ عدالت میں جرم ثابت ہوا ہے جس پر موت کی

سزادی گئی ہے، اس سزا کی سپریم کورٹ تک کی عدالتوں نے توثیق کی ہے اس لیے حکومت کے اختیار میں نہیں تھا کہ پھانسی کو روک دیتی اور یہ اختیار صرف مقتول کے وارثوں کے پاس تھا کہ وہ معاف کریں یا سزا پر عملدرآمد کرائیں۔ دوسری طرف پھانسی رکوانے کے لیے سرگرم رہنماؤں اور حلقوں کا کہنا ہے کہ حکومت نے عجلت سے کام لیا ہے اور مقتول کے ورثاء تک رسائی حاصل کرنے اور ان سے بات کرنے کا موقع نہیں دیا گیا ورنہ یہ ممکن تھا کہ اگر آقائے صادق گنجی کے ورثاء سے رابطہ ہو جاتا تو انہیں معافی یا خون بہا پر راضی کر لیا جاتا مگر اس کی نوبت نہیں آئی اور حق نواز کو پھانسی دے دی گئی ہے۔

اخباری اطلاعات کے مطابق حق نواز نے آخری رات پر سکون گزاری، پھانسی سے قبل عبادت کی، خود چل کر پھانسی کے تختے تک پہنچا اور بعض رپورٹوں میں حق نواز کی زبانی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس نے اپنا مذہبی فریضہ سمجھ کر آقائے صادق گنجی کو قتل کیا ہے جس پر اسے کوئی ندامت نہیں ہے کیونکہ اس کے بقول آقائے صادق گنجی نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کی شان میں گستاخی کی تھی جو اس کے لیے ناقابل برداشت تھی اس لیے وہ اس آخری حد تک جا پہنچا۔

جہاں تک مذہبی حوالہ سے کسی کو قتل کرنے کی بات ہے اس کی شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً کسی طرح بھی حمایت نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس سے انارکی پھیلتی ہے، خانہ جنگی کی راہ ہموار ہوتی ہے، قانون کا نظام متاثر ہوتا ہے، قومی زندگی سبوتاژ ہوتی ہے اور ملک کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس لیے مولانا حق نواز جھنگوی شہیدؒ اور علامہ احسان الٰہی ظہیر شہیدؒ سے لے کر علامہ عارف الحسینی اور ہمارے گوجرانوالہ کے علامہ شبیر نقوی ایڈووکیٹ تک جتنے لوگ بھی اس مذہبی انتہا پسندی کی بھینٹ چڑھے ہیں ان سب کا قتل ہمارے نزدیک یکساں طور پر قابل مذمت ہے اور کوئی باشعور شہری ان میں سے کسی ایک قتل کو بھی منفی نتائج کے حوالہ سے کسی دوسرے قتل سے کم قرار نہیں دے سکتا۔ لیکن اس پس منظر میں دو تین امور بطور خاص فکر انگیز حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور محب وطن حلقوں کے لیے ان سے صرف نظر کی ہمارے خیال میں مزید کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

1. ایک یہ کہ ملک میں مسلسل بڑھتی ہوئی سنی شیعہ کشیدگی کا اعلیٰ سطح پر سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا ضروری ہے۔ ہم اس سے قبل ان کالموں میں عرض کر چکے ہیں کہ طرفین کے جو سینکڑوں افراد قتل ہو چکے ہیں اور ابھی یہ مذموم سلسلہ رکتا ہوا نظر نہیں آتا، ان سب واقعات کے عوامل و اسباب کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان واقعات کے پس منظر میں صرف سنی شیعہ کشمکش نہیں ہے بلکہ دوسرے عوامل بھی اس عمل میں بتدریج شامل ہوتے گئے ہیں اور بہت مؤثر ہو چکے ہیں حتیٰ کہ باخبر حلقوں کا کہنا ہے کہ اگر کسی

مرحلہ پر (خدا کرے کہ) اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی ذمہ دار قیادت میں باہمی برداشت اور رواداری کا کوئی فارمولا طے ہو کر ماضی کے تلخ واقعات کو سمیٹنے کی بات طے پا جاتی ہے تو بھی دوسرے بعض عوامل کے زیادہ مؤثر ہونے کے باعث کسی باہمی مفاہمت کی کامیابی کے امکانات زیادہ واضح نہیں ہوں گے۔ اس لیے یہ اولین ضرورت ہے کہ اس کشیدگی کے اسباب و عوامل کی الگ الگ نشاندہی ہو اور تمام محرکات کا راستہ روکنے کے لیے سنجیدگی کے ساتھ اقدامات کیے جائیں۔ اس مقصد کے لیے ہم اپنی سابقہ تجویز کا اعادہ کریں گے کہ سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں عدالتی کمیشن قائم کیا جائے جو کھلی انکوائری کے ذریعے سنی شیعہ تصادم کے محرکات اور اسباب و عوامل کی نشاندہی اور ایک دوسرے کے خلاف فریقین کے مقدمات کا ازسرنو جائزہ لے۔

2. دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ کسی بھی فریق کے لیے اپنے مذہبی رہنماؤں کی توہین قابل برداشت نہیں ہوتی۔ اس لیے اگر انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح صحابہ کرامؓ اور اہل بیت عظامؓ کی سطح کے مذہبی مقتداؤں کی توہین کو جرم قرار دیتے ہوئے ان کی اہانت پر اسی سطح کی سنگین سزا نافذ نہیں ہوگی تو مشتعل نوجوانوں کو قانون ہاتھ میں لینے سے نہیں روکا جا سکے گا اور اس طرح کے افسوسناک واقعات ہوتے رہیں گے۔ لہٰذا یہ ضروری ہو گیا ہے کہ فریقین کی اعلیٰ قیادت کو اعتماد میں لے کر حضرات صحابہ کرامؓ اور اہل بیت عظامؓ کے ناموس کے تحفظ کا قانون نافذ کر دیا جائے تاکہ کسی کے پاس قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

3. تیسری گزارش یہ ہے کہ سنی شیعہ کشیدگی یا دیگر حوالوں سے ملک کی جو قیمتی اور ممتاز شخصیات دہشت گردی کی بھینٹ چڑھی ہیں ان کے قاتلوں کو تختہ دار تک پہنچانے کا اہتمام کیا جائے۔ مثلاً حکیم محمد سعیدؒ، محمد صلاح الدینؒ، مولانا محمد عبد اللہؒ، مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، مولانا حق نواز جھنگویؒ، علامہ عارف الحسینیؒ، علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ، مولانا انیس الرحمان درخواستیؒ، مولانا حبیب اللہ مختارؒ اور کسی بھی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات جنہیں دہشت گردوں نے درندگی اور وحشت و بربریت کی بھینٹ چڑھا دیا ہے، یا وہ کسی بھی مذہبی، لسانی، علاقائی اور گروہی انتہا پسندی کا شکار ہوئے ہیں۔ حکومت پاکستان کا آقائے صادق گنجی کے قاتل کو تختہ دار تک پہنچانے کا دعویٰ بجا مگر یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ سینکڑوں مقتولین میں سے صرف ایک کا قاتل پھانسی کے پھندے تک پہنچا

ہے اور باقیوں کے قاتلوں کے بارے میں دور دور تک اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا۔ اس لیے اگر حکومت قانونی نظام پر اعتماد بحال کرنا چاہتی ہے اور اس تاثر سے بچنا چاہتی ہے کہ یہ سب کچھ بیرونی دباؤ کی وجہ سے ہوا ہے تو اسے مذکورہ بالا شخصیات کے قاتلوں کو بھی اسی اہتمام اور توجہ کے ساتھ تختہ دار تک پہنچانا ہوگا جس کا مظاہرہ حق نواز کے بارے میں کیا گیا ہے۔ ورنہ قانونی نظام کی کارفرمائی کی بجائے بیرونی دباؤ کی عملداری کے تاثر کو روکا نہیں جا سکے گا۔ اور یہ بات ملک کے فرقہ وارانہ امن کے لیے کس قدر تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے اس کا اندازہ ہماری اسٹیبلشمنٹ سے زیادہ بہتر کون کر سکتا ہے؟

سنی و شیعہ رہنماؤں سے ایک دردمندانہ گزارش

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۲ مارچ ۲۰۰۱ء

شیخ حق نواز کی پھانسی کے بعد جھنگ، ہنگو اور شیخوپورہ میں فرقہ وارانہ تشدد کے جو المناک واقعات رونما ہوئے ہیں اور بیسیوں بے گناہ شہریوں کی افسوسناک ہلاکت پر منتج ہوئے ہیں انہوں نے اس سوال کی شدت اور سنگینی میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے کہ آخر اس عمل کو کب اور کہاں بریک لگے گی؟ عید کے دن مجھے اپنے علاقہ کے پولیس افسران کی ایڈوائس پر اپنے تیس سال سے چلے آنے والے معمول کو بدل کر ایک متعیّن راستے پر پیدل عید گاہ جانے کی بجائے راستہ بدل کر اور سواری پر نماز عید پڑھانے کے لیے جانا پڑا، اور اس سے بڑھ کر ہم اپنی مساجد میں دروازے بند کر کے سنگینوں کے سائے میں نمازیں ادا کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس سے شاید دونوں طرف کے کچھ جذباتی اور انتہا پسند نوجوانوں کے جذبات کو تھوڑی بہت تسکین ملتی ہو یا اس خونی کھیل کو جاری رکھنے کے خواہش مند حلقوں کے مقاصد کچھ آگے بڑھتے ہوں مگر دین، قوم اور ملک کے لیے یہ سب کچھ انتہائی تباہ کن ہے اور اس کی تباہ کاری کی صلاحیت میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

سنی شیعہ مسلح کشمکش میں بیرونی عوامل کی کارفرمائی سے انکار نہیں اور ہم اس کی کئی بار ان کالموں میں نشاندہی کر چکے ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ مسئلہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی محاذ آرائی کا ہے اور خارجی عوامل کے لیے بھی آلۂ کار اور ایندھن کا کام بھی ہر دو طرف کے جذباتی نوجوان سرانجام دیتے ہیں۔ اس لیے دیگر عوامل و محرکات سے سر دست صرف نظر کرتے ہوئے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے

رہنماؤں بالخصوص جذباتی نوجوانوں سے دو گزارشات کرنے کو جی چاہ رہا ہے، خدا کرے کہ کسی دل میں یہ بات اتر جائے اور اس خونی عمل کے کسی جگہ رکنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

پہلی بات بخاری شریف کی اس روایت کے حوالہ سے ہے جو "کتاب الادب" میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے منقول ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بڑے بڑے کبیرہ گناہوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے اور برا بھلا کہے۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کوئی شخص اپنے ماں باپ کو کیسے گالی دے سکتا ہے؟ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ اس نے دوسرے کے ماں باپ کو گالی دی اور اس نے جواب میں اس کے باپ یا ماں کو گالی دی تو گویا اس نے اپنے ماں باپ کو خود گالی دی۔ یعنی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اپنے ماں باپ کے لیے گالی کا سبب اور واسطہ بننے والا شخص خود ان کو گالی دینے کا مرتکب قرار پائے گا۔ کم و بیش اسی نوعیت کی بات سورہ الانعام کی آیت ۱۰۸ میں قرآن کریم نے بھی ارشاد فرمائی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ تم دوسروں کے جھوٹے خداؤں کو برا بھلا نہ کہو اس لیے کہ وہ جواب میں تمہارے سچے خدا کو برا بھلا کہیں گے اور اس کا سبب تم خود بنو گے۔

اس لیے "مرغی پہلے یا انڈا" کی طرح اس بحث میں پڑے بغیر کہ اس باہمی قتل و غارت کا آغاز کس نے کیا تھا، ہم اہلِ سنت اور اہلِ تشیع دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے جذباتی اور انتہا پسند نوجوانوں کو اس نکتہ پر غور کی دعوت دینا چاہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے سنجیدگی اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس بات کا جائزہ لے لیں کہ دونوں طرف کے جو بڑے بڑے بزرگ اور سرکردہ قائدین اس المناک قتل و غارت کی نذر ہو چکے ہیں کہیں وہ سبب اور واسطہ کے درجہ میں خود ہی اپنے بزرگوں کے قاتل تو قرار نہیں پاتے؟ میں تو جتنا اس مسئلہ کی گہرائی میں جاتا ہوں دل و دماغ کے لرزہ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اسی حساب کے تحت یہ گزارش کر رہا ہوں۔

دوسری گزارش جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عملی سنت کے حوالہ سے کرنا چاہتا ہوں۔ عرب قبائل میں انتقام در انتقام کا سلسلہ اسی طرح چلا آرہا تھا جیسے اب سنی اور شیعہ روزانہ انتقامی جذبہ کے تحت اندھا دھند قتل ہو رہے ہیں۔ جناب نبی کریمؐ نے اس سلسلہ کو بریک لگانے کے لیے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان فرمایا کہ گزشتہ قتلوں کے انتقام کا سلسلہ ختم کر کے نئے سرے سے پر امن زندگی کا آغاز کرو اور گزشتہ قتلوں اور ان کے انتقام کو بھول جاؤ۔ آنحضرتؐ نے اس کا صرف زبانی اعلان نہیں کیا بلکہ عملی طور پر بھی اظہار فرمایا کہ اپنے چچا زاد بھائی ربیعہ بن الحارث بن عبد المطلبؓ کے معصوم بیٹے ایاس کا قتل معاف کرنے کا اسی مجلس میں اعلان فرما دیا اور اپنے اعلان پر عملدرآمد کا آغاز گھر

سے کر دیا۔ ایاس بنو سعد میں پرورش پا رہا تھا کہ بنو ہذیل نے اسے قتل کر دیا، اس کا انتقام قبائلی روایات کے مطابق بنو عبد المطلب کے ذمہ تھا، متعدّد لوگوں کے دلوں میں اسی انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور وہ یقیناً کسی موقع کے انتظار میں ہوں گے کہ جناب نبی اکرمؐ نے بنو عبد الطلب کی طرف سے اس معصوم بچے کا خون معاف کرنے کا اعلان فرما کر نہ صرف یہ کہ انتقام در انتقام کے اس بظاہر ختم نہ ہونے والے سلسلہ کو روک دیا بلکہ باقی لوگوں کے لیے بھی ایک عملی نمونہ پیش کر دیا۔ اور یہ اسی کی برکت تھی کہ پشت در پشت خونریزی کے عادی اور خوگر عرب قبائل کو امن اور باہمی اعتماد کی منزل گم گشتہ مل گئی۔

آج بھی امن کا راستہ یہی ہے کہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے سرکردہ اکابر سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس مکروہ عمل کو بریک لگانے کے لیے سنت نبویؐ کی روشنی میں کوئی فارمولا طے کریں اور اس پر اپنے جذباتی نوجوانوں کو پابند کریں یا بصورت دیگر امن کا دشمن بن جانے والوں سے لاتعلقی اور براءت کا اعلان کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ جو فریق بھی اس سمت پہل کرے گا وہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کا دامن تھامنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی قوم کے لیے امن وسلامتی کا پیغام بر ثابت ہو گا۔ لیکن اس کے لیے پاکستان کے امن اور قومی وحدت کو سبوتاژ کرنے کے خواہش مند عناصر کو ”کراس“ کرنے کا حوصلہ درکار ہے، خدا کرے کہ سنی شیعہ قائدین اس حوصلہ کا بروقت اظہار کر سکیں، آمین ثم آمین۔

پارلیمنٹ کے ذریعے اجتہاد؟

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مئی ۲۰۰۱ء

...... گزارش ہے کہ ہمارے نزدیک ان کے استدلال کی دیگر کئی باتوں کے علاوہ ایک اصولی اور بنیادی غلطی یہ بھی ہے کہ وہ قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح اور اجتہاد واستنباط میں امت کے اجماعی تعامل اور جمہور اہلِ علم کے موقف کو بہت سے معاملات میں نظر انداز کر رہے ہیں جس کی ہمارے ہاں کسی درجہ میں بھی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ اگر جمہور اہل علم اور امت کے اجماعی تعامل کو کراس کر کے قرآن وسنت سے براہ راست استنباط واستدلال کا دروازہ کھول دیا جائے تو موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں امت مسلمہ میں ہزاروں مکاتب فکر وجود میں آئیں گے جو فکر واستدلال کے محاذ پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوں گے اور وہ دھما چوکڑی مچے گی کہ الامان والحفیظ۔

کچھ عرصہ قبل محترم ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال صاحب نے یہ مہم شروع کر دی تھی کہ قرآن وسنت کی از سر نو تعبیر وتشریح کی جائے اور اجتہاد واستنباط کا حق علماء کی بجائے پارلیمنٹ کو دیا جائے۔ اس کی وجہ

انہوں نے یہ بیان فرمائی تھی کہ امت میں اس وقت جو فرقہ بندی ہے اس سے نجات کی صورت اس کے سوا ممکن نہیں ہے۔ ہم نے ایک مضمون میں ان سے گزارش کی تھی کہ ان کا یہ فارمولا تو ''بارش سے بھاگا اور پرنالے کے نیچے کھڑا ہو گیا'' کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ اس وقت امت کا بڑا حصہ اعتقادی طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہے: اہل سنت اور اہل تشیع۔ جبکہ اہل سنت فقہی طور پر پانچ حصوں میں بٹے ہوئے ہیں: حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور ظاہری۔ یہ سب مل کر زیادہ سے زیادہ آٹھ دس گروہ بنتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں عالمگیریت کا عنصر موجود ہے۔ جبکہ انہیں ختم کر کے مسلم ممالک کی اسمبلیوں کے ذریعے اجتہاد و استنباط کا دروازہ کھولا جائے گا تو دیگر کئی قباحتوں کے علاوہ ایک بڑی قباحت یہ ہوگی کہ مسلم ممالک اور ان کی قومی و صوبائی اسمبلیوں کی تعداد کے حساب سے سینکڑوں نئے فقہی مذاہب وجود میں آجائیں گے جو سب کے سب علاقائی ہوں گے اور ملت اسلامیہ کی رہی سہی وحدت بھی پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گی۔......

امریکہ عالمی قیادت کا اہل نہیں:
جناب آیت اللہ خامنہ ای کا خطاب

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء

ایران کے روحانی پیشوا آیت اللہ خامنہ ای نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم افغانستان پر حملے کے لیے امریکہ کی کسی قسم کی مدد نہیں کریں گے اور ہم افغانستان پر حملوں کے خلاف ہیں کیونکہ ہمارا مسلم پڑوسی ملک پہلے ہی مفلوک الحال ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ دہشت گردی کے خلاف مہم یا امن کے لیے کسی عالمی مہم کی قیادت کا اہل نہیں، امریکہ کے مقاصد کچھ اور ہیں۔ امریکہ ایک طرف عالمی تعاون کے لیے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کر رہا ہے جبکہ دوسری طرف عالمی ممالک کی تعظیم ملحوظ نہیں رکھ رہا جو ایک نفرت انگیز رویہ ہے۔ انہوں نے امریکی صدر کے اس بیان پر تنقید کی جس میں امریکی صدر نے تمام ممالک سے کہا تھا کہ آپ ہمارے ساتھ ہیں یا دہشت گردوں کے ساتھ ہیں۔ ایرانی راہنما نے کہا کہ نہ ہم امریکہ کے ساتھ ہیں اور نہ دہشت گردوں کے ساتھ ہیں کیونکہ امریکہ کے ہاتھ صیہونی ریاست کے مظالم اور جرائم سے داغدار ہیں۔

اسرائیل اور برطانیہ کی حالیہ کشمکش

ہم سمجھتے ہیں کہ ایرانی راہنما کے خیالات موجودہ حالات میں عالمِ اسلام کی رائے عامہ کے جذبات

کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں لیکن ان پر تبصرہ سے قبل ایران کے حوالہ سے ایک اور خبر ملاحظہ فرمالیں کہ گزشتہ روز برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا تہران کا دورہ کرنے کے بعد اسرائیل پہنچے تو وزیراعظم ایریل شیرون نے ان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا اور اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون پیریز نے بھی برطانوی وزیر خارجہ کے اعزاز میں دیا جانے والا عشائیہ منسوخ کر دیا۔ اس پر برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر نے فون پر براہ راست اسرائیلی وزیراعظم سے بات کی جس کے بعد برطانوی وزیر خارجہ کی اسرائیلی وزیراعظم سے ملاقات ہو سکی۔ اسرائیلی راہنماؤں کے غصے کی وجہ دورۂ ایران کے موقع پر ایرانی اخبارات میں شائع ہونے والا برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا کا ایک مضمون بنا ہے جس میں انہوں نے امریکہ میں دہشت گردی کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

> ”دہشت گردی کے فروغ میں یہ عنصر بھی کار فرما ہے کہ فلسطین میں کئی سالوں سے جو واقعات رونما ہو رہے ہیں اس پر غصہ و ناراضگی پائی جاتی ہے۔“

خبر کے مطابق اسرائیلی حکمران اس جملے پر بہت زیادہ سیخ پا ہوئے ہیں اور انہوں نے محسوس کیا ہے کہ فلسطین میں رونما ہونے والے تشدد کی ذمہ داری اسرائیل پر ڈالی جا رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کے دھماکوں کی دھول بیٹھنے کے بعد ان اسباب و عوامل پر غور کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے جو حالات کو اس انتہا پر لانے کا باعث بنے ہیں او ان اسباب و عوامل میں اسرائیل کا کردار بھی دھیرے دھیرے نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور تبصرہ بھی ملاحظہ فرمالیں جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں جدید تاریخ کے استاذ مارک المنڈ کا ہے جس میں انہوں نے اسرائیلی وزیراعظم شیرون کو سور کا دماغ رکھنے والا اور انتہا پسند قرار دیتے ہوئے انہیں مخاطب کر کے کہا ہے کہ

> ”انہیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ امریکہ کی حمایت کے بغیر اسرائیل کی بقا ممکن نہیں ہے۔ اگر امریکہ اس کی پچاس سال سے بھرپور حمایت نہ کر رہا ہوتا تو وہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ اس لیے اسے امریکہ کی راہ میں روڑا بننے کی بجائے تعاون کا رویہ اپنانا چاہیے۔ اپنی بقا، دفاع اور معاشی خوشحالی کے لیے وہ امریکی امداد کا محتاج ہے، اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ گیارہ ستمبر کے حادثے میں جتنے امریکی مارے گئے ہیں اتنے اسرائیلی ۱۹۴۸ء سے اب تک ہونے والی تمام جنگوں میں نہیں مارے گئے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرانے والے صرف ایک جہاز میں جتنے مسافر مارے گئے اتنے اسرائیلی پی ایل او، حماس یا حزب اللہ کے حملوں میں نہیں مرے۔“

ہمارے خیال میں امریکہ میں ہونے والی مبینہ دہشت گردی کے اسباب و محرکات کی نشاندہی اور ان میں اسرائیلی کردار کی اہمیت کے حوالہ سے برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا کا مذکورہ مضمون اور برطانوی اخبار ڈیلی میل میں شائع ہونے والا پروفیسر مارک المنڈ کا یہ تبصرہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے ان نئے رجحانات کی عکاسی ہوتی ہے جو اگرچہ پہلے بھی موجود تھے مگر دبے ہوئے تھے کہ امریکہ کی طرف سے اسرائیل کی مسلسل پشت پناہی اور تعاون کے اثرات امریکہ کے حق میں مثبت نہیں ہیں۔ البتہ گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد دیگر سنجیدہ دانشور بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیلی کردار کا جائزہ لینا ضروری ہے جس کی طرف برطانوی وزیر خارجہ نے اپنے مذکورہ بالا مضمون میں اشارہ کیا ہے۔ یقیناً اسرائیل کے اس کردار کو نمایاں کرنے اور عالمی رائے عامہ کو اس کی طرف متوجہ کرنے میں ایرانی حکومت کے دوٹوک موقف اور جرأت مندانہ طرز عمل کا بھی دخل ہے بلکہ موجودہ تناظر میں یہ کریڈٹ ایران ہی کو جاتا ہے کہ اس نے اسرائیل کو اس موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا اور دہشت گردی کے فروغ میں اسرائیلی کردار کو نمایاں کر کے عالمی راہنماؤں اور دانشوروں کو اس بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔

امریکہ کے عالمی کردار پر ایک نظر

ہمیں ایرانی پیشوا جناب آیت اللہ خامنہ ای کے اس ارشاد سے بھی اتفاق ہے کہ امریکہ دہشت گردی کے خلاف یا عالمی امن کے حق میں کسی مہم کی قیادت کا اہل نہیں ہے کیونکہ اس کا اپنا کردار دوہرے پن کا حامل ہے اور اس کے اپنے ہاتھ دہشت گردی کی سرپرستی اور معاونت سے داغدار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے اور اس کے پاس اسباب و وسائل کی فراوانی ہے۔ دولت، اسلحہ، ٹیکنالوجی اور دنیا بھر میں معاونین اور حمایتیوں کا ایک وسیع حلقہ اسے میسر ہے لیکن اس سب کچھ کے باوجود اس کا دوہرا معیار و کردار کسی عالمی مہم میں اس کی قیادت کی اہلیت کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ کیونکہ معروضی صورتحال یہ ہے کہ

1. امریکہ خود کو نسل پرستی اور دہشت گردی کا مخالف قرار دیتا ہے لیکن وہ اسرائیل کی نسل پرست اور دہشت گرد حکومت کی مسلسل اور مکمل پشت پناہی کر رہا ہے۔
2. امریکہ اقوام متحدہ کے فیصلوں کو بزور قوت نافذ کرنے کا علمبردار ہے لیکن کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کے فیصلوں اور وعدوں کو یکسر نظر انداز کیے ہوئے ہے۔
3. امریکہ شہری حقوق اور سیاسی آزادیوں کا پرچم اٹھائے ہوئے ہے لیکن خلیج عرب کے ممالک میں اس کی فوجی موجودگی ان ملکوں کے عوام کے شہری حقوق اور سیاسی آزادیوں

کی بحالی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

4. امریکہ رائے عامہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اسی کو کسی ملک کے فیصلوں کی بنیاد قرار دیتا ہے لیکن موجودہ مہم میں امریکہ کا ساتھ دینے کے بارے میں پاکستان اور دیگر بہت سے ممالک کی رائے عامہ کی قطعًا کوئی پرواہ کیے بغیر ان حکومتوں پر مہم میں شامل ہونے کے لیے دباؤ ڈالے ہوئے ہے۔

5. امریکہ قوموں کی آزادی اور ممالک کی خود مختاری کے احترام کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے لیکن دہشت گردی کے خلاف خود اپنی طے کردہ مہم میں دنیا بھر کے ممالک کو "ساتھ دو ورنہ دشمن سمجھے جاؤ گے" کے خالص فرعونی لہجے میں دھمکا کر اس نے اقوام و ممالک کی آزادی و خود مختاری کا مذاق اڑایا ہے۔

امریکہ عالمی قیادت کا اہل نہیں

ان حالات میں ایرانی پیشوا جناب آیت اللہ خامنہ ای کا یہ ارشاد کہ "امریکہ دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم کی قیادت کا اہل نہیں" صرف ان کے اپنے جذبات کا اظہار نہیں بلکہ عالمی رائے عامہ بالخصوص دنیا بھر کے مسلم حکمرانوں کے لیے دعوت فکر بھی ہے جسے نظر انداز کر دینا سراسر ناانصافی اور زیادتی کی بات ہوگی۔

دہشت گردی کا کوئی بھی حامی نہیں ہے اور دنیا کے سب باشعور انسان اس کے خاتمہ کے لیے کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن دہشت گردی کے ساتھ ساتھ اس کے اسباب و محرکات اور عوامل کی بیخ کنی بھی ضروری ہے۔ اور اس عالمی مہم کی قیادت کے لیے کسی ایسے ملک کو آگے آنا چاہیے جس کا اپنا دامن صاف ہو۔ ہیروشیما، ناگاساکی، ویتنام، فلسطین، افغانستان، اور سوڈان کے نہتے شہریوں پر بم برسانے والے اور مشرقِ وسطیٰ کے عوام کی سیاسی آزادیوں اور شہری حقوق کا خون کرنے والے ملک کے ہاتھ میں دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم کی قیادت کا پرچم آخر کس طرح دیا جا سکتا ہے؟

ایرانی قوانین اور اقوامِ متحدہ کا منشور

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۲ دسمبر ۲۰۰۱ء

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کی انسانی حقوق کمیٹی نے کچھ عرصہ قبل اسلامی جمہوریہ ایران کو انسانی

حقوق کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دیتے ہوئے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں ایرانی حکومت سے متعدّد قوانین اور پالیسیوں کی تبدیلی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ قرارداد ۵۲ کے مقابلہ میں ۷۱ ووٹوں سے منظور ہوئی ہے۔ قرارداد کے خلاف ووٹ دینے والوں میں اکثریت مسلم ممالک اور سابق کمیونسٹ ملکوں کی ہے جبکہ ۴۱ ممالک رائے شماری سے غیر حاضر رہے جن میں زیادہ افریقی ممالک ہیں۔ اخباری رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جنرل اسمبلی اگلے ماہ اس قرارداد کی حتمی منظوری دے گی۔

قرارداد میں ایرانی حکومت سے جن قوانین کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے ان میں بطور خاص

(۱) سرعام سزا دینے (۲) ہاتھ یا پاؤں کاٹنے

(۳) سنگسار کرنے (۴) بعض غیر سنگین جرائم پر موت کی سزا دینے

(۵) اور کوڑے مارنے کی سزائیں

بھی شامل ہیں جنہیں قرارداد میں ”وحشیانہ سزائیں“ قرار دیا گیا ہے۔ خیال ہے کہ جنرل اسمبلی کی طرف سے اس قرارداد کی حتمی منظوری کے بعد اگر ایران نے ان قوانین میں ردوبدل نہ کیا تو اس کے خلاف اقوام متحدہ کی طرف سے امتناعی احکامات اور پابندیوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

مسلم ممالک میں شرعی سزاؤں کے خلاف مہم

اس سے قبل افغانستان میں کابل کا کنٹرول حاصل کرنے والے شمالی اتحاد کے وزیر قانون اور وزارت انصاف کے ایک ڈائریکٹر نے گزشتہ روز ایک انٹرویو میں واضح کیا ہے کہ طالبان دور کے ”سخت قوانین“ تبدیل کیے جا رہے ہیں اور صدر داؤد خان کے دور کا قانونی نظام واپس لایا جا رہا ہے۔ شمالی اتحاد کے ان راہنماؤں کے بقول خاص طور پر سنگسار کرنے، کوڑے مارنے اور ہاتھ کاٹنے جیسی سزائیں منسوخ کر دی جائیں گی۔ اس کے ساتھ ہی ایک قومی اخبار نے طالبان حکومت کے دور میں ایک سال قید کاٹنے والے پینتیس سالہ افغان شہری کا انٹرویو شائع کیا ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ طالبان حکومت نے اسے گرل فرینڈ رکھنے کے جرم میں سزا دی تھی جبکہ صدر داؤد کے دور میں یہ جرم نہیں تھا۔

دوسری طرف سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ عبداللہ کے اس حالیہ اخباری بیان کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تو یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی میڈیا قرآن کریم کے احکامات کے خلاف زہریلا پراپیگنڈا کر رہا ہے۔

پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال کے بارے میں اقوامِ متحدہ کی انسانی حقوق کمیٹی، امریکی وزارت خارجہ کے جنوبی ایشیا ڈیسک اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کی چند سال کی مسلسل رپورٹوں میں ان امور

کا تذکرہ ہوتا رہا ہے اور خود پاکستان کے بعض سیاسی راہنماؤں کی طرف سے کوڑے مارنے، سنگسار کرنے اور ہاتھ کاٹنے کی سزاؤں کو کھلم کھلا وحشیانہ قرار دیا گیا ہے۔

اقوام متحدہ کا منشور اور اسلامی تعلیمات

اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کشمکش کے پس منظر پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ یہ بات واضح طور پر سامنے آجائے کہ اقوام متحدہ اور مغربی ممالک کا اس بارے میں موقف کیا ہے اور وہ اس قسم کی قراردادوں اور رپورٹوں کے ذریعے مسلم ممالک سے کیا تقاضہ کر رہے ہیں۔

مجرم کی عزتِ نفس

اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کے جس چارٹر کو دنیا بھر میں انسانی حقوق کے تحفظ اور عملداری کی بنیاد بنا رکھا ہے اس کی دفعہ نمبر ۵ میں کہا گیا ہے کہ

> ''کسی شخص کو ذہنی اذیت، جسمانی تشدد اور عزت نفس کے منافی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی ایسی سزا دی جائے گی۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی جرم کی سزا کا ذہنی اذیت، جسمانی تشدد اور تذلیل کے عناصر سے خالی ہونا ضروری ہے۔ جبکہ اسلام میں معاشرتی جرائم کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں، مثلاً:

- سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ میں کہا گیا ہے کہ ڈکیتی اور قتل کے مرتکب افراد کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں اور انہیں سولی پر لٹکا دیا جائے۔
- اسی سورہ کی آیت ۳۸ میں کہا گیا ہے کہ چوری کرنے والے مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔
- سورہ نور کی آیت ۲ میں کہا گیا ہے کہ زنا کرنے والے مرد اور عورت دونوں کو سو سو کوڑے مارے جائیں۔
- اسی سورہ کی آیت ۴ میں کہا گیا ہے کہ کسی پاک دامن عورت پر بدکاری کی جھوٹی تہمت لگانے والے کو اسی کوڑے مارے جائیں۔
- سورہ نور کی آیت نمبر ۲ میں کہا گیا ہے کہ بدکاری کی سزا سرعام دی جائے تاکہ لوگ اسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔
- فقہاء امت کا کہنا ہے کہ سورہ نور میں مذکورہ زنا کی سزا غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے

لیے ہے جبکہ شادی شدہ مرد اور عورت زنا کے مرتکب ہوں تو تورات میں ان کے لیے سنگسار کرنے کی سزا مقرر تھی جسے بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا اور متعدّد کیسوں میں تورات کے اسی قانون کے مطابق مجرموں کو سنگسار کرنے کی سزا دی۔

یہ چند حوالہ جات اس بات کی وضاحت کے لیے دیے گئے ہیں کہ ہاتھ کاٹنے، پاؤں کاٹنے، سنگسار کرنے، کوڑے مارنے اور سرعام سزا دینے کے یہ قوانین ایرانی حکومت یا طالبان حکومت کے خود ساختہ نہیں بلکہ قرآن کریم کے بیان کردہ ہیں جن پر صدیوں تک امت میں عمل ہوتا رہا ہے۔ لیکن چونکہ ان سزاؤں میں جسمانی تشدد، ذہنی اذیت اور عزت نفس مجروح ہونے کے واضح پہلو موجود ہیں اس لیے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی رو سے یہ قوانین وحشیانہ قرار پاتے ہیں اور ان کے نفاذ سے اقوام متحدہ کے اصولوں کی رو سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

سنگین جرائم یا انسانی حقوق؟

ایران کے خلاف اقوام متحدہ کی مذکورہ قرارداد میں ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ کسی سنگین جرم کے بغیر موت کی سزا دینے کا سلسلہ ختم کیا جائے۔ یہ بہت دلچسپ نکتہ ہے اس لیے کہ اسلام میں زنا، ارتداد اور توہینِ رسالت کے جرائم میں موت کی سزائیں مقرر ہیں اور یہ تینوں امور اقوام متحدہ کے نزدیک سنگین جرم نہیں ہیں بلکہ سرے سے انہیں جرم ہی تصور نہیں کیا جاتا۔ حتیٰ کہ مذہب تبدیل کرنے کے عمل کو اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ ۱۸ میں انسانی حقوق میں شمار کیا گیا ہے اور کسی بھی معاملہ میں رائے قائم کرنے اور اس کے کھلم کھلا اظہار کو ہر شخص کا بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اقوام متحدہ کے منشور اور اس کی بنیاد پر دنیا بھر کے مسلم ممالک سے انسانی حقوق کے عملی احترام کے لیے اس کے مطالبہ کی زد میں جو قوانین آتے ہیں ان میں سے اکثر وہ ہیں جو قرآن و سنت کے بیان کردہ ہیں اور اسلامی شریعت کے قوانین تصور کیے جاتے ہیں۔ ہم نے ان سب اسلامی قوانین کا احاطہ نہیں کیا جو اقوام متحدہ کے منشور سے ٹکراتے ہیں بلکہ بطور نمونہ صرف چند ایک کا تذکرہ کیا ہے تاکہ عالمی سطح پر موجودہ تہذیبی اور ثقافتی کشمکش کا وہ پہلو واضح طور پر سامنے آسکے جو اس وقت دنیا بھر میں اقوام متحدہ کے منشور کی بنیاد پر یکساں قوانین کے نفاذ کے لیے کی جانے والی جدوجہد کا اہم عنوان بن چکا ہے۔

شریعت سے دستبرداری کا ایجنڈا

اقوام متحدہ کی اب تک کی قراردادوں اور رپورٹوں میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر مسلم ممالک اپنے قانونی نظاموں کو اقوام متحدہ کے منشور اور قراردادوں کے مطابق تبدیل کرتے ہیں تو انہیں نکاح، طلاق، وراثت، زنا، شراب، چوری، ڈکیتی، قذف، ارتداد اور ناموسِ رسالتؐ جیسے بہت سے معاملات میں قرآن مجید اور سنت نبویؐ کے صریح احکام سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ کیونکہ قرآن و سنت کے ان واضح احکام و قوانین سے دستبرداری اختیار کیے بغیر اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر پر اس طرح کا عملدرآمد ممکن ہی نہیں ہے جس کے لیے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی مسلسل قراردادیں منظور کرتی چلی جا رہی ہے۔ اور ایران کے خلاف بھی اس نے اسی مقصد کے لیے یہ قرارداد منظور کی ہے۔ اقوام متحدہ کا موقف یہ ہے کہ جن ممالک نے انسانی حقوق کے اس چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں وہ اس پر عملدرآمد کے پابند ہیں اس لیے انہیں اس منشور اور اس کی وضاحت میں اقوام متحدہ کی منظور کردہ قراردادوں پر مکمل عملدرآمد کا اہتمام کرنا چاہیے اور یہ ان کی ذمہ داری ہے۔

اب ایک طرف قرآن و سنت کے واضح احکام ہیں اور دوسری طرف اقوام متحدہ کا منشور اور جنرل اسمبلی کی قراردادیں ہیں جنہوں نے مسلم حکمرانوں کو دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا کہ وہ یا تو اقوام متحدہ کے منشور پر کیے گئے دستخطوں کی پاسداری کرتے ہوئے اس کے تمام مطالبات کو منظور کر کے ترکی کی طرح باقی مسلم ملکوں میں بھی اسلامی قوانین کو شجر ممنوعہ قرار دے دیں، یا پھر اقوام متحدہ کے منشور کی قرآن و سنت کے منافی دفعات کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے خلاف تحفظات کا اظہار کریں اور ان کی تبدیلی کے لیے منظم دباؤ ڈالیں۔

اقوام متحدہ کے منشور پر نظر ثانی کی ضرورت

یہ بات ایک حقیقت ہے کہ نصف صدی قبل جب اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کا یہ چارٹر منظور کیا تھا تو اس وقت مسلم دنیا کی وہ پوزیشن نہیں تھی جو آج ہے، بیشتر ممالک غلام تھے اور جو چند مسلم ملک آزاد کہلاتے تھے وہ بھی ایک منظم گروپ کے طور پر اپنی بات پیش نہیں کر سکتے تھے۔ جبکہ آج اقوام متحدہ میں ساٹھ کے قریب مسلم ممالک کا گروپ موجود ہے اور اسے یہ پوزیشن حاصل ہے کہ اگر مسلم ممالک قرآن و سنت کے ساتھ عملی وابستگی اور دینی حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقوام متحدہ کے منشور پر نظر ثانی کا مطالبہ کریں اور اس منشور کے ذریعے پوری دنیا پر مغربی تہذیب و ثقافت مسلط کرنے کی کوششوں کے خلاف ڈٹ جائیں تو وہ مغرب کی اس ثقافتی یلغار کو بریک لگا سکتے ہیں جو امریکہ کی فوجی

قوت اور اقوام متحدہ کے منشور اور قراردادوں کے زور پر پوری دنیا کے مسلم معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔

چند سال قبل ملائیشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد نے مسلم حکومتوں سے کہا تھا کہ وہ اقوام متحدہ کے طرزعمل اور پالیسیوں کے خلاف منظم گروپ کے طور پر احتجاج کریں اور اجتماعی دباؤ ڈال کر اقوام متحدہ کو اپنے منشور اور پالیسیوں پر نظر ثانی پر مجبور کریں۔ ہمارے نزدیک مسلم حکومتوں کے لیے آج بھی باوقار راستہ یہی ہے، ورنہ دنیا بھر کے مسلم حکمران یہ بات نوٹ کر لیں کہ اگر انہوں نے اسلامی شریعت کے صریح منافی اقوام متحدہ کے فیصلوں کے سامنے ہتھیار ڈالے تو وہ اس عمل میں تنہا ہوں گے اور مسلم دنیا کے عوام کو اقوام متحدہ کے منشور کی خاطر قرآن و سنت کے ارشادات سے دستبردار ہونے کے لیے وہ کبھی تیار نہیں پائیں گے۔

ہاشمی سلطنت کا قیام: نئی امریکی سازش؟

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۲ء

لندن سے شائع ہونے والے ہفت روزہ نوائے وقت نے ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۲ء کی اشاعت میں ایک رپورٹ کے ذریعے انکشاف کیا ہے کہ امریکہ نے عراق پر متوقع حملہ کے بعد سرے سے عراق کی ریاست کو ختم کر کے اسے اردن میں ضمن کرنے کے پلان پر غور شروع کر دیا ہے اور اس سلسلہ میں امریکی ماہرین منصوبے کو آخری شکل دینے میں مصروف ہیں۔ رپورٹ کے مطابق مجوزہ پلان یہ ہے کہ عراق اور اردن کو ملا کر ایک علیحدہ سلطنت تشکیل دی جائے گی جس پر اردن کے شاہ عبداللہ کی قیادت میں ہاشمی خاندان حکومت کرے گا اور اس نئے مجوزہ ملک کا دارالحکومت عمان ہوگا۔

امریکہ میں حکمت عملی تیار کرنے والے ادارے ''اسٹراٹ فور'' کا کہنا ہے کہ امریکا کی جنگ کے بعد عراق میں استحکام قائم کرنے کی غرض سے ہاشمی سلطنت کی حمایت میں اردن اور عراق کو متحد کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ عراق کے خلاف امریکہ کی جنگ کا آغاز عنقریب ہونے والا ہے اور واشنگٹن اور مشرقِ وسطیٰ کی حکمت عملی تیار کرنے والے ماہرین متوقع امریکی فتح پر نئی حکمت عملی تیار کرنے میں مصروف ہیں جو طویل مدت کے لیے فائدہ مند ہو، ان فوائد میں سنی عربوں کی اکثریت والے مرکز عراق کو اردن میں شامل کر کے ہاشمی سلطنت کی تشکیل کی تجویز بھی ہے۔ یہ منصوبہ امریکہ کے نائب صدر ڈک چینی کے ذریعے تیار کیا گیا ہے جس پر ماہ جولائی میں لندن میں امریکہ کی حامی عراقی سنی اپوزیشن کے ارکان اور اردن کے ولی عہد شہزادہ حسن کے درمیان غیر معمولی اجلاس

میں صلاح مشورہ ہوا تھا۔

اس تجویز کے مطابق عراق کے سنی عرب عوام اردن کے شاہ عبداللہ سے درخواست کریں گے کہ وہ عراق کا اقتدار سنبھال لیں۔ اس درخواست کی بنیاد اس بات پر ہوگی کہ ۱۹۵۸ء میں عراق کے بادشاہ شاہ فیصل دوم کا تختہ الٹ کر کرنل عبدالکریم قاسم نے اقتدار سنبھال لیا تھا، یہ شاہ فیصل اردن کے شاہ عبداللہ کے چچا لگتے تھے اور دونوں کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہے جو ہاشمی خاندان کہلاتا ہے اور اسی حوالہ سے عربوں پر حکمرانی کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق امریکی ماہرین کا خیال ہے کہ اگر عراق کے خلاف طاقت استعمال کر کے صدر صدام حسین کو ان کے منصب سے ہٹا دیا جائے تو بھی عراق پر امریکہ کے طویل المیعاد کنٹرول کا مقصد حاصل نہیں ہوتا کیونکہ عراق میں مغرب کے سنیوں اور مشرق میں بسنے والے شیعہ کے درمیان تصادم اور خانہ جنگی کی کیفیت رہے گی اور امریکہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کی بجائے اس میں الجھا رہے گا۔ چونکہ امریکہ کا اصل مقصد تیل کے چشموں کا کنٹرول حاصل کرنا ہے جو تصادم اور خانہ جنگی کی فضا میں مشکوک رہے گا اس لیے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا جا رہا ہے کہ سنی اکثریت رکھنے والے مغربی اور مرکزی عراق کو اردن کے ساتھ ملا کر ''ہاشمی سلطنت'' بنا دی جائے اور اس پر شاہ عبداللہ کے خاندان کا حق حکمرانی تسلیم کر لیا جائے جو اب تک مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کا وفادار خاندان چلا آرہا ہے اور امریکی ماہرین کو آئندہ بھی اس خاندان کی وفاداری پر مکمل اعتماد ہے۔

امریکہ کا یہ مجوزہ منصوبہ قابل عمل ہے یا نہیں اور اس کے عالمی اور علاقائی سطح پر کیا اثرات نمودار ہوں گے، اس سے قطع نظر ہاشمی خاندان کے تاریخی پس منظر پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ اس منصوبے کو سمجھنا آسان ہو جائے۔ یہ ہاشمی خاندان شریف مکہ حسین کا خاندان ہے جو خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور میں عثمانی سلطنت کی طرف سے مکہ مکرمہ کا حکمران تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کا دارالحکومت قسطنطنیہ (استنبول) تھا اور حجاز مقدس اس کا ایک صوبہ تھا۔ جبکہ حسین مذکورہ مکہ مکرمہ کا گورنر تھا، اسے شریف مکہ کہا جاتا تھا اور وہ ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کا تیاپانچہ کرنے کے لیے انگریزوں نے ان صاحب کو آلہ کار بنا کر ان سے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کرایا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ ہاشمی ہیں، آل رسولؐ ہیں اور اسلامی احکام میں خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط کو ضروری قرار دیا گیا ہے، جبکہ ترکی خلفاء قریشی اور عربی نہیں بلکہ عجمی ہیں اس لیے وہ خلافت کی اہلیت نہیں رکھتے، ان کی بجائے اگر حسین شریف مکہ خلافت کا دعویٰ کریں تو ہاشمی ہونے کی وجہ سے ان کا دعویٰ اہل اسلام کے لیے زیادہ قابل توجہ ہوگا اور مکہ مکرمہ کو دارالحکومت بنانے سے اس خلافت کی مخالفت کے امکانات

بھی کم ہو جائیں گے۔

ترکی کے عثمانی خلفاء صدیوں سے خلافت کا منصب سنبھالے ہوئے تھے اور عالمِ اسلام کے غالب حصہ میں انہیں امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین کے طور پر یاد کیا جاتا تھا حتیٰ کہ مسجد حرام، مسجد نبوی اور بیت المقدس تینوں مقدس مقامات میں ان کے نام سے خطبہ پڑھا جا رہا تھا لیکن وہ قریشی نہیں تھے۔ اس لیے انگریزوں کو خلافتِ عثمانیہ کے خلاف ایک شرعی ہتھیار مل گیا چنانچہ خلفاء کے خلاف مذکورہ اعتراض کے علاوہ بہت سے دیگر الزامات کے ساتھ ایک فتویٰ تیار کیا گیا کہ عثمانی خلفاء خلافت کی اہلیت نہیں رکھتے اس لیے انہیں معزول کرنا شرعاً ضروری ہے۔

یہ وہ دور تھا جب متحدہ ہندوستان میں برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف مسلح بغاوت کی تیاریاں جاری تھیں، بغاوت کی اس تحریک کے لیڈر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی خلافتِ عثمانیہ کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے خلافت کے حکام سے بات چیت کے لیے حجاز مقدس پہنچے ہوئے تھے اور عثمانی وزیر جنگ جمال پاشا سے ان کی ملاقات ہو چکی تھی۔ ادھر حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے ساتھی خلافتِ عثمانیہ کے تعاون سے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی تیاریاں کر رہے تھے اور ادھر شریف مکہ حسین انگریزوں کی مدد سے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کے منصوبہ کو آخری شکل دے رہے تھے۔ اس دوران مذکورہ فتویٰ سامنے آ گیا جس پر دستخط کرنے کے لیے حضرت شیخ الہندؒ سے بھی کہا گیا مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ اسی انکار کی وجہ سے شریف مکہ نے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا جس کے بعد وہ جزیرہ مالٹا میں کم و بیش پونے چار سال تک قید رہے۔

اس پس منظر میں شریف مکہ حسین نے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر کے ترکی فوجوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا۔ شریف مکہ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ حجاز مقدس کو خلافتِ عثمانیہ کے دائرہ سے نکالنے میں کامیابی کی صورت میں اسے عرب سلطنت کا حکمران تسلیم کر لیا جائے گا اور ”امیر المؤمنین“ کے خطاب کے ساتھ اس کی حکومت کا اعلان کر دیا جائے گا۔ مگر بغاوت کامیاب ہونے کے بعد انگریزوں نے یہ وعدہ پورا کرنے سے انکار کر دیا بلکہ پوری عرب دنیا میں ہاشمی خاندان کی حکومت قائم کرنے سے قطع نظر خود حجاز مقدس پر بھی اس کی حکومت کا حق تسلیم نہیں کیا گیا اور اس کی بجائے نجد کے حکمران خاندان آلِ سعود کو آگے کر کے سعودی عرب کے نام سے ایک نئی سلطنت قائم کر دی گئی۔ آلِ سعود کئی پشتوں سے نجد پر حکمران چلے آ رہے تھے اور صدیوں سے خلافتِ عثمانیہ سے ان کی ”آویزش“ جاری تھی، انہوں نے کبھی خلافتِ عثمانیہ کی بالادستی قبول نہیں کی تھی بلکہ مسلسل اس کے

خلاف حالت جنگ میں رہے تھے، اسی وجہ سے ان کا حق اس خطہ پر زیادہ سمجھا گیا۔

شریفِ مکہ حسین صاحب کا حشر یہ ہوا کہ انہیں نظر بند کر دیا گیا اور اسی حالت میں ان کی موت ہوئی۔ جبکہ ان کے فرزند کو فلسطین اور اردن کی ایک پٹی دے کر "المملكة الاردنية الهاشمية" کے نام سے ایک نئی سلطنت قائم کر دی گئی۔ اردن کے موجودہ حکمران شاہ عبد اللہ اسی خاندان کے چشم و چراغ اور مذکورہ حسین شریف مکہ کے پڑپوتے ہیں۔ جبکہ عراق میں اس خاندان کے شاہ فیصل دوم کا تختہ ۱۹۵۸ء میں الٹ کر جرنیلوں نے حکومت سنبھال لی اور موجودہ صدر صدام حسین عراق کی سیکولر فوج کی حکمرانی کے اسی تسلسل کا حصہ ہیں۔

اس پس منظر میں اردن اور عراق کے ایک بڑے حصے کو ملا کر نئی "ہاشمی سلطنت" قائم کرنے کے مجوزہ امریکی منصوبے کو دیکھا جائے تو استعماری قوتوں کے داؤ پیچ اور ان کے مکروفریب کے حملوں کو سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ کس طرح وہ اپنے مذموم مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب اسی عراق کے قضیہ کو لے لیجئے، وہاں سنی شیعہ کشمکش موجود ہے اور اس کا اظہار بھی ہوتا رہتا ہے لیکن اس کشمکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکہ جہاں عراق کے مرکزی حصے کو اپنے ایک وفادار خاندان کے حوالے کر دینا چاہتا ہے وہاں عراق کے سنیوں پر یہ احسان بھی رکھنا چاہتا ہے کہ انہیں شیعوں کے شور و شر اور مداخلت سے مستقل طور پر نجات دلائی جا رہی ہے۔ جبکہ سنی سلطنت اور آل رسولؐ کی حکمرانی کا تمغہ ان کے سر پر الگ سجے گا۔ اور کچھ بعید نہیں کہ اس نئی سنی اور ہاشمی سلطنت کو داخلی طور پر سعودی عرب کی طرح مذہبی رنگ دے کر ہاشمی حکمران کے سر پر امیر المؤمنین کا تاج بھی رکھ دیا جائے جس سے اس خاندان کے جد امجد شریف مکہ حسین کے ساتھ کیے گئے انگریزوں کے وعدہ کی تکمیل کی صورت بھی نکل آئے گی اور عالمِ اسلام میں "خلافت اسلامیہ" کی بحالی کا نعرہ لگانے والوں کا منہ بند کرنے کا بہانہ بھی بن جائے گا کہ لو خلافت اسلامیہ قائم ہو گئی ہے اور امیر المؤمنین کی حکومت بن گئی ہے اور تم جس کام کے لیے اتنے عرصہ سے شور مچا رہے تھے وہ ہم نے کر دیا ہے۔

لیکن کیا امریکی منصوبہ ساز اس پلان کو خدانخواستہ عملی جامہ پہنا کر بھی عالمِ اسلام کے دینی حلقوں کو مکروفریب کے جال میں پھانسنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے ورثاء کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں ہے کہ جنہوں نے پردادا کے مکر کے جال سے دھوکہ نہیں کھایا وہ پڑپوتے کے فریب کا شکار کیسے ہو سکتے ہیں؟

مولانا ضیاء القاسمیؒ اور اہلِ سنت کی ترجمانی

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ---- فروری ۲۰۰۳ء

حضرت مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ کا نام پہلی بار طالب علمی کے دور میں سنا جب ان کی خطابت کا ہر طرف شہرہ تھا اور توحید و سنت کے پرچار کے ساتھ ساتھ شرک و بدعات کے تعاقب میں وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ خطابت کے محاذ پر سرگرم تھے۔ ہم طالب علم تھے گوجرانوالہ شہر اور گردو نواح میں جہاں بھی ان کی تقریر ہوتی ہم جتھہ بن کر جاتے اور ان کے پرجوش خطابت کا حظ اٹھاتے۔ یہ ان کی خطابت کے عروج کا دور تھا، وہ پورے جوش و جذبہ کے ساتھ دو دو تین تین گھنٹے بولتے اور پرجوش خطابت کے ساتھ ترنم کا جوڑ ملا کر عجیب سماں باندھ دیتے۔

شرک و بدعات کے رد و تعاقب میں والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے علمی و تحقیقی کام سے کم و بیش برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کے ہر عالمِ دین نے استفادہ کیا ہے۔ مولانا ضیاء القاسمیؒ بھی ان میں سے تھے، اس لیے جب کبھی ادھر سے گزر ہوتا تو اسی عقیدت کے ساتھ حضرت والد صاحب مدظلہ سے ملنے کے لیے رکتے اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ بھی ان کے ساتھ اسی نسبت سے انس و شفقت کا معاملہ فرماتے۔

میں طالب علمی کے دور میں ہی جمعیۃ علماء اسلام سے وابستہ ہو گیا تھا اور ۱۹۶۲ء میں جنرل ایوب خان مرحوم کے مارشل لاء کے خاتمہ کے بعد سیاسی جماعتوں کی بحالی ہوئی تو میں نے جمعیۃ علماء اسلام کی باقاعدہ رکنیت اختیار کی جو بحمد اللہ تعالیٰ اب تک قائم ہے۔ جبکہ مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ کا جماعتی تعلق اس دور میں تنظیم اہلِ سنت پاکستان کے ساتھ تھا اور وہ ایک موقع پر تنظیم اہلِ سنت پاکستان کے سیکرٹری جنرل بھی رہے۔

شرک و بدعات کی تردید کے بعد مولانا مرحوم کا دوسرا خطابتی محاذ رفض و تشیع کا تعاقب رہا ہے اور وہ زندگی کے ہر دور میں کسی نہ کسی طرح اس مشن کے ساتھ عملی طور پر وابستہ رہے ہیں۔ اہلِ تشیع کی طرف سے اپنے جداگانہ تشخص کے اظہار اور اس کے لیے اوقاف، نصاب تعلیم اور دیگر کئی امور میں ان کے لیے الگ انتظامات کا مطالبہ صدر محمد ایوب خان کے دور میں ہی شروع ہو گیا تھا اور معروف شیعہ راہنما سید محمد دہلوی کی قیادت میں اہلِ تشیع نے قومی دھارے میں اپنے جداگانہ امتیاز کے لیے جدوجہد شروع کر دی تھی۔ اس محاذ پر تنظیم اہلِ سنت پاکستان نے اہلِ سنت کے جذبات کی ترجمانی کے لیے سرگرم جدوجہد کی اور اس جدوجہد کو منظم کرنے میں مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ کا کردار نمایاں رہا۔......

سعودی عرب کی مجوزہ سیاسی اصلاحات

روزنامہ اسلام، لاہور ---۱۸ فروری ۲۰۰۳ء

روزنامہ جنگ لاہور نے عید الاضحیٰ کے روز ریاض سے ریڈیو کے حوالہ سے خبر دی ہے کہ سعودی عرب کے شاہی خاندان نے اعلیٰ سطح پر ایک مشاورت میں فیصلہ کیا ہے کہ ملک میں سیاسی عمل کی اجازت دے کر عوام کے نمائندوں پر مشتمل پارلیمنٹ قائم کی جائے گی اور چھ سال کے عرصہ میں پارلیمنٹ کو اقتدار منتقل کر دیا جائے گا۔ رپورٹ میں اس خبر کے ساتھ یہ خدشہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ ملک کے قدامت پسند مذہبی طبقے کی طرف سے اس فیصلے کی مخالفت متوقع ہے۔

سعودیہ میں عوامی مشاورتی نظام کی تجویز

چند سال قبل بھی اس نوعیت کی خبر آئی تھی کہ سعودی عرب میں مشاورتی نظام قائم کیا جارہا ہے جس میں شاہی خاندان سے ہٹ کر دوسرے لوگوں کو بھی مشاورت کے نظام میں شریک کیا جائے گا اور اقتدار کے دائرہ کو وسعت دی جائے گی۔ جبکہ اس کے بعد ایک مجلس شوریٰ کا قیام بھی عمل میں لایا گیا تھا مگر صورتحال میں عملی طور پر کوئی تبدیلی اب تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ بلکہ حکومت و مشاورت کے نظام میں شرکت تو رہی ایک طرف، حکومتی اقدامات اور شاہی خاندان کی سرگرمیوں کے بارے میں اخبارات اور خطبات میں کسی ناقدانہ رائے کا اظہار بھی ابھی تک سعودی عرب میں شجر ممنوعہ ہے۔ اور اس سلسلہ میں شاہی خاندان کی حساسیت کا عالم یہ ہے کہ اب سے دس سال قبل خلیج عرب میں امریکی فوجوں کی آمد کے موقع پر سعودی عرب کے دو سو کے لگ بھگ ممتاز علماء کرام اور دانشوروں کی طرف سے ایک عرضداشت سعودی فرمانروا کی خدمت میں پیش کی گئی تھی جس میں سعودی عرب کے داخلی نظام میں شرعی اصولوں کی روشنی میں ضروری تبدیلیوں کی درخواست کے ساتھ ساتھ امریکی فوجوں کو خلیج میں آنے کا موقع دینے کی بھی مخالفت کی گئی تھی۔ مگر اس عرضداشت کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا تھا کہ علماء اور دانشوروں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کھلے بندوں حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کریں۔ حتیٰ کہ اس عرضداشت پر دستخط کرنے والے بہت سے علماء کرام اور دانشور گرفتار کر لیے گئے تھے اور بعض جلاوطنی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

اس لیے اگر سعودی عرب میں عوامی سطح پر مشاورت کا کوئی نظام طے کرنے کی تجویز ہے تو ظاہر بات ہے کہ ارباب علم و دانش کی طرف سے اس کا خیر مقدم ہی کیا جائے گا۔ جبکہ اخباری رپورٹ میں ظاہر کیے گئے اس خدشہ کی ہمیں کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ ملک کے قدامت پرست مذہبی

طبقوں کی طرف سے حکومت و مشاورت کے نظام میں عوامی نمائندوں کی شرکت کی مخالفت کی جائے گی۔

اسلام کے سیاسی نظام میں رائے عامہ کا کردار

دراصل اسلام کے بارے میں ایک بات مسلسل غلط فہمی کی وجہ سے سمجھ لی گئی ہے کہ اس کے سیاسی نظام اور حکومت کی تشکیل کے کاروبار میں عوام اور ان کے نمائندوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اور یہ کہ کسی مسلمان حکومت کے قیام اور اس کی بقاء کا دارومدار صرف اس بات پر ہے کہ جس طاقتور گروہ کا بس چلے وہ اقتدار پر قبضہ کرلے اور جب تک اس میں اقتدار پر قبضہ جمائے رکھے کا دم خم باقی ہے اقتدار اس کا حق ہے۔ بدقسمتی سے اموی، عباسی اور عثمانی خلافتوں کے دوران خاندانی سیاسی ڈھانچوں کے تسلسل اور جنوبی ایشیا میں قائم ہونے والی مسلم حکومتوں کے خاندانی پس منظر نے اس خیال کو پختہ کر دیا ہے۔ اس لیے جب بھی اسلامی نظام حکومت کی بات ہوتی ہے تو ایک شخص، گروہ، یا خاندانی آمریت کا تصور ہی ذہنوں میں ابھرتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اسلام کا آئیڈیل نظام مذکورہ حکومتیں نہیں بلکہ خلافت راشدہ کا نظام ہے۔ خاندانی خلافتوں اور طاقت کے بل پر قائم ہونے والی حکومتوں کو مختلف ادوار میں برداشت ضرور کیا گیا ہے جس طرح ہمارے ہاں نظریۂ ضرورت بلکہ نظریۂ مجبوری کے تحت آئین سے ماورا حکومتوں کو برداشت کر لیا جاتا ہے۔ لیکن ضرورت اور مجبوری کے تحت برداشت کی جانے والی حکومتوں کو نہ تو آئیڈیل تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ اسلامی دستور کی تشکیل میں انہیں بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ دنیا میں جب بھی کسی اسلامی حکومت کا قیام دستور و قانون کے حوالہ سے عمل میں لایا جائے گا اس کی بنیاد قرآن و سنت کے فیصلے اور خلفاء راشدینؓ کا تعامل اور طرز عمل ہی بنیں گے، اور انہی کی روشنی میں تشکیل پانے والا دستور ایک صحیح اسلامی دستور قرار پائے گا۔

حکومت کی تشکیل کے سلسلہ میں اسلام کا مزاج کیا ہے؟ اس کے بارے میں دو تین روایات کا حوالہ دینا چاہوں گا۔

سیدنا صدیق اکبرؓ کی خلافت

پہلی روایت مسلم شریف کی ہے جو سیدنا ابوبکرؓ کے فضائل کے باب میں مذکور ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے چند روز قبل فرمایا کہ میں اپنے والد محترم ابوبکرؓ اور بھائی عبد الرحمٰنؓ کو بلاؤں تاکہ آپؐ انہیں خلافت کے بارے میں کوئی دستاویز لکھ دیں۔ جناب نبی اکرمؐ کو خدشہ تھا کہ خلافت کا کوئی اور دعویدار نہ کھڑا ہو جائے لیکن پھر حضورؐ نے اس

سے منع فرما دیا اور کہا یابی اللہ والمومنون الا ابا بکر کہ ابو بکرؓ کے سوا اللہ تعالیٰ بھی کسی کو خلیفہ نہیں بنائیں گے اور مسلمان بھی ان کے سوا کسی کو خلیفہ کے طور پر قبول نہیں کریں گے۔

اس کا مطلب واضح ہے کہ آنحضرتؐ نے پہلے حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ نامزد کرنے کا ارادہ کیا لیکن بعد میں مسلمانوں کی اجتماعی رائے پر اعتماد کرتے ہوئے عملاً ایسا نہیں کیا۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب مسلمانوں کی باہمی مشاورت کے ذریعہ ہوا۔ خلافت اور امامت کے حوالہ سے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے موقف کا بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ اہلِ سنت کے نزدیک حضورؐ نے اپنا جانشین خود مقرر کرنے کی بجائے اسے مسلمانوں کی رائے پر چھوڑ دیا تھا۔ جبکہ اہلِ تشیع کے نزدیک حضورؐ نے اپنے جانشین کی نامزدگی خود فرمادی تھی۔ اہلِ سنت کے نزدیک یہ نظام خلافت کہلاتا ہے اور اس کی تشکیل میں نامزدگی کا کوئی دخل نہیں ہے جبکہ اہلِ تشیع کے نزدیک یہ امامت کہلاتی ہے اور نامزدگی کے ذریعہ ہی اس کی تعمیل ہوتی آئی۔

سیدنا عمر فاروقؓ کی وصیت

دوسری روایت بخاری شریف میں ہے جو امام بخاریؒ نے "کتاب الحاربین من اہل الکفر والردۃ" میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے حوالہ سے تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے آخری خطبہ جمعۃ المبارک میں یہ ارشاد فرمایا کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ بعض لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں کہ اگر میرا انتقال ہو گیا تو فلاں بزرگ کے ہاتھ پر اسی طرح خلافت کی بیعت کر لیں گے جیسے ایک مجلس میں حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئی تھی، اور جس طرح حضرت ابو بکرؓ کی خلافت منعقد ہو گئی تھی اسی طرح جس بزرگ کے ہاتھ پر وہ اچانک بیعت کر لیں گے ان کی خلافت کو تسلیم کرنے پر بھی لوگ مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن میں خبر دار کرتا ہوں کہ کوئی شخص اس بات کے دھوکے میں نہ رہے کیونکہ جناب رسول اللہؐ کے وصال کے بعد حالات خاص نوعیت کے تھے اور حضرت ابو بکرؓ کی شخصیت مسلمانوں میں متفقہ تھی، اس لیے ایک مجلس کی بیعت کی وجہ سے ان کی خلافت تسلیم کر لی گئی تھی۔ اب تمہارے پاس ان جیسی کوئی شخصیت نہیں ہے جس کے سامنے سب لوگ گردن جھکا دیں، اس لیے جو شخص بھی عام مسلمانوں کی مشاورت کے بغیر کسی کی بیعت کی بات کرے اس کی بات ہرگز قبول نہ کی جائے۔ بخاری شریف کی اس روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا کہ ایسی باتیں کرنے والے لوگ مسلمانوں سے ان کے اختیارات غصب کرنا چاہتے ہیں اس لیے میں ان سے خبر دار کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

گویا حضرت عمرؓ نے اپنے آخری خطبۂ جمعۃ المبارک میں یہ بات بطور اصول بیان فرمادی کہ کسی

مسلمان حکومت کا قیام عام مسلمانوں کی مشاورت سے ہی عمل میں آسکتا ہے اور عام مسلمانوں کے شریک کیے بغیر ان سے بالا بالا کسی حکومت کے قیام کی کوشش ان کے اختیارات اور حقوق غصب کرنے کے مترادف ہے جس سے گریز کی حضرت عمرؓ نے سختی کے ساتھ مسلمانوں کو تلقین فرمائی ہے۔

عوامی نمائندوں کا تصور

تیسری روایت بھی بخاری شریف کی ہے جو امام بخاریؒ نے حضرت مسور بن مخرمہؓ اور حضرت مروان بن الحکمؒ کے حوالہ سے غزوۂ حنین کے باب میں اور چند دیگر ابواب میں بھی بیان کی ہے کہ غزوۂ حنین میں حاصل ہونے والا غنیمت کا مال اور قیدی حضورؐ نے مجاہدین میں تقسیم فرما دیے تو اس کے بعد شکست خوردہ قبیلہ بنو ہوازن کا وفد آیا جس نے آپؐ سے اپنے قیدی اور مال واپس مانگے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ میں کافی دنوں سے تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں مگر تم نہیں آئے تو میں نے مال بھی مجاہدین میں تقسیم کر دیا ہے اور قیدی مرد اور عورتیں بھی ان میں بانٹ دی ہیں۔ اس لیے دونوں تمہیں واپس نہیں مل سکتے ان میں سے ایک کا انتخاب کر لو تو میں مسلمانوں سے اس سلسلہ میں بات کرتا ہوں۔ بنو ہوازن کے وفد نے کہا کہ ہمیں ہمارے مرد اور عورتیں واپس کر دیے جائیں جو جنگ میں آپ نے قید کر لیے تھے اور جنہیں غلام اور لونڈیاں بنا کر آپ نے لشکر میں تقسیم کر دیا ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے ان سے قیدیوں کی واپسی کا وعدہ کر لیا اور مسلمانوں کو جمع کر کے ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ اس وقت بارہ ہزار کے قریب مسلمان تھے۔ ان سے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں نے قیدیوں کی واپسی کا وعدہ کر لیا ہے اس لیے تم میں سے محض اپنی خوشی سے قیدی واپس کر دے تو اس کی مرضی ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنا قیدی واپس نہ کرنا چاہے تو میں اس سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ یہ قیدی واپس کر دے تو میں اس کے عوض اگلی جنگ کے قیدیوں میں سے قیدی اسے دے دوں گا۔ لشکر کے سب حضرات نے آپؐ کا یہ ارشاد گرامی سن کر بیک آواز کہا کہ ہم سب بخوشی اپنے اپنے قیدی واپس کرتے ہیں۔ لیکن جناب نبی اکرمؐ نے اس اجتماعی آواز پر اطمینان نہیں فرمایا اور کہا کہ ہمیں پتہ نہیں چل سکا کہ تم میں سے کون بخوشی راضی ہے اور کون اس بات پر خوش نہیں ہے۔ اس لیے سب اپنے خیموں میں واپس جاؤ اور تمہارے عرفاء (نمائندے) ہمیں آکر تمہاری رائے سے آگاہ کریں پھر ہم حتمی فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ سب لوگ خیموں میں واپس ہو گئے اور ان کے نمائندوں نے باری باری آکر حضورؐ کو بتایا کہ سب لوگ قیدیوں کو واپس کرنے میں بخوشی راضی ہیں، اس پر آپؐ نے بنو ہوازن کے قیدی ان کو واپس کر دیے۔

اس روایت سے یہ بات بطور اصول معلوم ہوتی ہے کہ جہاں حقوق کا معاملہ ہو وہاں سب کی رائے لینا ضروری ہے اور اگر سب لوگوں کی رائے براہ راست معلوم کرنا ممکن نہ ہو تو ان کے نمائندوں

کے ذریعہ بھی ان کی رائے معلوم کی جاسکتی ہے۔ اور یہاں ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ لوگوں کے جذبات، رائے اور احساسات معلوم کر کے حکومت تک پہنچانے والے افراد حکومت کے نمائندے نہیں ہیں بلکہ انہیں نبی اکرمؐ نے عرفاءکم یعنی "تمہارے نمائندے" کہا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ان نمائندوں کا تعین حکومت کا کام نہیں بلکہ عام لوگوں کا حق ہے کہ وہ اپنے نمایندوں کا چناؤ کریں تاکہ وہ ان کے حقوق، آراء، جذبات اور احساسات سے حکومت کو آگاہ کر سکیں۔

اس پس منظر میں اگر سعودی حکومت ملک کے نظم ونسق اور مشاورت کے نظام میں عوام کو شریک کرنے کا کوئی پروگرام طے کرتی ہے اور عوام کی رائے، جذبات اور مسائل سے آگاہی کے لیے عوامی نمائندوں کے چناؤ کا کوئی نظم بناتی ہے تو یہ اسلامی اصولوں سے انحراف نہیں ہوگا بلکہ اسلام کے ان اعلیٰ اصولوں اور اقدار کی طرف واپسی کا عمل ہوگا جس کی وضاحت حضرت عمرؓ نے اپنے آخری خطبہ جمعۃ المبارک میں فرمائی تھی۔ اور جن اصولوں اور اقدار و روایات سے مسلسل انحراف کر کے ہم نے خود اسلام کے آئیڈیل اور اعلیٰ سیاسی نظام کو شکوک و شبہات کے دھندلکوں میں گم کر رکھا ہے۔

دورِ جدید میں اجتہاد

شیخ زید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ---۱۸ مارچ ۲۰۰۳ء

...... آج کل عام طور پر ایک بات تسلسل کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ علماء کرام نے "اجتہاد" کا دروازہ بند کر دیا ہے اور جمود کو امت پر مسلسل مسلط کر رکھا ہے جس کی وجہ سے امت پر ترقی کے دروازے مسدود ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس مرحلہ پر اس سوال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے لیا جائے تو مناسب بات ہوگی۔

جہاں تک اجتہاد کے بنیادی اصول وضوابط کے تعین کی بات ہے، اس کا دروازہ تو ابتدائی تین صدیوں کے بعد سے اس لحاظ سے بند ہے کہ اس کے بعد اجتہاد کا عمل انہی دائروں میں ہوتا آرہا ہے جو مسلمہ فقہی مکاتبِ فکر نے طے کر دیے تھے اور یہ دروازہ کسی کے بند کرنے سے بند نہیں ہوا بلکہ ضرورت پوری ہو جانے کے بعد فطری طور پر خود بخود بند ہو گیا ہے جیسا کہ کسی بھی علم کا فطری پراسیس ہوتا ہے، البتہ مسلمہ فقہی مکاتبِ فکر کے متعیّن کردہ اصولوں کے دائرہ میں اجتہاد کا معاملہ قدرے تفصیل طلب ہے۔ ہمارے خیال میں جو فقہ جس دور میں بھی کسی اسلامی مملکت کا قانون رہی ہے، اس میں وقت کی رفتار اور ضرورت کے مطابق اجتہاد کا عمل بھی جاری رہا ہے۔ اس اجتہاد میں نئے پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ پرانے فقہی فتاویٰ پر نظر ثانی کا عمل بھی شامل ہے۔

- خلافتِ عثمانیہ اور جنوبی ایشیا کی مغل حکومت دونوں کا قانون فقہ حنفی پر مبنی تھا۔ خلافتِ عثمانیہ میں "مجلۃ الاحکام العدلیہ" کی تدوین اور مغل حکومت میں "فتاویٰ عالم گیری" کی ترتیب کے کام پر نظر ڈال لیجیے، آپ کو سابقہ فقہی فتاویٰ پر نظر ثانی اور نئے مسائل کے حل کی اجتہادی کاوشیں دونوں جگہ یکساں دکھائی دیں گی۔
- موجودہ دور میں سعودی عرب میں حنبلی فقہ کی عمل داری ہے، آپ اس کا جائزہ لیں گے تو سعودی قضاۃ کے فیصلوں میں آپ کو حنبلی فقہ اب سے دو سو برس قبل کی جزئیات کی شکل میں نہیں بلکہ آج کی ضروریات اور تقاضوں کے حوالے سے جدید اجتہادات کی روشنی میں آگے بڑھتی نظر آئے گی۔
- اسی طرح اہلِ تشیع نے ایران میں فقہ جعفری کو ملکی قانون کا درجہ دیا ہے تو یقیناً انہوں نے صدیوں پہلی کتابیں اٹھا کر انہیں عدالتی قانون کی حیثیت نہیں دے دی بلکہ آج کے حالات اور تقاضوں کے مطابق انہیں جدید اجتہادات کے ساتھ جدید قانونی زبان اور اصطلاحات کے ذریعہ نافذ العمل بنایا ہے۔

یہ فقہی مذاہب کے اس کردار کی بات ہے جو انہوں نے مختلف ممالک میں سرکاری مذاہب کے طور پر ادا کیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ اس سے ہٹ کر پرائیویٹ سیکٹر میں دیکھ لیجیے۔ ہمارے ہاں جنوبی ایشیا میں مغل اقتدار کے خاتمہ کے بعد اجتہاد اور افتا کا یہ عمل عدالت اور سرکار کے دائرہ سے نکل کر عوامی حلقوں میں آ گیا تھا۔ اس خطے میں گزشتہ دو صدیوں کے دوران سینکڑوں دار الافتا قائم ہوئے ہیں جو اب بھی کام کر رہے ہیں اور ان میں سے بیسیوں کو علمی و عوامی حلقوں میں اس درجہ کا اعتماد حاصل ہے کہ دینی معاملات میں ان کی بات کو حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے بلا مبالغہ لاکھوں فتاویٰ جاری کیے ہیں جو کئی ضخیم کتابوں کی صورت میں مارکیٹ میں موجود ہیں۔ اگر اہل علم کی کوئی ٹیم اس کام کے لیے مقرر کی جائے کہ وہ ان فتاویٰ کا جائزہ لے کر یہ تجزیہ کرے کہ ان میں کتنے فتوے ایسے ہیں جن میں ان مفتیان کرام نے اجتہادی صلاحیت سے کام لیتے ہوئے قرآن وسنت کی روشنی میں جدید مسائل کے نئے حل پیش کیے ہیں تو ہمارے محتاط اندازے کے مطابق ان کا تناسب مجموعی فتاویٰ کے بیس فی صد سے کسی طرح کم نہیں ہو گا۔ آپ ان کے فتاویٰ سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس بات سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ انہوں نے نئے مسائل کا سامنا کیا، ان کے حل کے لیے اجتہاد کا عمل اختیار کیا اور جدید مسائل میں مسلمانوں کی راہ نمائی کی ہے۔......

اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی روایات اور ان کے ذرائع

روزنامہ اسلام، لاہور ---۲۷ اپریل ۲۰۰۳ء

گزشتہ روز اسلام آباد میں ”برصغیر میں مطالعۂ حدیث“ کے عنوان پر ایک سیمینار میں شرکت کا موقع ملا۔ اس سیمینار کا اہتمام ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد نے کیا اور یہ ۲۱ و ۲۲ اپریل ۲۰۰۳ء کو دو دن تک جاری رہا۔

...... محترم ڈاکٹر حسن الشافعی نے حدیثِ نبوی کے حوالہ سے مستقبل کی ضروریات کی خوبصورت انداز میں وضاحت کی اور خاص طور پر حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ پر روشنی ڈالی کہ اسلامی نظام کے بارے میں آج کی ضرورت یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دھلویؒ کے فلسفہ وفکر سے دنیا کو متعارف کرایا جائے اور اس کی روشنی میں انسانی حقوق، جدید عمرانی علوم، اور سیاسی اجتماعیت جیسے مسائل پر احادیث نبویہ ؐ کی تحقیق وتشریح کی جائے۔

ڈاکٹر حسن الشافعی نے ایک اور ضرورت کی طرف بھی توجہ دلائی کہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی روایات اور ان کے ذرائع مختلف ہیں لیکن اگر دونوں مذاہب کی مشترکہ روایات کو یکجا کرنے کا اہتمام کیا جا سکے تو ان کے خیال میں ستر فیصد روایات ایسی ہیں جو اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی احادیث کی کتابوں میں مشترک ہیں۔ ڈاکٹر شافعی کا خیال ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو یہ ایک بڑی علمی خدمت ہوگی اور اس سے دونوں کے درمیان خلیج کو کم کرنے میں بھی مدد ملے گی۔......

فلسطینی وزیراعظم محمود عباس اور بہائی فرقہ

روزنامہ اسلام، لاہور ---۱۱ جولائی ۲۰۰۳ء

فلسطین کی آزادی اور فلسطینیوں کے لیے الگ ریاست کے قیام کے لیے کم و بیش پینتیس برس سے مسلسل جدوجہد کرنے والے لیڈر یاسر عرفات کو منظر سے ہٹا کر محمود عباس کو سامنے لایا گیا ہے اور اب امریکہ اور اسرائیل فلسطین کے مستقبل کے حوالہ سے کم وبیش سارے معاملات محمود عباس سے طے کر رہے ہیں۔ قارئین کو یہ بات یاد ہوگی کہ یاسر عرفات کو پس منظر میں لے جانے اور محمود عباس کو فلسطینی اتھارٹی کا وزیراعظم بنوانے میں سب سے زیادہ دلچسپی امریکہ نے لی تھی اور اسی کے دباؤ پر محمود

عباس کو فلسطین کا وزیر اعظم نامزد کر کے یاسر عرفات منظر سے ہٹ گئے تھے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ محمود عباس کی آخر کیا خصوصیت ہے کہ اس فیصلہ کن مرحلہ میں انہیں فلسطینی معاملات کا کارِ مختار بنا دیا گیا ہے اور فلسطین کے مستقبل کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دینے کے لیے امریکہ کو اس قدر دباؤ ڈالنا پڑا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ عالمی استعمار کی تکنیک یہی ہے کہ کسی بھی ملک یا قوم سے اپنی مرضی اور منشا کے مطابق معاملات طے کرنے کے لیے پہلے اس ملک میں اپنی مرضی کا آدمی برسرِاقتدار لایا جائے اور پھر اسے تحفظ فراہم کر کے اس کے ذریعے تمام معاملات طے کر لیے جائیں۔ ہم خود پاکستان میں اسی طریق واردات کا شکار ہیں لیکن اس کے باوجود محمود عباس کی ذات اور شخصیت کے حوالہ سے بات ذہن میں صاف نہیں ہو رہی تھی۔ خدا بھلا کرے جماعت اسلامی پاکستان کے ڈائریکٹر امور خارجہ جناب عبد الغفار عزیز کا کہ انہوں نے ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کے جولائی کے شمارہ میں اپنے ایک مضمون میں یہ انکشاف کر کے میری یہ الجھن دور کر دی ہے کہ یہ محمود عباس صاحب بہائی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے انہیں امریکہ اور اسرائیل نے فلسطین کے مستقبل کے معاملات طے کرنے کے لیے ”قابل اعتماد فلسطینی لیڈر“ کا درجہ دیا ہے۔

بہائی فرقہ کا اصل سرچشمہ ایران ہے جہاں انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں مرزا محمد علی نامی ایک صاحب نے دعویٰ کیا کہ اہلِ تشیع کا امامیہ فرقہ اپنے بارہ اماموں میں سے جس آخری امام کو ”امام غائب“ سمجھتا ہے اور ان کے دوبارہ آنے کا منتظر ہے اس امام غائب کے ساتھ مرزا محمد علی کا رابطہ قائم ہو گیا ہے اور مرزا محمد علی کو امام غائب کے ساتھ رابطہ کے لیے ”باب“ کا مقام مل گیا ہے۔ اسی وجہ سے انہیں محمد علی الباب کہا جاتا ہے اور اس فرقہ کو ان کی نسبت سے ”بابی“ کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ مرزا محمد علی باب نے اس دعویٰ کے بعد ایک نئے دین کا تصور پیش کیا اور بتایا کہ اب دنیا کی نجات ان کی تعلیمات پر عمل کرنے میں ہے۔

مرزا محمد علی باب کے خلاف ایران کے شیعہ علماء نے سخت ردعمل کا اظہار کیا اور بالآخر انہیں مقدمہ چلا کر تبریز چھاؤنی میں سزائے موت دے دی گئی۔ مرزا محمد علی باب کے بعد ان کے مشن کو ان کے ایک ہوشیار شاگرد مرزا بہاء اللہ شیرازی نے آگے بڑھایا اور یہ تاثر دیا کہ مرزا محمد علی باب صرف ان کی بشارت دینے اور ان کی راہ ہموار کرنے کے لیے آئے تھے، دنیا کے اصل ہادی وہ ہیں، ان پر وحی آتی ہے، وہ نبوت کے منصب پر فائز ہیں اور پہلے تمام ادیان اسلام سمیت منسوخ ہو کر اب ان کے نئے مذہب بہائی میں ضم ہو چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم

السلام کی حیثیت (معاذ اللہ) نہروں کی ہے اور مرزا بہاء اللہ شیرازی اس دریا کی مانند ہے جس میں ساری نہریں آکر ضم ہو جاتی ہیں اور اپنا الگ تشخص کھو دیتی ہیں۔ مرزا بہاء اللہ نے قرآن کریم کے منسوخ ہونے کا اعلان کیا اور کہا کہ اب اس وحی الٰہی کو فائنل اتھارٹی کا درجہ حاصل ہے جو ان پر ”الواح مقدسہ“ کی صورت میں نازل ہوئی ہے۔ بیت اللہ کی بجائے فلسطین کے شہر ”عکا“ کو نیا قبلہ قرار دیا گیا اور وحدت ادیان کا تصور پیش کیا گیا۔

راقم الحروف نے کچھ عرصہ قبل حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی کے ہمراہ شکاگو میں بہائیوں کی ایک عبادت گاہ دیکھی تھی، اس کے وسیع ہال میں مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں، ہندوؤں اور سکھوں کے لیے عبادت کی الگ الگ جگہیں بنائی گئی ہیں اور سب کی مذہبی کتابیں مہیا کی گئی ہیں۔ بہائیوں نے ایک الگ کیلنڈر بھی ترتیب دیا جس میں ہر ماہ کے ۱۹ دن ہیں اور سال بھی ۱۹ ماہ کا ہے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک ۱۹ کے عدد کو مقدس سمجھا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک دور میں ۱۹ کے عدد کے حوالہ سے قرآن کریم کا اعجاز دنیا کے سامنے پیش کرنے اور پھر اس حوالہ سے قرآن کریم کی بعض آیات اور احادیث مبارکہ کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی مہم چلی تھی تو کچھ عرصہ یہ مہم چلنے کے بعد واضح ہوا کہ اس کے پیچھے بہائیوں کا فلسفہ و فکر کام کر رہا تھا۔

مرزا بہاء اللہ شیرازی کو بھی ایران کے شیعہ علماء کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے وہ ترکی گئے تاکہ خلافتِ عثمانیہ اور ایران کے درمیان مخاصمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے لیے جگہ بنا سکیں لیکن یہ بات زیادہ دیر نہ چل سکی اور بالآخر فلسطین کے شہر عکا کو انہوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا جہاں ان کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد ان کے فرزند مرزا عبد البہاء نے بہائیوں کی قیادت سنبھال لی۔ بہائیوں کے بارے میں مؤرخین اور تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ انہیں اسی طرح روسی بادشاہت کی پشت پناہی حاصل تھی جیسے ہمارے ہاں قادیانیوں کو انگریزی حکومت نے پروان چڑھایا تھا اور ایران میں روسی مفادات کے لیے بہائی اسی طرح کام کرتے رہے جیسے ہمارے ہاں قادیانیوں نے برطانوی استعمار کی مسلسل خدمات سرانجام دیں اور اب امریکی استعمار کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ایران کے مذہبی انقلاب سے قبل بادشاہت کے دور میں بہائیوں نے ایران کی فوج اور سول میں خاصا اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا اور کہا جاتا تھا کہ ایرانی معاملات کا اصل کنٹرول بہائیوں کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ سابق ایرانی وزیر اعظم امیر عباس ہویدا سمیت بہت سے سرکردہ لوگوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ بہائی تھے اس لیے ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد نئی حکومت کے عتاب کا نشانہ سب سے زیادہ وہی بنے۔ اور مشہور ہے کہ انقلاب کی مخالفت کے جرم میں جن لوگوں کو موت کی سزا دی گئی ان میں زیادہ

تعداد بہائی افسران کی تھی۔

قادیانیوں کی طرح بہائی بھی دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہیں اور ان کے بڑے بڑے مراکز قائم ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جنوبی ایشیا میں ان کا سب سے بڑا مرکز دہلی میں ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد پاکستان میں بھی ان کی خاصی تعداد آئی ہے اور مختلف شہروں میں آباد ہے۔ کراچی، اسلام آباد، لاہور، ملتان، حیدرآباد اور سیالکوٹ سمیت درجنوں بڑے شہروں میں ان کے مراکز موجود ہیں اور مختلف حوالوں سے ان کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ قادیانیوں کے ساتھ بھی ان کی مناظرانہ اور معاصرانہ چشمک جاری رہتی ہے، دونوں ایک دوسرے کے خلاف بہت کچھ لکھتے رہتے ہیں اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے دوبارہ نزول اور حضرت امام مہدیؒ کے ظہور کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور پیش گوئیوں کو دونوں فریق اپنے اپنے معانی پہنا کر خودساختہ تاویلات کے ساتھ مرزا بہاء اللہ شیرازی یا مرزا غلام احمد قادیانی پر فٹ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ باہمی بحثیں مناظرانہ ذوق رکھنے والے حضرات کے لیے خاصی دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔

فلسطین کے نئے لیڈر کے طور پر ایک بہائی مرزا محمود عباس کے چناؤ سے جہاں یہ بات واضح ہوئی ہے کہ اب فلسطین میں وہی کچھ ہوگا جو امریکہ اور اسرائیل چاہیں گے وہاں ایک پہلو یہ بھی سامنے آیا ہے کہ فلسطینی مسلمانوں میں کوئی شخص اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ امریکہ اور اسرائیل اپنے مفادات کے حوالہ سے اس پر کسی درجہ میں بھی اعتماد کر سکیں۔ حتیٰ کہ یاسر عرفات جس نے امریکہ کو راضی رکھنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا یا وہ غریب بھی کھڈے لائن لگا دیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ بات ''ڈس کریڈٹ'' کی نہیں بلکہ ''کریڈٹ'' کی ہے کہ امریکہ کسی مسلمان کو اعتماد کے قابل نہیں سمجھ رہا اور اسے اپنا کام چلانے کے لیے اسلام سے منحرف ہو جانے والے گروہوں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔

عراق میں بھی اسی طرح کی صورتحال ہے کہ کوئی عراقی لیڈر اس حد تک آگے جانے کو تیار دکھائی نہیں دیتا جہاں تک امریکہ عراق کو آگے لے جانا چاہتا ہے۔ اور افغانستان میں بھی تمام تر جبر و تشدد اور قتل و غارت کے باوجود امریکہ اپنی مرضی کا نظام اور لیڈر شپ افغانوں پر مسلط کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا اس لیے کہ کرزئی حکومت کی طرف سے افغانستان کے نئے دستور کا جو ڈھانچہ منظر عام پر آیا ہے اس میں اسلام کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے اور تمام شرعی قوانین کے مکمل نفاذ کی ضمانت پر نئے دستوری ڈھانچے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ البتہ پاکستان کی صورتحال ابھی واضح نہیں ہو رہی، قادیانی گروہ کے آنجہانی سربراہ مرزا طاہر احمد نے تین سال قبل کہا تھا کہ پاکستان میں اب ہماری حکومت آنے والی

ہے۔ یقیناً اس کی کوئی پلاننگ موجود ہوگی اور چونکہ امریکہ بہادر کے ایجنڈے میں فلسطین کے بعد کشمیر کی باری ہے اور کہا جا رہا ہے کہ کشمیر کے مسئلہ کے حل کے لیے کوئی متبادل روڈ میپ زیر غور ہے اس لیے لازماً یہاں بھی کسی مرزا محمود عباس کی ضرورت پیش آئے گی۔ اب معلوم نہیں کہ ہمارے موجودہ حکمران ہی مرزا محمود عباس بننے کے لیے تیار ہو گئے ہیں یا انہیں یاسر عرفات کا ''پروٹوکول'' دے کر پردۂ غیب سے کوئی اور مرزا محمود عباس نمودار ہونے والا ہے۔

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

مولانا اعظم طارقؒ: گرفتاری سے شہادت تک

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۱۹۹۸ء

روزنامہ خبریں لاہور ۲۱ دسمبر ۱۹۹۷ء کی خبر کے مطابق لاہور ہائیکورٹ کے راولپنڈی بینچ نے سپاہ صحابہؓ کے راہنما اور پنجاب اسمبلی کے رکن مولانا محمد اعظم طارق کی اس درخواست پر ڈی آئی جی پولیس سے رپورٹ طلب کر لی ہے کہ انہیں اپنا علاج جیل سے باہر کرانے کی اجازت دی جائے۔

مولانا محمد اعظم طارق چند ماہ قبل لاہور سیشن کورٹ کے احاطہ میں بم کے اس دھماکہ میں شدید زخمی ہو گئے تھے جس میں مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی شہید ہوئے تھے۔ اس حادثے میں مولانا محمد اعظم طارق کا پورا وجود چھلنی ہو گیا تھا مگر ان کی جان بچ گئی اور وہ مسلسل صاحبِ فراش ہیں۔ اسی دوران انہیں گرفتار کر لیا گیا اور بعض اطلاعات کے مطابق انہیں ذہنی تشدد کا نشانہ بنائے جانے کے علاوہ علاج کی مناسب سہولتوں سے بھی مسلسل محروم رکھا جا رہا ہے۔ بعض قریبی حلقوں کے مطابق ان کے خلاف جن مقدمات میں ملوث ہونے کا الزام ہے ان میں سے بیشتر میں وہ پولیس کی تفتیش کے مطابق بے گناہ ثابت ہو چکے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ ابھی تک زیر حراست ہیں اور حکومت جان بوجھ کر ان کی گرفتاری کا سلسلہ دراز سے دراز تر کرتی جا رہی ہے۔

یہ صورتحال انتہائی افسوسناک ہے اور اسے کسی طرح بھی پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر مولانا محمد اعظم طارق کے خلاف واقعی کوئی سنجیدہ کیس ہے تو اسے سامنے لایا جائے، بلکہ ہم یہ گزارش کریں گے کہ ایک عدالتی کمیشن قائم کر کے مولانا محمد اعظم طارق کے خلاف درج تمام مقدمات کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے۔ اور اگر یہ کیس محض خانہ پُری کے لیے ہیں تو ایک زخمی اور زیر علاج مذہبی راہنما اور

رکن اسمبلی کو بلاوجہ جیل میں رکھنا سراسر زیادتی ہے جس پر ہر منصف مزاج شخص کو احتجاج کرنا چاہیے۔ ہم حکومت سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ مولانا محمد اعظم طارق کو رہا کیا جائے ورنہ کم از کم انہیں اپنا علاج ان کی خواہش کے مطابق جیل سے باہر کرانے کی سہولت مہیا کی جائے کہ یہ تو ایک عام سا انسانی حق اور جائز مطالبہ ہے جسے نظر انداز کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۱۹۹۹ء

سپاہ صحابہؓ کے راہنما اور پنجاب اسمبلی کے رکن مولانا اعظم طارق ایک عرصہ سے جیل میں ہیں اور ان کی رہائی کی کوئی صورت سامنے نہیں آ رہی۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۵ دسمبر ۱۹۹۸ء کے مطابق لاہور ہائیکورٹ نے ایک رٹ درخواست پر اس صورتحال کا نوٹس لیا ہے اور حکومتِ پنجاب کو ہدایت کی ہے کہ وہ مولانا اعظم طارق کو ان کے خلاف درج تمام مقدمات کی فہرست مہیا کرے، اور اگر وہ ان مقدمات میں پولیس کو مطلوب نہیں ہیں تو انہیں رہا کر دیا جائے۔ درخواست گزار نے اپنی رٹ میں یہ کہا تھا کہ جن دو مقدمات میں مولانا اعظم طارق کو گرفتار کیا گیا تھا ان دونوں میں ان کی ضمانت ہو چکی ہے مگر اس کے باوجود انہیں رہا نہیں کیا گیا۔ اس کے جواب میں اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل پنجاب نے عدالتِ عالیہ کے سامنے یہ موقف اختیار کیا کہ ضمانت کے مچلکے داخل نہ ہونے کی وجہ سے انہیں رہا نہیں کیا گیا۔

ہمارے خیال میں یہ سب خانہ پُری ہے، اصل بات یہ ہے کہ صوبائی حکومت مولانا اعظم طارق کو ہر حال میں سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہے اور مختلف حیلوں بہانوں سے اس تسلسل کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس لیے اگر عدالتِ عالیہ اس بارے میں انصاف کرنا چاہتی ہے تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ فاضل عدالت تمام مقدمات کا ریکارڈ طلب کر کے انصاف کے تقاضوں کو خود پورے کرنے کا اہتمام کرے، ورنہ موجودہ حکومت سے اس سلسلہ میں کسی خیر کی کوئی توقع نہیں ہے۔

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۱ جولائی ۲۰۰۲ء

انسدادِ دہشت گردی کی عدالت سے مولانا محمد اعظم طارق کی ضمانت منظور ہو جانے کے باوجود انہیں حکومت پنجاب نے مزید تین ماہ کے لیے نظر بندی کے عنوان سے زیر حراست رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ این این آئی کی ایک رپورٹ کے مطابق مولانا محمد اعظم طارق کو حکومتی حلقوں کی طرف سے یہ پیشکش کی گئی ہے کہ اگر وہ جلاوطنی قبول کر لیں تو انہیں رہا کیا جا سکتا ہے ورنہ حکومت اس بات پر مجبور ہے کہ انہیں مسلسل زیر حراست رکھے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مولانا موصوف نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ملک سے باہر جانے کی بجائے ملک کے اندر جیل میں رہنے کو

ترجیح دیں گے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا محمد اعظم طارق کی رہائی کا اب بظاہر کوئی امکان باقی نہیں رہا اور موجودہ حکومت کے دور میں انہیں اپنا وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزارنا ہوگا۔ مولانا محمد اعظم طارق نوجوان عالمِ دین ہیں، کالعدم سپاہ صحابہ کے سربراہ رہے ہیں، جھنگ سے قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے منتخب رکن رہے ہیں اور انہیں ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد افغانستان پر امریکی حملے کے خلاف ''دفاع پاکستان و افغانستان کونسل'' کے زیر اہتمام احتجاجی تحریک میں سرگرم کردار ادا کرنے پر گرفتار کیا گیا تھا۔ تب سے وہ مسلسل حراست میں ہیں اور اس ''جرم'' میں گرفتار ہونے والے بعض دیگر سرکردہ رہنماؤں کی رہائی کے باوجود ان کی رہائی کے امکانات دن بدن معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس دوران سپاہ صحابہ پاکستان کو بعض دیگر مذہبی تنظیموں کے ہمراہ خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے اور اس پر فرقہ وارانہ اور انتہاپسندانہ سرگرمیوں کا الزام ہے۔ اس لیے بادی النظر میں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ فرقہ وارانہ سرگرمیوں اور انتہاپسندانہ رجحانات کو کنٹرول کرنے کے لیے کچھ عرصہ تک انہیں جیل میں رکھنا ضروری سمجھا جا رہا ہے۔ لیکن ان کے بہی خواہ حلقے اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو فرقہ وارانہ انتہاپسندی کے جرم میں سپاہ صحابہ کے بالمقابل جس حریف تنظیم کو خلاف قانون قرار دیا گیا ہے اس کے سربراہ کو بھی اسی طرح جیل میں رکھا جانا چاہیے تاکہ یہ بات واضح ہو کہ حکومت فی الواقع فرقہ وارانہ سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے میں سنجیدہ ہے اور اس حوالے سے سب کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھے ہوئے ہے۔ مگر صورتحال اس کے برعکس ہے اور کالعدم سپاہ صحابہ کی حریف کالعدم تنظیم کے سربراہ نہ صرف جیل سے باہر ہیں بلکہ مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں میں پوری طرح آزادی کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں۔ اس لیے اس پس منظر میں مولانا محمد اعظم طارق کی مسلسل گرفتاری نہ صرف ان کے بہی خواہوں بلکہ غیر جانبدار حلقوں کو بھی انصاف اور دیانت کے تقاضوں کے منافی محسوس ہو رہی ہے۔

جہاں تک سپاہ صحابہ اور مولانا محمد اعظم طارق کے فرقہ وارانہ کردار کا تعلق ہے تو ان کی پالیسیوں سے خود ہم بھی کبھی متفق نہیں رہے۔ مولانا حق نواز جھنگویؒ سے لے کر مولانا محمد اعظم طارقؒ تک کالعدم سپاہ صحابہ کے ہر سربراہ سے ہم نے ان کی پالیسیوں اور طریق کار پر دوبدو گفتگو میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے اور متعدّد مضامین کے ذریعے اس اختلاف کا قومی پریس میں بھی تذکرہ کیا ہے۔ لیکن کسی جماعت یا رہنما کی پالیسی اور طریق کار سے اختلاف اور چیز ہے اور اسے انصاف سے بالکل محروم کر دینے پر خاموشی اختیار کرنا بالکل مختلف امر ہے۔ اس لیے ہم یہ گزارش ضروری سمجھتے ہیں

کہ نہ صرف یہ کہ اس معاملے میں حکومت کو اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے بلکہ ملک کی دینی و سیاسی جماعتوں کو بھی اس پر سنجیدہ توجہ دینی چاہیے۔ کیونکہ انصاف کے تقاضوں کو کسی بھی طبقہ یا گروہ یا فرد کے حوالے سے نظر انداز کر دینے کے اثرات کبھی محدود نہیں رہتے اور اس روایت کو قائم رہنے دیا جائے تو کوئی بھی اور کسی بھی وقت اس طرز عمل کی زد میں آسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں کالعدم سپاہ صحابہ کے نائب صدر شیخ حاکم علی کا ایک خط جو انہوں نے ۱۲ جون ۲۰۰۲ء کو مختلف دینی، سیاسی اور صحافتی شخصیات کے نام لکھا ہے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

”۱۲ جنوری ۲۰۰۲ء کو حکومت کی طرف سے بعض جہادی اور مذہبی جماعتوں پر پابندی عائد کیے جانے کے بعد کالعدم سپاہ صحابہ پر بھی پابندی عائد کر دی گئی اور اب تک پانچ گرینڈ آپریشنز کیے جا چکے ہیں جن میں بڑی تعداد میں ہمارے قائدین اور کارکنوں کو گرفتار کر کے بار ہا نظر بند کیا گیا ہے اور جیلوں میں ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ حکومت کے ریاستی مظالم پر حقوق انسانی کے نام نہاد ادارے خاموش ہیں۔

جناب والا! کالعدم سپاہ صحابہ کے قائدین ہر دور میں امن و امان کے قیام اور ملکی سلامتی اور قومی یکجہتی کے حوالے سے ہر فورم پر اپنی خدمات پیش کرتے رہے ہیں اور کبھی بھی ہماری قیادت کی پالیسی مذہبی کشیدگی یا دہشت گردی کا باعث نہیں بنی۔ ہماری جدوجہد اصولوں پر مبنی ہے۔ وہ یہ کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم و اہل بیت رضی اللہ عنہم کی تکفیر اور گستاخی کرنے والوں کے لیے سزا کا قانون بنایا جائے۔ اسی مقصد کے لیے مولانا محمد اعظم طارق نے قومی اسمبلی میں ناموس صحابہ بل پیش کیا تھا۔

جناب والا! کالعدم سپاہ صحابہ نے ۱۹۹۲ء میں مولانا عبد الستار نیازی کی سربراہی میں مذہبی کشیدگی کے خاتمے کے لیے حکومتی فورم سے لے کر متحدہ علماء بورڈ اور ملی یکجہتی کونسل، یہاں تک کہ قاضی حسین احمد امیر جماعت اسلامی پاکستان، مولانا شاہ احمد نورانی امیر جمعیۃ علماء پاکستان اور بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ صاحب کو امن فارمولا کے لیے ثالثی کی پیشکش کی اور عملی طور پر امن کے لیے ہر دور میں کوشاں رہے۔ لیکن ہر آنے والی حکومت نے ریاستی جبر و تشدد سے ہمارے اصولی موقف کو سنے بغیر لاٹھی اور گولی سے اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں پولیس کی زیادتیوں سے تنگ آکر اور انصاف کی راہیں مسدود کیے جانے پر بعض عناصر نے لاقانونیت پھیلانے

کی کوشش کی، ایسے عناصر کو پارٹی سے نکال باہر کیا گیا۔

جناب والا! اب تک پرویز مشرف کی حکومت بھی پہلی حکومتوں کی طرح ریاستی جبر و تشدد اور طاقت کے ذریعے بے گناہ علماء اور کارکنوں کو جیلوں میں بند کر چکی ہے اور پانچ سو کے قریب ہمارے علماء اور کارکنوں کو یکطرفہ طور پر ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ہم نے وسیع تر ملکی مفاد اور امن عامہ کے لیے مزاحمت کا راستہ اختیار کرنے کا اعلان نہیں کیا اور پرامن رہنے کی پالیسی اختیار کی ہے جس کے نتیجے میں اتنے مظالم کیے گئے کہ انگریزوں نے بھی علماء حق پر نہیں کیے تھے۔ آج پاکستان میں قید مذہبی کارکنوں پر اتنا ظلم و ستم کیا گیا جتنا کیوبا میں امریکہ کی قید میں مسلمانوں پر بھی نہیں کیا گیا۔

جناب والا! مولانا محمد اعظم طارق کو مسلسل ۸ ماہ سے نظر بند کیا جا رہا تھا۔ گزشتہ دنوں لاہور ہائیکورٹ کے ریویو بورڈ سے نظر بندی کے خاتمے کے بعد انہیں جیل سے پھر حراست میں لے لیا گیا اور حکومت ان پر نیا مقدمہ قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ آنجناب سے التماس ہے کہ مولانا محمد اعظم طارق سمیت سینکڑوں بے گناہوں کی رہائی کے لیے عملی جدوجہد کریں اور ہمارے خلاف حکومت کے مظالم کا نوٹس لیتے ہوئے ہمیں انصاف دلانے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں اور پریس میں بھی آواز حق بلند کر کے ملی یکجہتی اور رواداری کا ثبوت دیں۔“

ہمیں اس خط کے مندرجات کی صحت پر اصرار نہیں ہے لیکن ایک متاثرہ فریق کے موقف کے طور پر اس پر سنجیدہ غور و خوض کو ہم عدل و انصاف کا ایک ناگزیر تقاضا تصور کرتے ہیں اور اسی لیے اسے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ حکومت، اہل دین، سیاسی حلقے اور انسانی حقوق کی علمبرداری کا دعویٰ کرنے والے ادارے اس کا جائزہ لیں اور انصاف کے تقاضوں کی بحالی کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ ہمارے نزدیک یہ معاملہ صرف کالعدم سپاہ صحابہ اور مولانا محمد اعظم طارق تک محدود نہیں بلکہ کالعدم تحریک جعفریہ، کالعدم جیش محمد اور کالعدم لشکر طیبہ یعنی خلاف قانون قرار پانے والی تمام تنظیموں نیز پروفیسر حافظ محمد سعید اور مولانا مسعود اظہر سمیت ان جماعتوں کے تمام اسیر رہنماؤں اور کارکنوں کا یہ جائز اور ناگزیر حق ہے کہ انہیں انتظامی احکامات کے تحت زیر حراست رکھنے اور ان کی تنظیموں کو خلاف قانون قرار دینے کے عمل کو یکطرفہ نہ رکھا جائے بلکہ اس کے عدالتی تقاضے پورے کیے جائیں۔ اس کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان میں ان تنظیموں اور رہنماؤں کے خلاف باقاعدہ ریفرنس دائر کر کے انہیں ملک کے سب سے بڑے عدالتی فورم میں اپنی پوزیشن واضح کرنے کا موقع دیا

جائے اور کالعدم قرار دی جانے والی تنظیموں اور ان کے گرفتار رہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف الزامات کی کھلی تحقیقات کا اہتمام کیا جائے تاکہ ملکی اور بین الاقوامی رائے عامہ کے سامنے یہ بات واضح ہو کہ ان تنظیموں پر پابندی اور ان کے رہنماؤ اور کارکنوں کی مسلسل گرفتاری کے حکومتی اقدامات بلاجواز نہیں ہیں۔ اگر حکومت اس کے لیے تیار نہیں تو ان جماعتوں اور رہنماؤں کے خلاف کاروائیاں بہرحال یکطرفہ ہی تصور کی جائیں گی۔ (بشکریہ روزنامہ پاکستان)

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ---ستمبر ۲۰۰۲ء

جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمان نے میانوالی جیل میں اسیر کالعدم سپاہِ صحابہؓ کے سربراہ مولانا اعظم طارق سے ملاقات کر کے ان کی ایک ماہ سے زائد عرصہ سے جاری بھوک ہڑتال ختم کرا دی ہے اور ان کی مسلسل گرفتاری کو افسوسناک قرار دیتے ہوئے بتایا کہ وہ ان کی رہائی کے لیے متعلقہ حکام سے بات چیت کر رہے ہیں۔

مولانا اعظم طارق کو افغانستان پر امریکی حملہ کے بعد اس کے خلاف ''دفاعِ پاکستان و افغانستان کونسل'' کی احتجاجی تحریک میں سرگرم کردار ادا کرنے پر گرفتار کیا گیا تھا جس کے بعد سے وہ مسلسل زیر حراست ہیں اور متعلقہ عدالتوں سے ان کی ضمانت ہو جانے بلکہ لاہور ہائیکورٹ کی طرف سے ان کی رہائی کے واضح حکم کے باوجود انہیں رہا کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے۔ جس پر احتجاج کرتے ہوئے انہوں نے جیل میں بھوک ہڑتال کر دی تھی۔

مولانا اعظم طارق کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ چونکہ مولانا موصوف جھنگ سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبر رہے ہیں، اور اب بھی وہ الیکشن میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لیے انہیں الیکشن سے دور رکھنے کے لیے ایک طے شدہ پالیسی کے تحت زیر حراست رکھا جا رہا ہے، اور یہ بات ان کے بنیادی حقوق کے ساتھ ساتھ حکومت کی طرف سے آزادانہ اور شفاف انتخابات کے دعووں کے بھی منافی ہے۔

ہم مولانا فضل الرحمان کے اس اقدام کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ انہوں نے خود جیل جا کر مولانا اعظم طارق کی بھوک ہڑتال ختم کرائی اور انہیں ان کی رہائی کے لیے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ مولانا فضل الرحمان صاحب، جمعیت علماء اسلام کے دیگر قائدین بلکہ متحدہ مجلسِ عمل کے راہنماؤں سے ہماری درخواست ہے کہ مولانا اعظم طارق اور ان کے علاوہ مولانا محمد مسعود اظہر، پروفیسر حافظ محمد سعید اور دیگر ایسے سینکڑوں گرفتار علماء کرام اور دینی کارکنوں کی رہائی کے لیے سنجیدگی کے ساتھ حکومت سے بات چیت کریں۔ جن کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے برادر اسلامی ملک افغانستان پر امریکہ کے حملہ

کے خلاف احتجاج کا جائز حق استعمال کیا اور اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے اپنے مظلوم افغان بھائیوں کا ساتھ دیا۔ ہمیں امید ہے کہ متحدہ مجلس عمل کی قیادت اس سلسلہ میں سنجیدگی کے ساتھ کوئی قدم اٹھائے تو ان مظلوم دینی راہنماؤں اور کارکنوں کی رہائی کی صورت نکل سکتی ہے۔

روزنامہ اسلام، لاہور ---۱۱ اکتوبر ۲۰۰۳ء

مولانا اعظم طارقؒ بھی اپنے پیشرو رہنماؤں مولانا حق نواز جھنگویؒ، مولانا ضیاء الرحمانؒ فاروقی، اور مولانا ایثار الحق القاسمیؒ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سفاک قاتلوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے یہ افسوسناک خبر امریکہ کے شہر بفیلو میں سنی جہاں ۶ اکتوبر کو مولانا عبد الحمید اصغر کے ہمراہ دار العلوم مدنیہ کی ختم بخاری شریف کی تقریب میں شرکت کے لیے عصر کے وقت پہنچا۔ اس تقریب سے حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے خطاب کرنا تھا اور مجھے بھی کچھ معروضات پیش کرنے کے لیے حضرت مولانا ڈاکٹر محمد اسماعیل میمن نے حکم دیا تھا جو دار العلوم مدنیہ بفیلو کے سربراہ ہیں اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ کے خلیفۂ مجاز ہیں۔ ہم جب تقریباً سات گھنٹے کا بائی روڈ سفر کر کے بفیلو پہنچے تو وہاں عصر کا وقت تھا جبکہ پاکستان میں رات پچھلے پہر کا عمل ہو گا، پہنچتے ہی دار العلوم مدنیہ کے ایک استاد نے خبر دی کہ مولانا اعظم طارق اسلام آباد میں گولڑہ موڑ کے قریب بے رحم قاتلوں کی فائرنگ کا نشانہ بنتے ہوئے اپنے چار محافظوں سمیت جام شہادت نوش کر گئے ہیں۔ زبان پر بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون جاری ہوا اور دل غم واندوہ کی گہرائیوں میں ڈبکیاں کھانے لگا۔

ابھی گزشتہ ماہ سات ستمبر کو چناب نگر میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ کی سالانہ ختم نبوت کانفرنس تھی، عشاء کے بعد کی نشست سے خطاب کر کے میں واپسی کی تیاری کر رہا تھا پتہ چلا کہ مولانا محمد اعظم طارق آ گئے ہیں اور انہوں نے تھوڑی دیر کے بعد کانفرنس سے خطاب کرنا ہے۔ ایک عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے ان کی قیام گاہ کی طرف چلا گیا، وہ اپنے عقیدت مندوں اور محافظوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے تھے، مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور تپاک سے ملے۔ ہم نے ایک دوسرے سے حال احوال معلوم کیا، کھانا اکٹھے کھایا، پھر انہوں نے اپنے رفقاء کو اشارہ کیا اور وہ سب کمرے سے باہر چلے گئے۔ تنہائی ہوتے ہی انہوں نے دو باتوں کے بارے میں مشورہ کے طور پر استفسار کیا۔

- پہلی بات یہ تھی کہ انہوں نے سیاسی طور پر جو راستہ اختیار کیا ہے اس کے بارے میں میری رائے پوچھی۔ ان کا کہنا تھا کہ پنجاب کے حوالہ سے ہمارے لیے الگ سیاسی راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ میں نے کہا کہ وہ اگر مجلس عمل اور جمعیۃ علمائے اسلام سے ہٹ کر پنجاب کے

حالات کے پیش نظر ایک الگ سیاسی راستے کو ضروری سمجھتے ہیں تو اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ان کا حق ہے کہ وہ اپنے احوال وظروف اور مشن و جماعت کی ضروریات کے پیش نظر جو سیاسی لائحہ عمل مناسب سمجھیں اختیار کریں لیکن اس کے لیے متحدہ مجلس عمل اور جمعیۃ علمائے اسلام کے ساتھ محاذ آرائی ضروری نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب اس ضمن میں باہمی محاذ آرائی کی صورت نظر آتی ہے تو میرے جیسے کارکنوں کو تکلیف ہوتی ہے اور اس کا نقصان ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ بسا اوقات مجبوری ہو جاتی ہے تاہم ہماری کوشش ہے کہ ایسی صورتحال پیدا نہ ہو۔

- دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ وہ نوجوانوں کی ذہنی اور فکری تربیت کے لیے ایک پروگرام ترتیب دینا چاہتے ہیں جس کے لیے وہ چاہتے ہیں کہ میں تعاون کروں اور اس پروگرام میں عملی شرکت بھی کروں۔ میں نے گزارش کی کہ یہ میرے لیے انتہائی خوشی کی بات ہے اور میں فکری اور علمی محاذ پر ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں، اس لیے کہ میں دیانت داری کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ ہم جس جس شعبہ میں بھی کام کر رہے ہیں اس کے لیے ہمارے کارکنوں بلکہ قیادت تک کی ذہنی اور فکری تیاری مکمل نہیں ہے۔ اور ہم ضروری تیاری کے بغیر مختلف محاذوں پر جو کچھ کر رہے ہیں اس کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو رہا ہے۔ مثلاً سنی شیعہ مسئلہ کو ہی لے لیں، مجھے اس محاذ کی اہمیت سے انکار نہیں اور میں دینی و قومی دونوں حوالوں سے اس مسئلہ کی اہمیت اور سنگینی سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ لیکن میرے نزدیک اس کا حل کارکنوں کو جذباتی طور پر مناظرانہ انداز میں تیار کر دینا نہیں ہے بلکہ سنی شیعہ کشمکش کی ایک پوری تاریخ ہے اور طویل تاریخی پس منظر ہے جس سے اس محاذ کی قیادت اور کارکنوں کا پوری طرح آگاہ ہونا ضروری ہے۔ اور ان کے ذہنوں میں صرف عقائد کے فرق کا واضح ہو جانا کافی نہیں ہے بلکہ اسی طرح یہ بھی لازمی ضرورت ہے کہ ہماری ملی تاریخ میں اہم مواقع پر اہلِ تشیع نے جو کردار ادا کیا ہے اس سے واقفیت ہو۔ اس وقت دنیائے اسلام میں اہلِ تشیع کی جو تحریکات کام کر رہی ہیں ان سے پوری طرح آگاہی ہو اور عالمِ اسلام کے بارے میں اہلِ تشیع کی عالمی قیادت کا اس وقت جو ایجنڈا ہے اس کا علم ہو۔ ان امور سے کما حقہ آگاہی کے بغیر اس محاذ پر کوئی بھی کام مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو گا بلکہ فائدہ کی بجائے نقصان کا احتمال زیادہ ہے۔ مولانا محمد اعظم طارقؒ نے میری باتوں کو توجہ سے سنا، بعض سے اتفاق بھی کیا اور یہ فرمائش کی کہ نوجوانوں کی ذہنی و فکری تربیت کے نصاب اور پروگرام کی تیاری میں ان سے تعاون کروں۔ میں نے اس سلسلہ میں

ان سے اتفاق کیا اور پھر آئندہ جلد ملاقات کے وعدہ پر ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

مگر کسے خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات ہو گی اور پھر اس کے بعد اس دنیا میں ان سے ملاقات و گفتگو کا موقع نہیں ملے گا۔ یہ قضا و قدر کے فیصلے ہیں جو اٹل ہوتے ہیں اور وہی صحیح بھی ہوتے ہیں۔ مولانا اعظم طارق شہیدؒ نے جس انداز سے زندگی بسر کی اور ایک مشن کو زندگی کا مقصد بنا کر اس کے لیے جو قربانیاں دیں وہ بلاشبہ عزیمت و استقامت کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔ مولانا حق نواز جھنگویؒ، مولانا ایثار الحق القاسمیؒ، مولانا ضیاء الرحمانؒ فاروقی اور ان کے بعد اب مولانا محمد اعظم طارقؒ نے آج کے دور میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ناموس کے تحفظ کے لیے جدوجہد کے ایک راستے کا انتخاب کیا جو مشکلات کا راستہ تھا، تکالیف کا راستہ تھا، جان ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھنے کا راستہ تھا، اذیتوں اور مصیبتوں کا راستہ تھا اور بے رحم قوتوں سے ٹکرانے کا راستہ تھا۔ ان کے طریق کار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور طرزِ عمل کی تغلیط کی جا سکتی ہے، خود مجھے بھی اختلاف رہا ہے جو اب بھی قائم ہے اور میں نے اس کے اظہار میں کبھی ابہام سے کام نہیں لیا۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود اپنے مشن کے ساتھ ان کے خلوص اور اس کے لیے ان کی قربانیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے زیادہ قربانی کیا ہو گی کہ وہ اپنی جانوں پر کھیل گئے اور اپنی بھرپور جوانیاں سالہا سال تک قید و بند کی نذر کرنے کے بعد اس قربان گاہ پر اپنی جانوں کی بھینٹ بھی چڑھا دی۔

مولانا حق نواز جھنگویؒ، مولانا ضیاء الرحمانؒ فاروقی، مولانا ایثار القاسمیؒ اور ان کے دیگر شہداؤں کی طرح مولانا محمد اعظم طارقؒ اور ان کے چار محافظوں کی شہادت کو بھی فرقہ وارانہ کشیدگی کے پس منظر میں دیکھا جائے گا۔ ظاہری منظر یہی نظر آتا ہے اور ماضی کا پس منظر بھی اسی رخ کی نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور دیگر بہت سے اہل دانش کی اس رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی تیسرا ہاتھ ملک میں سنی شیعہ کشیدگی کو محاذ آرائی کے ایک نئے راؤنڈ کی طرف دھکیلنا چاہتا ہے اور یہ المناک سانحہ اس کی شرمناک سازش کا کرشمہ بھی ہو سکتا ہے۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق حسب معمول حکومت کی طرف سے مکمل تحقیقات کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کے لیے تحقیقاتی کمیٹیاں قائم ہو گئی ہیں اور وفاقی و صوبائی حکمرانوں کے بیانات میں قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی تسلیاں بھی دی جا رہی ہیں۔ مگر یہ سب معمول کی باتیں ہیں اور روٹین ورک کا حصہ ہیں۔ چند روز تک یہ بیانات آتے رہیں گے، ممکن ہے تحقیقاتی کمیٹیاں کوئی رپورٹ بھی دے دیں اور کسی رسمی کارروائی کی طرف تھوڑی بہت پیش رفت بھی ہو جائے لیکن یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی نہ مولانا محمد اعظم طارق شہیدؒ کے قاتل کیفرِ کردار تک پہنچیں گے اور نہ ہی مسئلہ کے حل کا کوئی راستہ دکھائی دے گا۔

جہاں تک سنی شیعہ کشیدگی اور تصادم کا تعلق ہے ان کے مابین قتل و قتال کا یہ افسوسناک سلسلہ براہ راست ہے یا کوئی تیسرا ہاتھ اس صورتحال سے فائدہ اٹھا رہا ہے جس میں فریقین کے لوگ بھی ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہوسکتے ہیں۔ اس کے بارے میں ہم ایک سے زائد بار عرض کر چکے ہیں کہ بنیادی اسباب و عوامل کی نشاندہی اور ان کا ازالہ کیے بغیر اس کشیدگی کو کم کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے حال ہی میں نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ عالمی سطح پر مغرب اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور اشتعال و کشیدگی کی جو فضا مزید خراب ہوتی جارہی ہے اس کے اسباب و عوامل کو سمجھنا ضروری ہے اور ان کی نشاندہی کر کے ان کو ختم کرنے کے لیے سنجیدہ اقدامات کی ضرورت ہے۔ ورنہ جس دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے مغرب اس وقت سرگرم عمل ہے وہ ختم نہیں ہوسکے گی۔ میں جنرل صاحب کے اس ارشاد سے اتفاق کرتا ہوں، ہم نے اس کا خیر مقدم کیا ہے اور خود ہمارا موقف بھی یہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جنرل صاحب محترم اور حکومت سے ہماری گزارش ہے کہ ملک کے اندر سنی شیعہ کشیدگی اور باہمی تصادم کی جو فضا پائی جاتی ہے اس کی صورتحال بھی اس سے مختلف نہیں ہے، یہاں بھی اسباب و عوامل کی کارفرمائی ہے اور اس کے پس منظر میں بھی باہمی شکایات، غلط فہمیوں اور زیادتیوں کا ایک طویل پس منظر موجود ہے۔ اس لیے اس طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ امن کی طرف یہی ایک راستہ جاتا ہے اور اسے نظر انداز کر کے مسئلہ کے حل کے لیے وقتی طور پر کیے جانے والے اقدامات کا نتیجہ خود فریبی کے سوا کچھ نہیں نکلے گا۔ ان گزارشات کے ساتھ ہم مولانا اعظم طارق شہیدؒ اور ان کے رفقاء کے وحشیانہ قتل کی شدید مذمت کرتے ہیں اور حکومت سے قاتلوں کی فوری گرفتاری کا مطالبہ کرتے ہوئے دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت مولانا شہیدؒ کی قربانیوں کو قبول فرمائیں، انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور جملہ پسماندگان اور عقیدتمندوں کو صبر جمیل کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

صدام حسین کا اصل قصور
جس کا تذکرہ کہیں نہیں

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۸ دسمبر ۲۰۰۳ء

صدام حسین کی گرفتاری

امریکی ذرائع کے مطابق عراق کے معزول صدر صدام حسین کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور وہ اس وقت اتحادی فوجوں کی تحویل میں ہیں۔ خبروں میں بتایا گیا ہے کہ انہیں تکریت کے علاقہ میں زیر زمین پناہ گاہ سے اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ سوئے ہوئے تھے، ان کے پاس دو رائفلیں اور متعدّد دستی بم تھے اور لاکھوں ڈالر بھی ان کے پاس تھے، جبکہ ان کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور چہرے پر تھکن اور مشقت کے آثار تھے۔ ان کی ڈاڑھی سمیت تصویر اخبارات میں آئی ہے جس سے تاثر ملتا ہے کہ وہ حالت جنگ میں تھے اور آخر وقت تک ہتھیار بکف تھے مگر مخبروں کی مساعی کامیاب ہوئیں اور وہ انہیں اتحادی فوجوں کے شکنجے میں لانے کی کوشش میں بالآخر کامیاب ہو گئے۔ صدام حسین کا ڈی این اے ٹیسٹ لے کر تصدیق کر دی گئی ہے کہ وہ فی الواقع وہی صدام حسین ہیں جو عراق کے حکمران رہے ہیں اور امریکہ کو مطلوبہ ہیں۔ ان کی ڈاڑھی صاف کر دی گئی ہے اور ڈاڑھی کے بغیر بھی ان کی تازہ تصویر مغربی ذرائع کے حوالے سے اخبارات کی زینت بنی ہے۔

صدر بش اور برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر نے فوری طور پر پریس کانفرنس کر کے اس پر خوشی کا اظہار کیا ہے اور اسے اتحادی فوجوں کی فتح قرار دیا ہے جبکہ اس بات پر ملے جلے تاثر کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ صدام حسین کی گرفتاری کے بعد عراق میں اتحادی فوجوں کے خلاف مزاحمت اور گوریلا کارروائیوں میں کمی آئے گی یا وہ پہلے سے زیادہ بڑھ جائیں گی۔

بعث پارٹی اور عرب قومیت پرستی

تقریباً ربع صدی تک عراق کے حکمران رہنے والے صدام حسین بعث پارٹی کے اہم لیڈروں میں سے تھے جس نے عرب دنیا میں عرب نیشنلزم کو فروغ دینے اور عراقی نیشنلزم کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ عرب نیشنلزم یا علاقائی قومیتوں کا نسخہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے لیے مغربی دانشوروں اور حکمرانوں نے بڑی چابکدستی اور ہوشیاری کے ساتھ استعمال کیا تھا۔ اور عالمِ اسلام کے

سیاسی مرکز خلافتِ عثمانیہ کو سبوتاژ کرنے میں وہ اس طرح کامیاب ہوئے تھے کہ عربوں کو عجمی ترکوں کی حکمرانی سے آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دی اور جب وہ خلافت عثمانیہ کو بکھیر کر یہ آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو انہیں مصری، شامی، اردنی، عراقی، فلسطینی اور دیگر علاقائی قومیتوں کے دام ہمرنگ زمین میں الجھا دیا۔ اس کے ردعمل میں عرب دانشوروں کے ایک طبقہ نے "علاج بالمثل" کا طریقہ اختیار کیا کہ جس عرب قومیت یا علاقائی قومیتوں نے خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کر کے اس خطہ میں مغربی ممالک کی دخل اندازی اور بالادستی کی راہ ہموار کی تھی اسی عرب قومیت اور علاقائی قومیتوں کو مغرب کی بالادستی کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کرنا چاہا۔ جمال عبد الناصر، احمد بن بیلا، ابراہیم عبود، عبد الکریم قاسم، معمر القذافی، نور الدین عطاشی اور دیگر متعدد عرب لیڈروں کی حکمت عملی یہی تھی اور انہوں نے مغرب کی بالادستی اور مداخلت کا ذریعہ بننے والی عرب قومیت کو ہی مغرب سے نجات کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔

۱۹۶۷ء کی اسرائیل عرب جنگ کے نتائج

سوویت یونین چونکہ ایک حریف کے طور پر امریکہ کے سامنے آ چکا تھا اس لیے اس نے عرب قومیت کے اس نعرہ کی حمایت کی اور اسے سپورٹ کر کے اپنے حلقۂ اثر میں اضافہ کیا۔ لیکن ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی خوفناک شکست نے پورا منظر تبدیل کر دیا اور قوم پرست عرب لیڈروں کو بھی اپنی سیاست اور اقتدار بچانے کے لیے امریکہ کی دہلیز پر سجدہ ریز ہونا پڑا۔ صدام حسین بنیادی طور پر اسی کیمپ سے تعلق رکھتے تھے، وہ عرب قومیت اور پھر عراقی قومیت کے علمبردار تھے۔ انہوں نے اسی نظریہ پر قائم بعث پارٹی کے لیے شب و روز محنت کی اور اقتدار تک جا پہنچے۔ بعث پارٹی کو ایک دور میں سوویت یونین کی سیاسی اور اخلاقی حمایت حاصل تھی لیکن مسابقت کی دوڑ میں اس کے پیچھے رہ جانے پر دیگر عرب قوم پرست لیڈروں کی طرح صدام حسین کو بھی امریکہ کی دوستی کے دائرہ میں آنا پڑا اور پھر وہ وقت بھی دنیا نے دیکھا کہ صدام حسین اس خطہ میں امریکہ کے دوستوں میں شمار ہونے لگے۔ انہیں ایران کے خلاف جنگ میں امریکہ کی بھرپور پشت پناہی حاصل تھی اور وہ اس وقت امریکہ کے بہترین دوستوں میں گنے جاتے تھے۔

صدام حسین: کل کا دوست، آج کا دشمن

مگر جب صدام حسین کی ضرورت نہ رہی یا دوسرے لفظوں میں امریکہ کو اسرائیل اور عراق میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو خلیج عرب کا منظر ایک بار پھر تبدیل ہو گیا۔ اب صدام حسین دوست نہیں

بلکہ دشمن تھے، انہیں فراہم کی جانے والی قوت اور وسائل کی واپسی یا تباہی ضروری قرار پا گئی تھی۔ اس لیے انہیں ایک ایسے جال میں الجھا دیا گیا کہ اس کے نتیجے میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے قدم خلیج عرب میں جمتے چلے گئے اور آج خلیج عرب بلکہ پورے مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی فوجیں ہیں، اسرائیل اور اس کی دہشت گردی ہے، اور ان دونوں کی طرف رحم طلب نگاہوں سے مسلسل دیکھنے والی سہمی سہمی سی عرب حکومتیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس منظر نامہ میں اور کسی بات کی گنجائش سردست نظر نہیں آ رہی۔

صدام حسین کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا، ان کے جرائم کے ثبوت فراہم کیے جائیں گے اور انہیں قانون کے مطابق سزا دی جائے گی۔ یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے، فاتحین نے اپنے قبضے میں آنے والے مفتوحین کے ساتھ ہمیشہ یہی سلوک کیا ہے۔ یہ صرف جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی یا ان کی تعلیمات و ہدایات پر یقین رکھنے والے بعض خدا ترس جرنیل تھے جنہوں نے دشمنوں پر مکمل قبضہ اور دسترس رکھنے کے باوجود مختلف مواقع پر عفو و درگزر سے کام لیا۔ ورنہ فاتحین کی عدالتوں نے مفتوحین کے ساتھ دنیا میں کیا کچھ نہیں کیا؟ بلکہ یہ عدالتیں تو وہ ہیں جو انصاف کا معیار خود قائم کرتی ہیں، اس کا طریقہ کار خود وضع کرتی ہیں، فیصلوں کی کسوٹی بھی خود ہوتی ہیں اور ان کے فیصلوں کے صحیح ہونے کے لیے صرف اتنی دلیل کافی ہوتی ہے کہ وہ فاتحین کی عدالتیں ہیں اور مفتوحین ان کے قبضہ و اختیار میں ہیں۔

صدام حسین کے جرائم

صدام حسین کے جرائم میں بہت سی باتیں شمار کی جاتی ہیں اور بہت سی ابھی شامل کی جائیں گی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

1. انہوں نے عراقی عوام کو جمہوری حقوق اور شہری آزادیوں سے محروم رکھا اور ان پر ایک صدی تک جبر کے ذریعہ حکومت کرتے رہے،
2. انہوں نے بین الاقوامی قانون اور اقوام متحدہ کے فیصلوں کی پاسداری نہیں کی اور من مانی سے کام لیتے رہے،
3. انہوں نے عراق کے اہلِ تشیع اور کردوں کو وحشیانہ جبر و تشدد اور مظالم کا نشانہ بنایا،
4. وہ اپنے اردگرد کی چھوٹی ریاستوں کے لیے خوف اور دہشت کی علامت بنے رہے،
5. اور انہوں نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے کی بجائے اسے ختم کرنے کی پالیسی اختیار کیے رکھی۔

اس نوعیت کی اور بھی بہت سی باتیں ان کے خلاف فرد جرم کا حصہ بنیں گی لیکن ہمارے نزدیک صدام حسین کا اصل قصور کچھ اور ہے جس کا دور دور تک کہیں تذکرہ نہیں ہو گا۔ وہ قصور ہے مغرب کی دوستی اور اس دوستی کا غلط مفہوم جس نے انہیں اس مقام تک پہنچا دیا ہے۔ صدام حسین نے ایک دور میں مغرب کو اپنا دوست سمجھا اور اس کے بہت سے تقاضے پورے کیے لیکن وہ غلط طور پر یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ دوستی دو طرفہ ہے اور وقت آنے پر دوسری طرف سے بھی دوستی کے تقاضوں کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ جبکہ مغرب اس معاملہ میں ''ون وے ٹریفک'' کا عادی ہے۔ اس کے نزدیک دوستی کا مفہوم صرف یہ ہے کہ وہ جس کو اپنا دوست کہے وہ ضرورت کے مطابق اس کے کام آتا رہے اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لے کہ جونہی اس کی ضرورت ختم ہوگئی یا اس نے جوابی دوستی کا تقاضا کر دیا تو اس کا نام دوستوں کی فہرست سے کٹ جائے گا۔ صدام حسین کے پاس شاید وقت نہیں تھا ورنہ وہ فلپائن کے مارکوس اور ایران کے رضا شاہ پہلوی کا حشر ایک نظر دیکھ لیتے کہ مغرب اپنے دوستوں سے بالآخر کیا سلوک کیا کرتا ہے۔

بہر حال صدام حسین اپنے سابقہ دوستوں کی تحویل میں ہیں اور ان کے ساتھ وہ جو سلوک روا رکھیں گے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ منظر عام پر آتا رہے گا۔ مگر ہمیں ان بہت سے دیگر ''صدام حسینوں'' پر ترس آرہا ہے جو مغرب کی دوستی کے سنہری جال میں مسلسل پھنسے ہوئے ہیں اور ابھی تک جال کی سنہری تاروں سے ان کی نظریں نہیں ہٹ رہیں۔ انہیں کون بتائے گا کہ وہ رضا شاہ پہلوی، مارکوس اور صدام حسین سے مختلف نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں ڈیل کرنے والے مغربی دوست رضا شاہ پہلوی، مارکوس اور صدام حسین کو ڈیل کرنے والوں سے کوئی الگ مخلوق ہیں۔ خدا ہی ان بے چاروں کے حال پر رحم فرمائے، آمین۔

تعلیمی نصاب میں تبدیلی
اور آغا خان فاؤنڈیشن

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۹ اپریل ۲۰۰۴ء

ملک کے سرکاری نصابِ تعلیم کے حوالے سے مبینہ تبدیلیوں پر بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے اور آغا خان فاؤنڈیشن کا حوالہ اس میں بار بار سامنے آرہا ہے۔ بہت سے دوست سوال کر رہے ہیں کہ ملک کے ریاستی نصاب تعلیم کے ساتھ آغا خان فاؤنڈیشن کا کیا تعلق ہے اور ملک کے بہت سے تعلیمی

حلقوں کو آغا خان فاؤنڈیشن سے کیا شکایت ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اس قدر تشویش واضطراب کا اظہار کر رہے ہیں؟ اس لیے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس حوالہ سے کچھ گزارشات قارئین کی خدمت میں پیش کر دی جائیں۔

سیکولر تعلیمی نصاب کا مغربی ایجنڈا

اصل مسئلہ تو ملک کے ریاستی اور سرکاری نصاب کی ''اوورہالنگ'' کا ہے کہ ہمارے مغربی آقا سیاسی اور عسکری تسلط کے بعد اب تعلیمی اور ثقافتی معاملات کو بھی اپنے کنٹرول میں لینا چاہتے ہیں اور ان کا پروگرام یہ ہے کہ پاکستان کے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم کو مغربی نظام تعلیم سے ہم آہنگ کیا جائے جس کے لیے ضروری ہے کہ نصاب تعلیم سے وہ تمام مواد نکال دیا جائے جو مسلمانوں کے اسلامی تشخص کو اجاگر کرتا ہے یا پاکستان کے نظریاتی و تہذیبی امتیاز کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے بارے میں مختلف اداروں کی رپورٹیں سامنے آچکی ہیں اور جس جس حصے کو اس حوالہ سے نصاب سے خارج کرنا ضروری سمجھا جا رہا ہے متعدّد رپورٹوں میں اس کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اس میں عقائد و ثقافت کا مسئلہ سب سے اہم ہے کہ مغرب کے لیے یہ بات قابل اعتراض ہے کہ مسلمان طلبہ اور طالبات کو اس بات کی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ بحیثیت مسلمان دوسری اقوام سے الگ تشخص رکھتے ہیں۔ اسلام واحد حق مذہب ہے۔ مسلمان اپنے ذاتی، خاندانی اور معاشرتی معاملات میں قرآن و سنت کی تعلیمات کا پابند ہے اور اسے اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات کو نظرانداز کر کے دوسری اقوام کی تہذیب و ثقافت اور اقدار و روایات کی پیروی کرے۔ کیونکہ یہ سب باتیں مغرب کے نزدیک درست نہیں ہیں اس لیے کہ ان سے مسلمانوں کے دوسری تمام اقوام سے الگ اور ممتاز ہونے کا ذہن بنتا ہے اور یہ اس عالمگیر اور بین الاقوامی مفاہمت، ہم آہنگی اور رواداری کے منافی ہے جس کا مغرب اس وقت دعوے دار ہے اور جسے ہر حال میں قابل عمل بنانے کے لیے مغرب اپنی پوری قوت صرف کر رہا ہے۔

مسلمانوں کی الگ ثقافتی حیثیت اور پاکستان کا جداگانہ نظریاتی و تہذیبی تشخص مغرب کا اصل ہدف ہیں اور اس کی تمام تر تگ و دو کا مرکزی نکتہ اس امتیاز اور تشخص کا خاتمہ ہے۔ اس کے لیے ہوم ورک مکمل ہے، پیپر ورک کی حد تک کام ہو چکا ہے اور اب مسئلہ اسے روبہ عمل لانے کا ہے جس کے لیے مغرب کو پاکستان کے موجودہ روایتی حلقوں میں سے کسی پر اعتماد نہیں ہے۔ مغرب یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کے سرکاری محکموں اور تعلیمی اداروں میں ایسے افراد بہت کم ہیں جو اس ایجنڈے میں مغرب کے ہم نوا ہیں اور اگر کچھ افراد موجود ہیں تو ان میں اتنی جرأت، حوصلہ اور صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس

طرف کوئی عملی پیش رفت کر سکیں اور وہ مغرب کی حمایت میں زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

مغرب نے اس حوالہ سے مختلف افراد اور طبقات پر بہت کام کیا ہے اور بڑے پیسے خرچ کیے ہیں۔ بہت سی مراعات کی صورت میں اور متعدّد این جی اوز کے ذریعے اپنے مطلب کے افراد کو بہت نوازا ہے لیکن کوئی عملی نتیجہ اسے حاصل نہیں ہوا۔ اس لیے مغرب نے ملک کی اکثریت پر اعتماد کرنے کی بجائے یا اس میں سے افراد منتخب کر کے ان پر مزید پیسے ضائع کرنے کی بجائے ایک اقلیت کا انتخاب کیا ہے جو اقلیت ہونے کے باوجود تعلیمی محاذ پر منظم نیٹ ورک رکھتی ہے، اس کا بین الاقوامی تعلیمی نیٹ ورک سے تعلق ہے، اس کے پاس ایک معیاری تعلیمی نظام کو چلانے کی صلاحیت اور وسائل دونوں موجود ہیں اور اس نے اس سلسلہ میں اچھا خاصا کام پہلے سے کر رکھا ہے۔ اس کے لیے پاکستان میں امریکہ کی سفیر محترمہ نینسی پاؤل اور آغا خان فاؤنڈیشن کے سربراہ جناب شمس الحق لاکھانی کے درمیان ایک باقاعدہ تحریری معاہدہ کی خبریں آچکی ہیں جس کے تحت آغا خان فاؤنڈیشن پاکستان کے تعلیمی نظام و نصاب کو عالمی تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے کام کرے گی اور امریکہ اسے اس کے لیے ساڑھے چار سو لاکھ ڈالر دے گا۔ جبکہ حکومت پاکستان نے اس کے ساتھ اپنی رضامندی اور تعلق کا اس طرح اظہار کر دیا ہے کہ شمس الحق لاکھانی اور نینسی پاؤل کے اس مبینہ تحریری معاہدہ پر وفاقی وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال اور سندھ کے وزیر تعلیم عرفان مروت نے بھی دستخط کیے ہیں۔ اس معاہدہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آغا خان فاؤنڈیشن کے قائم کردہ تعلیمی بورڈ کو سرکاری سطح پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور رپورٹ یہ ہے کہ اس بورڈ کو امتحانی یونیورسٹی کا درجہ دے کر ملک کے تمام سرکاری تعلیمی بورڈز کو اس کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے۔ جبکہ وفاقی وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال ایک اخباری بیان میں بتا چکی ہیں کہ آغا خان ایجوکیشنل بورڈ ۲۰۰۶ء سے امتحان لینے کا سلسلہ شروع کر دے گا۔

اس پر ملک کے دینی اور تعلیمی حلقوں کو تشویش ہے کہ ایک طرف تو تعلیمی نصاب کو مغرب کے دباؤ کا سامنا ہے کہ نصاب تعلیم سے اسلامی مواد اور روایات کو خارج کرنے کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور دوسری طرف جو تھوڑا بہت برائے نام اسلامی مواد موجود ہوگا وہ بھی ایک اقلیتی گروہ کی ترجیحات اور پالیسی کے مطابق ہوگا جس سے ملک کی غالب اکثریت کے عقائد، ثقافت اور دینی روایات کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

آغا خان کمیونٹی: پس منظر اور عقائد و نظریات

جہاں تک آغا خان کمیونٹی کا تعلق ہے اس کے بارے میں الندوۃ العالمی الاسلامی (ریاض، سعودی

عرب) کی شائع کردہ کتاب "الموسوعۃ المیسرۃ فی الادیان والمذاہب المعاصرۃ" میں "الاسماعیلیۃ" کے عنوان سے دی گئی معلومات کے مطابق "آغا خانی فرقہ" اسماعیلیوں کی شاخ ہے۔ اور اسماعیلیوں کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ امام جعفر صادقؒ کی وفات کے بعد جب اہلِ تشیع نے ان کے فرزند امام موسیٰ کاظمؒ کو ان کا جانشین قرار دے کر امام تسلیم کیا تو ایک گروہ نے اس فیصلہ سے اختلاف کیا اور امام جعفر صادقؒ کے دوسرے بیٹے امام اسماعیلؒ کو اپنا امام بنا لیا، اس حوالہ سے وہ اسماعیلی کہلاتے ہیں۔ جبکہ دیگر اہلِ تشیع کی اکثریت اثناعشری کہلاتی ہے جو بارہویں امام تک امامت کا تسلسل مانتے ہیں، بارہویں امام ان کے نزدیک غائب ہو گئے تھے اور ان کی واپسی تک انہی کی امامت جاری رہے گی۔ مگر اسماعیلیوں کے نزدیک اماموں کا تسلسل اب تک جاری ہے اور موجودہ آغا خان اس کے مطابق انچاسویں امام بنتے ہیں۔

اسماعیلیوں کے مختلف گروہ مختلف ادوار میں گزرے ہیں، ان میں قرامطہ بھی ہیں جو باطنی سلسلہ کا معروف گروہ ہے، ان میں فاطمی بھی ہیں جن کی ایک عرصہ تک مصر پر حکومت رہی ہے، ان میں تاریخ کا معروف کردار حسن بن صباح بھی ہے جس نے باطنی سلطنت قائم کر رکھی تھی اور زمین پر خود ساختہ جنت بنا رکھی تھی، ان میں بوھرے بھی ہیں جن کا ہیڈ کوارٹر بمبئی میں ہے اور ایک گروہ اسماعیلیوں میں ایسا بھی ہے جو ساتویں امام محمد بن اسماعیل کو امام غائب مانتا ہے اور اس کے بعد امامت کے تسلسل کا قائل نہیں ہے۔ ان کے معتقدات مذکورہ کتاب میں اس طرح درج ہیں کہ وہ:

- ایک معصوم امام کی موجودگی کو ضروری مانتے ہیں۔
- امام کو خدا کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔
- امام کو اپنی آمدنی کا پانچواں حصہ خمس ادا کرتے ہیں۔
- امام پر ایمان کو نجات کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔
- تناسخ کے قائل ہیں۔
- امام کو تمام انبیاء کرامؑ کا وارث قرار دیتے ہیں۔
- اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کرتے ہیں۔
- تقیہ یعنی ضرورت کے وقت عقیدہ کو چھپانے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

جبکہ پنجاب یونیورسٹی کے "دائرہ معارف اسلامیہ" کے مطابق اسماعیلیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جو امام وقت کو نہیں مانتا وہ کافر ہے اور امام کو قرآن کی تشریح اور عقائد و عبادات کی مختلف صورتوں کے تعین کا حتمی اختیار حاصل ہے۔ آغا خانیوں کے موجودہ سلسلے کا آغاز آقائے حسن علی شاہ سے ہوا جو ایران سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں "آغا خان" کا خطاب حکومتِ برطانیہ نے دیا تھا، وہ برطانوی حکومت کے

آلۂ کار کے طور پر اس دور میں سرگرم عمل تھے، ان کی وفات پر ۱۸۸۱ء میں علی شاہ آغا خان دوم بنے، ان کے بیٹے آغا خان سوم سلطان محمد شاہ تھے جنہوں نے ۱۸۸۵ء میں یہ منصب سنبھالا اور برصغیر کی سیاسی تاریخ میں جن آغا خان کا نام کثرت سے ذکر ہوتا ہے یہ وہی آغا خان سوم ہیں، ان کی ولادت کراچی میں ہوئی، ۱۹۵۷ء میں ان کی وفات پر ان کے پوتے پرنس کریم ان کی جگہ آغا خان چہارم بنے جو اب تک اس منصب پر فائز چلے آرہے ہیں۔

کراچی کو آغا خان کمیونٹی کی سرگرمیوں میں مرکزی حیثیت حال ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات یعنی گلگت، بلتستان، سکردو اور ہنزہ وغیرہ میں آغا خانیوں کی خاصی تعداد آباد ہے اور اسی وجہ سے آغا خان کی توجہات کا یہ علاقہ مرکز بنا ہوا ہے۔ شمالی علاقہ جات میں مغرب بالخصوص امریکہ کی دلچسپی ظاہر ہے کہ اس خطہ میں دنیا کا سب سے اونچا میدان ”دیوسائی“ ہے جہاں بیٹھ کر چین، جنوبی ایشیا، وسطی ایشیا اور مغربی ایشیا کو فضائی طور پر کنٹرول کیا جاسکتا ہے اس لیے یہ میدان امریکہ کی ضرورت بن چکا ہے، اس حوالہ سے شمالی علاقہ جات کو الگ طور پر ایک ریاست بنانے یا کم از کم پاکستان کے اندر الگ صوبے کی حیثیت دینے کی کوشش بھی مسلسل جاری رہتی ہے۔

یہ آغا خانی فرقہ کا مختصر تعارف ہے جو مذکورہ بالا دو کتابوں کے حوالہ سے درج کیا گیا ہے۔ اس پس منظر میں آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ امریکی سفیر کے معاہدہ کو دیکھا جائے اور آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ پاکستان کے تعلیمی نظام کو منسلک کرنے کے منطقی نتائج کا جائزہ لیا جائے تو مستقبل کے خوفناک نقشہ کو سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ ارباب فہم و دانش سنجیدگی کے ساتھ اس طرف توجہ دیں اور عوام کو اس سلسلہ میں صحیح معلومات فراہم کرتے ہوئے انہیں بتائیں کہ عالمی نظام کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے نام پر ان کے ساتھ کیا ڈرامہ کھیلا جارہا ہے۔

تعلیمی نصاب میں مجوزہ تبدیلی پر اضطراب

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۱۱ اپریل ۲۰۰۴ء

سکولوں اور کالجوں کے نصاب تعلیم کے بارے میں متضاد خبریں سامنے آرہی ہیں۔ حکومتی حلقوں کا کہنا ہے کہ نصاب میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں کی جارہی، وفاقی وزراء نصاب تعلیم سے اسلامی مواد کو خارج نہ کرنے کی یقین دہانیاں کرا رہے ہیں اور اب وزیر اعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی نے بھی کہا ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم اسلامی ہے اور اس میں اس حوالے سے کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ لیکن

دوسری جانب ملک کے تعلیمی حلقے مسلسل حالتِ اضطراب میں ہیں، اساتذہ اور طلبہ کے مختلف فورموں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ نصاب میں تبدیلیاں کر دی گئی ہیں، نئی نصابی کتابوں میں متعدّد ایسی تبدیلیاں موجود ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ملک کے تعلیمی و امتحانی نظام کو آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ منسلک کرنے کے لیے تیزی کے ساتھ پیش رفت جاری ہے۔ ملک کے دینی حلقے بھی اس حوالے سے خاصے متحرک ہیں۔ گزشتہ روز جامعہ نعیمیہ لاہور میں مختلف دینی جماعتوں کے نمائندوں کے مشترکہ اجلاس میں اس صورتحال کو اضطراب انگیز قرار دیتے ہوئے تحریکِ ختم نبوتؐ کی طرز پر جدوجہد منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہم نے بھی پاکستان شریعت کونسل کے زیر اہتمام ایک مشاورتی اجلاس ۱۵ اپریل کو مسجد امن باغبان پورہ لاہور میں مولانا فداء الرحمان درخواستی کی زیر صدارت منعقد کیا جس میں متعدّد دینی جماعتوں کے رہنماؤں نے شرکت کی اور جامعہ نعیمیہ لاہور کے مہتمم ڈاکٹر سرفراز نعیمی نے تازہ ترین صورتحال کے بارے میں شرکائے اجلاس کو بریف کیا۔ اس موقع پر دو باتیں سامنے آئیں:

1. ایک یہ کہ وزیراعظم پاکستان کی زیر صدارت منعقدہ اجلاس کے حوالے سے جو یہ خبر آئی ہے کہ نصابِ تعلیم سے سورہ توبہ کے اخراج کا فیصلہ واپس لے لیا گیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی جگہ تبدیل کر دی گئی ہے اور سورہ توبہ کو، جو زیادہ تر جہاد کے احکام و واقعات پر مشتمل ہے، میٹرک کی بجائے ایف اے کے نصاب میں شامل کر دیا گیا ہے جس سے وہ لاکھوں طلبہ اس کی تعلیم سے محروم رہیں گے جو میٹرک کے بعد تعلیم جاری نہیں رکھ سکیں گے۔
2. دوسری بات یہ ہے کہ اصل مسئلہ ایک سورہ یا چند آیات قرآنی کا نصاب میں شامل کرنا یا ان کی جگہ تبدیل کرنا نہیں بلکہ اصل متنازعہ امر یہ ہے کہ ملک کے نظامِ تعلیم کو بتدریج آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے اور اس حوالے سے دینی حلقوں کا اضطراب بڑھتا جا رہا ہے۔

اس سلسلہ میں اجلاس میں بتایا گیا کہ پاکستان کے تعلیمی نظام کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے اسلام آباد میں امریکی سفیر محترمہ نینسی پاؤل اور آغا خان فاؤنڈیشن کے جناب شمس الحق لاکھانی کے درمیان باقاعدہ تحریری معاہدہ ہوا ہے جس کے تحت آغا خان فاؤنڈیشن اس سلسلہ میں بنیادی کردار ادا کرے گی اور حکومتِ امریکہ کی طرف سے اسے ساڑھے چار سو لاکھ ڈالر دیے جائیں گے۔ اس معاہدہ پر وفاقی وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال اور سندھ کے وزیر تعلیم جناب عرفان مروت نے بھی دستخط کیے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت پاکستان نے اس معاہدہ کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا ہے اور اس

پر عملدرآمد کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔

اس کے علاوہ یہ خبریں بھی منظر عام پر آ رہی ہیں کہ آغاخان فاؤنڈیشن کے تعلیمی بورڈ کو سرکاری سطح پر تسلیم کر لیا گیا ہے جو ۲۰۰۶ء سے باقاعدہ امتحانات لینا شروع کر دے گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی آ رہی ہے کہ ملک کے تمام تعلیمی بورڈز کو، جن کی تعداد تیئیس بتائی جاتی ہے، اس بورڈ کے ساتھ ملحق کرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے اور آغاخان تعلیمی بورڈ کو امتحانی یونیورسٹی کا درجہ دے کر ملک کے تمام تر امتحانی نظام کو اس کی نگرانی میں دیا جا رہا ہے۔

اس کا مطلب ملک کے تعلیمی اور دینی حلقے یہ سمجھ رہے ہیں کہ آئندہ ملک کے سرکاری تعلیمی نظام کی نگرانی آغاخان فاؤنڈیشن کرے گی اور ظاہر ہے جب ایسا ہو گا تو بات صرف امتحانی سسٹم تک محدود نہیں رہے گی بلکہ نصاب کی تیاری بھی اسی کی نگرانی میں ہوگی۔ اس طرح ملک کی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت اور فکر و ثقافت تمام تر کا دار و مدار آغاخان فاؤنڈیشن کی پالیسی اور ترجیحات پر ہو گا۔ اگر حالات کی رفتار کا یہ تجزیہ اور مستقبل قریب کے خدشات کا یہ نقشہ درست ہے تو یہ انتہائی خطرناک بات ہے اور اس کے بارے میں ملک کے تعلیمی و دینی حلقوں کی طرف سے جس اضطراب کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ نہ صرف درست ہے بلکہ ضرورت سے کہیں کم ہے۔

امریکی سفیر اور آغاخان فاؤنڈیشن میں معاہدہ

پاکستان کے تعلیمی نظام کے بارے میں امریکی سفیر اور آغاخان فاؤنڈیشن کے مذکورہ معاہدے نے پاکستانیوں کے لیے دو مسائل کھڑے کر دیے ہیں:

(ا) ایک یہ کہ اب ہمارے تعلیمی نظام و نصاب کے معاملات بھی امریکہ نے براہ راست سنبھال لیے ہیں اور ہمارے وزراء نے اس پر دستخط کر کے اس صورتحال کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے تعلیمی نظام و نصاب کے بارے میں مغربی حلقوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے جا رہے ہیں اور جو مطالبات سامنے آ رہے ہیں ان کی طرف عملی پیش رفت کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ مغرب کے ان مطالبات میں سرفہرست مطالبہ یہ ہے کہ تعلیمی نصاب سے دینی امور کو خارج کر دیا جائے، اس لیے کہ جب ایک مسلم نوجوان کو عقیدہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور اسے یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلام حق مذہب ہے اور باقی مذاہب حق نہیں ہیں، پھر اس کے ساتھ جب اسے یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اپنے خاندانی نظام اور عمومی معاشرت میں دیگر اقوام کی پیروی کرنے کی بجائے اپنے دین کے احکام و قوانین پر عمل کرنے کا پابند ہے تو وہ ذہنی، فکری اور عملی طور پر وہ اس عالمی برادری کے ساتھ ہم آہنگ نہیں رہتا جس کی قیادت اس وقت مغرب کے ہاتھ میں ہے اور جسے وہ ''اینڈ آف

ہسٹری“ اور ”ماڈرن سولائزیشن“ قرار دے کر اسے پوری دنیا پر طاقت کے زور سے مسلط کرنے کے درپے ہے۔

مغرب کے نزدیک مسلمانوں اور پاکستانیوں کے عالمی برادری اور سوسائٹی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عقیدہ و ثقافت اور خاندان و معاشرت کے حوالے سے وہ تمام مواد تعلیمی نصاب سے خارج کر دیا جائے جو اسلام کے جداگانہ تشخص اور مسلمانوں کے خاندانی و معاشرتی نظام کی دوسری قوموں سے امتیاز کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس بنا پر اگر تعلیمی نصاب کے بارے میں مغرب کا یہ موقف قبول کر لیا جائے، جبکہ تعلیمی نظام میں امریکی مداخلت کا مقصد بھی یہی ہے، تو پھر وہ چھوٹی چھوٹی اور جزوی باتیں غیر اہم ہو جاتی ہیں جن کے حوالے سے ہمارے دینی حلقے اس وقت احتجاج کر رہے ہیں اور تعلیمی نظام کا اصل فکری ڈھانچہ اور ثقافتی فریم ورک ہی سوالیہ نشان بن کر رہ جاتا ہے۔ پھر بات صرف تعلیمی نصاب تک محدود نہیں رہتی بلکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نظریاتی تشخص اور اس کے الگ ملک کے طور پر قیام کی نظریاتی اساس اور تہذیبی پس منظر کا جواز بھی دھندلکوں کی نذر ہونے لگتا ہے جسے ملک کا کوئی بھی محب وطن شہری ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتا۔

(۲) نینسی پاؤل اور شمس الحق لاکھانی کے مذکورہ مبینہ معاہدے سے دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ امریکہ یا مغرب نے پاکستان کے تعلیمی نظام و نصاب کے بارے میں اپنے مقاصد کی طرف پیش رفت میں پاکستان کے معروف تعلیمی حلقوں میں سے کسی پر اعتماد نہیں کیا بلکہ اس نے ذریعے کے طور پر ایک ایسی اقلیت کا انتخاب کیا ہے جو اپنے عقیدے و فکر کے حوالے سے پاکستان کی غالب اکثریت سے کسی طرح کی ہم آہنگی نہیں رکھتی اور عالمِ اسلام کے بارے میں اس کے سیاسی کردار پر پاکستان کے دینی و تعلیمی حلقے واضح تحفظات و خدشات رکھتے ہیں۔ آغا خان فاؤنڈیشن یا آغا خان یونیورسٹی یقیناً ایک تعلیمی ادارے کے طور پر متعارف ہے اور اسی حیثیت سے اسے سامنے لایا گیا ہے لیکن آغا خان فرقے کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ یہ ایک الگ فرقہ ہے جو عقائد اور سیاسی کردار دونوں حوالوں سے عالمِ اسلام کے سوادِ اعظم سے الگ طرزِ عمل کا حامل ہے۔

اس طرح مذکورہ معاہدے کی رو سے پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ایک نیا محاذ کھول دیا گیا ہے کہ وہ ایک طرف اپنے تعلیمی نظام اور تہذیب و ثقافت کو مغرب کے تقاضوں اور دباؤ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف داخلی محاذ پر اپنے اکثریتی عقائد و روایات کو اقلیتی مداخلت اور دست برد سے بچانے کے لیے بھی محنت کریں۔ اب ملک کے دینی حلقوں کو آغا خانی گروہ کے بارے میں ملک کے عوام کو یہ بتانا ہو گا کہ اس اقلیتی فرقے کے عقائد کیا ہیں، ملت اسلامیہ کی سیاسی تاریخ میں اس کا

کردار کیا رہا ہے، عالمِ اسلام کی موجودہ صورتحال میں وہ کس کیمپ میں کھڑا ہے، اور اسلام اور مغرب کی ہمہ گیر کشمکش میں وہ کس کی خدمات سرانجام دے رہا ہے؟ آغاخانی دوستوں کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے لیے جس جگہ اور کیمپ کا انتخاب کا ہے وہ ان کے لیے کس حد تک مفید ثابت ہوگا اور انہیں اس کی مستقبل میں کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ جوں جوں بات آگے بڑھے گی انہیں اس کا احساس ہوتا جائے گا لیکن بدقسمتی سے جب وہ احساس وادراک کی اصل منزل تک پہنچیں گے تو واپسی کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔

آغاخانی فرقہ کا تعارف

گزشتہ صدی میں یہ رول اور کردار قادیانیوں نے پسند کیا تھا وہ اپنے منطقی انجام تک پہنچ چکے ہیں، مغرب نے اب ان کی بجائے اس کام کے لیے کسی اور کو چنا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مغرب کے نزدیک اس کی حیثیت ایک چلے ہوئے کارتوس کی ہے جسے دوبارہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ خیر یہ سوچنا آغاخان کمیونٹی کے ارباب دانش کا کام ہے، اگر انہوں نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے تو یقیناً اس کے نتائج وعواقب سے بھی وہ بے خبر نہیں ہوں گے۔

البتہ اپنے قارئین کو اس بات سے آگاہ کرنا ہم ان کا حق سمجھتے ہیں کہ "آغاخانی فرقہ" کون ہے اور اس کا جداگانہ تشخص اور عقائد کیا ہیں۔ چنانچہ پنجاب یونیورسٹی کے "دائرہ معارف اسلامیہ" کے مطابق:

- یہ "اسماعیلی فرقہ" کی ایک شاخ ہے۔ اسماعیلی فرقہ حضرت امام جعفر صادقؒ کی وفات کے بعد باقی اہلِ تشیع سے اس اختلاف پر الگ ہوگیا تھا کہ باقی اہلِ تشیع نے امام جعفر صادقؒ کے فرزند امام موسیٰ کاظمؒ کو ان کا جانشین اور اپنا امام تسلیم کیا تھا جبکہ اسماعیلیوں نے ان کی بجائے امام جعفر صادقؒ کے بڑے بیٹے امام اسماعیلؒ کو ان کے جانشین کے طور پر اپنا امام قرار دیا تھا۔
- باقی اہلِ تشیع کے نزدیک بارہویں امام کے غائب ہونے کے بعد اب ان کی دوبارہ واپسی تک انہی کی امامت چلتی رہے گی مگر آغاخانی فرقے کے نزدیک اماموں کا یہ تسلسل نسل در نسل چلا آرہا ہے اور ان کے موجودہ امام پرنس کریم آغاخان انچاسویں امام ہیں۔ اسماعیلیوں کے مختلف گروہ ہیں جن میں ہمارے ہاں خوجے، بوہرے، داؤدی اور آغا خانی معروف ہیں۔ آغاخانی فرقے کا عقیدہ یہ ہے کہ امام براہ راست خدا کا نمائندہ ہوتا ہے اور عقائد وعبادات کی مختلف صورتیں متعیّن کرنے کا اختیار بھی اسی کو حاصل ہے۔ قرآنی آیات کی تشریح میں اس کا قول آخری ہے، دنیا کا نظام اماموں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے، اخروی نجات کے لیے امام سے

تعلق قائم ہونا ضروری ہے اور جو شخص امامِ وقت کو تسلیم کیے بغیر مر گیا وہ کافر کی موت مرے گا۔

- اسماعیلی فرقے کی الگ شاخ کے طور پر آغا خانی گروہ کا آغاز ایران میں آقائے حسن علی شاہ کی امامت سے ہوا جو آغا خان اول کہلاتے ہیں، ان کی وفات ۱۸۸۱ء میں ہوئی۔ ان کے جانشین آغا خان دوم علی شاہ کی وفات ۱۸۸۵ء میں ہوئی۔ آغا خان سوم سلطان محمد شاہ ۱۸۸۵ء میں امامت کے منصب پر فائز ہوئے، ان کی ولادت کراچی میں ہوئی اور انہوں نے جنوبی ایشیا کی سیاست میں سرگرم کردار ادا کیا، وہ برطانوی وائسرائے کی کونسل کے ممبر رہے اور انہیں اس دور میں متعدّد اعزازات سے بھی نوازا گیا، تحریک پاکستان میں بھی ان کے کردار کا بطور خاص تذکرہ ہوتا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں ان کی وفات کے بعد پرنس کریم آغا خان چہارم کے لقب کے ساتھ آغا خانیوں کے امام بنے اور اب تک وہی امام چلے آ رہے ہیں۔
- دائرہ معارف اسلامیہ میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں آغا خان فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد دو کروڑ کے لگ بھگ ہے جو جنوبی ایشیا، انڈونیشیا، چین، ملایا، مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کے مختلف ممالک کے علاوہ پاکستان کے مختلف شہروں میں آباد ہیں، جبکہ کراچی کو آغا خانی سرگرمیوں میں مرکزی مقام حاصل ہے۔

اس پس منظر میں اگر ملک کے تعلیمی اور دینی حلقے اپنے تعلیمی نصاب و نظام کے حوالے سے تحفظات کا اظہار کر رہے ہیں اور ایجوکیشن سسٹم کو ایک اقلیت کے سپرد کر دینے پر ان کا اضطراب بڑھتا جا رہا ہے تو یہ غیر متوقع اور غیر منطقی ردعمل نہیں ہے۔ حکمرانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس اضطراب کو محسوس کریں، اس کے اسباب و عوامل اور نتائج و عواقب کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لیں اور اس چنگاری کو شعلہ بننے سے قبل حکمت عملی اور تدبر و حوصلے کے ساتھ قابو کرنے کی کوشش کریں ورنہ پانی سر سے گزر جانے کے بعد پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مئی ۲۰۰۴ء

نصابِ تعلیم میں مبینہ تبدیلیاں اور حکومتی وضاحتیں

سکولوں اور کالجوں کے نصاب تعلیم میں اسلامی حوالوں سے مبینہ تبدیلیوں کا مسئلہ ان دنوں قومی سطح پر زیر بحث ہے اور حکومتی حلقوں کی وضاحتوں کے باوجود اس سلسلہ میں شکوک و شبہات اور بے اعتمادی کی فضا بدستور موجود ہے۔

ملک کے دینی و تعلیمی حلقوں کا کہنا ہے کہ نصاب کی جو نئی کتابیں سامنے آئی ہیں ان میں متعدّد قابل اعتراض باتیں موجود ہیں اور بعض مقامات پر قرآنی سورتیں اور آیات نصاب سے خارج کرنے کے علاوہ نئی کتابوں میں ایسا مواد شامل کیا گیا ہے جس کا مقصد نئی پود کے اذہان کو دینی پابندیوں سے آزاد کرنا اور ملک کے نصاب تعلیم کو سیکولر رُخ دینا ہے۔ مغربی حلقوں کی طرف سے ایک عرصہ سے پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ جس طرح مغربی ممالک نے اپنے ریاستی نصاب تعلیم سے مذہب کو خارج کر رکھا ہے اسی طرح پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کے نصاب تعلیم سے بھی مذہبی مواد اور دینی تعلیمات کو خارج کیا جائے تاکہ مسلم ملکوں کا نصاب تعلیم بین الاقوامی یا مغربی ملکوں کے تعلیمی نظام و نصاب سے ہم آہنگ ہو سکے۔ لیکن پاکستان میں دستوری طور پر اسلام ملک کا ریاستی مذہب ہے اور حکومت ملک میں اسلامی تعلیمات کے فروغ کی آئینی طور پر پابند ہے، نیز پاکستان کے دینی حلقے اور عوام اس سلسلہ میں بیدار ہیں، اس لیے ریاستی نصاب تعلیم سے دینی مواد کو خارج کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی۔ چونکہ ملک کے نصاب تعلیم کے بارے میں مغربی ملکوں کی خواہشات اور بین الاقوامی اداروں کا دباؤ پاکستانی عوام اور دینی حلقوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے اور وہ اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک پاکستان اور دیگر مسلم ممالک میں کس قسم کے تعلیمی نصاب و نظام کے لیے کوشاں ہیں اس لیے وہ اس سلسلہ میں بے حد حساس ہیں اور کسی جزوی یا معمولی ردوبدل پر بھی ان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہر طرف احتجاج کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نصاب تعلیم کے بارے میں قومی حلقوں میں ہونے والی حالیہ بحث اور حکومتی حلقوں کی وضاحتوں کے باوجود عوام اور دینی حلقوں کا پیہم احتجاج اس پر گواہ ہے اور وہ ان تبدیلیوں کے بارے میں حکومتی حلقوں کی کسی وضاحت پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ہمارے نزدیک ریاستی نصاب تعلیم کی نئی کتابوں میں سامنے آنے والی مبینہ تبدیلیوں کا مسئلہ توجہ طلب ہے اور ہم اس سلسلہ میں ملک کے دینی اور تعلیمی حلقوں کے احتجاج کی حمایت کرتے ہیں لیکن ہمارے لیے اس سے کہیں زیادہ یہ صورتحال تشویش و اضطراب کا باعث ہے کہ ملک کے تعلیمی نظام کا سلسلہ آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں ایسی خبریں سامنے آ رہی ہیں جو خاصی پریشان کن ہیں۔ مثلاً یہ کہا جا رہا ہے کہ پاکستان میں متعیّن امریکی سفیر اور آغا خان فاؤنڈیشن کے چیئرمین کے درمیان باقاعدہ معاہدہ طے پایا ہے جس کے تحت آغا خان فاؤنڈیشن پاکستان کے تعلیمی نصاب و نظام کو بین الاقوامی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کام کرے گی اور امریکہ اس مقصد کے لیے اسے مالی امداد فراہم کرے گا۔ پھر یہ خبریں بھی اخبارات کی زینت بن چکی ہیں کہ آغا خان

فاؤنڈیشن کے تعلیمی بورڈ کو حکومت پاکستان نے سرکاری طور پر منظور کر لیا ہے اور ملک بھر کے تعلیمی بورڈز کو آغاخان فاؤنڈیشن کے بورڈ کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے۔ یہ خبریں اگر درست ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ پاکستان کے سرکاری تعلیمی بورڈز آغاخان فاؤنڈیشن کی راہنمائی میں کام کریں گے اور آغاخان فاؤنڈیشن کو ملک کے تعلیمی نصاب و نظام کی تشکیل اور راہنمائی میں کلیدی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔

آغاخان فاؤنڈیشن کا تعلق اہلِ تشیع کے ایک اقلیتی فرقہ سے ہے جو اسماعیلیوں کی شاخ کے طور پر متعارف ہے۔ اور اسماعیلیوں کا مختصر تعارف یہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؒ کی وفات کے بعد اہلِ تشیع کا اثناعشری فرقہ حضرت موسیٰ کاظمؒ کو ان کا جانشین مانتا ہے، جبکہ اسماعیلیوں کے نزدیک ان کے بڑے بھائی امام اسماعیلؒ حضرت امام جعفر صادقؒ کے جانشین ہیں۔ اثناعشریوں کی امامت کا سلسلہ بارہویں امام تک پہنچ کر مکمل ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک بارہویں امام غائب ہیں اور امام مہدیؒ کی صورت میں وہی دوبارہ دنیا میں آئیں گے، جبکہ اسماعیلی گروہ امام غائب کا قائل نہیں ہے اور ان کے نزدیک امامت نسل در نسل منتقل ہوتی ہوئی پرنس کریم آغاخان تک پہنچی ہے جو آغاخانیوں کے حساب سے اسماعیلیوں کے انچاسویں امام ہیں۔ آغاخانیوں کا عقیدہ ہے کہ امام براہ راست خدا کا نمائندہ ہوتا ہے اور اسے شریعت کی تعبیر تشریح کا حتمی اختیار حاصل ہے، قرآن کریم کی تشریح اور عبادت و عقیدہ کے تعین و وضاحت میں امام کا قول حرف آخر ہے، امام پر ایمان لانا اور اس کی بیعت کرنا ضروری ہے اور ان کے امام کی بیعت نہ کرنے والے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ سیاسی حوالے سے آغاخانیوں کا تعارف مبینہ طور پر مغربی استعمار کے آلہ کار کا چلا آ رہا ہے، ان کے امام کو آغاخان کا خطاب حکومت برطانیہ نے دیا تھا اور اب بھی عالمی سطح پر آغاخان کمیونٹی کی سرگرمیاں عامۃ المسلمین کی بجائے سیکولر این جی اوز کے عالمی نیٹ ورک کا حصہ ہیں۔

اس پس منظر میں ملک کے تعلیمی نصاب و نظام کو آغاخان فاؤنڈیشن کے ساتھ منسلک کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ پاکستان کی نئی نسل کے تعلیم و تربیت کے پورے نظام کو ایک ایسے اقلیتی فرقہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے جس کے عقائد ملک کی اکثریت کے عقائد سے ہم آہنگ نہیں ہیں اور جس کے سیاسی کردار کے بارے میں بھی عوام کے ذہنوں میں خدشات و تحفظات بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم حکومت سے گزارش کریں گے کہ وہ اس سلسلہ میں ملک کے دینی و تعلیمی حلقوں کو اعتماد میں لیتے ہوئے اصل صورتحال کی وضاحت کرے اور تعلیمی نصاب و نظام کی اسلامی بنیادوں کے تحفظ کے لیے اپنی دستور اور ذمہ داریاں پوری کرے۔

شیعہ کی تکفیر کے بارے میں ہمارا موقف

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جولائی ۲۰۰۴ء

ہمدرد یونیورسٹی دہلی کے شعبہ اسلامیات کے رکن
ڈاکٹر یوگندر سکند کی طرف سے ارسال کردہ سوالنامہ کے جوابات

......

سوال نمبر ۶: دینی مدارس نے مختلف مسالک کے مابین اتحاد اور مکالمہ یا کشمکش یا تصادم کے فروغ میں کیا کردار ادا کیا ہے؟

سوال نمبر ۷: آپ کے خیال میں ایک مسلک کے پیروکاروں کا دوسرے مسلک کی ترجمانی اور اس کے پیروکاروں کے ساتھ تعلق کے حوالے سے کیا رویہ ہے اور مسلکی مقابلہ بازی کے فروغ میں اس رویے کا کتنا حصہ ہے؟

سوال نمبر ۸: پاکستان میں عوام اور بالخصوص علما کے مابین مسلکی تصادم کی فضا کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے؟

سوال نمبر ۹: پاکستان کے مختلف مسالک خاص طور پر شیعہ سنی، دیوبندی بریلوی اور اہل حدیث حنفی مسلکوں کے مابین سنجیدہ، تعمیری اور مثبت مکالمہ کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں کی کچھ تفصیلات بتائیں۔

جواب: مسلکی حوالہ سے مدارس کی موجودہ فضا تسلی بخش نہیں ہے اور جس طرح جذباتی اور مناظرانہ انداز میں طلبہ کی ایک دوسرے کے خلاف ذہن سازی کی جاتی ہے، وہ نقصان دہ ہے۔ اس کے بجائے ہر مسلک کے مدارس کو یہ چاہیے کہ وہ اپنے طلبہ کو اپنے مسلک اور اس کے دلائل سے ضرور متعارف کرائیں اور ان کی ذہن سازی بھی کریں مگر یہ مثبت طور پر بریفنگ کے انداز میں ہو اور دوسرے مسالک کے معروضی تعارف کے ساتھ اپنے فضلا کو منطق اور استدلال کی زبان میں گفتگو کی تربیت دیں۔ مسلکی تفریق بالکل ختم تو نہیں ہو سکتی لیکن اگر برداشت کا ماحول پیدا کیا جائے اور جذباتی انداز کے بجائے استدلال اور افہام وتفہیم کا اسلوب اختیار کیا جائے تو اس کے نقصانات میں خاصی کمی آ سکتی ہے۔

سوال نمبر ۱۰: سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک سے آنے والے پیسے نے بین المسلکی تعلقات کو کس حوالے سے متاثر کیا ہے؟

جواب: سعودی عرب اور بعض دیگر عرب ریاستوں سے مختلف مسلم ممالک میں جو رقوم تقسیم

ہوتی ہیں، ان میں مسلکی ترجیحات کا دخل زیادہ چلا آ رہا ہے اور اس کے نقصانات بھی واضح ہیں۔ اس سے باہمی منافرت بڑھی ہے اور خود سعودی حکومت کے بارے میں ذہنوں میں تحفظات نے جنم لیا ہے۔

سوال نمبر ۱۱: بعض پاکستانی حلقے مثلاً سپاہ صحابہ شیعہ کو کافر اور دشمنِ اسلام قرار دیتے ہیں۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟ ہاں یا نہیں کی صورت میں آپ کی رائے کے وجوہ کیا ہیں؟ اگر آپ اس سے متفق نہیں تو اس نقطہ نظر کی تردید کے لیے آپ نے کیا کردار ادا کیا ہے؟

جواب: ہم نے سپاہ صحابہؓ کے شدت پسندانہ طریق کار سے ہمیشہ اختلاف کیا ہے اور مختلف مضامین میں اس کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس کے راہ نماؤں مثلاً مولانا حق نواز جھنگوی، مولانا ضیاء الرحمن فاروقی اور مولانا محمد اعظم طارق کے ساتھ براہ راست گفتگو میں بھی انہیں اپنے موقف سے آگاہ کیا ہے۔ ہم جمہور علماء اہلِ سنت کے اس موقف سے متفق ہیں کہ جو شیعہ تحریفِ قرآن کریم کا قائل ہے، اکابر صحابہ کرامؓ کی تکفیر کرتا ہے اور حضرت عائشہؓ پر قذف کرتا ہے، وہ مسلمان نہیں ہے۔ نیز ہم امت کی چودہ سو سالہ تاریخ کے مختلف ادوار میں شیعہ کے سیاسی کردار کے حوالے سے بھی تحفظات رکھتے ہیں لیکن اس کی بنیاد پر ان کے خلاف کافر کافر کی مہم، تشدد کے ساتھ ان کو دبانے اور کشیدگی کا ماحول پیدا کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہمارا اس حوالہ سے موقف یہ ہے کہ عقائد اور تاریخی کردار کے حوالہ سے باہمی فرق اور فاصلہ کو قائم رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور استدلال و منطق کے ساتھ اپنا موقف پیش کرنے کا راستہ ہی صحیح اور قرین عقل ہے اور اس حوالہ سے ہمیں امت مسلمہ کے اجتماعی رویہ سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔

......

سنی شیعہ کشیدگی: فریقین ہوش کے ناخن لیں

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۴ء

یہ تحریر صادق گنجی قتل کیس کے ملزم شیخ حق نواز کو پھانسی کی سزا ملنے کے بعد مارچ ۲۰۰۱ء میں لکھی گئی تھی۔ حالیہ واقعات کے تناظر میں اسے معمولی ترمیم کے ساتھ یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ مدیر الشریعہ

لاہور، سیالکوٹ اور ملتان میں فرقہ وارانہ تشدد کے جو نئے المناک واقعات رونما ہوئے ہیں اور بیسیوں بے گناہ شہریوں کی افسوسناک ہلاکت پر منتج ہوئے ہیں، انہوں نے اس سوال کی شدت اور سنگینی

میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے کہ آخر اس عمل کو کب اور کہاں بریک لگے گی؟ ہم ایک بار پھر اپنی مساجد میں دروازے بند کر کے سنگینوں کے سائے میں نمازیں ادا کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس سے شاید دونوں طرف کے کچھ جذباتی اور انتہا پسند نوجوانوں کے جذبات کو تھوڑی بہت تسکین ملتی ہو یا اس خونی کھیل کو جاری رکھنے کے خواہش مند حلقوں کے مقاصد کچھ آگے بڑھتے ہوں مگر دین، قوم اور ملک کے لیے یہ سب کچھ انتہائی تباہ کن ہے اور اس کی تباہ کاری کی صلاحیت میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

کشمکش کے خارجی و داخلی عوامل

سنی شیعہ مسلح کشمکش میں بیرونی عوامل کی کارفرمائی سے انکار نہیں اور ہم اس کی کئی بار اپنی معروضات میں نشان دہی کر چکے ہیں، لیکن بنیادی طور پر یہ مسئلہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی محاذ آرائی کا ہے اور خارجی عوامل کے لیے بھی آلہ کار اور ایندھن کا کام ہر دو طرف کے جذباتی نوجوان سرانجام دیتے ہیں۔ اس لیے دیگر عوامل و محرکات سے سردست صرف نظر کرتے ہوئے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے رہنماؤں، بالخصوص جذباتی نوجوانوں سے دو گزارشات کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ خدا کرے کہ کسی دل میں یہ بات اتر جائے اور اس خونی عمل کے کسی جگہ رکنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

پہلی بات بخاری شریف کی اس روایت کے حوالہ سے ہے جو "کتاب الادب" میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے منقول ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بڑے بڑے کبیرہ گناہوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے اور برا بھلا کہے۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کوئی شخص اپنے ماں باپ کو کیسے گالی دے سکتا ہے؟ جناب نبی اکرم نے فرمایا کہ اس نے دوسرے کے ماں اور باپ کو گالی دی اور اس نے جواب میں اس کے باپ یا ماں کو گالی دی تو گویا اس نے اپنے ماں باپ کو خود گالی دی۔ یعنی جناب نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق اپنے ماں باپ کے لیے گالی کا سبب اور واسطہ بننے والا شخص خود ان کو گالی دینے کا مرتکب قرار پائے گا۔

کم و بیش اسی نوعیت کی بات سورۃ الانعام کی آیت ۱۰۸ میں قرآن کریم نے بھی ارشاد فرمائی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ تم دوسروں کے جھوٹے خداؤں کو برا بھلا نہ کہو، اس لیے کہ وہ جواب میں تمہارے سچے خداؤں کو برا بھلا کہیں گے اور اس کا سبب تم خود بنو گے۔

اس لیے "مرغی پہلے یا انڈا" کی طرح اس بحث میں پڑے بغیر کہ اس باہمی قتل و غارت کا آغاز کس نے کیا تھا، ہم اہلِ سنت اور اہلِ تشیع، دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے جذباتی اور انتہا پسند نوجوانوں کو اس نکتہ پر غور کی دعوت دینا چاہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے سنجیدگی اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس بات کا جائزہ لے لیں کہ دونوں طرف کے جو بڑے بڑے بزرگ اور سرکردہ قائدین اس

المناک قتل وغارت کی نذر ہو چکے ہیں، کہیں وہ سبب اور واسطہ کے درجے میں خود ہی اپنے بزرگوں کے قاتل توقرار نہیں پاتے؟ میں تو جتنا اس مسئلہ کی گہرائی میں جاتا ہوں، دل ودماغ کے لرزہ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اسی احساس کے تحت یہ گزارش بھی کر رہا ہوں۔

انتقام در انتقام کا جاہلی رواج

دوسری گزارش جناب نبی اکرمؐ کی ایک عملی سنت کے حوالہ سے کرنا چاہتا ہوں۔ عرب قبائل میں انتقام در انتقام کا سلسلہ اسی طرح چلا آرہا تھا جیسے اب سنی اور شیعہ روزانہ انتقامی جذبہ کے تحت اندھا دھند قتل ہو رہے ہیں۔ جناب نبی اکرمؐ نے اس سلسلہ کو بریک لگانے کے لیے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان فرمایا کہ گزشتہ قتلوں کے انتقام کا سلسلہ ختم کر کے نئے سرے سے پرامن زندگی کا آغاز کرو اور گزشتہ قتلوں اور ان کے انتقام کو بھول جاؤ۔ جناب نبی اکرمؐ نے اس کا صرف زبانی اعلان نہیں کیا بلکہ عملی طور پر بھی اس کا اظہار فرمایا کہ اپنے چچازاد بھائی ربیعہ بن الحارث بن عبد المطلب کے معصوم بیٹے ایاس کا قتل معاف کرنے کا اسی مجلس میں اعلان فرما دیا اور اپنے اعلان پر عمل درآمد کا آغاز گھر سے کر دیا۔ ایاس، ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب کا بیٹا تھا اور بنو سعد میں پرورش پا رہا تھا کہ بنو ہذیل نے اسے قتل کر دیا۔ اس کا انتقام قبائلی روایات کے مطابق بنو عبد المطلب کے ذمہ تھا۔ متعدّد لوگوں کے دلوں میں اس انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور وہ یقیناً کسی موقع کے انتظار میں ہوں گے کہ جناب نبی اکرمؐ نے بنو عبد المطلب کی طرف سے اپنے اس معصوم بچے کا خون معاف کرنے کا اعلان فرما کر نہ صرف یہ کہ انتقام در انتقام کے اس بظاہر ختم نہ ہونے والے سلسلے کو روک دیا بلکہ باقی لوگوں کے لیے بھی ایک عملی نمونہ پیش کر دیا اور یہ اسی کی برکت تھی کہ پشت در پشت خونریزی کے عادی اور خوگر عرب قبائل کو امن اور باہمی اعتماد کی منزل گم گشتہ مل گئی۔

امن فارمولے کی ضرورت

آج بھی امن کا راستہ یہی ہے کہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے سرکردہ اکابر سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس مکروہ عمل کو بریک لگانے کے لیے سنت نبوی کی روشنی میں کوئی فارمولا طے کریں اور اس پر اپنے جذباتی نوجوانوں کو پابند کریں یا بصورت دیگر امن کا دشمن بن جانے والوں سے لاتعلقی اور براءت کا اعلان کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ جو فریق بھی اس سمت میں پہل کرے گا، وہ جناب نبی اکرم کی سنت مبارکہ کا دامن تھامنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی قوم کے لیے بھی امن وسلامتی کا پیغام بر ثابت ہو گا لیکن اس کے لیے پاکستان کے امن اور قومی وحدت کو سبوتاژ کرنے کے خواہش مند عناصر کو ’’کراس‘‘ کرنے کا

حوصلہ درکار ہے۔ خدا کرے کہ سنی شیعہ قائدین اس حوصلہ کا بروقت اظہار کرسکیں، آمین ثم آمین۔

سنی شیعہ کشیدگی۔ چند اہم معروضات

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ---دسمبر ۲۰۰۴ء

سنی شیعہ تنازع کے حوالے سے "الشریعہ" میں وقتاً فوقتاً ہم اظہار خیال کرتے رہتے ہیں اور اس بارے میں قارئین ہمارے عقیدہ، جذبات اور طرز عمل سے بخوبی آگاہ ہیں۔ چند ماہ قبل ہم نے ہمدرد یونیورسٹی دہلی سے آمدہ ایک سوال پر اس سلسلے میں اپنے اسی موقف کو اختصار کے ساتھ دہرادیا جس کا اظہار اس سے قبل مختلف مضامین میں کیا جا چکا ہے تو اس پر کالعدم سپاہ صحابہ کے ترجمان ماہنامہ "خلافتِ راشدہ" فیصل آباد نے ستمبر ۲۰۰۴ کے شمارے میں غصے اور ناراضی کا اظہار کیا ہے اور والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے ایک فتویٰ کے حوالے سے اپنے قارئین کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ حضرت موصوف کے فتویٰ سے انحراف ہے اور "الشریعہ" نے ان کے موقف سے ہٹ کر کوئی راہ اختیار کرلی ہے۔ اگر حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کا حوالہ نہ ہوتا تو شاید ہم اس پر تبصرہ کی ضرورت محسوس نہ کرتے، لیکن چونکہ "خلافت راشدہ" کے فاضل مضمون نگار نے اپنے غیظ وغضب کے اظہار کے لیے اس فتویٰ کو آڑ بنایا ہے، اس لیے چند امور کی وضاحت ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

کالعدم سپاہ صحابہ کے ترجمان کا کہنا ہے کہ:

> مولانا زاہد الراشدی جید عالمِ دین، عظیم اسلامی سکالر، معروف کالم نگار اور ایک مذہبی رسالہ ماہ نامہ الشریعہ کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کے والد محترم حضرت شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر بہت بڑی علمی شخصیت اور عظیم عالمِ دین ہیں۔ انہوں نے ۱۲ مارچ ۱۹۸۶ کو شیعہ کے بارے میں درج ذیل فتویٰ جاری کیا تھا:
>
> "الجواب ہو المصوب: شیعہ اپنے کفریہ عقائد کی وجہ سے اسلام سے خارج ہیں جن میں تین باتیں اصولی ہیں:
>
> 1. قرآن کریم ان کے نزدیک اصلی شکل میں نہیں۔
> 2. ان کے نزدیک جمہور حضرات صحابہ کرام (العیاذ باللہ) کافر ہیں۔
> 3. ان کے نزدیک ائمہ معصوم ہیں، حالانکہ معصوم ہونا صرف حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا خاصہ ہے۔ گویا ان کے نزدیک ہر امام نبی ہے۔

نعوذ باللہ من الخرافات۔
لہٰذا شیعہ کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں، اور ان کے تقیہ سے قطعاً متاثر نہیں ہونا چاہیے۔
واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم۔

ابوالزاہد محمد سرفراز
شیخ الحدیث مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ
یکم رجب ۱۴۰۶ ہجری۔ ۱۲ مارچ ۱۹۸۶"

محترم مولانا زاہد الراشدی مدظلہ کے والد محترم کا تفصیلی فتویٰ آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہے۔ اب محترم مولانا زاہد الراشدی کا اپنا طرز عمل بھی ملاحظہ فرمائیں کہ ہمدرد یونیورسٹی دہلی کے شعبہ اسلامیات کے رکن شیعہ مذہب کے پیروکار ڈاکٹر یوگندر سکند نے ایک تحریری انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو محترم مولانا زاہد الراشدی نے اپنے زیرادارت شائع ہونے والے ماہنامہ الشریعہ جولائی ۲۰۰۴ میں شائع کیا ہے۔ اس انٹرویو میں شیعہ انٹرویو نگار مذکور نے سوال نمبر ۱۱ کیا ہے کہ

"بعض پاکستانی حلقے مثلاً سپاہ صحابہ شیعہ کو کافر اور دشمن اسلام قرار دیتے ہیں۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟ ہاں یا نہیں کی صورت میں آپ کی رائے کے وجوہ کیا ہیں؟ اگر آپ اس سے متفق نہیں تو اس نقطہ نظر کی تردید کے لیے آپ نے کیا کردار ادا کیا ہے؟"

اب محترم مولانا زاہد الراشدی مدظلہ کی طرف سے جواب ملاحظہ فرمائیں:

"ہم نے سپاہ صحابہؓ کے شدت پسندانہ طریق کار سے ہمیشہ اختلاف کیا ہے اور مختلف مضامین میں اس کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس کے راہ نماؤں مثلاً مولانا حق نواز جھنگوی، مولانا ضیاء الرحمن فاروقی اور مولانا محمد اعظم طارق کے ساتھ براہ راست گفتگو میں بھی انھیں اپنے موقف سے آگاہ کیا ہے۔ ہم جمہور علماء اہلِ سنت کے اس موقف سے متفق ہیں کہ جو شیعہ تحریف قرآن کریم کا قائل ہے، اکابر صحابہ کرام کی تکفیر کرتا ہے اور حضرت عائشہؓ پر قذف کرتا ہے، وہ مسلمان نہیں ہے۔ نیز ہم امت کی چودہ سو سالہ تاریخ کے مختلف ادوار میں شیعہ کے سیاسی کردار کے حوالے سے بھی ذہنی تحفظات رکھتے

ہیں، لیکن اس کی بنیاد پر ان کے خلاف کافر کافر کی مہم، تشدد کے ساتھ ان کو دبانے اور کشیدگی کا ماحول پیدا کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہمارا اس حوالہ سے موقف یہ ہے کہ عقائد اور تاریخی کردار کے حوالہ سے باہمی فرق اور فاصلہ کو قائم رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور استدلال و منطق کے ساتھ اپنا موقف پیش کرنے کا راستہ ہی صحیح اور قرین عقل ہے اور اس حوالہ سے ہمیں امت مسلمہ کے اجتماعی رویہ سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔"

آپ نے دیکھا کہ مسؤل کا سوال کتنا واضح اور صاف تھا، لیکن حضرت مولانا زاہد الراشدی مدظلہ نے جواب کو انتہائی پیچیدہ بنا کر پیش کیا جس سے یہ تاثر صاف نکلتا ہے کہ سپاہ صحابہ والے شیعہ کو غلط کافر کہتے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ سوال کرنے والے نے پوچھا کہ سپاہ صحابہ والے شیعہ کو کافر اور دشمن اسلام قرار دیتے ہیں۔ ہاں یا نہیں کی صورت میں جواب دیں اور اس کی وجہ بیان فرما دیں۔ کاش مولانا زاہد الراشدی مدظلہ اس سوال کے جواب میں اپنے والد محترم کا فتویٰ ہی نقل کر دیتے جس میں انہوں نے واضح انداز میں نہ صرف شیعہ کو خارج از اسلام قرار دیا بلکہ ان کے کفر کی تین وجوہات بھی درج کر دی ہیں اور آخر میں پھر لکھا ہے کہ شیعہ کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور ان کے تقیہ سے قطعاً متاثر نہیں ہونا چاہیے۔

ماہنامہ الشریعہ کے اگلے ماہ اگست کے شمارے میں اسی پروفیسر ڈاکٹر یوگندر سکند نے شیعہ سنی تعلقات کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے شیعہ کے خلاف فتویٰ دینے والے علماء حق کو شرک کا مرتکب ہونے، ان کے فتویٰ کو کفر اختیار کرنے سے بھی بڑا جرم قرار دیا ہے۔ محترم جناب مولانا زاہد الراشدی سے دردمندانہ درخواست ہے کہ خدارا خود کو غیر جانب دار اور مذہبی سکالر ثابت کرنے کے لیے شیعہ کی سازشوں کا شکار ہو کر سپاہ صحابہ کے قائدین اور ہزاروں کارکنان کی قربانیوں اور اپنے اسلاف کے فتاویٰ جات کو خاک میں ملانے کی کوشش نہ کریں۔

قارئین سے گزارش ہے کہ وہ "خلافتِ راشدہ" کی اس تحریر کو ایک بار پھر پڑھ لیں اور پھر ہماری درج ذیل معروضات پر توجہ فرمائیں:

- مضمون نگار کو شکایت ہے کہ سوال میں شیعہ کے کافر ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے، مگر ہم نے جواب میں بات کو لمبا کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بات نہیں ہے، اس لیے کہ سوال میں صرف شیعہ کے کافر ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں نہیں پوچھا گیا بلکہ یہ سوال سپاہ صحابہ کا نام لے کر اس کے حوالے سے کیا گیا ہے، اس لیے یہ ہماری اخلاقی ذمہ داری تھی کہ جہاں اصل مسئلہ پر اپنا موقف عرض کریں، وہاں اس مسئلہ کے پس منظر میں سپاہ صحابہ کے طرز عمل کے بارے میں بھی اپنا نقطہ نظر بیان کر دیں اور ہم نے وہی کیا ہے۔
- مضمون نگار نے یہ تاثر دینا چاہا ہے کہ ہم شیعہ کے بارے میں اکابر علماء اہل سنت کے فتویٰ سے اختلاف کر رہے ہیں جو کہ غلط ہے، کیونکہ جس تحریر میں سپاہ صحابہ کے طرز عمل سے اختلاف کیا گیا ہے، اسی میں فتویٰ کی تائید بھی موجود ہے۔ البتہ ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ تکفیر کرتے ہوئے اس کی وجوہ کا حوالہ بھی دیا جائے اور یہ کہہ کر تکفیر کی جائے کہ جو شیعہ قرآن کریم کی تحریف کا قائل ہے، اکابر صحابہ کرام کی تکفیر کرتا ہے، حضرت عائشہ پر نعوذ باللہ قذف کرتا ہے، ائمہ کو انبیاء کرام کی طرح معصوم مانتا ہے یا دین کی اور کسی ضروری بات کا انکار کرتا ہے، وہ مسلمان نہیں ہے اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ یہ صراحت اس لیے ضروری ہے کہ شیعہ کہلانے والے بعض فرقے اور افراد ایسے موجود ہیں جن کا یہ عقیدہ نہیں ہے اور اگر کوئی شخص ان عقائد سے لاتعلقی کا اعلان کرتا ہے اور اس کا عمل بھی اس لاتعلقی کی تائید کرتا ہے تو محض شیعہ کہلانے کی وجہ سے اس کی تکفیر کا کوئی جواز نہیں ہے۔ مثلاً زیدی فرقہ شیعہ کہلاتا ہے مگر اس کے یہ عقائد نہیں ہیں۔ یمن میں ایسے زیدیوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو زیدی شیعہ کہلاتے ہیں مگر ان کے عقائد اہلِ سنت والے ہیں حتیٰ کہ یمن کے نامور سنی عالم قاضی شوکانی کا شمار بھی زیدیوں میں کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے ایران کے دستور میں زیدیوں کو صراحتاً اہلِ سنت کے فقہی مذاہب حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کے ساتھ شمار کیا گیا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں نور بخشی شیعوں کی ایک بڑی تعداد ہے جن کے عقائد اثنا عشریوں سے مختلف ہیں۔ ان کے عقائد کا الگ طور پر جائزہ لیے بغیر انھیں اثنا عشریوں کے ساتھ ایک ہی فتویٰ میں شمار کر لینا ان کے ساتھ زیادتی کی بات ہوگی اور افتا کے مسلمہ اصولوں کے بھی منافی ہوگا۔ اس لیے ہمارے نزدیک بات وہی صحیح ہے جو ہمارے اکابر کہتے آ رہے ہیں کہ مذکورہ بالا عقائد یا ان میں سے کوئی ایک عقیدہ بھی رکھنے والے شیعہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں اور ان کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے۔

- ہم نے اختلاف اکابر علماء کرام کے فتویٰ سے نہیں، بلکہ کالعدم سپاہ صحابہ کے طرز عمل اور طریق کار سے کیا ہے اور اب نہیں، شروع سے ہم یہ اختلاف کرتے آ رہے ہیں جس پر ہمارے بہت سے سابقہ مضامین گواہ ہیں، بلکہ سپاہ صحابہ کے قائدین کے ساتھ گفتگو میں بھی ہم نے اس کا برملا اظہار کیا ہے اور سپاہ صحابہ کے شدت پسندانہ طرز عمل کو ہم نے ہمیشہ غلط اور نقصان دہ قرار دیا ہے۔ یہ بالکل ایک الگ مسئلہ ہے اور اسے فتویٰ سے ہٹ کر ایک مستقل مسئلہ کے طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ کافر ہونا یا نہ ہونا الگ سوال ہے اور کافروں کے ساتھ تعلقات اور معاملات کا تعین اس سے بالکل مختلف امر ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کافروں کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں کیا تھا۔ مشرکین عرب کے ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل اور تھا، اہل کتاب کے ساتھ معاملات کی نوعیت اس سے مختلف تھی اور مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے درمیان رہنے والے منافقین کے ساتھ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل ان دونوں سے بالکل الگ تھا۔ ان منافقین کے کفر کی گواہی قرآن کریم نے دی ہے اور ان کے کفر میں کسی شک وشبہہ کی گنجایش نہیں ہے حتیٰ کہ ان کا جنازہ پڑھانے اور ان کے لیے دعاے مغفرت کرنے سے بھی قرآن کریم نے روک دیا تھا، لیکن ان کے ساتھ شدت اختیار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ مختلف معاملات میں مسلمانوں کے ساتھ شریک رہتے تھے، مسلمانوں کو نہ ان کے معاشرتی بائیکاٹ کا حکم دیا گیا اور نہ ہی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مسلم سوسائٹی سے الگ کیا، حتیٰ کہ بعض غیور مسلمانوں نے بعض منافقین کو قتل کرنے کی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع کر دیا اور فرمایا، اس سے دنیا میں غلط تاثر پھیلے گا اور لوگ کہیں گے کہ محمد اپنے کلمہ گو ساتھیوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔
- شدت پسندی کے طرز عمل سے اختلاف کر کے ہم کوئی نیا موقف اختیار نہیں کر رہے، بلکہ ہمارے بزرگوں کا موقف بھی یہی ہے جس کی ایک جھلک شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے اس مکتوب گرامی میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے جو انھوں نے آج سے بارہ سال قبل سپاہ صحابہ کے ارکان کے نام لکھا تھا اور جسے گوجرانوالہ کے معروف عالم دین مولانا محمد ایوب صفدر (مہتمم مدرسہ فیضان سرفراز، پلی نوشہرہ سانسی، جناح روڈ، گوجرانوالہ) نے ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر تقسیم کیا تھا۔ وہ مکتوب گرامی درج ذیل ہے:

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

۱۷رجب ۱۴۱۲ھ/۲۳جنوری ۱۹۹۲ء

من ابی الزاہد

الی محترم المقام حضرت مولاناصاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! مزاج سامی!

گزارش ہے کہ سپاہ صحابہ کے حضرات نے ایران کی طاغوتی طاقت کے بل بوتے اور شہ پرناچنے والی رافضیت کا پاکستان میں جو دروازہ بند کیا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ وقت کی اہم ضرورت ہے بلکہ دینی لحاظ سے بھی فرض کفایہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی اس مبارک کوشش کو کامیاب کرے اور دن دگنی رات چگنی ترقی عطافرمائے۔ آمین ثم آمین

اگر بار خاطر نہ ہو تو چند ضروری باتیں عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں:

1. جو ذہن آپ حضرات نے نوجوانوں کا بنایا ہے یا بنائیں گے، وہی وہ اپنائیں گے، کیونکہ اکثریت ان کی علم دین نہیں رکھتی اور اکابر کو بھی نہیں دیکھا۔ جو آپ ان کو بتائیں گے، اسی کو وہ حرف آخر سمجھیں گے اور تن، من، دھن کی بازی لگائیں گے۔ واللہ الموفق۔
2. نوجوان جذباتی ہوتے ہیں اور جذبات میں بہت کچھ کر اور کہہ جاتے ہیں۔ شدت اور سختی سے کبھی مسائل حل نہیں ہوئے اور نہ قوت اور طاقت سے کسی فرد یا نظریہ کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ صدر صدام حسین کی ضد اور نادانی کی وجہ سے تیس سے زائد طاقت ور حکومتیں بھی اسے ختم نہ کرسکیں اور وہ ابھی تک جیتا جاگتا ہے۔ اس لیے گزارش ہے کہ نوجوانوں کو قولاً اور فعلاً شدت اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ روکیں۔ رافضیوں کے کفر میں تو شک ہی نہیں، مگر در و دیوار پر کافر کافر لکھنے اور نعرہ بازی سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا۔ عیاں راچہ بیاں۔
3. ممکن ہے بعض جذباتی اور سطحی اذہان میری اس تحریر سے یہ اخذ کریں کہ میں بک گیا ہوں یا دب گیا ہوں تو یہ نظریہ درست نہ ہوگا۔ بفضلہ تعالیٰ یہ گناہ گار انتہائی غربت اور جوانی کے زمانے میں بھی نہ بکا ہے نہ دبا۔ اب اسی (۸۰) سال کی عمر میں قبر کے پاس پہنچ کر کیسے بک یا دب سکتا ہے؟
4. کافی عرصہ ہوا ہے، حضرت مولانا عطاء المنعم شاہ صاحب دام مجدہم نے حضرت

امیر معاویہؓ کے سرکاری طور پر یوم منانے کی تحریک شروع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ میں نے ان کو مفصل خط لکھا تھا کہ آپ کے والد مرحوم امیر شریعت تو بدعات کو مٹانے کے لیے لٹھ لیے پھرتے تھے، آپ اس بدعت کو کیسے جاری کرتے ہیں؟ میرے خیال میں میرا عریضہ ضرور موثر ثابت ہوا اور اس کے بعد ان کا کوئی بیان اس بدعت کی ایجاد کرنے کا میرے علم میں نہیں ہے۔

5. آپ حضرات کی طرف سے زور وشور کے ساتھ حضرات خلفاء راشدین کے ایام سرکاری طور پر منوانے کا مطالبہ آتا ہے۔ آپ جن اکابر کے دامن سے وابستہ ہیں، ان کی تاریخ دیکھ لیجیے۔ کبھی ایسی بدعات کے ایجاد کا تصور بھی انھیں نہیں آیا۔ عوام تو نہیں جانتے، مگر آپ تو علما ہیں، وسیع مطالعہ کے مالک ہیں۔ اس کارروائی کے بدعت ہونے کے بارے میں آپ حضرات کے سامنے کتابوں کے حوالے پیش کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ولاریب فیہ۔

6. آپ حضرات کا مطالبہ صرف اور صرف خلافت راشدہ کا نظام قائم کرنے کا ہونا چاہیے جو حکمران طبقہ اور سرمایہ داروں کے لیے پیام موت ہے۔ ایام منوانے کی بدعت کے پیچھے ہرگز نہ پڑیں۔ خلافت راشدہ کے نظام کے نافذ کرنے کے مطالبہ میں عند اللہ تعالیٰ بھی آپ سرخرو ہوں گے اور عوام کا تعاون بھی حاصل رہے گا۔

7. اگر بادل نخواستہ آپ کے ایام منانے کی کوئی کوشش منظور کر لی گئی تو حکمران طبقہ بھی اور عوام بھی یہ باور کریں گے کہ ان کو اب خاموش رہنا چاہیے، ان کا مطالبہ پورا ہو گیا ہے۔ اس سے آپ کے اصل مقصد پر زد پڑے گی۔ بھٹو صاحب نے جمعہ کے دن چھٹی کرنے پر کہہ دیا تھا کہ لو، اب اسلام نافذ ہو گیا ہے۔

8. بعض غالی قسم کے اہل بدعت اس کارروائی کے خلاف سخت پراپیگنڈا کر رہے ہیں کہ دیوبندی دن منائیں تو بدعت نہ ہو اور بریلوی منائیں تو بدعت ہو جائے۔ ان کا یہ اعتراض بالکل درست ہے۔ ماہ جنوری ۱۹۹۲ء کا رضائے مصطفیٰ ضرور بہ ضرور دیکھیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

والسلام

ابو الزاہد محمد سرفراز

از گکھڑ

اس اختلاف کی ایک اور جھلک سفیر ختم نبوت حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی رحمہ اللہ تعالیٰ کے رفیق خاص مولانا مشتاق احمد کے مضمون کے اس اقتباس میں بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہے جو انہوں نے مولانا چنیوٹی کے حالات زندگی پر تحریر کیا ہے اور جو ماہنامہ الشریعہ کے ستمبر ۲۰۰۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ مولانا مشتاق احمد اس مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا چنیوٹی سپاہ صحابہؓ سے ہمدردی تو رکھتے تھے لیکن ان کے مخصوص نعروں کے عام جلسوں میں لگائے جانے سے متفق نہ تھے۔ جامعہ عربیہ چنیوٹ کی مسجد میں سالانہ ردمرزائیت کورس کی اختتامی تقریب منعقد ہوئی۔ شہید ناموس صحابہ مولانا اعظم طارق مرحوم مہمان خصوصی تھے۔ مولانا اعظم طارق کی تقریر سے پہلے کسی نے ''کافر کافر شیعہ کافر'' کے نعرے لگائے تو مولانا چنیوٹی نے برملا ڈانٹا کہ تم اچھل اچھل کر نعرے لگانے والے تو جلسہ کے بعد اپنے گھروں کو چلے جاؤ گے۔ یہ غریب (مولانا اعظم طارق) جیل چلا جائے گا۔ ان کو جیل سے باہر بھی رہنے دو۔ کیا انہیں جیل بھیجنا چاہتے ہو؟ مولانا اعظم طارق مرحوم عجیب تاثرات کے ساتھ مولانا چنیوٹی کو دیکھتے رہے لیکن اپنی تقریر میں بھی کوئی تبصرہ نہ کیا۔''

''خلافت راشدہ'' کے فاضل مضمون نگار اور ان کے ہم نواؤں سے گزارش ہے کہ کالعدم سپاہ صحابہ کے طرز عمل کے ساتھ ہمارا اختلاف بھی وہی ہے جو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم، سفیر ختم نبوت حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی رحمہ اللہ تعالیٰ اور دیگر بہت سے سرکردہ اور سنجیدہ علماء کرام کا ہے۔ اس پر سیخ پا ہونے کے بجائے کالعدم سپاہ صحابہ کی قیادت کو اس کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے اور اپنے طرز عمل اور طریق کار پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ شیعہ جارحیت کے خلاف اہل سنت کے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کا آغاز سپاہ صحابہ نے نہیں کیا، بلکہ اس سے قبل پاکستان میں حضرت مولانا عبد الستار تونسوی مدظلہ، حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ، حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ، حضرت مولانا دوست محمد قریشیؒ، حضرت مولانا احمد شاہ چوکیرویؒ، حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود مدظلہ اور دیگر سرکردہ علماء کرام نے نصف صدی تک اس جدوجہد کی قیادت اور راہ نمائی ہے، البتہ کالعدم سپاہ صحابہ نے اس میں شدت پسندی کا اضافہ کیا ہے اور تشدد کا ماحول پیدا کیا ہے، مگر اب وقت آ گیا ہے کہ اس شدت پسندی کے نفع ونقصان کا جائزہ لے لیا جائے اور پیچھے مڑ کر دیکھ لیا جائے کہ اس طرز عمل سے ہم نے کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے؟

ہم اس میں کالعدم سپاہ صحابہ کو تنہا قصوروار نہیں سمجھتے، بلکہ ہمارے نزدیک اس شدت پسندی کا بیج انقلاب ایران کے بعد اس کی سرپرستی میں کالعدم تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ نے پاکستان میں فقہ جعفریہ کے جداگانہ نفاذ کا مطالبہ اور اسلام آباد کے وفاقی سیکرٹریٹ کا محاصرہ کر کے بویا تھا۔ سپاہ صحابہ اس کے ردعمل میں وجود میں آئی، لیکن اس ردعمل میں اس قدر آگے نکل گئی کہ نفع ونقصان کا توازن قائم رکھنا یاد نہ رہا اور پیچھے ہٹنے کے راستے بھی بند نظر آنے لگے۔ ہمارا مشورہ اب بھی صرف یہ ہے کہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیا جائے، سود وزیاں کا حساب کر لیا جائے اور ان اکابر واسلاف کے طریقے پر واپس آنے کی راہیں تلاش کر لی جائیں جو ہم سے زیادہ متصلب سنی تھے، اہلِ سنت کے عقائد کے ساتھ ہم سے زیادہ وابستگی اور وفاداری رکھتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ملی اور قومی مقاصد کا شعور بھی رکھتے تھے اور توازن کا دامن ہمیشہ تھامے رکھتے تھے۔ اسی میں سلامتی ہے، یہی صحیح راہ عمل ہے اور اسی میں اہلِ سنت کے عقائد، حقوق اور مفادات کا تحفظ بھی ہے۔

سنی شیعہ کشمکش کا کارڈ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء

سعودی عرب کے وزیر خارجہ شہزادہ سعود الفیصل نے عراق کی تازہ ترین صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکی پالیسیوں کی وجہ سے عراق بتدریج ایران کے زیر اثر جا رہا ہے اور عراق کے اہلِ سنت اقلیت میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ عراق کے لیے جو دستور تجویز کیا گیا ہے، اس کے بارے میں ہم اپنے تحفظات کا اظہار کر چکے ہیں اور اس سے عراق کی سنی آبادی مطمئن نہیں ہے۔ اس سے قبل عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل جناب عمرو موسیٰ کی طرف سے بھی اس قسم کے خدشات کا اظہار ہوا ہے اور عرب صحافتی حلقوں میں عراقی دستور پر ملے جلے ردعمل کا سلسلہ جاری ہے۔

عراق کے بارے میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ انہوں نے فوج کشی کر کے عراقی عوام کو صدام حسین کے آمرانہ حکومت سے نجات دلائی ہے اور اب وہ عراق کو جمہوریت کی راہ پر گامزن کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں جبکہ عراق میں امریکی اتحاد کی فوجوں کے خلاف مسلح مزاحمت کا سلسلہ جاری ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

''جمہوریت بذریعہ گولی'' کا یہ فارمولا افغانستان میں بھی آزمایا جا رہا ہے اور افغان عوام کو بندوق کے سائے میں جمہوریت سے روشناس کرانے کا عمل جاری ہے۔ بعض عرب اخبارات میں اس

حوالے سے شائع ہونے والی رپورٹوں کے مطابق عراق کی نومنتخب پارلیمنٹ نے جس دستور کو ریفرنڈم کے لیے جاری کیا ہے اور جس پر اکتوبر کے دوران استصواب کرایا جا رہا ہے، اس کا مسودہ واشنگٹن سے تیار ہو کر آیا ہے اور اگر اسے اسی طرح نافذ کر دیا گیا تو عراق کے واضح طور پر تین حصوں میں تقسیم ہو جانے کا خطرہ بڑھ جائے گا۔ ان رپورٹوں میں بتایا گیا ہے کہ اس مسودہ پر قومی اسمبلی میں اتفاق رائے کے حاصل نہ ہونے کے باوجود اسے ریفرنڈم کے لیے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے اور جس طرح ایسے ممالک میں ریفرنڈم ہوتے ہیں، اس کی رسم پوری ہونے کے بعد اسے نافذ کر دیا جائے گا جس کے لیے مسلسل راہ ہموار کی جا رہی ہے۔

دستوری مسودہ پر اعتراض کرنے والے حلقوں نے اس کے جن پہلوؤں کے بارے میں خدشات کا اظہار کیا ہے، ان میں تین باتیں بطور خاص ہیں:

1. ایک یہ کہ اس میں عراق کو ایک اسلامی ریاست کی بجائے سیکولر ریاست قرار دیا گیا ہے اور عراق کا اسلامی تشخص اس میں برقرار نہیں رکھا گیا۔
2. دستور کے اس مسودہ میں عراق کو عرب ملک قرار نہیں دیا گیا بلکہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ عراق میں جو لوگ آباد ہیں، ان میں عرب بھی شامل ہیں۔ اس طرح عراق بحیثیت ملک عرب ممالک میں اس دستور کی رو سے شمار نہیں ہوگا اور عراق کے عرب تشخص کو ختم کرنے کی اس دستوری کاروائی پر عرب لیگ نے بھی تحفظات کا اظہار کیا ہے۔
3. عراق میں شیعہ سنی تناسب کے حوالے سے صورتحال یہ ہے کہ شمال کی کرد آبادی سنی ہونے کے باوجود کردوں کے قومی تشخص کے عنوان سے قومی معاملات میں شریک کی گئی ہے، جبکہ جنوب کی شیعہ آبادی اہلِ تشیع کے مذہبی تشخص کے ساتھ قومی معاملات میں شریک ہے۔ اس طرح شمال پر کردوں کا کنٹرول ہوگا اور جنوب میں ۹ صوبوں میں اہلِ تشیع کی بالادستی ہوگی، جبکہ عرب بحیثیت سنی درمیان کے صرف تین صوبوں انبار، صلاح الدین، اور نینوا کا کنٹرول حاصل کر سکیں گے۔

ایک عرب کالم نگار صلاح الدین حافظ نے عراق کی مجوزہ دستور کی رو سے سامنے آنے والی نئی تقسیم کی صورت کچھ اس طرح بیان کی ہے کہ

> ”شیعہ بحیثیت شیعہ متحد ہیں۔ جنوب میں ان کی اکثریت ہے اور انہیں ۹ صوبوں پر اقتدار حاصل ہوگا۔ جبکہ سنی آبادی عربوں اور کردوں میں تقسیم ہوگی۔ سنی کردوں کو صرف ان کے کرد قومی تشخص کے ساتھ شمال کے علاقوں میں اقتدار حاصل ہوگا اور

عربوں کو اہلِ سنت کے مذہبی تشخص کے ساتھ صرف تین صوبوں پر اقتدار ملے گا‘‘۔

صلاح الدین حافظ کے بقول جنوب کے تیل کے علاقے اہلِ تشیع کے پاس ہیں، شمال میں تیل کے علاقے کردوں کے حصے میں ہیں، جبکہ تینوں عرب سنی صوبوں میں تیل موجود نہیں ہے اور وہ ’’حلی باب اللہ‘‘ اللہ کے دروازے پر ہوں گے۔ اس طرح اہلِ تشیع جنوب میں مذہبی تشخص کے ساتھ متحد ہوں گے۔ تیل کی دولت ان کے پاس ہوگی اور وہ ایران کے پہلو میں ہیں۔ عراق کا ایک ملک کی حیثیت سے عرب تشخص ویسے ہی اس دستوری مسودہ میں تسلیم نہیں کیا گیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس خطے میں غیر عرب تشخص، جو ظاہر ہے کہ ’’فارسی‘‘ ہوگا، آگے بڑھے گا۔ اور جنوبی عراق جہاں ایرانی اثرات پہلے ہی نمایاں ہیں، دھیرے دھیرے عرب دنیا سے کٹ کر مکمل طور پر ایران کے زیر اثر چلا جائے گا۔

ہمارے خیال میں سعودی عرب کے وزیر خارجہ شہزادہ سعود الفیصل نے عراق کی صورتحال اور اس کے مجوزہ دستور کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا ہے، اس کا پس منظر یہی ہے۔ اور اگر معاملات اسی طرح آگے بڑھتے ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی جان بوجھ کر اس خطے میں عربوں اور ایران کو ایک دوسرے کے سامنے لانے کے لیے کوشاں ہیں، یا دوسرے لفظوں میں اس خطے میں موجود رہنے کے لیے انہوں نے شیعہ سنی کشمکش کا کارڈ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، اور وہ خلیج کے ممالک میں عوامی بیداری کا رخ اس طرف موڑ دینا چاہتے ہیں۔

عرب دنیا کے بہت سے ممالک مثلاً بحرین، کویت، شام، لبنان وغیرہ میں شیعہ کمیونٹی سیاست میں مؤثر طور پر موجود ہے، مگر لبنان کے علاوہ اور کسی ملک میں جداگانہ مذہبی تشخص کے ساتھ قومی معاملات میں ان کی شرکت نہیں ہے۔ لبنان کے بعد عراق دوسرا ملک ہوگا جہاں اس دستور کے نفاذ کے بعد قومی معاملات میں اہلِ تشیع کی شرکت جداگانہ مذہبی تشخص کے ساتھ ہوگی اور یہ سلسلہ آگے چل نکلا تو پوری عرب دنیا سنی شیعہ کشمکش کی راہ پر چل پڑے گی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس وسیع تر کشمکش میں ایک کو دوسرے کی ’’زیادتیوں‘‘ سے بچانے کے لیے امریکہ اور اس کے حواری پورے جواز کے ساتھ خطے میں رہیں گے۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی اس خطہ میں عسکری موجودگی پہلے بھی عراق اور کویت کے تنازع کو ختم کرانے کے لیے آنے والی امریکی فوجیں ابھی تک موجود ہیں۔ اب اس قسم کا ایک اور مصنوعی تنازع مذہبی حوالہ سے زیادہ وسیع تناظر میں کھڑا کیا جا رہا ہے جو اس خطہ میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی مسلح افواج کی مستقل موجودگی کا جواز بنے گا، اور عرب دنیا میں مغرب کی

چیرہ دستیوں کے خلاف بڑھنے والی عوامی بیداری کا رخ بڑی آسانی سے دوسری طرف موڑ دیا جائے گا۔ اس میں نہ کہیں تیل کی دولت کے استحصال کا ذکر ہوگا اور نہ اسرائیل کے تحفظ واستحکام کی بات آئے گی، بس سنی شیعہ کشمکش کا عنوان ہوگا، ایران اور عرب آمنے سامنے ہوں گے اور مغربی ممالک ایک بار پھر ترازو ہاتھ میں لیے بندر بانٹ میں مصروف ہو جائیں گے۔

سوال یہ ہے کہ کیا عرب لیگ اور ایران باہم مل بیٹھ کر اس خطے کے عوام کو اس نئے عذاب سے بچانے کے لیے کوئی مشترکہ موقف اور لائحہ عمل اختیار نہیں کر سکتے؟

فرقہ وارانہ کتابوں کی ضبطی کا معاملہ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ---اکتوبر ۲۰۰۶ء

ان دنوں اخبارات میں حکومت کی طرف سے جاری کردہ کتابوں کی ایک فہرست کے بارے میں مختلف حلقوں کے بیانات شائع ہو رہے ہیں۔ اس فہرست کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ کم و بیش ساٹھ کتابوں پر مشتمل ہے اور یہ ان کتابوں کی فہرست ہے جنہیں فرقہ وارانہ کشیدگی کا باعث بننے والی کتابیں قرار دے کر انہیں ضبط کرتے ہوئے دوبارہ ان کی اشاعت کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کتابوں میں حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کی تصنیف ''تقویۃ الایمان'' اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے فتاویٰ کا مجموعہ ''فتاویٰ رشیدیہ'' بھی شامل ہے اور اس کے علاوہ بعض ایسی کتابیں بھی اس فہرست میں درج کی گئی ہیں جو عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے قادیانیوں کی تردید میں لکھی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم دو باتوں کی طرف ملک کی حکومت اور اہل علم کو توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں:

قادیانیت: مسلم فرقہ یا الگ مذہب؟

ایک یہ کہ قادیانیوں کے خلاف لکھی گئی کتابوں کو اس فہرست میں شامل کرنے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قادیانی گروہ بھی مسلمانوں کے باہمی فرقوں میں سے کوئی فرقہ ہے- اور اس پس منظر میں یہ تاثر اور بھی زیادہ گمراہ کن ہو جاتا ہے کہ قادیانی اپنے بارے میں علماء امت اور پارلیمنٹ فیصلوں کو رد کرتے ہوئے مسلمان کہلانے اور خود کو ایک مسلم فرقہ کے طور پر متعارف کرانے پر مصر ہیں، اور ان کی مسلسل کوشش ہے کہ انہیں مسلمانوں سے الگ غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی بجائے مسلمان فرقہ میں سے ایک فرقہ تصور کیا جائے- اس لیے فرقہ وارانہ کتابوں پر پابندی کے عنوان سے قادیانیوں کے خلاف کتابوں کو اس زمرہ میں شمار کر کے ان کی فہرست میں انہیں داخل کرنا قادیانیوں کی اس گمراہ کن

کوشش کو تقویت پہنچانے کے مترادف ہے اور اس پر حکومت کو نظر ثانی کرنی چاہیے۔

علمی تحقیقات پر پابندی؟

دوسری بات یہ کہ فرقہ وارانہ اختلافات پر عمل اور تحقیقی انداز میں لکھی گئی کتابوں کو اس زمرہ میں شمار کرنا علم و تحقیق کا دروازہ بند کرنے کے ساتھ ساتھ کسی بھی فرقہ کو اپنا موقف علمی انداز میں بیان کرنے کے حق سے محروم کر دینے کے بھی مترادف ہے اور اس کی کسی بھی صورت میں حمایت نہیں کی جا سکتی۔ یہ صرف مذہب کے شعبہ کی بات نہیں، زندگی کے دوسرے شعبوں کے مسائل میں بھی اسی طرح کا اختلاف رائے موجود ہے، اختلاف رائے پر مبنی گروہ بندیاں بھی ہیں اور ہر مسئلہ پر اپنے نقطۂ نظر کے اظہار کے ساتھ ساتھ دوسروں کے موقف سے اختلاف اور اس کے رد کی روایت بھی صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ اس پر قدغن لگانے سے تو بحث و مباحثہ اور مکالمہ کا وہ دروازہ ہی بند ہو جائے گا جسے مذاہب کے درمیان رابطہ اور ڈائیلاگ کے عنوان سے اب عالمی سطح پر کھولنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس لیے علم و تحقیق اور مکالمہ و مباحثہ پر پابندی لگانا نہ صرف فطرت بلکہ دینی تقاضوں کے بھی منافی ہے۔

گزشتہ سال مدرسہ نصرۃ العلوم کے ایک محترم فاضل مولانا حافظ مہر محمد میانوالوی کو اسی حوالہ سے گرفتار کیا گیا، وہ کئی ماہ جھنگ جیل میں رہے اور ان پر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا، حالانکہ وہ ایک محقق و مصنف ہیں اور اپنی کتابوں میں دلیل اور حوالہ کے ساتھ سنی شیعہ تنازعات پر بحث کرتے ہیں۔ لیکن انہیں فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلانے کا مجرم قرار دے کر گرفتار کیا گیا اور کئی ماہ جیل میں رکھا گیا حتیٰ کہ عدالت نے یہ دیکھ کر کہ ان کا انداز تو تحقیق اور مباحثہ کا ہے اور وہ دلیل و حوالہ کے ساتھ بات کرتے ہیں انہیں باعزت بری کر دیا۔

ہم حکومت سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اس سلسلہ میں "اندھے کی لاٹھی" کی طرز کا قانون نافذ کرنے کی بجائے سنجیدگی کے ساتھ کوئی معیار قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ جو کتاب یا تحریر اس انداز میں لکھی گئی ہے کہ اس میں کسی فرقے کے خلاف لوگوں کو تشدد پر اکسایا گیا ہے یا ایسی منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو نقص امن کے لیے خطرہ بن سکتی ہے، اس پر ضرور پابندی لگائی جانی چاہیے اور ایسا کرنے والوں کے خلاف لازماً کاروائی ہونی چاہیے۔ لیکن اس کی آڑ میں سنجیدہ علمی مباحثہ اور مسائل پر دلیل اور حوالہ کے ساتھ بات کرنے کا راستہ بند کر دینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے، ہمیں امید ہے کہ ملک کے علمی و دینی حلقے اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ دیں گے اور باہمی مشاورت اور مناسب عملی پیشرفت کے ساتھ حکومت کو اس فہرست اور طرز عمل دونوں سے نظر ثانی کے لیے آمادہ

کرنے کی کوشش کریں گے۔

قرآن کریم کے چالیس پارے

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۰۷ء

سینٹ میں متحدہ حزب اختلاف نے وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف کے اس بیان کے خلاف تحریک التوا جمع کرا دی ہے جس میں انہوں نے ایک نجی ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ تیسری جماعت سے آٹھویں جماعت تک بچوں کو چالیس پارے پڑھائے جائیں گے تاکہ انہیں مدرسہ جانے کی ضرورت نہ پڑے۔ تحریک التوا میں ارکان سینٹ نے کہا ہے کہ وفاقی وزیر تعلیم کے اس بیان سے پاکستانی قوم کو شدید دکھ ہوا ہے جس کا نوٹس لیا جانا چاہیے۔

وفاقی وزیر تعلیم ایک ذمہ دار ریٹائرڈ فوجی آفیسر ہیں جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وفاقی وزارت تعلیم کے منصب پر فائز ہیں جس کے دستور میں یہ درج ہے کہ اسلامی تعلیمات کا فروغ اور ایک صحیح اسلامی معاشرہ کا قیام حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ہے مگر ان کی اپنی معلومات کا یہ حال ہے کہ انہیں یہ تک معلوم نہیں ہے کہ قرآن کریم کے پارے کتنے ہیں؟ قرآن کریم کے چالیس پاروں کے بارے میں ایک واعظانہ روایت اہلِ تشیع کے حوالہ سے سنتے آرہے تھے کہ قرآن کریم کے اصل میں چالیس پارے تھے جن میں سے دس پارے بکری کھا گئی اور مکمل قرآن کریم اب صرف امام غائب کے پاس ہے جو اثنا عشریہ اہلِ تشیع کے عقیدہ کے مطابق ایک غار میں مستور ہیں اور قیامت سے پہلے وہ قرآن کریم لے کر باہر آئیں گے، لیکن اس روایت کو اہلِ تشیع کی سنجیدہ علمی قیادت بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

۱۹۸۷ء کے دوران حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور مولانا حافظ حسین احمد ایم این اے سمیت ایک وفد کے ہمراہ راقم الحروف کو ایران جانے کا اتفاق ہوا تو ایران کے ایک ذمہ دار اور مقتدر مذہبی راہنما جناب آیت اللہ خزعلی نے ہمارے سامنے قرآن کریم ہاتھ میں لے کر حلف اٹھاتے ہوئے کہا تھا کہ ''ما ایمان داریم کہ این قرآن کریم حق است نہ یک حرف کم نہ زیاد''۔ اس پر مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور آیت اللہ خزعلی کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ ایک الگ دلچسپ قصہ ہے مگر اس حوالہ سے اس موقع پر ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ چالیس پاروں والے قصہ کو تو شیعہ کی علمی قیادت بھی قبول نہیں کر رہی، جبکہ ہمارے وفاقی وزیر تعلیم کے ذہن میں کسی دور کی یہ سنی سنائی بات اٹکی ہوئی ہوگی جس کا انہوں نے اپنے ٹی وی انٹرویو میں اظہار کر دیا ہے اور قوم کے بچوں کو دینی مدارس سے دور رکھنے کی مہم میں آٹھویں جماعت تک بچوں کو ''چالیس پارے'' پڑھانے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اس لیے ہم اس موقع پر

اس کے سوا کیا عرض کر سکتے ہیں کہ

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملاّ است

کار طفلاں تمام خواہد شد

البتہ اس میں ''ملاّ'' کی بجائے ''وزیر'' پڑھ لیا جائے، اس لیے کہ ملاّ غریب تو بدستور تیس پاروں والے قرآن کریم کو ہی سینے سے لگائے ہوئے ہے اور اس کی حتی الوسع خدمت کر رہا ہے۔

صدام حسین اور عرب قومیت

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۴ جنوری ۲۰۰۷ء

عید قربان پر سابق عراقی صدر صدام حسین امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی انا کی سولی پر لٹک گئے اور اتحادیوں نے عید کے روز عراقی عوام اور امت مسلمہ کو صدام حسین کی لاش کا تحفہ دے کر ایک بار پھر دنیا کو بتا دیا کہ مسلم دنیا میں امریکہ کی ''ون قطبی طاقت'' کے سامنے جھکنے سے انکار کرنے والوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے اور اتحادی جب چاہیں اپنے باغیوں کی گردن میں پھندا فٹ کر کے انہیں زندگی کے حق سے محروم کر سکتے ہیں۔

صدام حسین کی پھانسی

صدام حسین دنیا میں عرب نیشنلزم کے اس عنصر کے نمائندہ کے طور پر عراق کے حاکم بنے تھے جس نے مذہب بیزاری کے جلو میں عرب قومیت کا پرچم بلند کیا تھا اور بائیں بازو کے افکار کی بنیاد پر عراقی نیشنلزم کی نیو اٹھائی تھی۔ وہ بعث پارٹی کے رہنما تھے جو سیاست میں مذہب کی ملاوٹ کے خلاف ہے بلکہ اجتماعی معاملات میں مذہب کے کردار کی نفی کو ضروری سمجھتی ہے۔ لیکن ان کی زندگی کا اختتام اس کیفیت میں ہوا کہ قرآن کریم ان کے ہاتھ میں تھا، انہوں نے پھانسی گھاٹ کی طرف جانے سے قبل نماز پڑھی اور جب پھانسی کے تختے کی طرف بڑھے تو اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے تختے پر کھڑے ہو گئے۔ پھر بعض خبروں کے مطابق انہوں نے کلمہ طیبہ پڑھا اور جب جلاد نے ان کے گلے میں پھانسی کا پھندا فٹ کرتے ہوئے کہا کہ ''جہنم میں جاؤ'' تو صدام حسین نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا کہ ''جنت میں جاؤں گا''۔ اور پورے وقار کے ساتھ منہ پر ماسک پہننے سے انکار کرتے ہوئے تختہ دار پر جھول گئے۔ اس سے قبل انہوں نے دعائیہ جملہ کے طور پر یہ آخری الفاظ کہے کہ ''عراق سلامت رہے اور فلسطین عربوں کا ہے''۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ''اعتبار خاتمہ کا ہوتا ہے''۔ یعنی جو شخص جس حالت میں دنیا سے رخصت ہوتا ہے آخرت کے معاملات اسی حوالے سے طے پاتے ہیں۔ اس لیے صدام حسین کے آخری لمحات کی کیفیات کو دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انہیں سرخروئی حاصل ہوگی اور ان کی زندگی کے یہ آخری لمحات ان کے متنازعہ ماضی کا کفارہ بن جائیں گے۔

مجھے صدام حسین کی زندگی کے آخری لمحات دیکھ کر حجاج بن یوسف یاد آگیا، وہ بھی عراق کا حاکم تھا، اس نے بھی اہل دین کے خلاف ظلم و جبر کی انتہا کر دی تھی۔ اس نے سلطنت کے استحکام کو باقی ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہوئے ہزاروں صالحین کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔ اس نے مکہ مکرمہ کا محاصرہ کر کے بیت اللہ پر سنگباری کی تھی اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت سعید بن جبیرؒ جیسے اساطین امت کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے تھے۔ لیکن اس کے کھاتے میں بڑی بڑی نیکیاں بھی ہیں۔ سندھ کے راجہ داہر کے ہاتھوں چند مسلمان خواتین کی گرفتاری پر اسی نے غیرت کھا کر اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کی قیادت میں لشکر تیار کیا تھا اور دمشق کی خلافت سے اس لشکر کی روانگی کی اجازت طلب کر کے اسے سندھ کی طرف روانہ کیا تھا۔ بعض روایات کے مطابق قرآن کریم پر اعراب لگوانے کا کام بھی اسی کی نگرانی میں تکمیل تک پہنچا تھا جس کی وجہ سے غیر عربوں کے لیے قرآن کریم کی براہ راست تلاوت آسان ہوگئی۔

حجاج بن یوسف کی زندگی متضاد کارناموں کا مجموعہ ہے لیکن بعض حضرات نے اس کی زندگی کے آخری لمحات کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ مرض الموت میں اس کی بوڑھی ماں نے اسے اس کے مظالم یاد دلاتے ہوئے جب کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کس منہ سے پیش ہوگا؟ تو اس نے جواب میں کہا کہ ماں مجھے ڈراؤ نہیں، اللہ تعالیٰ تجھ سے کہیں زیادہ مہربان اور شفیق ہے۔ ایک بار میں نے ایک عوامی خطاب کے دوران حجاج بن یوسف کی وفات سے قبل کے لمحات اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت پر اس کا یہ یقین قدرے تفصیل سے بیان کیا تو ایک صاحب نے مجھ سے سوال کر دیا کہ اللہ تعالیٰ اگر حجاج بن یوسف کو بخش دیں گے تو ان ہزاروں مظلوموں کا کیا بنے گا جن کے بے گناہ خون سے اس نے اپنے ہاتھ رنگے تھے۔ میں نے بعض بزرگان دین کے حوالے سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو بخشنا چاہتے ہیں تو اس کے مظالم کا بدلہ کئی گنا اپنی طرف سے مظلوموں کو ادا کر کے اس کی بخشش کا اہتمام کر دیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی کی کوئی ادا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پسندیدگی کا درجہ پالے تو باقی مراحل اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے طے فرما دیتے ہیں اور یہ نہ انصاف کے خلاف ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر ہے۔

صدام حسین کی زندگی بھی ایسے ہی تضادات سے عبارت رہی ہے۔ وہ اصلاً اس عرب نیشنلزم کے

علمبردار تھے جس کی بنیاد بعث پارٹی نے مذہب کی نفی پر رکھی تھی اور وہ عالمی سیاست میں بائیں بازو کی نظریاتی سیاست کی نمائندگی کرتے تھے۔ عرب نیشنلزم کی اٹھان ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کی صدیوں کی حکمرانی کے ردعمل کے طور پر عربوں کی آزادی کے تصور کے ساتھ ہوئی تھی۔

سقوطِ خلافتِ عثمانیہ کے بعد عرب قومیت کے تین رخ

خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کی راہ ہموار کرنے والوں نے جس طرح ترکوں کو یہ سبق پڑھایا تھا کہ وہ یورپین ہیں اور بالاتر قوم ہیں اس لیے ان کا عربوں کے نتھی رہنا ان کے روشن مستقبل کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے، اسی طرح عربوں کو بھی اس دور میں یہ سبق پڑھایا گیا تھا کہ وہ عرب ہیں اور عجمیوں کا ان پر حکمران ہونا عربوں کی بالاتری کے منافی ہے اس لیے انہیں ترکی کی خلافتِ عثمانیہ سے جلد از جلد نجات حاصل کر لینی چاہیے۔ اس "عرب نیشنلزم" کے مختلف پہلو اور متعدّد جہات تھیں:

1. ایک جہت مذہبی تھی جس کا اظہار خلافتِ عثمانیہ کی طرف سے مکہ مکرمہ کے گورنر شریف مکہ سید حسین ہاشمی کی اس بغاوت کی صورت میں ہوا جس کی وجہ یہ بیان کی گئی تھی کہ ترکی والے عجمی ہیں اور ظالم ہیں انہیں خلافت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ خلیفہ اسلام کے لیے قریشی ہونا شرط ہے اور غیر قریشی خلیفہ اسلام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے شریف مکہ حسین نے جو قریشی اور ہاشمی تھے، برطانوی استعمار کے اس وعدے پر ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی کہ انہیں عرب دنیا کا خلیفہ تسلیم کر لیا جائے گا۔ لیکن جب بغاوت کامیاب ہوئی اور ترکوں کو سرزمین عرب سے نکال دیا گیا تو شریف مکہ کے بیٹوں کو عراق اور اردن کی حکمرانی دے کر سرزمین حجاز پر آلِ سعود کا خاندانی اقتدار تسلیم کر لیا گیا، جبکہ اسی شریف مکہ کے ایک بیٹے کو عراق کا حکمران بنا دیا گیا جس نے ہاشمی ہونے کے ناتے سے عراق کی جداگانہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔
2. لیکن عرب نیشنلزم کا دوسرا پہلو جس کی بنیاد مذہب کی بجائے سیکولرازم پر تھی اس نے انقلاب کے ذریعے اس کا تختہ الٹ دیا۔ جنرل عبد الکریم قاسم اور بعث پارٹی عرب قومیت کے اسی ونگ کی قیادت کر رہے تھے اور صدام حسین کے اقتدار کا آغاز بھی اسی حوالے سے ہوا تھا۔
3. عرب قومیت کا ایک تیسرا رخ بھی تھا جو سعودی عرب کی مذہبی عرب قومیت اور بعث پارٹی کی سیکولر عرب قومیت، دونوں سے مختلف تھی۔ اس کی قیادت مصر کے جمال عبد الناصر کے ہاتھ میں تھی جو نہ تو سعودی عرب کی طرح ملک میں شرعی قوانین کے نفاذ کے

لیے تیار تھے اور نہ ہی بعث پارٹی کی طرح مذہب کی نفی کرتے تھے۔

خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد عرب قومیت ان تین رخوں پر آگے بڑھتی رہی، آپس میں ایک دوسرے سے الجھتے بھی رہے، سرد جنگ کے دوران امریکہ اور روس کے کیمپوں میں تقسیم بھی رہے اور بہت سے عرب ملکوں میں اس بنیاد پر تقسیم اور انقلابات بھی رونما ہوئے۔ لیکن ان تمام جھگڑوں کے باوجود عرب قومیت ان سب میں قدرِ مشترک چلی آرہی ہے اور عرب لیگ کے فورم پر آج بھی سب مل کر فیصلے کرتے ہیں۔

ایران عراق جنگ اور اس کی پشت پناہی

یہی وجہ ہے کہ جب ایران میں مذہبی انقلاب کی کامیابی کے بعد عرب دنیا میں اس کے نفوذ اور رسوخ کے امکانات واضح ہونے لگے تو صدام حسین نے ایران کے ساتھ آٹھ سال تک مسلسل جنگ لڑکر اس کا راستہ روک دیا۔ اس جنگ میں انہیں امریکہ کی پشت پناہی بھی حاصل تھی کہ امریکہ کے مستقبل کے ایجنڈے کے لیے یہ جنگ ضروری تھی، لیکن پوری عرب دنیا اس جنگ میں صدام حسین کے ساتھ تھی اور اس کے پس منظر میں یہی عرب قومیت کارفرما تھی جو ایک عجمی قوت کے عرب دنیا میں اثرونفوذ کو روکنے کے لیے اس جنگ کو ناگزیر تصور کرتی تھی۔ صدام حسین کو ایران عراق جنگ میں دو حیثیتیں حاصل تھیں:

1. ایک یہ کہ وہ عرب دنیا کو عجمی اثرورسوخ سے محفوظ رکھنے کی جنگ لڑ رہے تھے،
2. اور دوسری یہ کہ وہ عرب دنیا میں اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی تقسیم کے پس منظر میں اہلِ سنت کے مفادات کا تحفظ کررہے تھے۔

اس لیے ان کی پھانسی کے ذریعے موت کو عرب دنیا میں سنی شیعہ کشمکش بلکہ خانہ جنگی کے آغاز کا الارم تصور کیا جارہا ہے اور بعض حلقوں کی طرف سے یہ کہا جارہا ہے کہ اس موقع پر انہیں پھانسی دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے سنی شیعہ کشمکش کو خانہ جنگی کے ہدف تک لے جانا مقصود ہے جس کا دائرہ صرف عراق تک محدود نہیں رہے گا بلکہ کویت، بحرین، لبنان اور سعودی عرب کے ساتھ ساتھ مرحلہ وار پوری عرب دنیا کے اس میں ملوث ہونے کا امکان موجود ہے۔ اور عرب دنیا میں تیزی سے بڑھتے ہوئے مذہبی رجحانات سے اسرائیل کو محفوظ رکھنے اور امریکی مفادات کو بچانے کے لیے اس سے زیادہ کامیاب نسخہ کوئی نہیں ہے۔

بہرحال اس تناظر میں صدام حسین اپنے حصے کا کام سرانجام دے کر بارگاہ ایزدی میں پیش ہوچکے ہیں، ان کے بہت سے کاموں سے اختلاف بلکہ شدید اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان کی زندگی کا آخری

حصہ بہرحال استعمار کے خلاف جرأت و استقامت اور حوصلہ و عزیمت سے عبارت ہے اور اسی حوالے سے ہم بارگاہ خداوندی سے امیدوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں گے اور رحمت خداوندی انہیں اپنے سائے میں جگہ دے گی۔

ہم خیال مسلم ممالک کا الگ بلاک بنانے کی ضرورت

روزنامہ اسلام، لاہور ---۳فروری ۲۰۰۷ء

صدر جنرل پرویز مشرف کے انڈونیشیا کے دورہ کے موقع پر دنیا کے اس سب سے بڑے مسلم آبادی والے ملک کے صدر سوسیلو بمبانگ یودھویونو کے ساتھ ان کی مشترکہ پریس کانفرنس کے حوالے سے یہ خوش کن خبر گزشتہ روز سامنے آئی ہے کہ ان دونوں رہنماؤں نے ہم خیال مسلم ممالک کا الگ بلاک بنانے کی ضرورت پر اتفاق کیا ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف ان دنوں بہت سے مسلم ممالک کے دورے پر ہیں اور مشرقِ وسطیٰ کے بعض ممالک کے رہنماؤں سے تبادلۂ خیالات کے بعد وہ مشرقِ بعید گئے ہیں جہاں انہوں نے آبادی کے حوالے سے دنیا کے سب سے بڑے مسلمان ملک انڈونیشیا کے صدر کے ساتھ گفتگو کے بعد مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اس دورہ کا مقصد فلسطین کے مسئلہ کے حل کے لیے مضبوط اور سب کے لیے قابل قبول آواز بلند کرنا اور لبنان و عراق میں بدامنی کا خاتمہ بیان کیا ہے۔

اس دورے میں مختلف مقامات پر صدر پاکستان نے جن خیالات کا اظہار کیا اور مسائل کے حل کے لیے جن تجاویز پر مسلم حکمرانوں سے بات چیت کی ان سب سے قطع نظر ہم اس کے ایک پہلو پر کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ پاکستان اور انڈونیشیا نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ بااثر اور ہم خیال ممالک کے رہنماؤں کا ایک گروپ قائم کیا جائے جو عالمِ اسلام کے درمیان ہم آہنگی اور مشرقِ وسطیٰ میں تنازعات کے حل کے لیے کام کرے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ انڈونیشیا کے صدر جناب سوسیلو بمبانگ یودھویونو نے اس موقع پر تجویز پیش کی کہ عالمِ اسلام کو درپیش مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے علماء کی بین الاقوامی کانفرنس بلائی جائے۔ جبکہ دونوں رہنماؤں کا کہنا ہے کہ ہم دونوں نے محسوس کیا ہے کہ اب عمل کا وقت آگیا ہے اور خاموشی کا وقت گزر گیا ہے، اگر آواز بلند نہ کی تو صورتحال مزید خراب ہوگی جس پر قابو پانے کی ضرورت ہے کیونکہ مسلمانوں اور پوری دنیا کے لیے

یہ اہم وقت ہے۔

جہاں تک بااثر مسلمان ممالک کے حکمرانوں کا ایک مستقل گروپ یا بلاک قائم کرنے کا تعلق ہے اس کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی جارہی ہے۔ ماضی میں پاکستان، ایران اور ترکی پر مشتمل "آر سی ڈی" کا قیام اسی جذبہ کے ساتھ عمل میں آیا تھا اور اسلامی سربراہ کانفرنس بھی اسی عزم کے ساتھ وجود میں آئی تھی لیکن ہمارے نزدیک اس سلسلہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جس کی وجہ سے آر سی ڈی اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکی اور اسلامی سربراہ کانفرنس بھی ایک نمائشی ادارے سے زیادہ کوئی مقام حاصل نہیں کرپائی وہ یہ ہے کہ اس وقت مسلم ممالک میں جو لوگ حکمران ہیں ان کی اکثریت آزادانہ ذہن نہیں رکھتی اور مغرب کے قائم کردہ یک طرفہ بین الاقوامی نظام کے جال اور طلسم سے گلوخلاصی کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی۔ مغرب نے سائنس، ٹیکنالوجی، معیشت، سیاست، عسکریت، تجارت اور دیگر شعبوں میں تو برتری اور اجارہ داری قائم کر ہی رکھی ہے مگر اس سے کہیں زیادہ اجارہ داری کا ماحول اس نے فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کے میدان میں قائم کر رکھا ہے اور ہمارے حکمران طبقات اس اجارہ داری سے مرعوب اور بے بس ہو کر امت مسلمہ کو اسی راستے پر زبردستی چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ ذہن آزاد ہوں اور فکر مرعوب نہ ہو تو باقی تمام مسائل کا حل نکل سکتا ہے۔ لیکن ذہن و فکر ہی سپر اندازی پر آمادہ ہو چکے ہوں تو نہ الگ بلاک سے کچھ بنے گا اور نہ ہی حکمرانوں کا کوئی گروپ قائم کرنے سے کسی مثبت پیش رفت کی توقع کی جا سکتی ہے۔

علماء کی بین الاقوامی کانفرنس کا فائدہ بھی اسی صورت میں ہوگا جب ذہن و فکر کی آزادی کو اصل ہدف قرار دیا جائے گا۔ اس لیے کہ علمائے کرام کسی نئی کانفرنس میں کوئی نئی رائے نہیں دیں گے، وہ تو ہر مسلمان ملک میں ایک بات تسلسل سے کہہ رہے ہیں کہ ہمارا اصل مسئلہ فکری آزادی اور تہذیبی تشخص کا ہے مگر ہمارے حکمران طبقوں نے اسلام سے آزادی اور مغربی فکر و فلسفہ کی اتباع کو "آزادئ فکر" کا نام دے رکھا ہے اور مسلمان ممالک کے تمام وسائل اسی مقصد کے لیے صرف ہو رہے ہیں۔ علماء کی بین الاقوامی کانفرنس بلائی جائے یا ہم خیال مسلم حکمرانوں کا کوئی گروپ قائم ہو جائے، اس وقت تک کوئی قدم صحیح سمت نہیں ہوگا جب تک مغرب کی فکری اور تہذیبی غلامی کو مسترد کر کے قرآن و سنت کی بنیاد پر اور خلفائے راشدین کی طرز پر فکری آزادی کا راستہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔

آزادی قرآن و سنت اور اپنے ماضی سے نہیں بلکہ مغرب کی فکری غلامی اور تہذیبی پیروی سے حاصل کرنا ہوگی۔ صدر پرویز مشرف اور صدر یودھویونو عالمِ اسلام کے بڑے لیڈر رہیں، وہ اگر امت

مسلمہ کی صحیح سمت رہنمائی کا عزم کرلیں تو ان کے پاس صلاحیت اور وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن اگر خدانخواستہ ہم خیال حکمرانوں کے نئے گروپ یا بلاک کا نتیجہ بھی مغرب کے فکری اور تہذیبی غلبے کو مضبوط کرنا ہی نکلے تو امت مسلمہ کی اس مزید بد قسمتی پر افسوس کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟

خلافت و امامت اور
حکومتی نظام کی تشکیل کے جدید تقاضے

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد --- ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۷ء

...... اہلِ سنت کے نزدیک یہ نظام ”خلافت“ کے عنوان سے ہے جبکہ اہلِ تشیع اسے ”امامت“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور میرے خیال میں ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ:

1. ”خلافت“ کی بنیاد نامزدگی پر نہیں بلکہ امت کی صوابدید اور اختیار پر ہے، جبکہ ”امامت“ منصوص ہے اور نامزدگی کے ذریعے اس کا تعین ہوتا ہے۔
2. ”خلافت“ کسی خاندان اور نسل میں محدود نہیں، جبکہ ”امامت“ صرف ایک خاندان میں محدود ہے۔
3. ”خلیفہ“ کا دینی درجہ مجتہد کا ہے جس کے فیصلوں اور احکام میں صواب اور خطا دونوں کا احتمال موجود رہتا ہے، جبکہ ”امام“ معصوم ہے، اس کی رائے میں خطا کا احتمال نہیں اس لیے کسی بھی معاملہ اس کی رائے حتمی ہوتی ہے۔
4. ”خلیفہ“ اپنی خلافت میں خدا کی نمائندگی نہیں کرتا، جبکہ ”امام“ خدا کا نمائندہ ہوتا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو خلیفۃ الرسول کہا جاتا تھا۔ قاضی ابو یعلیٰؒ نے ”الاحکام السلطانیہ“ میں روایت نقل کی ہے کہ ایک بار کسی شخص نے حضرت ابوبکرؓ کو یا خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا تو خلیفہ اول نے اسے ٹوک دیا اور فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں بلکہ رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔ میری طالب علمانہ رائے میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں خدا کی نمائندگی کے نام پر کوئی پاپائی اختیارات نہیں رکھتا بلکہ رسول اللہ کے نمائندہ کے طور پر ان کی ہدایات اور تعلیمات کا پابند ہوں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد پہلے خطبہ میں صاف طور پر فرما دیا کہ میں اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسولؐ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت تم پر واجب ہے، اور اگر ایسا نہ

کروں تو میری اطاعت تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔ اسے دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ یہ تھیاکریسی کی نفی تھی اور شخصیت کی بجائے دلیل کی حکومت کے قیام کا اعلان تھا جس سے اسلام کے نظام خلافت آغاز ہوا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اہلِ سنت کے موقف اور روایات کے مطابق) اپنا جانشین نامزد نہیں کیا تھا بلکہ خلیفہ کے انتخاب کو امت کی صوابدید اور اختیار پر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ایک موقع پر خلیفہ نامزد کرنے کا ارادہ فرمایا لیکن پھر یہ کہہ کر ارادہ ترک کر دیا کہ یابی اللہ و المومنون الا ابابکر ابوبکر کے سوا کسی اور کو خلیفہ بنانے سے اللہ تعالیٰ بھی انکار کرتا ہے اور مومنین بھی اس پر راضی نہیں ہوں گے۔ میری طالب علمانہ رائے میں یہ جناب نبی اکرمؐ کی طرف سے امت کی اجتماعی صوابدید پر اعتماد کا اظہار تھا اور حکمت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ کسی کو نامزد کر کے نامزدگی کو ہمیشہ کے لیے قانون نہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر کی خلافت کا فیصلہ عوامی رائے بلکہ اچھے خاصے عوامی بحث و مباحثہ کے بعد ہوا اور اس طرح امت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے حکمران کا خود انتخاب کرے۔

اس کے ساتھ اگر مسلم شریف کی ایک اور روایت کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”تمہارے اچھے حکمران وہ ہیں جو تم سے محبت کریں اور تم ان سے محبت کرو، اور تمہارے برے حکمران وہ ہیں جو تم سے نفرت کریں اور تم ان سے نفرت کرو“۔ اس میں بھی اشارہ ہے کہ حاکم اور رعیت کے درمیان اعتماد کا رشتہ ضروری ہے، البتہ اس اعتماد کے اظہار کی عملی صورت ہر زمانہ کے حوالہ سے مختلف ہو سکتی ہے۔

اس لیے قرآن پاک اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و عمل کے حوالہ سے اسلامی حکومت کی تین بنیادیں نظر آتی ہیں:

1. حکومت کا قیام عوام کی مرضی سے ہوگا۔
2. خلیفہ کو استبدادی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے بلکہ وہ قرآن و سنت کے احکام کا پابند ہوگا۔
3. قرآن و سنت کے صریح احکام کے مقابلہ میں عوامی رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

اس کے ساتھ اگر حضرت ابوبکرؓ کے پہلے خطبہ کا یہ جملہ شامل کر لیا جائے کہ ”اگر میں سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو“ تو اس سے ایک اور اصول بھی اخذ ہوتا ہے کہ:

4. حکومت عوام کے سامنے جوابدہ ہے، اور عوام کو حکومت کے احتساب کا حق حاصل ہے۔

...... میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں حکومتی ڈھانچے اور دستوری نظام کی تشکیل اور قادیانیوں کی حیثیت طے کرنے کے بارے میں ملک کے تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام نے متفقہ طور پر جو فیصلے کیے، وہ اسی رخ پر ہوئے ہیں جن کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا تھا، بلکہ ہم نے تو افغانستان میں طالبان کی امارتِ اسلامیہ قائم ہونے کے بعد وہاں بھی اس بات کے لیے کوشش کی ہے کہ کسی طرح وہاں دستوری حکومت کا کوئی راستہ نکل آئے۔ میں خود ایک دور میں قندھار گیا ہوں، امیر المومنین ملا محمد عمر سے ان کے دور اقتدار میں ملاقات کی ہے اور اگرچہ ان سے براہ راست اس مسئلہ پر بات نہیں ہو سکی، لیکن ان کی شوریٰ کے ذمہ دار حضرات سے میں نے بات کی۔ میں اپنے ساتھ قرارداد مقاصد، علماء کے ۲۲ دستوری نکات اور جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کا ۱۹۷۰ء کا انتخابی منشور لے کر گیا تھا اور میں نے انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ علمائے پاکستان کی طرح قرآن و سنت کی بالادستی کی شرط کے ساتھ عوامی نمائندگی اور دستوری حکومت کا اہتمام کریں، کیونکہ آج کے دور میں کسی حکومت کے جواز کو عالمی سطح پر تسلیم کرانے کے لیے یہ ناگزیر تقاضے ہیں۔ اور چونکہ اس کا تعلق اجتہادی امور سے ہے اور حالات کے مطابق ایسے معاملات میں کوئی بھی مناسب فیصلہ کرنے کی گنجائش موجود ہوتی ہے، اس لیے انہیں اس مشورہ پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ مگر یہ ہماری بدقسمتی تھی یا حالات کا جبر تھا کہ معاملات کو اس رخ پر لانے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

اس کے برعکس ہمارے ایک اور پڑوسی ملک ایران میں جب مذہبی قیادت برسر اقتدار آئی اور ابھی تک برسر اقتدار ہے، اس نے اپنے روایتی موقف کو جدید سیاسی تقاضوں کے سانچے میں ڈھالا، دستوری حکومت اور عوامی نمائندگی کا اہتمام کیا اور باوجودیکہ اہلِ تشیع کا امامت کا سسٹم اہل سنت کے خلافت کے سسٹم کی بہ نسبت زیادہ سخت اور تھیاکریسی کے زیادہ قریب ہے، انہوں نے اسے بھی ”ولایتِ فقیہ“ کے عنوان سے دستوری نظام کا حصہ بنا دیا، اس لیے وہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

دستور کی حد تک پاکستان میں ہم نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور اگر پاکستان اور ایران کے دساتیر کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ایک اسلامی حکومت کے بارے میں اہلِ سنت کے نقطۂ نظر اور اہلِ تشیع کے نقطۂ نظر کا فرق جدید دستوری زبان اور آج کی سیاسی اصطلاحات میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ایران میں چونکہ حکومتی طبقات اور حکومتی نظام چلانے والے افراد اس کے مطابق تعلیم و تربیت بھی رکھتے ہیں، اس لیے انہیں اس کے مطابق ملک کا نظام چلانے میں کوئی دقت پیش نہیں آ رہی، مگر ہمارے ہاں مقتدر طبقات اور اسٹیبلشمنٹ پاکستان اور اس کے دستور کی نظریاتی بنیاد کے حوالے سے ابھی تک

تذبذب اور گومگو کا شکار ہیں، بلکہ عوامی دباؤ کے تحت قبول کیے جانے والے اس دستور اور اس کی اسلامی دفعات سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں، اس لیے پاکستان کا دستور اور اس کی اسلامی دفعات قومی زندگی میں عملی پیشرفت کے مواقع سے ابھی تک محروم ہیں۔......

مولانا جامیؒ اور خواجہ وارثؒ

ماہنامہ قومی ڈائجسٹ، لاہور --- دسمبر ۲۰۰۷ء

...... جلسوں میں بھی جاتا رہا ہوں اور جن حضرات کو بڑے شوق سے سننے جاتا تھا ان میں صاحبزادہ سید فیض الحسن اور مولانا محمد حسین شیخوپوریؒ نمایاں ہیں۔ مولانا شیخوپوری کی تو خیر میں پنجابی سننے جاتا تھا۔ مولانا عبد الرحمان جامیؒ کو بھی بہت سنا ہے اور ان سے باقاعدہ رابطہ رہا۔ مولانا جامیؒ کو میں نے شیعہ حضرات کے جلسے میں بھی سنا ہے جہاں وہ واحد مقرر ہوتے تھے جو کئی گھنٹے بولتے تھے۔ مثلاً اس ماحول میں کہ دسویں محرم کی شب ہے، چوک گھنٹہ گھر ہے، ہزاروں کا مجمع ہے، اور صدارت کی کرسی پر مفتی جعفر حسین بیٹھے ہیں۔ مولانا جامیؒ نے گفتگو کا آغاز ان الفاظ سے کیا کہ "اج میرا دل کردا اے گل اوتھوں شروع کراں جتھوں ٹری سی"۔ (آج میرا جی چاہتا ہے کہ بات وہاں سے شروع کروں جہاں سے چلی تھی)۔ یہ کہنے کے بعد انہوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت اور مظلومیت بیان کی۔ اس موضوع پر ایسے مجمع میں ایک سنی عالم کا بولنا بہت بڑی بات تھی۔ کوئی بیس منٹ کے بعد پھر کہا کہ "چلو ہن کربلاؤں چلیے"۔ (چلو اب کربلا کی طرف چلتے ہیں)۔ تو یہ انداز تھا اس وقت مولانا جامیؒ کی تقریر کا۔ اس زمانے میں ایک دوسرے کے خلاف علماء بولتے تھے، لوگ اعتراض کرتے تھے، رقعے بھی لکھے جاتے تھے، لیکن یہ آج والا فسادی قسم کا ماحول نہ تھا۔......

...... پہلی دفعہ تو میں ۱۹۷۵ء میں گرفتار ہوا تھا۔ گوجرانوالہ میں جمعیۃ علماء اسلام کا آل پاکستان کنونشن ہوا تھا جس میں ہم نے پرائیویٹ شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ اس پر حکومت نے جمعیۃ کی پوری قیادت پر مقدمات بنائے تھے۔ اکتیس علماء پر مقدمے بنے تھے۔ پارٹی نے فیصلہ کر لیا کہ ہم ضمانتیں نہیں کروائیں گے، قبل از گرفتاری ضمانت نہ کروانے کا فیصلہ تھا۔ میں دو ہفتے گرفتار رہا پھر میری ضمانت ہوگئی۔ دوسری دفعہ میں ۱۹۷۶ء میں گرفتار ہوا تھا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر کے ساتھ مسجد نور میں یہ کنونشن ہوا تھا جس میں ملک بھر سے پانچ ہزار علماء نے شرکت کی تھی۔ گوجرانوالہ سے ایک صاحب رانا محمد اقبال اوقاف اور جیل خانہ جات کے وزیر تھے۔ ان ہی دنوں محکمہ اوقاف نے اس

مسجد اور مدرسہ کو اپنی تحویل میں لینے کا اعلان کر دیا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم کے متعلق نوٹیفکیشن جاری ہوگیا۔ اس میں مدرسہ کا نام نہیں لیا گیا تھا بلکہ لکھا تھا کہ مسجد نور مع ملحقہ پینتالیس کمروں کے۔ اس وقت نوید انور نوید گوجرانوالہ کے نوجوان وکیل تھے۔ ہم نے مزاحمت کرنے کا فیصلہ کیا اور احتجاجی تحریک شروع کر دی۔ ساڑھے چار مہینے لگاتار ہم نے تحریک چلائی، ڈیڑھ پونے دو سو ورکر گرفتار ہوئے، میں خود بھی تین مہینے جیل میں رہا، نوید انور نوید مرحوم بھی جیل میں رہے۔۔۔ خواجہ وارث شیعہ رہنما تھے وہ بھی ہماری تحریک میں شامل رہے۔ ہماری مسجد میں جلسہ ہو رہا تھا، رانا اقبال کے خلاف قرارداد پیش کی گئی تو خواجہ صاحب نے اٹھ کر کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں، پھر وہ گرفتار بھی ہوئے۔......

ایران اور فلسطین:
امریکی صدر کا مشرقِ وسطیٰ کا دورہ

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ---فروری ۲۰۰۸ء

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بش مشرقِ وسطیٰ کا دورہ کر کے واپس جا چکے ہیں۔ اس دوران انہوں نے سعودی عرب، کویت، مصر، متحدہ عرب امارات، فلسطین اور اسرائیل وغیرہ کا دورہ کیا اور اسرائیل اور فلسطین کے راہنماؤں سے بھی تبادلہ خیالات کیا۔ ان کے اس دورے کے مقاصد کیا تھے؟ اس کی ایک جھلک بعض عرب اخبارات کے مندرجہ ذیل تبصروں سے دیکھی جا سکتی ہے:

عرب اخبارات کے تبصرے

ایک عرب اخبار ”الحیاۃ“ کا کہنا ہے کہ

”امریکی صدر کا یہ دورہ ایک شہنشاہ کا دورہ تھا۔ مشرقِ وسطیٰ کے کئی ممالک مغربی اور امریکی صدور اور وزرائے اعظم کے نظارے دیکھتے رہتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی مسئلہ فلسطین حل کر سکا ہے اور نہ ہی مشرق اوسط کے عوام کے سنگین مصائب کو کم کر سکا ہے۔ عرب ممالک کے تعلیم یافتہ عوام بادشاہوں اور شہزادوں کے زیر نگیں رہنے کی بجائے جمہوریت کی فضا میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں، لیکن انہیں یہ مواقع فراہم نہیں کیے جا رہے۔ اس کا قصوروار امریکہ بھی ہے۔“

”عرب نیوز“ کا کہنا ہے کہ:

"امریکی صدر کے اس دورے کے دوران مشرق وسطیٰ کے سلگتے مسائل میں سے ایک مسئلہ بھی حل نہیں ہوا ہے اور عراق میں جگہ جگہ لگی ہوئی آگ میں سے کوئی آگ بجھ نہ سکی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے اس دورے کے دوران امریکی صدر ایران کے خلاف شعلہ فشانیاں کرتے رہے، حالانکہ انہوں نے مشرق وسطیٰ کے دورے پر روانہ ہونے سے قبل واشنگٹن میں کہا تھا کہ میں فلسطین کے مسائل کم کرنے کے لیے اسرائیل کو مقبوضات خالی کرنے پر مجبور کروں گا۔ لیکن ایک ہفتہ گزر گیا، امریکی صدر اسرائیلی حکمرانوں کو اس طرف مائل نہ کر سکے۔"

"الشرق الاوسط" نے لکھا ہے کہ

"امریکی صدر جارج بش نے جس بے فکری اور غیر سنجیدگی سے اسرائیل، کویت، فلسطین اور عرب امارات کا دورہ کیا ہے اور آج وہ سعودی عرب آ رہے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پکنک پر آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کسی ایک جگہ بھی درپیش سنگین مسائل کے حل کی طرف توجہ دی، نہ فریقین کو ایک جگہ بٹھانے کا اہتمام ہی کیا..... امریکہ چونکہ اکلوتی سپر پاور ہے اور محض اکلوتی سپر سے تمام تر توقعات وابستہ کیے رکھنا عالمی سطح پر اپنے تعلقات کو گرانے اور زک پہنچانے کے مترادف ہے، عرب ممالک سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے گزشتہ پچاس سال میں صرف امریکہ کو اپنا نجات دہندہ خیال کیا ہے، لیکن یہ خیال بار بار غلط اور غیر مفید ثابت ہوا۔"

"گلف نیوز" کا تبصرہ اس طرح ہے کہ

"مشرقِ وسطیٰ کے اس دورے کے دوران امریکی صدر کی اولین ترجیح ایران رہی ہے۔ وہ ایران کے بارے میں جو پالیسی بیان دیتے رہے، ان سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ یہ دورہ محض ایران کے لیے تھا کیونکہ جن ممالک کا موصوف نے دورہ کیا، ان کے بالکل ہمسائے میں ایران واقع ہے۔ گویا یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ایران کے معاملات سے براہ راست آگاہی حاصل کرنے اور عرب حکمرانوں اور عوام کی نفسیات سے آگاہی کے لیے ہی مشرقِ وسطیٰ کے دورے کا ڈول ڈالا گیا۔...... اگر ایران اس خطہ کے لیے خطرہ ہے بھی تو ہم سعودی عرب کے وزیر خارجہ سعود الفیصل کے اس قول پر عمل کر کے خطرے کا مقابلہ کر سکتے ہیں جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ایران سے ہمارے تعلقات ہیں، ہماری اس کے ساتھ کھلی بول چال ہے، اگر ہمیں اس سے کبھی

خطرہ محسوس ہوا تو ہم ایران سے براہ راست بات چیت کر کے معاملات حل کر لیں گے۔ امریکی صدر نے اس دورہ کے دوران اس خطے کے لیے بار بار انصاف اور آزادی کی بات کی۔ اگر امریکی صدر ان دونوں الفاظ کی معنویت سے آگاہ ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ فلسطین کے مظلوم مسلمانوں کو بھی انصاف اور آزادی فراہم کرنے میں فوری اور طاقت ور امداد دیں۔"

یہ تو وہ تبصرے ہیں جو معروف عرب اخبارات نے امریکی صدر کے دورۂ مشرقِ وسطیٰ کے اہداف اور دورے کے درمیان ان کی سرگرمیوں اور ارشادات کے حوالہ سے کیے ہیں۔

فلسطینیوں پر اسرائیلی جبر وتشدد کا نیا راؤنڈ

اب ایک جھلک اس صورت حال کی بھی دیکھ لی جائے جو ان کے دورے کے فوراً بعد مشرقِ وسطیٰ میں سامنے آئی ہے اور جس نے لاکھوں فلسطینیوں کو اسرائیل کے ہاتھوں جبر اور استبداد کے ایک اور مرحلے سے دوچار کر دیا ہے۔

روزنامہ پاکستان لاہور میں ۲۴ جنوری ۲۰۰۸ء کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق اسرائیل نے مقبوضہ بیت المقدس اور ملحقہ علاقے میں یہودی آبادیوں کے لیے نئے مکانات تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسرائیلی انتظامیہ کے ترجمان نے بتایا کہ آٹھ ہزار میں سے تقریباً اڑھائی ہزار مکانات مشرقی مقبوضہ بیت المقدس اور ملحقہ علاقوں میں بنائے جائیں گے، جبکہ فلسطینی صدر محمود عباس نے اس فیصلے کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہودی بستیوں کی تعمیر سے مشرقِ وسطیٰ میں امن کا عمل متاثر ہو گا۔

روزنامہ پاکستان میں ہی ۱۶ جنوری ۲۰۰۸ء کو شائع ہونے والی خبر کے مطابق غزہ میں اسرائیلی فوج کی تازہ کارروائی میں جاں بحق ہونے والے فلسطینیوں کی تعداد سترہ ہو گئی ہے جن میں حماس کے ایک اہم رہنما اور سابق وزیر خارجہ محمود الزہار کا بیٹا بھی شامل ہے۔ اس کارروائی کے بعد اسرائیلی فوج اور فلسطینیوں کے درمیان فائرنگ کے تبادلے میں چالیس دیگر شہری بھی زخمی ہوئے ہیں۔ اخباری اطلاعات کے مطابق اسرائیل نے غزہ کی ناکہ بندی کر رکھی ہے جس سے نہ صرف بجلی بلکہ خوراک کی ترسیل کا نظام بھی بری طرح متاثر ہوا ہے اور عالمی رائے عامہ کے مسلسل احتجاج کے باوجود اسرائیل ابھی تک اس ناکہ بندی میں نرمی کرنے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ پاکستان میں ۲۴ جنوری کو شائع ہونے والی خبر کے مطابق اسرائیلی وزیر اعظم ایہود اولمرت نے کہا ہے کہ اگر فلسطینی عوام امن چاہتے ہیں تو حماس کے خلاف بغاوت کریں اور ان کے تحفظ کا ایک ہی راستہ ہے کہ فلسطین سے عسکریت پسندی کا

خاتمہ کر دیا جائے۔ اسرائیلی وزیراعظم نے یہ بھی کہا ہے کہ غزہ کے شہری اگر اسرائیل پر حملہ کرتے ہیں تو وہ گاڑیوں کے بجائے پیدل چلیں، روشنی کی بجائے اندھیرے میں رہیں اور بھوک وافلاس سے مرتے رہیں۔

یہ ہے ایک منظر امریکی صدر کے دورۂ مشرق وسطیٰ اور اس کے فوراً بعد رونما ہونے والی صورت حال کا، جبکہ امریکہ دنیا کو یہ تاثر دینے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے کہ وہ مشرقِ وسطیٰ میں امن کی بحالی اور ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کے لیے کام کر رہا ہے اور صدر بش چاہتے ہیں کہ ان کا دور اقتدار ختم ہونے سے پہلے آزاد فلسطینی ریاست کے اعلان کی کوئی شکل سامنے آجائے۔

مسئلہ فلسطین: لبنان میں برطانوی سفیر کا اعترافِ حقیقت

اس پس منظر میں اس حوالے سے ایک اور رپورٹ پر بھی نظر ڈال لی جائے جو نئی دہلی سے شائع ہونے والے سہ روزہ ''دعوت'' نے ۷ جنوری ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں شائع کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ گزشتہ دنوں لبنان میں برطانیہ کی سفیر محترمہ فرانسز گائی نے ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ

> ''فلسطین میں ہمارے پیش رووں نے جو غلطیاں کی ہیں ان کو سدھارنا ہمارے لیے ناممکن ہے، لیکن عدل وانصاف پر مبنی امن وسلامتی کے لیے کوشش کرنا ہمارے لیے یقیناً ممکن ہے، تاہم مسئلہ یہ ہے کہ برطانیہ کو ایک مؤثر طاقت نہیں سمجھا جاتا۔''

اب اس بات کی وضاحت محترمہ فرانسز گائی ہی کر سکیں گی کہ ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کیے بغیر ''عدل وانصاف'' پر مبنی امن وسلامتی کے قیام کے لیے ان کے پاس کون سا فارمولا ہے، البتہ اس حوالے سے ان کا یہ خیال توجہ طلب ہے کہ

> ''دیگر ممالک کے حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ فلسطین کا دورہ وہاں کے عوام کی ذلت و خواری کو دیکھنے اور سمجھنے کی نیت سے اور اس نیت سے کریں کہ ایسی پالیسی اختیار کی جا سکے جس سے اہل فلسطین اس صورت حال سے باہر آجائیں۔''

مشرقِ وسطیٰ کی صورت حال پر یہ تبصرہ کسی عرب راہنما یا فلسطینی لیڈر کا نہیں بلکہ برطانیہ کی ایک سفارت کار خاتون کا ہے جسے سامنے رکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ اور اس کی قیادت میں مغربی حکمران مشرقِ وسطیٰ میں صرف ایسا امن چاہتے ہیں جس میں اسرائیل کے اب تک کے تمام اقدامات اور اس کے موجودہ کردار کو جائز تسلیم کر لیا جائے اور اس کی بالادستی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے فلسطینی عوام خود کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں۔ اور اسرائیل جو کچھ بھی کرے، فلسطینی

عوام اس کے خلاف کسی بھی قسم کی مزاحمت سے ہمیشہ کے لیے دست برداری کا اعلان کر دیں۔ اگر صدر بش فلسطینیوں کو امن و سلامتی کے اسی نکتے پر لانا چاہتے ہیں تو ایسا ہونا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ قوموں کو اس طرح دبانے اور دبائے رکھنے کی کوئی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوا کرتی اور آزادی، خود مختاری اور اقوام عالم میں باوقار حیثیت دنیا میں ہر قوم کی طرح فلسطینیوں کا بھی حق ہے جو جلد یا بدیر وہ ان شاء اللہ تعالیٰ حاصل کر کے رہیں گے۔

اہل السنۃ والجماعۃ کا معیار

روزنامہ اسلام، لاہور ---۲۱ مئی ۲۰۰۸ء

......قرآن و حدیث کے بیان کردہ عقائد پر عقلی بحث و مباحثہ اور ان کی عقلی توجیہات و تعبیرات کے نتیجے میں اس دور میں جو فرقے وجود میں آئے، ان میں معتزلہ، جبریہ، قدریہ، مرجئہ، خوارج، اہلِ تشیع اور اہلِ سنت وغیرہ کے نام معروف ہیں۔ ان میں سے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع اب تک اپنے پورے تعارف کے ساتھ موجود چلے آرہے ہیں جبکہ باقی فرقوں کا اپنے نام اور تعارف کے ساتھ وجود نظر نہیں آتا، البتہ ان کا ذہن اور سوچ کا انداز مختلف حوالوں سے اب بھی اس سابقہ تعارف اور تشخص کے بغیر امت میں پایا جاتا ہے۔

ان میں سے اہل السنۃ والجماعۃ خود کو امت کا اجتماعی دھارا قرار دیتے ہیں جن کی بنیاد دو اصولوں پر ہے:

1. ایک یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دینیات بالخصوص عقائد کی کیا صورت ارشاد فرمائی ہے۔
2. اور دوسری یہ کہ صحابہ کرامؓ نے اجتماعی طور پر اسے کیسے سمجھا ہے؟

اہلِ سنت کے نزدیک یہی وہ دو معیار ہیں جن کی بنیاد پر عقیدہ سمیت دین کی کسی بھی بات کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور اسی وجہ سے وہ اہل السنۃ والجماعۃ کہلاتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے مقدمہ میں اہلِ سنت کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اہلِ سنت وہ ہیں جو قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر اسی صورت میں ایمان رکھتے ہیں جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے۔ اور وہ ان ارشادات کی عقلی توجیہ کو ضروری نہیں سمجھتے اور نہ ہی عقلی توجیہ و تعبیر کو قرآن و سنت کے کسی فرمان پر یقین کا معیار تصور کرتے ہیں، البتہ جہاں کسی عقیدہ کی وضاحت یا کسی عقلی سوال کے جواب کے لیے ضرورت

محسوس کرتے ہیں، وہاں وضاحت کی حد تک اس عقلی بحث و مباحثہ کو ناجائز بھی نہیں سمجھتے اور ضرورت کے مطابق اس مباحثہ میں شریک ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ قرآن و سنت کی تصریحات کو ان کی ظاہری صورت میں تسلیم کرنے والے تمام لوگ اہلِ سنت ہیں، البتہ ظاہری صورت پر فی الجملہ ایمان رکھنے کے بعد اس کی تعبیر و توضیح میں اختلافات خود اہلِ سنت کے اندر بھی موجود ہیں اور ایسے کسی اختلاف سے کوئی شخص اہلِ سنت کے دائرے سے خارج نہیں ہوتا۔

اہلِ سنت کے دائرے میں عقائد کی ایسی تعبیرات، تشریحات، توجیہات اور توضیحات کے حوالے سے جو مختلف مکاتبِ فکر موجود چلے آ رہے ہیں، ان میں اشاعرہ، ماتریدیہ اور ظواہر کے گروہ متعارف ہیں جو امام ابوالحسن اشعری، امام ابو منصور ماتریدی اور امام ابن حزم ظاہری کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں عقائد کی تعبیر و تشریح کرتے ہیں اور بہت سے امور میں ان کے درمیان اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔......

دہشت گردی کے محرکات کی نشاندہی کی ضرورت

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۰ جون ۲۰۰۹ء

...... گزشتہ روز مجھے جامعہ نعیمیہ لاہور میں ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمیؒ کی شہادت کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے ایک تعزیتی ریفرنس میں شرکت کا موقع ملا، اس موقع پر میں نے جو گزارشات پیش کیں ان کے اہم پہلو درج ذیل ہیں۔

دہشت گردی ہمارے ہاں ایک عرصہ سے جاری ہے۔ ایک زمانے میں اس کا بازار زبان کے مسئلہ پر گرم ہوا، پھر اس نے سنی شیعہ کشمکش کے حوالہ سے دونوں طرف کے سینکڑوں لوگوں کا خون بہایا، یہ دہشت گردی قومیت کے نام پر بھی ہوئی جواب تک جاری ہے، اور اب یہ دہشت گردی نفاذِ شریعت کے نام پر نظر آ رہی ہے۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ ہم اس ہاتھ کو پہچانیں اور اسے بے نقاب کریں جو ہمیں کسی نہ کسی حوالہ سے لڑاتا رہتا ہے اور اپنے مقاصد پورے کرتا ہے۔ یہ ہاتھ جب تک بے نقاب نہیں ہوگا، دہشت گردی کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا اور یہ خفیہ ہاتھ کسی نہ کسی بہانے ہمارے ہاتھوں ہماری گردنیں کٹواتا رہے گا۔

میرے نزدیک اس وقت ہماری سب سے بڑی قومی ضرورت یہ ہے کہ دہشت گردی کے محرکات

اور اسباب و عوامل کی نشاندہی کی جائے اور ایک وائٹ پیپر کی صورت میں قوم کو بتایا جائے کہ زبان، قومیت، فرقہ واریت، اور نفاذِ شریعت کے نام پر ہونے والی اس دہشت گردی کے پیچھے کون ہے اور اس کے حقیقی اسباب و عوامل کیا ہیں؟ اس کے لیے ایک آزاد کمیشن قائم کیا جائے جو کہ حکومت کو بنانا چاہیے۔ اگر حکومت نہ بنائے تو سپریم کورٹ یہ کمیشن بنائے۔ اور اگر وہ بھی نہ بنائے تو کسی آزاد فورم کو یہ کمیشن بنانا چاہیے جو معروضی حقائق کا جائزہ کر قوم کو اعتماد میں لے اور اصل محرکات کو بے نقاب کرے۔......

مسلکی اختلافات اور اجتماعی قومی تقاضے:
امامِ اہلِ سنت ؒ کا طرز عمل

روزنامہ اسلام، لاہور ---۲۷ جون ۲۰۰۹ء

......میں اس موقع پر دو باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں:

ایک یہ کہ مسلکی اختلافات زندگی بھر حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا موضوع گفتگو رہے ہیں کہ انہوں نے مسلک کے ہر پہلو پر لکھا ہے اور بیان بھی کیا ہے۔ دیوبندی بریلوی اختلافات ہوں، سنی شیعہ کشمکش ہو، حنفی اہل حدیث تنازعات ہوں، حجیتِ رسول کا مسئلہ ہو، یا حیات و ممات اور سماع اموات کا عنوان ہو، ان میں سے شاید ہی کوئی موضوع ایسا باقی رہا ہو جس پر انہوں نے لکھا اور بیان نہ کیا ہو۔ انہوں نے مسلکی موضوعات پر لکھا اور خوب لکھا بلکہ حق ادا کر دیا۔ لیکن پبلک اجتماعات میں وہ ان موضوعات پر خطاب نہیں کرتے تھے۔ کسی بیان میں ضمناً کوئی بات آ گئی تو مسئلہ کی وضاحت کی حد تک ان کا بیان دوٹوک ہوتا تھا لیکن کسی اشد مجبوری کے بغیر کسی اختلافی مسئلہ کے موضوع پر عام اجتماعات میں وہ بیان نہیں کیا کرتے تھے۔ اختلافی مسائل پر وہ کتابوں کی صورت میں اظہار خیال کرتے تھے، سبق میں تفصیل سے بحث کرتے تھے اور درس میں بھی مسائل کی وضاحت دلائل کے ساتھ کیا کرتے تھے لیکن عام اجتماعات میں، پبلک جلسوں میں، حتیٰ کہ جمعۃ المبارک کے خطبات میں بھی ان کی گفتگو کے عنوانات اصلاحی ہوتے تھے۔ عقائد کی اصلاح، سنت کی اہمیت، دین کی اہمیت، حلال و حرام کا فرق، اور عادات و اخلاق کی اصلاح ان کی عوامی تقریروں کے موضوعات ہوتے تھے اور اس دوران ضمناً کوئی اختلافی مسئلہ آ جاتا تو اس کی وضاحت بھی کر دیا کرتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ انہوں نے دین کے کم و بیش ہر شعبہ میں کام کیا ہے اور خدمات سرانجام دی ہیں

لیکن جن دو مسئلوں کے لیے جیل کاٹی ہے وہ تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت اور ملک میں نفاذِ شریعت کا نفاذ ہے۔ تحریکِ ختمِ نبوت کے لیے انہوں نے ۱۹۵۳ء میں کم و بیش دس ماہ جیل کاٹی، جبکہ نفاذِ شریعت کے لیے وہ ۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے دوران نہ صرف جیل میں گئے اور مظاہروں کی قیادت کی بلکہ اپنا سینہ گولی کے لیے پیش کیا۔ اور یہ دونوں قربانیاں انہوں نے مشترکہ پلیٹ فارموں پر دی ہیں۔ ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں کل جماعتی ایکشن کمیٹی کے سربراہ بریلوی مکتبِ فکر کے بزرگ عالمِ دین مولانا سید ابوالحسنات قادری تھے اور اس میں دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث اور شیعہ علماء بھی شریک تھے۔ جبکہ ۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کی قیادت مولانا مفتی محمودؒ نے کی اور اس میں بھی تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام اور کارکن شریک تھے۔

مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی تحریکی اور مسلکی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے میں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اس بات کی بطور خاص تلقین کیا کرتے تھے کہ اپنے مسلک اور موقف پر مضبوطی سے قائم رہیں اور اکابر کا دامن کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں لیکن زبان اور لہجہ ہمیشہ نرم رکھیں، دلیل سے بات کریں اور سختی و تشدد سے گریز کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں حضرت امام اہلِ سنتؒ کی دینی جدوجہد کے مختلف دائروں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی ترجیحات اور اسلوب کی بھی پاسداری کرنی چاہیے۔

علامہ علی شیر حیدری شہیدؒ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۸ اگست ۲۰۰۹ء

۱۷ اگست کو صبح ڈیٹرائٹ (مشی گن، امریکہ) کی مسجد بلال میں فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد واشنگٹن واپسی کے لیے ایئرپورٹ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ مولانا قاری محمد الیاس نے اطلاع دی کہ علامہ علی شیر حیدریؒ کو شہید کر دیا گیا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ مسجد میں آنے سے پہلے انٹرنیٹ پر جنگ اخبار دیکھ کر آئے تھے جس کی اس دن پہلی خبر یہی تھی۔ واشنگٹن پہنچ کر انٹرنیٹ کے ذریعہ ہی تفصیلات معلوم کیں، بے حد صدمہ ہوا۔ وہ تحفظ ناموس صحابہؓ اور اہلِ سنت کے عقائد و حقوق کے دفاع کے محاذ کے ایک اہم راہنما تھے جن کی پوری زندگی اسی مشن میں گزری اور بالآخر حضرات صحابہ کرامؓ کے ناموس کے تحفظ کی جنگ لڑتے ہوئے انہوں نے اپنے پیش رو راہنماؤں کی طرح جام شہادت نوش کر لیا۔

اہل السنۃ والجماعۃ کی اساس قرآن کریم کے بعد سنت رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کے تعامل پر ہے۔ اسی

لیے وہ اہل السنۃ والجماعۃ کہلاتے ہیں۔ چنانچہ دین کی تعبیر وتشریح میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم کے اساسی مقام اور ان کے ناموس و حرمت کا تحفظ و دفاع ان کے فرائض کا حصہ ہے جس کے لیے مختلف حوالوں سے جدوجہد کا سلسلہ قرنِ اول سے جاری ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا ارشاد گرامی ہے کہ

"تم میں سے جو شخص کسی کی اقتداء کرنا چاہتا ہے تو اس کی اقتداء کرے جو فوت ہو چکا ہے اس لیے کہ زندہ شخص کسی وقت بھی فتنہ میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ وہ اقتداء کے قابل لوگ اصحاب محمدؐ ہیں جو سب سے زیادہ نیک دل ہیں، گہرے علم والے ہیں، اور سب سے کم تکلف والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبیؐ کی صحبت و رفاقت کے لیے او راپنے دین کی امامت کے لیے چنا ہے، پس ان کے نقش قدم پر چلو اور ان کے طریقوں کی پیروی کرو کیونکہ وہی ہدایت اور صراط مستقیم پر ہیں"۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا یہ ارشاد گرامی اہلِ سنت کے عقیدہ وعمل کی اساس ہے اور اسی کو وہ حق اور ہدایت کا معیار سمجھتے ہیں۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے تمام طبقات مثلاً مہاجرین، انصار، اہل بیت، ازواج مطہرات، اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے صحابہؓ کے ساتھ یکساں محبت وعقیدت کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان حفظ و مراتب اور درجات فضیلت کا لحاظ رکھنا بھی اہلِ سنت کے جذبات ایمانی کا حصہ ہے۔ اس سلسلہ میں کسی بھی افراط وتفریط سے گریز کو وہ اپنے ایمان کا تقاضا سمجھتے ہیں اور بوقت ضرورت اس کے اظہار کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

حضرات صحابہ کرامؓ چونکہ قرآن و سنت کی صحیح تعبیر وتشریح کا معیار ہیں اس لیے ان کی حرمت و عدالت کو مجروح ہونے سے بچانا اور ان کی ثقاہت و صداقت کو شک و شبہ سے بالاتر سمجھنا بھی اس کا ناگزیر تقاضا ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کے ناموس اور عدالت کے دفاع وتحفظ کو اہلِ سنت نے ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں میں شمار کیا ہے۔ ایک راویت میں ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے سرکاری طور پر بعض علمائے کرام کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ مسجدوں میں بیٹھ کر لوگوں کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سنایا کریں اور صحابہ کرامؓ کے مناقب اور فضائل ان کے سامنے بیان کیا کریں۔

اسی بنا پر صحابہ کرامؓ کی توہین وتنقیص اور ان پر ایسی جرح وتنقید کو، جس سے ان کے ایمان و عدالت اور مقام صحابیت پر زد پڑتی ہو، ہمیشہ گمراہی کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ امام ابو زرعہ رازیؒ کا کہنا ہے کہ

"جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی کی توہین وتنقیص کر رہا ہے تو

سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کرامؓ قرآن کریم کے نزول اور جناب رسول اللہؐ کی سنتوں کے گواہ ہیں اور گواہوں کو مجروح کرنے والے دراصل دین کا اعتماد ختم کرنا چاہتے ہیں"۔

عقائد اہلِ سنت اور ناموس صحابہ کرامؓ کے تحفظ و دفاع کا یہی مشن ہے جس کے لیے ماضی میں برصغیر پاک و ہند میں حضرت مجدد الف ثانی، حضرت امام ولی اللہ دہلوی، حضرت مرزا مظہر جان جاناں، حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور دیگر اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ مصروف کار رہے ہیں۔ جبکہ زمانۂ قریب میں مولانا عبد الشکور لکھوی، مولانا نور الحسن شاہ بخاری، مولانا دوست محمد قریشی، مولانا قاضی مظہر حسین، اور سردار احمد خان پتانی رحمہم اللہ جیسے بزرگوں نے زندگیاں کھپا دی ہیں۔ اور اسی قافلہ کی باقیات صالحات میں سے حضرت علامہ عبد الستار تونسوی اور حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت کے ساتھ تا دیر سلامت رکھیں، آمین یارب العالمین۔

ان بزرگوں کا طریق کار علمی، تحقیقی، اور دفاعی تھا جس میں تحریکی اور اقدامی عنصر کا اضافہ کرتے ہوئے گزشتہ تین عشروں کے دوران مولانا حق نواز شہیدؒ اور ان کے رفقاء "سپاہ صحابہ" کے نام سے سامنے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس مشن کو ملک گیر عوامی تحریک کی شکل دے دی۔ مولانا حق نواز جھنگوی شہیدؒ اور ان کے قریبی رفقاء مثلاً مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی شہیدؒ اور مولانا ایثار القاسمی شہیدؒ بنیادی طور پر جمعیۃ علمائے اسلام سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی جماعتی زندگی کا ایک بڑا حصہ جمعیۃ علمائے اسلام کے پلیٹ فارم پر نفاذِ شریعت کی جدوجہد میں گزرا۔ مگر جھنگ کے مخصوص ماحول نے مولانا حق نواز جھنگویؒ کی توجہ کو تحفظ ناموس صحابہؓ کی جدوجہد کی طرف مبذول کیا تو وہ اس کی طرف مسلسل بڑھتے چلے گئے اور اپنے ہم ذوق دوستوں کا ایک قافلہ تشکیل دیا جس نے سپاہ صحابہؓ کے نام سے پورے ملک میں صحابہ کرامؓ کی ناموس و حرمت پر مر مٹنے کا جذبہ و نعرہ کی گونج پیدا کی اور قربانیوں اور شہادتوں کی لائن لگا دی۔ دینی تحریکوں کو یہ رنگ دینے کے طریق کار سے ہمیں کبھی اتفاق نہیں رہا، ہم نے ان بزرگوں کے طریق کار کو ہی صحیح سمجھا جن کا ہم سطور بالا میں تذکرہ کر چکے ہیں اور ہم نے اس کا خود مولانا حق نواز جھنگوی شہیدؒ کے ساتھ براہ راست ملاقاتوں میں بھی اظہار کیا ہے۔ لیکن اس مقصد کے لیے مولانا حق نواز جھنگویؒ اور ان کے رفقاء و کارکنوں کا جذبہ و خلوص اور ایثار و قربانی ہمیشہ شک و شبہ سے بالاتر رہے ہیں اور اپنے مشن کے ساتھ بے لچک کمٹمنٹ اور اس پر کٹ مرنے کے جذبہ کو ہم نے ہمیشہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

مولانا حق نواز جھنگویؒ، مولانا ایثار القاسمیؒ، مولانا ضیاء الرحمٰنؒ فاروقی، اور مولانا محمد اعظم طارقؒ کے بعد علامہ علی شیر حیدریؒ اس قافلہ کے سالار تھے۔ وہ ایک کہنہ مشق استاد، نکتہ رس خطیب، صاحب علم مناظر، مدبر راہنما، اور پرجوش قائد تھے۔ انہوں نے اپنے پرجوش قافلہ کی جرأت مندانہ راہنمائی کے ساتھ ساتھ اپنے موقف کی جس طرح علم واستدلال کے ساتھ عوامی اور علمی حلقوں میں ترجمانی کی ہے اسے ان کے امتیازی وصف کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ وہ صرف عوامی اسٹیج کے آدمی نہیں تھے بلکہ کتاب وعلم کے ساتھ بھی ان کا گہرا رشتہ تھا۔ اس لیے ان کی شہادت ہمارے لیے دوہرا صدمہ ہے کہ خطابت وتحریک کی دنیامیں علم وکتاب سے تعلق رکھنے والے لوگ بتدریج کم ہوتے جا رہے ہیں۔

مجھے علامہ علی شیر حیدریؒ کے ساتھ زیادہ ملاقاتوں اور تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ملا۔ ان کی خواہش رہی ہے کہ میں کبھی دو چار روز ان کے پاس جامعہ حیدریہ خیرپور میں رہوں۔ میرا بھی جی چاہتا تھا اور ایک آدھ بار پروگرام بنانے کا ارادہ بھی کیا مگر مقدر میں نہ تھا اس لیے خواہش ادھوری رہی۔ البتہ مختلف جلسوں میں ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک بار ہمارے پاس گوجرانوالہ بھی تشریف لائے مگر تفصیلی گفتگو نہ ہوسکی۔ غالباً آخری ملاقات کڑیانوالہ ضلع گجرات کے ایک جلسہ میں ہوئی۔ وہ خالصتاً ناموس صحابہ کرامؓ کے تحفظ و دفاع کی جدوجہد کے آدمی تھے۔ انہوں نے اس کے لیے شب و روز محنت کی ہے، ہزاروں افراد کی ذہن سازی کی ہے، اور ہزاروں کارکنوں کو اس کے لیے تیار کیا ہے۔ ان کے طریق کار سے اختلاف کی گنجائش تھی لیکن ان کی شبانہ روز محنت، اپنے مشن کے ساتھ والہانہ وابستگی، اور ایثار و قربانی کا ایک طویل عرصہ ہم سب کے لیے قابل رشک ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور جملہ پسماندگان اور متوسلین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

شدت پسندی اور کشمکش کا ماحول: عالمی قوتوں کی ضرورت

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۰۹ء

...... نائن الیون کے بعد افغانستان میں امریکی اتحاد کی فوجیں آئیں اور طالبان کی حکومت ختم ہوئی تو مجاہدین کے مختلف گروپوں میں اشتعال کا بڑھنا اور ان میں باہمی تعاون اور ہم آہنگی کا فروغ بھی ایک فطری امر تھا جس کا سب سے زیادہ اثر پاکستان کی داخلی صورتحال پر پڑا۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عالمی

قوتوں اور پاکستان کی رولنگ کلاس نے مشترکہ طور پر اس مرحلے میں یہ حکمتِ عملی طے کر لی کہ مجاہدین کے مختلف گروپوں کی شدت اور اشتعال کو کم کرنے کی کوششوں کی بجائے علاج بالمثل کے طور پر اسے مزید بڑھانے کا ماحول پیدا کیا جائے اور وقفہ وقفہ سے مختلف علاقوں میں انہیں اشتعال دلا کر سامنے لایا جائے اور پھر اجتماعی کارروائی کے ساتھ انہیں کچل دیا جائے۔ سوات اور وزیرستان میں یہی کچھ ہوا ہے اور اب جنوبی پنجاب میں اسی قسم کی صورتحال پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ہمارے خیال میں پاکستان میں شدت پسندی اور اس کے ذریعے مختلف طبقات کے درمیان کشمکش کا یہ ماحول اس پس منظر سے ہٹ کر بھی بعض عالمی اور علاقائی قوتوں کی ضرورت ہے جس کے لیے وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ یہ مسلح شدت پسندی اور دہشت گردی کراچی میں قومیت اور زبان کے حوالے سے اپنا کام دکھا چکی ہے، بلوچستان میں یہی ایجنڈا قومیت کے نام سے پیشرفت کر رہا ہے، سوات اور وزیرستان میں اس نے شریعت کے نفاذ کا عنوان اختیار کیا ہے، سنی اور شیعہ مسلح تصادم کے پیچھے یہی بیرونی مفادات کار فرما ہیں، اور اب دیوبندی بریلوی کشمکش کو فروغ دے کر پنجاب میں یہ صورتحال پیدا کرنے کی کوشش میں بھی یہی عوامل متحرک دکھائی دیتے ہیں۔

...... دینی مدارس کی بنیاد چونکہ مسلکی ترجیحات پر ہے اس لیے دوسرے مسالک اور مذاہب کے بارے میں عدم برداشت کی فضا مدارس میں بہرحال موجود ہے، جو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے اور دینی قوتوں کی اجتماعیت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ لیکن کیا اس سے دہشت گردی نے جنم لیا ہے؟ یہ سوال توجہ طلب ہے۔ اس لیے کہ دینی مدارس میں سب سے زیادہ نفرت قادیانیوں کے خلاف پائی جاتی ہے لیکن دینی مدارس کے اساتذہ و طلبہ نے ان کے خلاف کبھی مسلح جدوجہد نہیں کی، بلکہ قادیانیوں کے خلاف نفرت کے اظہار اور حکومت سے ان کے بارے میں اپنے مطالبات منوانے کے لیے ہمیشہ پُرامن تحریک کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اسی طرح دینی مدارس میں دیوبندی بریلوی اختلافات اور حنفی اہلحدیث کشمکش بھی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے لیکن اس نے کبھی مسلح تصادم کی شکل اختیار نہیں کی۔ اس لیے سنی اور شیعہ گروہوں کے درمیان مسلح ٹکراؤ یا اس طرح کی شدت پسندی کے دیگر مظاہر کی جڑیں دینی مدارس کی بجائے کہیں اور تلاش کرنا ہوں گی اور اس کے لیے دینی مدارس کو ذمہ دار قرار دینا حقیقت پسندانہ بات نہیں ہوگی۔

نیز یہ بھی ایک معروضی حقیقت ہے کہ دینی مدارس کے مختلف مکاتبِ فکر کے الگ الگ وفاقوں کے باہمی میل جول اور بہت سے امور میں مشترکہ پالیسیوں اور موقف کے اظہار کے بعد دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کے مابین عدمِ برداشت کی شدت میں مسلسل کمی آرہی ہے اور دن بدن فضا پہلے

سے بہتر ہو رہی ہے۔ متعدّد دینی تحریکات میں مختلف مکاتبِ فکر کے طلبہ نے مشترکہ جدوجہد کی ہے۔ اس لیے مختلف مکاتبِ فکر کے دینی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ کے درمیان باہمی عدمِ مفاہمت اور عدمِ تعاون کی وہ فضا اگر موجود ہے جسے عدمِ برداشت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس میں بتدریج سست رفتار بہتری کے آثار سامنے آ رہے ہیں، لیکن اسے دہشت گردی کا باعث قرار دینے کا بہرحال کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں دینی مدارس کے وفاقوں کو اس سلسلے میں کردار ادا کرنا ہوگا کہ جس طرح وہ اعلیٰ سطح پر باہمی ملاقاتوں، مفاہمت اور تعاون کا اہتمام کرتے ہیں، اسی طرح مدارس کے اساتذہ اور طلبہ تک بھی اس کا دائرہ وسیع کریں۔......

دینی جدوجہد کے عصری تقاضے اور مذہبی طبقات

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ---فروری ۲۰۱۰ء

متحرک جماعتی زندگی سے کنارہ کشی کے بعد گزشتہ دو عشروں سے راقم الحروف دینی جدوجہد کے عصری تقاضوں اور دینی جماعتوں اور طبقات کی ذمہ داریوں کے حوالے سے کچھ نہ کچھ گزارشات پیش کر رہا ہے۔ معروضی حالات کے تناظر میں اس ”صدائے فقیر“ کے بعض پہلوؤں کو یہاں دہرانا مناسب معلوم ہوتا ہے:

- پاکستان میں نفاذِ شریعت کے لیے صرف سیاسی اور پارلیمانی جدوجہد کافی نہیں ہے بلکہ پبلک دباؤ اور عوامی قوت بھی اس کی ناگزیر ضرورت ہے، اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کی طرح غیر سیاسی دینی قوتیں اور جماعتیں بھی میدان میں متحرک رہیں۔ بالخصوص اس وقت ایک نئی دینی جماعت کی ضرورت ہے جو غیر سیاسی ہو اور مختلف مکاتبِ فکر کی نمائندگی کرتی ہو۔ ”غیر سیاسی“ سے میری مراد یہ ہے کہ وہ جماعت ووٹ، الیکشن، اور اقتدار کی سیاست سے الگ رہے۔ پاور پالیٹکس کا حصہ بننے کی بجائے مشترکہ دینی، ملی اور قومی مقاصد کے لیے تحریکی انداز میں کام کرے۔ اور رائے عامہ، عوامی دباؤ، اور اسٹریٹ پاور کے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کرے جو دینی تحریکات کی اصل قوت ہوا کرتی تھی اور جو ہم نے خاصی حد تک کھو دی ہے۔
- دینی جماعتوں اور حلقوں کے درمیان کشمکش اور ایک دوسرے کے کام کی نفی اور استخفاف و استحقار کا روز افزوں ذوق و مزاج ہمارے لیے زہرِ قاتل ہے۔ اس کی حوصلہ شکنی ضروری ہے

اور دینی جدوجہد کو صحیح رخ پر آگے بڑھانے کے لیے انتہائی درجہ میں لازم ہے کہ ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کیا جائے، ایک دوسرے کے کام کا احترام کیا جائے، اور باہمی مشاورت، مفاہمت اور تعاون کی فضا قائم کی جائے۔

- ہماری دینی جدوجہد خصوصاً نفاذِ اسلام کی تحریک کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اس سلسلے میں کام کرنے والی بہت سی جماعتیں مسلکی دائروں میں محدود ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک خاص حد سے آگے بڑھ نہیں پا رہیں۔ میں اس سلسلے میں یہ حوالہ دینا چاہوں گا کہ انقلاب ایران کے بعد مجھے علماء کرام اور وکلاء کے ایک وفد کے ساتھ ایران جانے کا موقع ملا جس میں مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور حافظ حسین احمد بھی شامل تھے۔ یہ ۱۹۸۷ء کی بات ہے۔ اس موقع پر ایک مجلس میں یہ سوال سامنے آیا کہ کیا پاکستان میں کوئی عالمِ دین اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ خمینی صاحب کی طرح ایک عوامی انقلاب کی قیادت کر سکے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک نہیں بلکہ ہمارے پاس دو شخصیات ایسی موجود تھیں جو خمینی بن سکتی تھیں۔ ۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفی کے بعد مولانا مفتی محمودؒ یا مولانا شاہ احمد نورانیؒ میں سے جو بھی آگے بڑھتا، قوم اس کو خمینی کا مقام دینے کے لیے تیار ہوتی، مگر مصیبت یہ ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ آگے بڑھتے تو مولانا شاہ احمد نورانیؒ کے پیروکاران کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے اور اگر مولانا شاہ احمد نورانیؒ پیشرفت کرتے تو یہ بات مولانا مفتی محمودؒ کے پیروکاوں کے لیے قابل قبول نہ ہوتی۔
- ہمارے ہاں نفاذِ اسلام کی جدوجہد کا گیئر ہمیشہ اس مقام پر آکر پھنس جاتا ہے۔ یہ ایک معروضی حقیقت ہے جس کی جتنی بھی تاویل کر لی جائے مگر اس کے وجود سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے میرے نزدیک کسی دینی جدوجہد یا تحریک کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلکی ترجیحات سے بالاتر ہو اور اس کے لیے میرے خیال میں قیامِ پاکستان سے پہلے کی "مجلسِ احرارِ اسلام" ایک اچھی مثال ہے کہ مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام اور دیگر طبقات کے اہلِ دانش نے مل کر ایک جماعت تشکیل دی اور مسلکی ترجیحات سے بالاتر ہو کر ملی و قومی مقاصد کے لیے عوامی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔
- ہمارے دینی مدارس فکری تربیت کے حوالے سے بانجھ ہو چکے ہیں اور وہ فضا اب کسی حد تک بھی موجود نہیں ہے جو اب سے تیس برس پہلے تک مدارس میں فکری، اخلاقی بلکہ دینی تربیت کے حوالے سے دکھائی دیتی تھی۔ ہمارے طلبہ بلکہ مدرسین کی اکثریت کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ہماری ماضی قریب کی دینی و ملی تحریکات کن مقاصد کے لیے تھیں، جنگِ آزادی میں کون کون

سے حضرات نے قائدانہ کردار ادا کیا، اور دیگر ملی تحریکات کے اہداف کیا تھے۔ ہمارے مدارس میں ذہنی تیاری اور فکری تربیت کے دائرے محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے ہیں جس سے کنفیوژن اور ذہنی انتشار بڑھتا جا رہا ہے، اور اسی کنفیوژن اور ذہنی انتشار سے بہت سی پس پردہ قوتیں مسلسل ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ یہ مسئلہ بڑے دینی مدارس اور وفاق المدارس کے سوچنے کا ہے مگر وہاں بھی اس کے بظاہر کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے۔

- اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ کئی برس سے میرا معمول ہے کہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں دورۂ حدیث کے طلبہ کو ہفتہ وار لیکچر کی صورت میں انسانی حقوق، معاصر مذاہب کے تعارف، ماضی قریب کی دینی تحریکات، اور پاکستان میں نفاذِ اسلام کی جدوجہد کے فکری و علمی پہلوؤں کی طرف سرسری انداز میں توجہ دلانے کی کوشش کرتا ہوں تو بہت سے طلبہ میرے منہ کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے میں اس دنیا کی نہیں بلکہ کسی اور دنیا کی بات کر رہا ہوں۔ اور شاید میں انہیں اس طرح "گمراہ" کر کے اکابر کے مسلک سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔
- ہمارے ہاں فکری تربیت کے فقدان کا ایک نامحمود نتیجہ اور ثمرہ یہ بھی ہے کہ ہم سب نے خود کو اختلاف اور تنقید سے بالاتر سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ گزشتہ دنوں ایک دوست میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ فلاں صاحب نے آپ کے خلاف کتاب لکھی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر انہیں میری کچھ باتوں سے اختلاف ہے تو ان پر لکھنا ان کا حق ہے۔ فرمانے لگے کہ انہوں نے آپ پر سخت تنقید کی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بھی ان کا حق ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ آپ اس کا جواب لکھیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میرا موقف بھی لوگوں کے سامنے ہے، ان کا موقف بھی آ گیا ہے، لوگ خود فیصلہ کر لیں گے کہ کس کی بات درست ہے۔
- میں نے ان سے یہ بھی گزارش کی کہ جماعتِ اسلامی کے ساتھ ہمارا نصف صدی سے یہ اختلاف چلا آ رہا ہے کہ انہوں نے اپنے دستور میں صحابہ کرامؓ کو تنقید سے بالاتر تسلیم نہیں کیا، حالانکہ اہلِ سنت کا صدیوں سے یہ موقف ہے کہ صحابہ کرامؓ تنقید سے بالاتر ہیں۔ مگر اب صورتحال یہ ہے کہ ہم نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ تنقید سے بالاتر ہونے والوں کا دائرہ بہت زیادہ وسیع کر لیا ہے جسے مزید وسیع کرتے جا رہے ہیں اور خود بھی اس میں شامل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔
- نفاذِ شریعت کا راستہ روکنے کا کام عالمی سطح پر ہے اور بین الاقوامی لابیاں اس کے لیے مسلسل

متحرک ہیں۔ ان کے کام کو سمجھنا، طریق واردات سے واقفیت حاصل کرنا، اور ان کے سدباب کے لیے منصوبہ بندی کرنا بھی دینی جماعتوں کی ذمہ داری ہے۔ نفاذِ شریعت کے لیے سطحی نعرے بازی اور جذباتی تقریروں سے آگے بڑھ کر ذہن سازی، ہوم ورک، لابنگ، ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال، اور دینی قوتوں کا باہمی ربط و تعاون بھی ضروری ہے۔ ہمارے مدارس کے طلبہ، مدرسین، دینی جماعتوں کے راہنما اور کارکن، اور مساجد کے ائمہ و خطباء کی غالب اکثریت اسلام اور مغرب کے درمیان انسانی حقوق کے عنوان سے لڑی جانے والی عالمی ثقافتی جنگ سے سرے سے واقف نہیں ہے۔ اس لیے مدرسین اور طلبہ کو اس کے لیے تیار کرنا اور یونانی فلسفہ کی طرح مغربی فلسفہ کو تدریسی نصاب میں شامل کرنا دینی مدارس کے فرائض میں شامل ہے۔ اسی طرح علمی مسائل اور خاص طور پر جدید فکری اور ثقافتی مسائل پر باہمی بحث و مباحثہ وقت کی اہم ضرورت ہے اور محاذ آرائی سے ہٹ کر علمی انداز میں اس بحث و مباحثہ کو آگے بڑھانے اور اس کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔

سنی شیعہ اختلافات:
والد محترمؒ اور عم مکرمؒ کا موقف و اسلوب

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۱۰ء

...... سنی شیعہ اختلافات کے حوالے سے حضرت والد محترمؒ کا موقف یہ تھا کہ یہ اصولی اختلافات ہیں اور ان کا تعلق ایمان و عقیدہ سے ہے۔ انہوں نے اس پر ”ارشاد الشیعہ“ کے نام سے مستقل کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے اس موقف کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ وہ اہلِ تشیع کی اور ان میں سے خاص طور پر اثنا عشریہ کی تکفیر کرتے تھے اور اس سلسلے میں ان کے موقف میں کوئی لچک نہیں تھی۔

جبکہ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ اصولی طور پر اس موقف سے متفق ہوتے ہوئے بھی اس کے اظہار کے لیے الگ اسلوب رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ لفظ ”شیعہ“ کو تکفیر کی بنیاد بنانے کی بجائے عقائد کی بنیاد پر تکفیر کرنی چاہیے، مثلاً یہ کہ جو شخص قرآن کریم میں تحریف کا قائل ہے یا صحابہ کرامؓ کی تکفیر کرتا ہے، وغیر ذالک، تو وہ کافر ہے۔ خود میرا ذوق بھی اس حوالے سے حضرت صوفی صاحبؒ والا ہے، اس لیے کہ عالمِ اسلام میں شیعہ کہلانے والے ایسے گروہ بھی موجود ہیں جن کی ائمہ اہلِ سنت نے تکفیر

نہیں کی۔

مثلاً یمن میں زیدی فرقہ کے لوگوں کی تعداد پچیس فیصد سے زائد ہے، ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو زیدی اور شیعہ کہلانے کے باوجود اہلِ سنت جیسے عقائد رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں پاکستان میں بھی ایسے بزرگ موجود ہیں جو متصلب سنی ہیں لیکن زیدی کہلاتے ہیں۔ حضرت سید نفیس شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے نام کے ساتھ زیدی لکھتے تھے، امام زیدؒ کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے تھے، امام زید بن علیؒ پر انھوں نے الاستاذ ابو زہرہ کی کتاب ”الامام زید بن علی“ بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کی تھی۔ اپنے مکان کے قریب انہوں نے جو دینی مدرسہ قائم کیا اس کا نام ”مدرسہ زید بن علی“ ہے۔ اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ میری پسندیدہ ترین شخصیتیں تین ہیں۔ ایک امام زید بن علیؒ، دوسرے خواجہ گیسو درازؒ اور تیسرے سید احمد شہیدؒ۔ ایران کے اہلِ تشیع زیدیوں کو شیعہ کا فرقہ قرار دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود ایران کے دستور میں زیدیوں کو شیعہ اکثریت کا حصہ تسلیم کرنے کی بجائے حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کے ساتھ اقلیتوں میں شمار کیا گیا ہے۔

اس لیے اثنا عشری شیعہ کی تکفیر میں کوئی کلام نہ ہونے کے باوجود عمومی تکفیر میں عالمِ اسلام کے مجموعی تناظر کو ملحوظ رکھنا بھی میرے نزدیک ضروری ہے، البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت والد محترمؒ کا موقف اس بارے میں بے لچک تھا اور جن تحفظات کا ہم اظہار کرتے ہیں، وہ ان کو چنداں اہمیت نہیں دیتے تھے۔......

محرم الحرام اور اہلِ سنت کے مقدسات

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۸ دسمبر ۲۰۱۰ء

محرم الحرام سن قمری و ہجری کا پہلا مہینہ ہے جس کے ساتھ اہلِ اسلام کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں اور یومِ عاشورہ یعنی دس محرم الحرام کے بارے میں فضیلت و اہمیت کی متعدّد روایات احادیث نبویہؐ کے ذخیرہ میں موجود ہیں لیکن نواسۂ رسول حضرت امام حسینؓ اور ان کے خانوادے کی محترم شخصیات و افراد کی المناک شہادت کا تذکرہ ان دنوں پورے عالمِ اسلام میں سب سے زیادہ کیا جاتا ہے جو بلاشبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر امتی کے لیے رنج و صدمے کا باعث ہے اور دنیا بھر میں مسلمان اپنے اپنے انداز میں ہر جگہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔

محرم الحرام کا ماحول

جبکہ ہمارے ہاں ایک اور روایت بھی اس سلسلہ میں پائی جاتی ہے کہ محرم الحرام سے پہلے ڈویژنل اور ضلعی سطح پر انتظامیہ مستعد و متحرک ہو جاتی ہے کہ محرم الحرام امن و امان کے ساتھ گزر جائے اور کوئی ایسا واقعہ رونما نہ ہونے پائے جو مسلمانوں میں بدامنی اور سنی شیعہ فرقوں کے درمیان کشیدگی میں اضافے کا باعث بن جائے۔ اس کی وجہ عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ

- اہلِ تشیع کا اس سانحۂ عظمیٰ پر جذبات اور رنج و غم کے اظہار کا اپنا طریقہ ہے کہ وہ مجالس منعقد کرتے ہیں، ماتمی جلوسوں کا اہتمام کرتے ہیں اور کھلے بازاروں میں ماتم کرتے ہوئے گزرتے ہیں۔ اہلِ سنت کے نزدیک اظہار رنج کا طریقہ مختلف ہے کہ وہ مساجد میں بیانات اور خطبات و دروس کی صورت میں خانوادۂ اہل بیت کے ساتھ اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہیں جبکہ ماتم کی مروجہ صورتوں کو وہ درست نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اس وجہ سے بعض مقامات پر باہمی کشیدگی بڑھ جاتی ہے اور مختلف شہروں میں اس کے باعث متعدّد مواقع پر اس کا افسوسناک اظہار ہو چکا ہے۔ اسی لیے انتظامیہ ہر جگہ محرم الحرام کے آغاز سے قبل علماء کرام اور سنی شیعہ رہنماؤں کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیتی ہے اور مختلف سطحوں پر امن کمیٹی کے اجلاسوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔
- اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی کشیدگی اور بسا اوقات تصادم کا باعث بن جاتی ہے کہ بعض شیعہ ذاکرین کی طرف سے ماتمی جلوسوں میں صحابہ کرامؓ کی اکابر شخصیات بالخصوص حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کا ذکر ایسے انداز سے ہوتا ہے جو اہلِ سنت کے لیے قابل قبول بلکہ بعض صورتوں میں قابل برداشت نہیں ہوتا جس سے باہمی منافرت میں اضافہ ہوتا ہے اور افسوسناک واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔

جناب آیت اللہ خامنہ ای کا فتویٰ

البتہ اہلِ تشیع کے سنجیدہ علماء کرام اور باشعور رہنما اس قسم کی باتوں کو پسند نہیں کرتے اور باہمی رواداری اور امن و مصالحت کے قیام کی کوششوں میں انتظامیہ اور اہلِ سنت سے ہمیشہ تعاون کرتے ہیں۔ اس سال اس حوالے سے ایک خوشی کی خبر بروقت سامنے آئی ہے جو اس مسئلہ کی شدت اور سنگینی کو کم کرنے میں خاصی معاون ہو سکتی ہے اور وہ اثنا عشریہ اہلِ تشیع کے عالمی رہنما اور ایران کے رہبرِ انقلاب جناب آیت اللہ خامنہ ای کا وہ فتویٰ ہے جو انہوں نے صحابہ کرامؓ اور امہات المومنینؓ کی

حرمت و تعظیم کے بارے میں جاری کیا ہے۔ اس کی کچھ تفصیلات دہلی سے شائع ہونے والے جریدے سہ روزہ ”دعوت“ نے ۱۶اکتوبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں اور اسلام آباد سے شائع ہونے والے اہلِ تشیع کے جریدہ ماہنامہ ”پیام“ نے نومبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں شائع کی ہیں۔ ماہنامہ پیام کی رپورٹ کے مطابق یہ فتویٰ یوں ہے کہ

”برادرانِ اہلِ سنت کے مقدسات کی توہین کرنا حرام ہے چہ جائیکہ بالخصوص زوجۂ رسولؐ پر تہمت لگائی جائے جس سے ان کے شرف و عزت پر حرف آتا ہو۔ بلکہ تمام انبیاءؑ کی خصوصاً سید الانبیاؐ کی ازواج کی توہین ممنوع ہے۔“

سہ روزہ دعوت دہلی نے یہ فتویٰ اس طرح نقل کیا ہے کہ جناب خامنہ ای نے فرمایا ہے کہ

”ہمارے سنی بھائیوں کی علامتوں اور مقدسات کی توہین و تحقیر بالخصوص رسول اکرمؐ کی ازواج پر تہمت باندھنا جو ان کے شرف میں خلل پڑنے کا باعث ہو حرام ہے۔ بلکہ یہ امر تمام انبیاء کی ازواج اور خاص طور پر ان کے سردار و سرور رسولِ اعظمؐ کی زوجات کے لیے محال ہے۔“

اس کا پس منظر یہ بیان کیا جارہا ہے کہ کوئی صاحب خود کو شیعہ رہنما ظاہر کر کے ویب سائٹ پر ام المومنین حضرت عائشہؓ کے بارے میں بطور خاص ہرزہ سرائی کر رہے ہیں جس سے مختلف ممالک میں ہیجان کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔ اس پر جناب خامنہ ای سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے اس سلسلہ میں باقاعدہ فتویٰ جاری کیا ہے جس کی بہت سے دیگر شیعہ اکابر نے بھی تائید کی ہے اور شیخ الازہر سمیت عالمِ اسلام کے متعدّد سنی رہنماؤں اور حکومت کویت نے اس کا خیر مقدم کیا ہے۔

ہمارے خیال میں جناب خامنہ ای کا یہ فتویٰ بہت اہم اور بروقت ہے جس سے ایسے لوگوں کی زبانوں پر قابو پانے میں مدد ملے گی جو حضرات صحابہ کرامؓ اور امہات المومنینؓ کے بارے میں نازیبا الفاظ اور لہجہ اختیار کر کے اہلِ سنت کے جذبات کو مجروح کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس فتویٰ سے ان سنجیدہ اور صاحبِ علم شیعہ رہنماؤں کو بھی حوصلہ ملے گا جو باہمی رواداری اور امن و مصالحت کے فروغ کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔

ایک سکھ سردار کا مشاہدہ

محرم الحرام میں امن وامان برقرار رکھنے کی کوششوں کے سلسلہ میں راقم الحروف کو بھی ایک مشترکہ اجلاس میں شرکت کا موقع ملا جو بین المذاہب امن کمیٹی پنجاب کے چیئرمین مولانا قاری محمد سلیم زاہد کی دعوت پر کمشنر آفس گوجرانوالہ میں کمشنر گوجرانوالہ ڈویژن جناب سعید واہلہ کی صدارت میں منعقد

ہوا۔ اس میں ڈویژن کے تمام اضلاع سے مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ ضلعی افسران اور مسیحی رہنماؤں نے بھی شرکت کی۔ کم و بیش سبھی مقررین نے باہمی رواداری کے فروغ پر زور دیا اور پیش آمدہ مسائل و معلومات کو افہام و تفہیم کے ساتھ حل کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔

گوجرانوالہ کے چیمبر آف کامرس کے صدر شیخ ثروت اکرام نے اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا کہ وہ ایک صنعتی نمائش کے سلسلہ میں کسی بیرونی ملک میں تھے کہ ایک سکھ تاجر کو انہوں نے کہا کہ سردار صاحب آپ اگر تقسیم ہند کے وقت ہمارے ساتھ رہتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ان سردار صاحب نے جواب میں کہا کہ ہم نے صحیح فیصلہ کیا تھا اور تجربہ نے اس بات کو درست ثابت کیا ہے اس لیے کہ

- میرا تعلق ساہیوال سے تھا مگر میں جب کم و بیش ساٹھ سال کے بعد وہاں گیا تو ایسے ویسا ہی پایا جیسے نصف صدی پہلے تھا، جبکہ اس کے مقابلے میں جالندھر نے ترقی کے بہت سے مراحل طے کر لیے ہیں۔
- دوسری بات سکھ سردار نے یہ کہی کہ ہمارے ہاں مسلمانوں کی مساجد میں امن کے ساتھ عبادت ہوتی ہے بلکہ وہ جب نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلتے ہیں تو ہندو اور سکھ خواتین اپنے بچوں کو لے کر دروازوں پر کھڑی ہوتی ہیں تاکہ مسجد میں عبادت کرنے والے مسلمان ان بچوں کو دم کر دیں، جبکہ پاکستان میں آپ مسلمان حضرات مسجد کے دروازے پر گن مین کھڑا کیے بغیر اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی نہیں کر سکتے۔

سکھ سردار کی یہ بات ہم سب کے لیے باعث عبرت ہے اور سبق آموز بھی کہ ترقی اور امن دونوں حوالوں سے معروضی صورتحال اس سے مختلف نہیں ہے جو سردار موصوف نے بیان کی۔ متعلقہ طبقات و عناصر کو اس کا سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہیے۔

راقم الحروف نے ''بین المذاہب امن سیمینار'' کے عنوان سے منعقد ہونے والے اس مشترکہ اجلاس میں عرض کیا کہ مسلمان، مسیحی، ہندو، سکھ اور دیگر مذاہب کے افراد پاکستان کے یکساں طور پر شہری ہیں اور امن سب کی مشترکہ ضرورت ہے۔ ہمارے درمیان ایک معاہدہ دستور کی صورت میں موجود ہے جس کی پابندی کر کے ہم باہمی امن و رواداری کا ماحول برقرار رکھ سکتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ہم سب دستوری معاہدے کے مطابق اپنے اپنے دائرے میں رہیں اور اس معاہدے کا احترام کریں۔ اس کے ساتھ ہی ہماری یہ بھی ضرورت اور ذمہ داری ہے کہ ایک دوسرے کے احترام کا ماحول قائم رکھیں، تحقیر و توہین کے لہجے سے گریز کریں اور اگر کوئی مسئلہ اختلاف کا باعث بن جائے تو اسے بھی باہمی مفاہمت اور گفت و شنید کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کریں۔ جھگڑا اس وقت ہوتا ہے جب ہم

اپنے معاہدات اور دستور کے دائروں کو عبور کرتے ہیں یا بیرونی مداخلت کی بعض صورتیں ہمیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر کے اپنا مطلب و مقصد پورا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر ان دو باتوں سے گریز کیا جائے تو آج بھی ہمارے باہمی امن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۹ دسمبر ۲۰۱۰ء

اس کے ساتھ ہی ایک اور اہم خبر کو بھی اپنی ان گزارشات کا حصہ بنانا چاہتا ہوں جو محرم الحرام کے آغاز کے حوالے سے اور زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے کہ ایران کے رہبر انقلاب اور اثنا عشری اہلِ تشیع کے عالمی راہنما جناب آیت اللہ خامنہ ای نے ام المؤمنین حضرت عائشہ اور دیگر امہات المؤمنین رضوان اللہ علیہن اجمعین کی توہین سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے اہلِ سنت کے تمام مقدسات بالخصوص امہات المومنینؓ کی توہین کو حرام قرار دینے کا اعلان کیا ہے جس کا مختلف ممالک کے سنی راہنماؤں کی طرف سے خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ اسلام آباد سے شائع ہونے والے اہلِ تشیع کے معروف جریدہ ماہنامہ پیام نے نومبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں اس کی تفصیلات شائع کی ہیں جن کے مطابق سعودی عرب کے شہر ”الاحساء“ کے سرکردہ حضرات نے ایک استفسار کے ذریعے جناب خامنہ ای کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ بعض سیٹلائٹ چینلز اور انٹرنیٹ ویب سائٹس پر مختلف افراد ام المومنین سیدہ عائشہؓ کی ذات گرامی کے بارے میں مسلسل بیہودہ گفتگو کر رہے ہیں جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہو رہے ہیں اور یہ بات باہمی کشیدگی اور منافرت میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔ اس کے جواب میں جناب آیت اللہ خامنہ ای نے یہ فتویٰ صادر کیا ہے:

> ”برادرانِ اہلِ سنت کے مقدسات کی توہین کرنا حرام ہے چہ جائیکہ بالخصوص زوجۂ رسولؐ پر تہمت لگائی جائے جس سے ان کے شرف و عزت پر حرف آتا ہو۔ بلکہ تمام انبیاءؑ کی خصوصاً سید الانبیاءؐ کی ازواج کی توہین ممنوع ہے۔“

ماہنامہ پیام کی رپورٹ کے مطابق دیگر اکابر شیعہ علماء مثلاً ایران کے آیت اللہ غازی، لبنان کی علوی تحریک کے سربراہ مصطفیٰ علی حسین، عراق کے آیت اللہ سیستانی، آیت اللہ العظمیٰ، ناصر مکارم شیرازی، اور حجۃ الاسلام سید احمد خاتمی نے بھی امہات المؤمنین بالخصوص ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے بارے میں توہین میز گفتگو کو ناجائز قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والوں سے براءت کا اظہار کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ فتویٰ ایسے فتنہ پرور واعظین کی حوصلہ شکنی کا باعث ہوگا جو حضرات صحابہ کرامؓ اور امہات

المومنینؓ کے بارے میں توہین میز گفتگو کر کے شرانگیزی کو فروغ دیتے ہیں۔

مقدسات کا تحفظ:
ملی مجلس شرعی کا اعلامیہ

روزنامہ اسلام، لاہور ---۹ دسمبر ۲۰۱۰ء

......٦ دسمبر کو لاہور میں ملی مجلس شرعی کا بھی ایک اہم اجلاس ہوا جس میں تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام نے شرکت کی۔ اجلاس کی صدارت مولانا مفتی محمد خان قادری نے کی جبکہ شرکاء میں راقم الحروف کے علاوہ مولانا عبدالمالک خان، مولانا عبدالرؤف فاروقی، مولانا حافظ عبدالرحمان مدنی، مولانا احمد علی قصوری، حافظ عاکف سعید، مولانا قاری جمیل الرحمان اختر، حافظ صلاح الدین یوسف، حافظ ذکاء الرحمان اختر، مولانا خلیل الرحمان قادری، جناب فرید احمد پراچہ، مولانا حافظ عبد الغفار روپڑی، مولانا قاری شیخ محمد یعقوب، مولانا ابو رجال، شیعہ راہنما علامہ حسین اکبر بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اجلاس میں مندرجہ ذیل مشترکہ اعلامیہ ترتیب دیا گیا جس کا اعلان ان سب راہنماؤں نے پریس کلب میں منعقدہ پریس کانفرنس سے مشترکہ طور پر کیا:

"ہم متفقہ طور پر ان عناصر کی بھرپور مذمت کرتے ہیں جو تحفظِ ناموسِ رسالت کے قانون 295C میں ترمیم، تنسیخ اور اس کے طریق کار (Procedural Law) کو تبدیل کر کے غیر مؤثر کرانے کے درپے ہیں۔ ہم حکومت پر واضح کرتے ہیں کہ اگر اس نے ایسی جسارت کی تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا اور امت مسلمہ اس کی قطعًا اجازت نہیں دے گی۔ ہم حکومت سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس قانون کو قطعًا نہ چھیڑے اور صدر پاکستان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ آسیہ بی بی کی سزا معاف نہ کریں بلکہ یہ معاملہ عدالتوں پر چھوڑ دیں۔ گورنر پنجاب کا آسیہ مسیح سے جیل میں ملاقات کرنا، حمایت کرنا اور رحم کی اپیل پر دستخط کرنا، توہین رسالت اور توہین عدالت ہے جس کی یہ اجلاس مذمت کرتا ہے۔ ہم یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ آئین پاکستان کے تحت صدر پاکستان کو حاصل سزا معاف کرنے کا اختیار ختم کیا جائے یا کم از کم حدود اور 295C کے تحت ملنے والی سزاؤں کو اس سے مستثنٰی قرار دیا جائے۔

ہم ملک کے طول و عرض میں ہونے والی دہشت گردی کی تمام وارداتوں کی پرزور

مذمت کرتے ہیں۔ بالخصوص مساجد، امام بار گاہوں، دیگر مذاہب کے مقدس مقامات اور اولیاء اللہ کے مزارات کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ بے حد قابل مذمت ہے۔ ان مقدس اور روحانی مقامات پر دہشت گردی کرنے والوں کا دین و مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ہم اس بات پر متفق ہیں کہ اس دہشت گردی کا اصل سبب امریکہ کی غلامی اور سیکولر قوتوں سے مرعوبیت ہے جس سے نکلنا حکومت پاکستان کی اولین ذمہ داری ہے۔ ہم اس بات پر بھی متفق ہیں کہ ہمیں اس صورتحال کا متحد ہو کر مقابلہ کرنا چاہیے ورنہ باہمی انتشار و افتراق سے ہماری ہوا اکھڑ جائے گی اور تمام مکاتبِ فکر کی جگ ہنسائی ہوگی جبکہ اسلام دشمن طاقتوں کو اس سے تقویت ملے گی۔

ہمارا ماضی سب کے سامنے ہے کہ عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ، ناموس رسالت کے تحفظ اور نفاذِ اسلام کے لیے تمام مکاتبِ فکر کے اکابر علماء کرام نے ہر مرحلہ پر متحد ہو کر ملت کی قیادت کی ہے۔ آج بھی اس کی ضرورت ملک کے اسلامی نظریاتی تشخص کے تحفظ اور قومی خود مختاری کی بحالی کے لیے شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے اور اسی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ہم مشترکات پر متحد رہنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں۔

ہم مشترکہ طور پر عوام سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ مسلکی اختلافات وار فرقہ واریت کو ہوا نہ دیں بلکہ آپس میں محبت و مؤدت اور یگانگت کو فروغ دیں، بالخصوص محرم الحرام کے موقع پر امن و امان برقرار رکھا جائے اور ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام کیا جائے۔“

قومی و ملی تحریکات میں اہلِ تشیع کی شمولیت

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۱۱ء

گزشتہ ایک ماہ کے دوران مجھے کراچی، بہاولپور، لاہور، راولپنڈی، خانیوال، کبیر والا، سرگودھا، نوشہرہ، پشاور اور دیگر شہروں میں مختلف دینی اجتماعات میں شرکت اور احباب سے ملاقاتوں کا موقع ملا

اور اکثر اوقات میں دوستوں کے اس سوال کا سامنا کرنا پڑا کہ تحریکِ تحفظِ ناموسِ رسالت کی مرکزی قیادت میں اہلِ تشیع کی شمولیت کے بارے میں آپ کا موقف اور رائے کیا ہے؟ میں نے گزارش کی کہ پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت میں بھی تحریکِ تحفظ ناموسِ رسالت کی مرکزی کونسل کا حصہ ہوں اور اس حوالے سے میرا موقف وہی ہے جو ملک کے اکابر علماء کرام کا قیامِ پاکستان کے بعد سے مسلسل چلا آرہا ہے۔

- قیامِ پاکستان کے بعد جب یہ سوال اٹھا کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کس فرقے کے مسلک اور فقہ کے مطابق ہوگا اور اس سلسلہ میں فکری، کلامی اور فقہی اختلافات کو کیسے کنٹرول کیا جائے گا؟ اس سوال کے جواب کے لیے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سربراہی میں تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام نے متفقہ ۲۲ نکات پیش کرکے اس سوال اور اعتراض کا منہ بند کر دیا اور بتایا کہ تمام تر اعتقادی اور فقہی اختلافات کے باوجود پاکستان میں آباد تمام مذہبی مکاتبِ فکر دستوری بنیاد اور قانونی نظام پر متفق ہیں، اور ایک متفقہ دستوری ڈھانچہ انہوں نے پیش کر دیا جس میں دیگر مکاتبِ فکر کے ساتھ اہلِ تشیع کے ذمہ دار علماء کرام بھی شریک تھے۔
- ۱۹۵۲ء میں تحریکِ ختمِ نبوت کے لیے تمام مکاتبِ فکر کو پھر سے جمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور آل پارٹیز ایکشن کمیٹی قائم کی گئی تو اس میں بھی اہلِ تشیع کی نمائندگی موجود تھی جبکہ مولانا ابوالحسنات قادریؒ اور امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔
- ۱۹۷۴ء میں محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کی قیادت میں کل جماعتی مجلسِ عمل تحفظِ ختمِ نبوت تشکیل پائی اور اس کی جدوجہد سے قادیانیت کو پارلیمنٹ کو غیر مسلم اقلیت کا درجہ دلوایا تو اس کی قیادت میں بھی اہلِ تشیع موجود تھے۔
- ۱۹۷۷ء میں ملک میں نفاذِ اسلام کے لیے تحریکِ نظامِ مصطفٰی کی جدوجہد حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی سربراہی میں میدان میں آئی اس کی قیادت میں بھی شیعہ راہنما موجود تھے۔
- ۱۹۹۸ء میں حضرت مولانا خواجہ خان محمد نور اللہ مرقدہ کی سربراہی میں ایک بار پھر کل جماعتی مجلس عمل کا احیا عمل میں لایا گیا تو اہلِ تشیع اس کی قیادت میں موجود تھی، بلکہ نائب صدر کے منصب پر ایک شیعہ راہنما فائز تھے۔
- اب جبکہ عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کی میزبانی اور امیر مجلس حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی دامت برکاتہم کی رہنمائی میں تحریکِ تحفظِ ناموسِ رسالت وجود میں آئی ہے تو ماضی کے اسی تسلسل میں شیعہ رہنماؤں کو اس کی ہائی کمان میں شامل کیا گیا ہے۔

- اس سے قبل متحدہ مجلسِ عمل میں بھی اہلِ تشیع کے دیگر مکاتبِ فکر کے ساتھ قیادت کا حصہ رہ چکے ہیں۔

اس طرح دینی تحریکات کے حوالے سے قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک جو روایت اور تسلسل چلا آرہا ہے وہ بدستور قائم ہے، اور یہ دراصل سیکولر حلقوں کے اس اعتراض یا الزام کا عملی جواب ہے کہ پاکستان کے اسلامی تشخص، ملک میں اسلام اور شریعت کی حکمرانی کے بارے میں ملک کے مذہبی مکاتبِ فکر پوری طرح متفق اور پاکستان میں نفاذِ اسلام فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں بلکہ متفقہ قومی مسئلہ ہے۔

ایک موقع پر بعض دوستوں نے یہ سوال کیا ہے کہ ہمارے والد محترم امام اہلِ سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا موقف اور طرزِ عمل کیا تھا؟ خصوصاً اس پس منظر میں کہ انہوں نے اثناء عشری اہلِ تشیع کی تکفیر پر ''ارشاد الشیعہ'' کے نام سے کتاب بھی لکھی ہے۔ میں نے گزارش کی کہ انہوں نے ''ارشاد الشیعہ'' تصنیف فرمائی اور اس میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ صرف ان کا موقف نہیں بلکہ یہ تو اہلِ سنت کا موقف ہے اور خود ہمارا موقف بھی اثناعشری اہلِ تشیع کی حد تک یہی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان تمام تحریکات کا حصہ رہے ہیں جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم محترم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ اور دیگر بزرگ ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں شریک ہوئے ہیں، جلوسوں کی قیادت کی، مشترکہ اجتماعات میں شرکت کرتے رہے ہیں اور دونوں گرفتار بھی ہوئے ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ کم وبیش دس ماہ، حضرت صوفی صاحبؒ نے تقریباً چھ ماہ اس تحریک میں جیل کاٹی ہے۔ ۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں دونوں حضرات سرگرمی کے ساتھ شریک ہوتے رہے، مشترکہ اجتماعات میں خطاب کرتے رہے ہیں اور جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی صدارت میں منعقد ہونے والا وہ تاریخی جلسہ تحریکی تاریخ کا حصہ ہے جس میں دوسرے مکاتبِ فکر کے اکابر علماء کرام کے علاوہ شیعہ راہنماؤں نے بھی خطاب کیا تھا۔ بلکہ یہ واقعہ بھی تاریخی اہمیت کا حاصل ہے کہ جلسہ کے بعد جب پولیس نے علامہ علی غضنفر کراروی کو جلسہ گاہ سے نکلتے ہی گرفتار کر لیا تو آغا شورش کاشمیری مرحوم نے نہ صرف اپنے خطاب کے دوران شدید احتجاج کیا بلکہ پولیس چوکی کا لوگوں کے ہجوم کے ساتھ محاصرہ کر لیا اور کراروی صاحب کو رہا کرکے وہاں سے واپس ہوئے۔

۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفٰی میں گوجرانوالہ میں حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ نے مشترکہ عوامی جلوس کی قیادت کی اور گکھڑ میں حضرت والد محترمؒ جلوسوں کی قیادت کرتے رہے۔ اور ان کا یہ تاریخی واقعہ بھی اسی تحریک کا ہے کہ فیڈرل فورس کے کمانڈر نے اس کو روکنے کے لیے اس کے راستے

میں لکیر کھینچ کر اعلان کیا کہ جو شخص اس لائن کو عبور کرے گا اسے گولی مار دی جائے گی۔ یہ سن کر حضرت والد محترمؒ نے اپنے رفقاء استاذ محترم حضرت مولانا محمد انور صاحب مدظلہ اور حاجی سید ڈار صاحب مرحوم کے ہمراہ یہ کہہ کر کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے لائن کراس کی کہ ”مسنون عمر پوری کر چکا ہوں اور اب شہادت کی تمنا رکھتا ہوں“۔ ان کا یہ جذبہ دیکھ کر فیڈرل سکیورٹی فورس کی رائفلیں سرنگوں ہو گئیں اور جلوس پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اپنی زندگی کے آخری دس سال وہ بستر علالت پر رہے لیکن اس دوران متحدہ مجلسِ عمل تشکیل پائی تو انہوں نے دونوں الیکشنوں میں متحدہ مجلسِ عمل کے امیدواروں کی حمایت کی اور لوگوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین فرمائی۔ بعض حضرات نے اس سلسلہ میں تحفظات کا بھی ان کے سامنے اظہار کیا مگر ان کا موقف وہی رہا۔

میں نے دوستوں سے عرض کیا کہ کسی کو مسلمان، منافق، یا کافر قرار دینے کا مسئلہ اپنی جگہ پر ایک دینی ضرورت ہوتی ہے لیکن قومی ضروریات اور معاشرتی روابط و معاملات کا ایک مستقل دائرہ ہوتا ہے اور ہمارے بزرگوں نے اپنی اپنی جگہ ان دونوں کا لحاظ رکھا ہے۔ حضرت والد محترمؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ کا زندگی بھر یہ معمول رہا ہے کہ وہ بہت سے معاملات پر اپنے تحفظات کا اظہار کرتے تھے اور رائے بھی دیتے تھے، لیکن جب کوئی اجتماعی فیصلہ ہو جاتا تھا تو اسے نہ صرف قبول کر لیتے تھے بلکہ اس کا بھرپور ساتھ دیتے تھے۔ خود میرا معمول بھی بحمد اللہ تعالیٰ یہی ہے کہ بعض معاملات پر اپنی مستقل رائے رکھتا ہوں، اس کا اظہار بھی کرتا ہوں اور کوئی مناسب موقع ہو تو اس پر بحث و مباحثہ سے بھی گریز نہیں کرتا، لیکن عملاً وہی کرتا ہوں جو اجتماعی فیصلہ ہوتا ہے اور جمہور اہلِ علم کا موقف ہوتا ہے۔ رائے کے حق سے میں کبھی دستبردار نہیں ہوا لیکن اپنی رائے کو حتمی قرار دے کر جمہور اہلِ علم کے موقف کے سامنے اڑنے سے ہمیشہ گریز کیا ہے اور اسے کبھی حق اور صواب کا راستہ نہیں سمجھا۔

میری طالب علمانہ رائے میں اسلام، کفر اور نفاق کی بحث کے باوجود معاشرتی معاملات اور اجتماعی روایات کو الگ دائرے میں رکھنا چاہیے اور اس سلسلہ میں دورِ نبویؐ میں ہمارے لیے مثال موجود ہے۔ عبداللہ بن ابی اور اس کے منافق ساتھیوں کو جن کی تعداد غزوۂ احد کے موقع پر تین سو کے لگ بھگ بیان کی جاتی تھی، قرآن کریم کی نصِ قطعی میں ”کافر“ قرار دیا گیا ہے اور یہ اعلان کیا گیا ہے کہ وماھم بمؤمنین وہ مسلمان نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عبادات میں شریک ہوتے رہے ہیں، غزوات میں اپنی تمام تر غلط حرکات کے باوجود شامل ہوتے رہے ہیں۔ ان کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ انہیں قتل نہ کر دیا جائے؟ تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ”نہیں! اس سے یہ تاثر پھیلے گا کہ محمدؐ اپنے

ساتھیوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں"۔ اس لیے کہ دنیا کو وہ مسلمانوں کا حصہ ہی نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ منافقین نے ایک موقع پر الگ مسجد بنا کر خود کو عمومی معاشرے سے الگ کرنا چاہا تو قرآن کریم نے اسے "مسجد ضرار" قرار دیا اور نبی اکرمؐ کو وہاں جانے سے منع کر دیا۔ وہ مسجد گرا دی گئی اور مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ منافقین کو ان کے کفر کے باوجود معاشرتی طور پر الگ ہونے سے روکا جائے کہ اس کے نقصانات زیادہ ہیں۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ اکابر کے فیصلوں پر حسبِ سابق اعتماد کیا جائے۔

......

راقم الحروف نے مختلف دوستوں کے سوالات پر تحریکِ تحفظِ ناموسِ رسالت کی قیادت میں اہلِ تشیع کی شمولیت کے مسئلے پر اپنے موقف کی وضاحت کی تھی جو روزنامہ اسلام میں ۱۱ فروری ۲۰۱۱ء کو "نوائے حق" کے عنوان سے میرے مستقل کالم کی صورت میں شائع ہوئی۔ اس پر محترم جناب مولانا محمد یونس قاسمی نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے جو مذکورہ کالم کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ مولانا قاسمی کی شکایت یہ ہے کہ اکابر کے فیصلے بدلتے رہتے ہیں جبکہ میں نے اس کالم میں ہی اس کے بارے میں عرض کر دیا تھا کہ کسی کو کافر قرار دینے یا مسلمان تسلیم کرنے کا دائرہ الگ ہے اور معاشرتی روابط اور مشترکہ تحریکات میں اشتراکِ عمل کا دائرہ اس سے مختلف ہے جس کی واضح مثال موجود ہے کہ دورِ نبویؐ میں عبد اللہ بن ابی اور اس کے ٹولے کو قرآن کریم کی نصِ قطعی میں کافر قرار دیے جانے کے باوجود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرتی طور پر انہیں الگ نہیں کیا بلکہ ان کی تمام تر خرابیوں اور غلط کاریوں کے ہوتے ہوئے بھی انہیں اجتماعی معاملات میں اپنے ساتھ شریک رکھا۔ اس لیے کہ انہیں معاشرتی طور پر الگ کرنے اور ان کے خلاف کوئی سخت کارروائی کرنے میں اس دور کے حالات میں مصلحت نہیں تھی۔

ہمارے اکابر کا طریقہ بھی یہی چلا آ رہا ہے کہ کفر کے فتووں کے باوجود مشترکہ قومی معاملات اور اجتماعی تحریکات میں اہلِ تشیع کو اپنے ساتھ شریک رکھا ہے اور اس میں کوئی تعارض اور الجھن کی بات نہیں ہے۔ اس سلسلے میں علماء کرام کے متفقہ ۲۲ نکات، ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت، ۱۹۷۳ء کے دستور، ۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت، ۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰ اور ۱۹۸۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت کا حوالہ مذکورہ کالم میں دیا جا چکا ہے۔ اس کے ساتھ اس تسلسل میں چند اور تحریکات کا اضافہ بھی کرنا چاہتا ہوں۔

- بھارت میں مسلمانوں کے شرعی خاندانی قوانین کے تحفظ کے لیے "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" کا مشترکہ پلیٹ فارم موجود ہے جس کے پہلے سربراہ حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، دوسرے سربراہ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ، تیسرے سربراہ حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ

تھے، جبکہ اب اس کے سربراہ حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی مدظلہ ہیں اور اہلِ تشیع اس بورڈ کا نہ صرف مسلسل حصہ ہیں بلکہ ممتاز شیعہ علماء اس کے مرکزی عہدہ دار بھی چلے آرہے ہیں۔

- ایران میں اہلِ سنت کے بزرگ عالمِ دین حضرت مولانا عبد العزیزؒ جو حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے تلامذہ میں سے تھے، ایرانی انقلاب کے بعد اس کی مرکزی کونسل اور دستور ساز اسمبلی کے ممبر رہے ہیں اور ایرانی دستور کی تشکیل میں ان کا اہم کردار ہے۔ حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور دوسرے علماء کرام کے ساتھ مجھے ۱۹۸۷ء میں ایران جانے کا موقع ملا تو ہم نے ایران میں حضرت مولانا عبد العزیزؒ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ انہوں نے ایرانی انقلاب اور دستور میں اپنے کردار کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ فرمایا، البتہ یہ شکایت کی کہ اب ایرانی راہنماؤں کا رویہ تبدیل ہوتا جارہا ہے اور وہ ان کی باتوں پر پہلے کی طرح توجہ نہیں دیتے۔
- افغانستان میں روسی استعمار کے خلاف جہاد میں اہلِ سنت کی نصف درجن کے لگ بھگ جہادی تنظیموں کے ساتھ ساتھ اہلِ تشیع کی "حزبِ وحدت" بھی جہادِ افغانستان کا حصہ رہی ہے اور ان تنظیموں کے درمیان اس دور میں اشتراک وتعاون بھی رہا ہے۔
- دینی مدارس کے تحفظ کے لیے تمام مکاتبِ فکر کے دینی مدارس کے وفاقوں کے اتحاد "اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ" میں وفاق المدارس الشیعہ شامل ہے جس کا ذکر محترم مولانا محمد یونس قاسمی نے بھی اپنے مضمون میں کیا ہے۔

اس لیے مولانا محمد یونس قاسمی صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ اصل الجھن انہیں صرف اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ وہ دونوں الگ الگ دائروں میں فرق نہیں کر پا رہے۔ اگر اس فرق کو وہ سنجیدگی سے محسوس کر لیں تو انہیں اکابر کے طرزِ عمل میں نہ کوئی تضاد نظر آئے گا اور نہ ہی یہ شکایت ہوگی کہ بزرگوں نے پہلے فیصلوں کے بعد نیا فیصلہ کرنے میں متعلقہ دوستوں کو اعتماد میں نہیں لیا۔ اکابر کے فیصلے فتوؤں کے دائرے میں مسلسل وہی چلے آرہے ہیں جو پہلے سے موجود ہیں اور معاشرتی روابط اور دینی تحریکات کے دائرے میں بھی ان کے فیصلوں کے تسلسل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ صرف دائروں کے فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اس کے بعد کسی دوست کے ذہن میں کوئی الجھن باقی نہیں رہے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- مئی ۲۰۱۱ء

مذکورہ بالا عنوان پر مولانا محمد یونس قاسمی، حافظ عبد المنان معاویہ اور راقم الحروف کی گزارشات ”الشریعہ“ کے مارچ اور اپریل کے شماروں میں قارئین کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ دونوں طرف سے ضروری باتیں سامنے آچکی ہیں اور اب کسی مزید بحث کی ضرورت باقی نہیں رہی، مگر مولانا محمد یونس قاسمی نے اپنے تازہ مضمون میں ایک دو باتیں ایسی فرمائی ہیں جن کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

انہوں نے راقم الحروف کے بارے میں فرمایا ہے کہ میں نے قرآن کریم کی کسی منسوخ آیت سے استدلال کیا ہے۔ حیرت کے ساتھ یہ بات پڑھنے کے بعد میں نے اس سلسلے کے اپنے مضامین پر پھر ایک نظر ڈالی ہے، اس لیے کہ میں نے تو اپنے مضامین میں قرآن کریم کی صرف ایک ہی آیت کریمہ کا حوالہ دیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ وماہم بمومنین وہ مومن نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور آیت کریمہ کا حوالہ میرے مضامین میں استدلال کے طور پر موجود نہیں ہے اور اس آیت کے منسوخ ہوجانے کا مجھے علم نہیں ہے۔ اگر اس کے منسوخ ہوجانے پر کوئی حوالہ موجود ہو تو میں اس سے باخبر ہونا چاہوں گا، خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ قرآن کریم کے اس جملے میں ان منافقین کے مومن نہ ہونے کی ”خبر“ دی گئی ہے جبکہ نسخ صرف احکام میں ہوتا ہے۔ ایمانیات اور اخبار نسخ کے دائرے کے امور نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے قرآن کریم کے حوالے سے ”مسجد ضرار“ کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے نسخ کی کوئی صورت بھی کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں نے اپنے سارے استدلال کی بنیاد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی طرزِ عمل اور معاشرتی رویے پر رکھی ہے کہ ان منافقین کے مومن نہ ہونے کے باوجود معاشرتی معاملات میں یہ لوگ نبی اکرمؐ کے ساتھ مسلسل شریک رہے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نہ صرف معاشرتی امور بلکہ مذہبی معاملات میں بھی اپنے ساتھ شریک رکھنے میں ہی مصلحت سمجھی ہے اور یہ سلسلہ نبی اکرمؐ کی حیات مبارکہ میں آخر تک رہا ہے۔ اخرج فانک منافق قسم کا کوئی واقعہ اگر ہوا بھی ہے تو وہ شخصی واقعہ ہے جسے نبی اکرمؐ کے عمومی رویے اور پالیسی کا آئینہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ طرز استدلال اہلِ حدیث حضرات کا ہے کہ کسی جزوی واقعہ یا ایک آدھ روایت کو بنیاد بنا کر پورے موقف کی عمارت کھڑی کر دیتے ہیں۔ احناف کا طرز استدلال اس سے بالکل مختلف ہے، ان کے ہاں مجموعی صورتحال کو سامنے رکھا جاتا ہے، صحابہ کرامؓ کے اجماعی تعامل کو دیکھا جاتا ہے، اور تمام متعلقہ

روایات جو میسر ہوں ان کا جائزہ لے کر موقف طے کیا جاتا ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل ان منافقین کے بارے میں یہ تھا کہ چند معروف منافقین کے علاوہ صحابہ کرامؓ کی صفوں میں موجود ان منافقین کی نشاندہی تک نہیں کی گئی۔ انہیں الگ کرنے اور معاشرتی طور پر انہیں علیحدہ قرار دینا تو بعد کی بات ہے، اس سے قبل ان کی جو نشاندہی ضروری قرار پاتی ہے اس کا مرحلہ بھی نہیں آیا۔ جناب نبی اکرمؐ نے صرف چودہ منافقین کے نام بتائے اور وہ بھی صرف حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کو، اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان میں سے کسی کا نام اور کسی کو نہیں بتائیں گے۔ حتٰی کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے انہیں کئی بار کرید کر پوچھنا چاہا مگر حضرت حذیفہؓ نے امیر المومنین حضرت عمرؓ کو بھی ان میں سے کسی منافق کا نام بتانے سے انکار کر دیا۔ جس پر حضرت عمرؓ نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا کہ کسی عام شخص کے جنازے پر اگر حضرت حذیفہؓ موجود ہوتے تو حضرت عمرؓ جنازہ پڑھتے تھے ورنہ یہ سوچ کر جنازہ پڑھنے سے گریز کرتے تھے کہ یہ میت کہیں ان چودہ منافقین میں سے کسی کی نہ ہو۔ جہاں منافقین کے ناموں تک کو خفیہ رکھنے کا اس قدر اہتمام موجود تھا وہاں معاشرتی طور پر انہیں الگ کر دینے اور ان کا بائیکاٹ کر دینے کی بات عملی طور پر کس طرح ممکن ہے؟

مولانا محمد یونس قاسمی کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ منافقین کے معاشرتی بائیکاٹ کی بات خود قرآن کریم نے ایک جگہ کی ہے جس کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۱۵ میں ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جو منافقین جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں آئے تھے، ان سے کہا گیا کہ اگلی جنگ میں تم مسلمانوں کے ساتھ شریک نہیں ہو سکو گے۔ چنانچہ غزوۂ خیبر میں وہ لوگ خواہش کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ نہیں جا سکے تھے۔ لیکن یہ مقاطعہ وقتی اور عارضی تھا اس لیے کہ سورۃ الفتح کی اس سے اگلی آیت ۱۶ میں ان منافقین سے کہا گیا ہے کہ:

> ”تمہیں عنقریب ایک اور قوم کے مقابلے میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی جو بڑی سخت پکڑ والی قوم ہے۔ تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اچھا اجر عطا کریں گے اور اگر تم پھر گئے جیسے تم اس سے پہلے پھر جاتے رہے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں سخت عذاب سے دوچار کر دے گا۔“

مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ یہ سخت پکڑ والی قوم (اولی باس شدید) جس کے مقابلے کے لیے منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کی قرآن کریم خود دعوت دے رہا ہے، مسیلمہ کذاب کی قوم تھی اور وہ قبیلے تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔ اس

لیے یہ کہنا کہ جناب نبی اکرمؐ نے آخری دور میں منافقین کو مسجدوں سے نکال دیا تھا اور انہیں اپنی صفوں سے الگ کر دیا تھا، ایک خواہش تو ہو سکتی ہے مگر امر واقعہ نہیں ہے۔ حتٰی کہ جب منافقین نے اپنی الگ مسجد بنا کر جداگانہ تشخص قائم کرنا چاہا تو قرآن کریم نے اسے ''مسجد ضرار'' قرار دے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں جانے سے منع کر دیا تھا اور جناب نبی اکرمؐ نے اس ''مسجد ضرار'' کو گرا کر بلکہ نذرِ آتش کر کے ان کے علیحدہ تشخص کے امکان کو ہی ختم کر دیا تھا۔

میری طالب علمانہ رائے کے مطابق وہ منافقین جنہیں قرآن کریم نے صراحتًا وما ہم بمومنین قرار دیا ہے اور وہ متذبذب اعرابی مسلمان جن کا قرآن کریم نے لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا کے عنوان سے ذکر کیا ہے، ان کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی پالیسی یہ رہی ہے کہ انہیں الگ تشخص قائم نہ کرنے دیا جائے بلکہ انہیں اپنے ساتھ رکھ کر ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے، اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی سرگرمیوں پر پوری نظر رکھتے ہوئے ان کے شر سے بچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی حکیمانہ پالیسی کا نتیجہ تھا کہ وہ منافقین جن کی تعداد غزوۂ احد کے موقع پر ایک ہزار میں سے تین سو بتائی جاتی ہے، اپنا الگ تشخص اور مورچہ قائم نہ کر سکنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ مسلم سوسائٹی میں تحلیل ہوتے چلے گئے اور جنگ یمامہ اور مرتدین کے خلاف جہاد کے بعد ان کا کوئی اکا دکا نشان بھی تاریخ کے تذکرے میں موجود نہیں ملتا۔

مولانا محمد یونس قاسمی نے ایک بار پھر فتوؤں کی بات چھیڑی ہے جبکہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ معاملہ فتاویٰ کے دائرے کا نہیں بلکہ معاشرتی اور قومی ضروریات کے دائرے کا ہے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند کے فتوٰی کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہمیں اس فتوے سے پوری طرح اتفاق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کے خاندانی شرعی قوانین کے تحفظ کے لیے ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے عنوان سے جو مشترکہ فورم کام کر رہا ہے اور اہلِ تشیع بھی اس کا حصہ ہیں، کیا دارالعلوم دیوبند اس سے الگ تھلگ ہے؟ اس بورڈ کی تو بنیاد ہی حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قدس اللہ سرہ العزیز کی صدارت میں رکھی گئی تھی اور وہ تاحیات اس کے صدر رہے ہیں۔ اور کیا حرمین شریفین میں اہلِ تشیع کو مسلمانوں کے ساتھ نمازوں، روزوں، حج، تراویح اور دیگر عبادات میں شریک ہونے سے روکنے کے لیے کوئی قدم اٹھایا گیا ہے؟ جن چند بزرگوں نے مقاطعہ کی بات کی ہے، وہ بھی ہمارے بزرگ ہیں، اکابر ہیں اور قابل احترام ہیں، لیکن آج بھی علماء امت کا اجماعی تعامل کیا ہے؟ اور ہمارے مراکز کی عملی پالیسی کیا ہے؟ اگر ہم شخصی آرا اور اجماعی تعامل میں فرق محسوس کرتے ہوئے اپنے اندر معروضی حقائق اور ملی ضروریات کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر سکیں تو اکابر کے عملی فیصلوں کی حکمتوں

کو سمجھنا آج بھی مشکل نہیں ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کی معروضی صورتحال اور چند تجاویز

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۵ اپریل ۲۰۱۱ء

شش ماہی امتحان کی تعطیلات کی وجہ سے گزشتہ تین دن سے کراچی میں ہوں اور حسب سابق جامعہ اسلامیہ کلفٹن اور جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن میں تخصص کی کلاسوں میں انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں پر گزارشات پیش کر رہا ہوں۔

اس دفعہ کراچی میں ایک نئی صورتحال سامنے آئی ہے کہ عرب ممالک کے موجودہ حالات بالخصوص بحرین کی شورش میں سعودی عرب کی مداخلت کے حوالے سے کراچی کی سڑکوں پر سعودی حکمرانوں کے خلاف بینرز آویزاں دیکھے جا رہے ہیں جن میں بحرین میں مداخلت پر سعودی عرب کے حکمران خاندان کے خلاف نعرہ بازی کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ عرب ممالک کی مجموعی صورتحال میں صرف بحرین کو عنوان بنا کر چلائی جانے والی یہ مخالفانہ مہم مخصوص فرقہ وارانہ تناظر میں ہی دیکھی جائے گی اور چونکہ بحرین میں یہ بحران سنی حکمرانوں اور شیعہ مظاہرین کے درمیان ہے اس لیے پاکستان میں اس حوالے سے پہلے موجود کشمکش کے ماحول میں ہمدردیوں اور حمایت کا تناظر بھی وہی ہوگا۔ اس لیے جہاں بحرین کے مظاہرین کی حمایت میں نعرہ بازی ہو رہی ہے وہاں سعودی عرب کے حکمران خاندان کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے حضرات بھی خاموش نہیں ہیں اور مسئلہ پر دونوں طرف سے سرگرمیاں دکھائی دینے لگی ہیں۔

اس پس منظر میں جامعہ بنوریہ سائیٹ کراچی کے مہتمم مولانا مفتی محمد نعیم نے شہر کے سرکردہ علماء کرام کا ایک بھرپور اجتماع جامعہ بنوریہ کی مسجد میں منعقد کیا جو بدھ (۱۳ اپریل ۲۰۱۱ء) کو ظہر کے بعد ہوا اور راقم الحروف کو بھی اس میں بطور مہمان خصوصی شرکت کا اعزاز بخشا گیا۔ کراچی کے بڑے علماء کرام میں سے مولانا اسعد تھانوی، مولانا تنویر الحق تھانوی، مولانا محمد اسلم شیخوپوری اور دیگر بزرگوں کے علاوہ مختلف دینی مدارس اور دینی جماعتوں کے ذمہ دار حضرات کی بڑی تعداد اجتماع میں شامل تھی اور بحرین کی صورتحال کے پس منظر میں سعودی حکمرانوں کی حمایت اور ان کے مقابل ایرانی حکمرانوں کی مخالفت میں گرما گرم تقریروں اور تبصروں کی فضا بن رہی تھی۔ راقم الحروف نے اس موقع پر جو

گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ میں مولانا مفتی محمد نعیم اور جامعہ بنوریہ کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے وقت کے ایک اہم مسئلہ پر کراچی کے سرکردہ علماء کرام کے اس اجتماع کا اہتمام کیا اور مجھے بھی اس میں حاضری کا شرف بخشا۔ اس وقت عرب دنیا میں جو عمومی سطح پر صورتحال درپیش ہے اس کا ایک حصہ بحرین کا مسئلہ بھی ہے جس پر اظہار خیال وجذبات کے لیے ہم سب یہاں جمع ہیں۔

عرب دنیا کی صورتحال اور استعماری ایجنڈا

میرا خیال ہے کہ ہمیں اس مسئلہ کو مجموعی صورتحال کے تناظر میں دیکھنا چاہیے اور میں عرب دنیا کی اس صورتحال کے چار مختلف پہلوؤں کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہوں گا۔

- عرب دنیا میں استعماری قوتوں کا سیاسی وفوجی تسلط ہے، مختلف ممالک بالخصوص حرمین شریفین کے اردگرد مغربی ممالک کی فوجیں بیٹھی ہیں جس کی وجہ سے تیل کے چشموں اور دیگر وسائل پر مغربی تسلط کے ساتھ ساتھ عرب عوام کی سیاسی آزادی اور عرب ممالک کی قومی خودمختاری ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔
- عرب ممالک کو اسرائیل کی مسلسل جارحیت کا سامنا ہے اور اسرائیل مغربی ممالک کی مکمل پشت پناہی کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ میں اپنا اثر ورسوخ اور جارحیت بتدریج بڑھاتا جا رہا ہے۔
- عرب ممالک کو ایران کے توسیع پسندانہ عزائم کا سامنا ہے، چار مختلف عرب ممالک میں اہلِ تشیع کی مقامی آبادی کو ایران کی طرف سے جو سپورٹ حاصل ہے وہ ایک مستقل مسئلہ بنتی جا رہی ہے، جسے اردن کے شاہ عبداللہ نے ایک موقع پر ان الفاظ میں تعبیر کیا تھا کہ عرب ممالک کے اہلِ سنت عوام شیعہ ہلال کے حصار میں ہیں۔ یعنی مختلف ممالک میں شیعہ آبادی کی ترتیب یوں ہے کہ وہ چاروں طرف سے اہلِ سنت کو گھیرے میں لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان شیعہ آبادیوں میں سیاسی سرگرمیوں کے رجحانات اور ایران کے ساتھ ان کے سیاسی تعلقات سے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے اس خطہ میں فاطمی حکومت کا دور واپس لانے کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔
- بیشتر عرب ممالک میں شخصی حکومتیں ہیں، وہ بادشاہت کی شکل میں ہوں یا فوجی ڈکٹیٹروں کی صورت میں، بہرحال شخصی آمریتیں ہیں۔ اور آج کے اس دور میں شخصی آمریتوں کے خلاف عوام کے جذبات کا بھڑکنا اور عوامی رائے کا منظم ہو کر حکومتوں کے سامنے آجانا ایک ایسی بات ہے جسے دنیا کے کسی بھی خطے میں نہیں روکا جا سکتا اور نہ ہی کسی ملک کے عوامی جذبات کی کلیتاً

نفی کی جا سکتی ہے۔

میری گزارش یہ ہے کہ ہم جس مسئلہ پر گفتگو کے لیے یہاں جمع ہیں اسے جزوی طور پر دیکھنے کی بجائے اس مجموعی تناظر میں دیکھنا چاہیے، ان سب پہلوؤں کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنا موقف اور پالیسی طے کرنی چاہیے اور مشرقِ وسطیٰ کی سنی شیعہ سیاست کے حوالے سے کوئی موقف طے کرتے ہوئے اس بات کا بہر حال لحاظ رکھنا چاہیے کہ

- ہماری کوئی بات اس خطہ میں استعماری قوتوں کے ایجنڈے اور تسلط کی حمایت نہ بن جائے،
- اسرائیل کے لیے تقویت کا باعث نہ ہو،
- اور عرب عوام کے اجتماعی جذبات اور سیاسی رجحانات کی نفی بھی اس سے نہ ہوتی ہو۔

مشرق وسطیٰ میں اہل تشیع کی سیاسی پیشرفت اور آلِ سعود

جہاں تک مشرقِ وسطیٰ میں اہلِ تشیع کی سیاسی پیشرفت اور اہلِ سنت کو اس سے در پیش خطرات و خدشات کا تعلق ہے میں خود اسے ایک عرصے سے محسوس کر رہا ہوں اور عرب اہلِ سنت کے ساتھ اس مسئلہ میں تعاون کو ضروری سمجھتا ہوں۔ جبکہ حرمین شریفین کا تقدس تو ایسا مسئلہ ہے جس کے سامنے تمام سیاسی مصلحتیں اور ترجیحات دم توڑ دیتی ہیں۔ اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مجھے آلِ سعود کے ساتھ بطور آلِ سعود کوئی ہمدردی نہیں ہے اور نہ ہی ان کے ماضی کا دفاع کرنا پسند کرتا ہوں، آلِ سعود کے گزشتہ پون صدی کے ماضی بلکہ اس سے پہلے کے دو صدیوں کے ماضی کے حوالے سے خود میرے تحفظات ہیں جن سے دستبردار ہونے کے لیے میں تیار نہیں ہوں۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود معروضی صورتحال یہ ہے کہ میرے خیال میں آلِ سعود اس وقت سعودی عرب کی سیاسی وحدت کی علامت ہیں، استعماری قوتیں سعودی عرب کو حصوں بخروں میں تقسیم کر کے جو مزید استعماری مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہیں ان کی راہ میں سعودی عرب میں سب سے بڑی رکاوٹ آلِ سعود ہیں۔

ایک سیاسی تجزیہ نگار کے طور پر میں دیکھ رہا ہوں کہ اگر آلِ سعود سعودی عرب حکومت کے اقتدار کے لیے منظر سے الگ ہو گئے تو سعودی عرب متحد نہیں رہ سکے گا اور عرب دنیا کے جغرافیائی منظر میں تبدیلی کے استعماری عزائم خدانخواستہ تکمیل کی طرف بڑھنے لگیں گے اور اس سے کہیں زیادہ حرمین شریفین کے تقدس و حرمت کا مسئلہ ہے۔ آلِ سعود اپنے بارے میں ہمارے تمام تر تحفظات کے باوجود حرمین شریفین کی جس طرح خدمت کر رہے ہیں، دنیا بھر سے آنے والے حجاج اور زائرین کو جس حسن و خوبی کے ساتھ سہولتیں فراہم کر رہے ہیں اور حرمین شریفین میں عبادات کے ماحول میں

جو امن و تحفظ اور نظم قائم ہے اس کا ڈسٹرب ہونا یقیناً ہمارے لیے بدقسمتی کی بات ہوگی۔ اس لیے موجودہ معروضی حالات میں آلِ سعود کے خلاف کسی بھی مہم کو میں عالمِ اسلام، عالم عرب اور حرمین شریفین کے مفادات کے خلاف سمجھتا ہوں اور اس حد تک آج کے اس اجتماع کے شرکاء کے جذبات میں ان کے ساتھ شریک ہوں۔

چند تجاویز

مگر میری گزارش ہے کہ اس کے لیے صرف یہ اجتماع کافی نہیں ہے، مولانا مفتی محمد نعیم اس آغاز پر شکریہ کے مستحق ہیں لیکن میرے نزدیک یہ صرف نقطۂ آغاز ہے اور اس کے لیے بہت سے سنجیدہ کام کی ضرورت ہے جس کے لیے چند تجاویز پیش کر رہا ہوں۔

- عالم عرب کی موجودہ صورتحال کا معروضی حقائق کی بنیاد پر جائزہ لے کر ارباب فکر و دانش کو ایک واقعاتی بریفنگ رپورٹ مرتب کرنی چاہیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے جا رہا ہے؟ ہمیں اپنے موقف اور پالیسی کی بنیاد اخباری خبروں، سنی سنائی باتوں اور جذباتی تقریروں پر نہیں رکھنی چاہیے بلکہ سنجیدہ اور باخبر اہل دانش کی تحقیقی اور تجزیاتی کاوشوں کو اس کی اساس بنانا چاہیے۔
- عرب حکومتوں کے ساتھ رابطوں کے حق میں تو میں بالکل نہیں ہوں اور نہ ہی یہ ہمارا مزاج ہے۔ البتہ عرب دنیا کے سرکردہ علماء کرام اور اہل دانش کے ساتھ ہمیں ضرور رابطہ کرنا چاہیے اور ان سے مشاورت کے ساتھ اپنی حکمت عملی اور پروگرام کا تعین کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک عرب دنیا کی دینی تحریکات کے ساتھ پاکستان کی دینی تحریکات، علمی مراکز اور جماعتوں کے مسلسل رابطے وقت کی اہم ضرورت ہیں۔
- مختلف عرب ممالک کے ماحول میں سنی شیعہ سیاست کے تفصیلی مطالعہ کی ضرورت ہے۔ مجھے مستقبل میں اس سیاست کے فروغ کے امکانات بہت واضح دکھائی دے رہے ہیں اس لیے اس محاذ پر کام کرنے والوں کو اس کے بارے میں تفصیلی اور حقیقی معروضی صورتحال کا مطالعہ کر کے پاکستان کے علماء کرام اور دینی کارکنوں کو اس سے واقف کرانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ جبکہ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اس قسم کے مطالعہ و تحقیق اور معروضی حالات سے آگاہی کو شجر ممنوعہ کا درجہ دے رکھا ہے۔
- ہم جن کی مدد کرنے جا رہے ہیں ان سے بھی پوچھ لینا چاہیے کہ انہیں ہماری مدد کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر ہماری مدد کی انہیں ضرورت یا کوئی فائدہ ہے تو وہ مدد کس شعبہ میں اور کس

انداز سے ہونی چاہیے؟ ایسا نہ ہو کہ ہم مدد کے نام پر ان کی مشکلات اور مسائل میں اور اضافہ کر دیں۔ ہمیں یہ منظر دوبارہ دنیا کے سامنے پیش نہیں کرنا چاہیے کہ افغانستان پر امریکی اتحاد کی فوج کشی کے موقع پر طالبان کی قیادت واضح طور پر کہہ رہی تھی کہ ہمیں اس وقت افرادی قوت کی مدد کی ضرورت نہیں ہے مگر ہمارے نوجوان اس کے باوجود پاک افغان سرحد پر جذباتی انداز میں جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے تھے۔

- اور سب سے زیادہ ضروری یہ بات ہے کہ اس مسئلہ پر ہمارے ہاں قومی سطح پر مشاورت ہو، بڑے دینی مدارس اور دینی جماعتوں کے قائدین کو مل بیٹھ کر صورتحال کا جائزہ لینا چاہیے اور ایک مشترکہ حکمت عملی باہمی مشاورت کے ساتھ طے کرنی چاہیے تاکہ ہم اس حوالے سے صحیح کردار ادا کر سکیں اور یہ مسئلہ ہمارے درمیان کسی نئے خلفشار کا عنوان نہ بن جائے۔

خلافت و امامت:
اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کا بنیادی اختلاف

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مئی ۲۰۱۱ء

جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں دورۂ حدیث کے طلبہ کے لیے ہر جمعرات کو ایک تعلیمی گھنٹہ فکری نوعیت کے مسائل اور حالات حاضرہ کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ اس سال پہلی اور دوسری سہ ماہی کے دوران مختلف ادیان کے تعارف اور ان کے بارے میں ضروری معلومات پر گفتگو ہوتی رہی، جبکہ ششماہی امتحان کے بعد سالانہ امتحان تک انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات کے حوالہ سے مسلمانوں اور اہل مغرب کے درمیان جاری فکری تہذیبی کشمکش سے متعلقہ چند امور پر گفتگو ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ گزشتہ سے پیوستہ جمعرات کو اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان خلافت و امامت کے مسئلہ پر اختلاف کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کی گئیں، جن کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے مابین نزاعی اور اختلافی مسائل میں ایک اہم مسئلہ خلافت و امامت کا ہے جس کے مختلف پہلوؤں پر صدیوں سے گفتگو اور مباحثہ جاری ہے، اس کے صرف ایک پہلو پر کچھ ضروری باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اصل مسئلہ اصولی طور پر ہے کیا اور اس میں اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے مابین مابہ النزاع امور کیا ہیں؟

اہلِ تشیع کا عقیدہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جانشین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو

نامزد کر دیا تھا، اس حیثیت سے وہ وصی رسول اللہ ہیں اور یہ کلمہ اہلِ تشیع کے ایمانیات اور اذان کا حصہ ہے۔ جبکہ اہلِ سنت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے اپنا جانشین خود نامزد کرنے کی بجائے اس کا انتخاب امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد کھلے مباحثہ اور اجتماعی صوابدید کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کو نبی اکرمؐ کا جانشین منتخب کیا تھا۔ چنانچہ اہلِ تشیع کے نزدیک رسول اکرمؐ کے جانشین حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں اور یہ منصب ''امامت'' کے عنوان سے موسوم ہے، مگر اہلِ سنت کے نزدیک جناب نبی اکرمؐ کے جانشین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ منصب خلافت کہلاتا ہے۔ خلافت و امامت کے ان دو فلسفوں میں چند بنیادی فرق ہیں جن کو ملحوظ رکھنا اس اختلاف کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

1. پہلا فرق تو یہی اصطلاح کا ہے کہ اہلِ سنت جانشینِ رسولؐ کو ''خلیفۃ الرسول'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور اہلِ تشیع اسے ''امام'' اور ''وصی'' کے عنوان سے ذکر کرتے ہیں۔
2. دوسرا فرق یہ ہے کہ ''خلیفہ'' نامزد نہیں ہوتا بلکہ امت اپنی صوابدید اور اجتماعی رائے کے ذریعے اس کا انتخاب کرتی ہے، مگر ''امام'' کے انتخاب میں رائے عامہ اور امت کی صوابدید کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور یہ منصب نامزدگی اور وصیت کے ذریعے تشکیل پاتا ہے۔
3. تیسرا فرق یہ ہے کہ ''امام'' اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نبی کی براہ راست راہنمائی فرماتے ہیں، اسی طرح امام کی بھی اللہ پاک راہنمائی خود کرتے ہیں، اس لیے امام جو بھی کہتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ جبکہ خلیفہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کرنے کی بجائے نبی اکرمؐ کے نائب اور ''خلیفہ'' کے طور پر امت کی قیادت کرتا ہے۔ جیسا کہ قاضی ابو یعلی نے ''الاحکام السلطانیہ'' میں ذکر کیا ہے کہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ایک شخص نے یا خلیفۃ اللہ کہہ کر خطاب کیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے اسے ٹوک دیا اور فرمایا کہ میں اللہ کا نہیں اللہ کے رسولؐ کا خلیفہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کو ''خلیفۃ رسول اللہ'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور ہمارے فقہاء کرام نے خلیفہ کی جو تعریف کی ہے اس میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو امت مسلمہ کی اجتماعی امور میں قیادت کرے اور نبی اکرمؐ کی نیابت کرتے ہوئے آپؐ کی ہدایات اور سنت کے مطابق حکومت و ریاست کے معاملات سرانجام دے۔ یہ فرق بہت بنیادی اور اہم ہے اس لیے کہ جب کوئی شخص براہ راست اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتا ہے تو وہ کوئی دلیل پیش کرنے کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کی صرف یہ بات کافی ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے میری یوں راہنمائی فرمائی ہے۔ لیکن جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرنے والے کو نبی اکرمؐ کا کوئی حوالہ دینا ہوتا ہے، اس کے بغیر اس کی کوئی بات نبی اکرمؐ کی بات نہیں کہلا سکتی، گویا خلیفہ دلیل اور حوالہ کا پابند ہے اور امام کے لیے کوئی حوالہ دینا ضروری نہیں ہے، اور خود دلیل اور اس کی ہر بات تسلیم کی جائے گی اس لیے کہ وہ خدا کا نمائندہ ہے۔

4. چوتھا فرق یہ ہے کہ امام اللہ تعالیٰ کا براہ راست نمائندہ ہونے کی حیثیت سے معصوم عن الخطا ہے اور اس کی کسی بات کو خطا سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ خلیفہ معصوم نہیں ہے بلکہ اس کا شرعی درجہ مجتہد کا ہے اور مجتہد کے فیصلوں میں صواب اور خطا دونوں کا احتمال یکساں قائم رہتا ہے۔ اہلِ سنت کا اصول ہے کہ المجتہد یخطی و یصیب مجتہد خطا کا مرتکب بھی ہوتا ہے اور صواب کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ اس لیے مجتہد کی کسی بھی بات سے علمی دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا ہے اور خلفاء راشدین اور ائمہ مجتہدین کے فیصلوں سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے۔ مگر امام معصوم ہوتا ہے اور اس کی رائے میں خطا کا احتمال نہیں ہے اس لیے اس کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ دونوں بزرگوں کے خلیفہ کی حیثیت سے پہلے خطبوں میں صراحت موجود ہے کہ ہم قرآن و سنت کے مطابق حکومت کریں گے اور اسی وجہ سے تم پر ہماری اطاعت ضروری ہے، اگر ہم قرآن و سنت کے پابند رہیں تو ہمارا ساتھ دو اور اگر ہم قرآن و سنت سے ہٹتے ہوئے نظر آئیں تو ہماری اطاعت تم پر ضروری نہیں ہے۔ اس حوالے سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں دلیل کی بنیاد پر قائم ہونے والی پہلی حکومت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تھی اس لیے کہ بادشاہت میں بادشاہ خود اتھارٹی ہوتا ہے جبکہ اللہ کا نبی بھی خود اتھارٹی ہوتا ہے، اسی طرح آج کے دور کی پارلیمنٹ بھی خود اتھارٹی تصور کی جاتی ہے کیوں کہ وہ کسی طے شدہ قانون کی پابند ہونے کی بجائے خود قانون بنانے اور اس میں ردوبدل کی مجاز ہوتی ہے۔ مگر ایسی حکومت جو کسی طے شدہ قانون کی پابند ہو اور اسے اس قانون میں رد و بدل کا اختیار بھی نہ ہو صرف ”خلافتِ اسلامیہ“ ہے، اس کے علاوہ کسی حکومت کو بھی خواہ وہ شخصی ہو، جماعتی ہو یا پارلیمانی ہو، علی الاطلاق دلیل کی حکومت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

5. خلافت اور امامت میں پانچواں فرق یہ ہے کہ خلیفہ عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے اور پبلک کا کوئی بھی شخص خلیفہ کے کسی بھی فیصلے پر سرعام روک ٹوک کر سکتا ہے۔ جبکہ امام کی

رائے حتمی ہوتی ہے اور وہ کسی کے سامنے بھی جواب دہ نہیں ہوتا۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت سنبھالتے ہی اپنے پہلے خطبہ میں عوام کے اس حق کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا تھا کہ ''اگر میں سیدھا چلوں تو میری معاونت کرو اور اگر میں ٹیڑھا ہونے لگوں تو مجھے سیدھا کرو''۔ یہاں ایک نکتہ کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ حضرت صدیق اکبرؓ یہ نہیں فرما رہے کہ اگر میں ٹیڑھا چلوں تو مجھے بتا دو اور ٹوک دو بلکہ یہ فرما رہے ہیں کہ مجھے سیدھا کر دو۔ یعنی عام آدمی کا حق خلیفہ کو اس کے غلط فیصلے پر صرف غلطی سے آگاہ کرنا نہیں ہے بلکہ اسے سیدھا کر دینے کا حق بھی اسے حاصل ہے۔ اسی کو آج کی دنیا میں عوام کا حق احتساب کہا جاتا ہے اور اسلام میں خلیفہ نہ صرف عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے بلکہ عوام کو اس کے احتساب کا حق بھی حاصل ہے۔

6. خلافت اور امامت کے تصور میں اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان چھٹا فرق یہ ہے کہ امامت نسبی اور موروثی ہے جیسا کہ اہلِ تشیع کے بارہ اماموں سے واضح ہے۔ جبکہ خلافت نسبی اور موروثی نہیں ہے اس لیے کہ حضرت ابوبکرؓ جناب نبی اکرمؐ کے نسبی وارث نہیں تھے اور نہ ہی چاروں خلفاء راشدینؓ میں سے کوئی ایک دوسرے کا نسبی وارث ہے۔

اہلِ سنت کے تصور خلافت اور اہلِ تشیع کے تصور امامت میں چند اہم فرق میں نے واضح کیے ہیں۔ اور اس حوالے سے یہ بات بھی آپ حضرات کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ ایرانی انقلاب کے بعد ایران میں اثنا عشریہ اہلِ تشیع کی جو مذہبی حکومت قائم ہوئی ہے اس کی دستوری بنیاد اسی امامت کے فلسفہ پر ہے، انہوں نے آج کے حالات کے تناظر میں جمہوریت، پارلیمنٹ اور ووٹ کو حکومت کی تشکیل کا ذریعہ ضرور بنایا ہے مگر دستور کی اساس ''ولایت فقیہ'' پر رکھی ہے۔ ان کے نزدیک جو بارہویں امام غائب ہیں اصل حکومت ان کی ہے، ان کی نیابت ''ولایت فقیہ'' کے عنوان سے ایک متفق علیہ فقیہ کرتے ہیں جو پہلے خمینی صاحب تھے اور ان کے بعد اب خامنائی صاحب ہیں۔ وہ پورے دستور و قانون اور ریاست و حکومت کے نگران اعلیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے ساتھ فقہاء اور ماہرین قانون کی ایک کونسل ''شورائے نگہبان'' کے عنوان سے ان کی مشیر و معاون ہے مگر اصل اتھارٹی ولایت فقیہ کے طور پر خامنائی صاحب کے پاس ہے اور انہیں یہ اختیار حاصل ہے کہ صدر، حکومت اور پارلیمنٹ سمیت کسی بھی ادارے کے فیصلے کو ویٹو کر سکتے ہیں۔ ان کے اس ویٹو کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہے اور یہی وہ دستوری شکل ہے جو اہلِ تشیع نے آج کے حالات کے تناظر میں اپنے تصور امامت کو دی ہے۔

جبکہ اہلِ سنت کی طرف سے خلافت کو دستوری ڈھانچہ فراہم کرنے کے لیے ابھی تک کوئی عملی پیشرفت نہیں ہوئی، پاکستان کے دستور میں ”قرار داد مقاصد“ کی صورت میں ایک اچھا آغاز ہوا تھا جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے جمہور کے نمائندوں کے ذریعے اس کی عملداری کی بات کی گئی ہے اور دستور میں قرآن و سنت کے قوانین کے نفاذ کی ضمانت اور قرآن و سنت کے منافی قانون سازی کی نفی کے ذریعے اس کی عملی شکل پیدا کی گئی ہے، لیکن دستور پر قرآن و سنت کی غیر مشروط بالادستی کے بارے میں تذبذب ابھی تک موجود ہے جو نفاذِ شریعت کی راہ میں اصل رکاوٹ ہے کیونکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں قرآن و سنت کا کوئی قانون از خود نافذ ہونے کی بجائے اپنے نفاذ اور عملداری کے لیے پارلیمنٹ کی منظوری کا محتاج اور اس پر موقوف ہے جس سے اصل بالادستی پارلیمنٹ کی تصور ہوتی ہے۔

پاکستان چونکہ اسلامی تشخص کے اظہار کے لیے ایک مستقل اور الگ ملک کی صورت میں وجود میں آیا تھا اور اسی اساس پر پاکستان کے دستوری ڈھانچے کی تشکیل ہوئی ہے، اس لیے یہ پاکستانی پارلیمنٹ کی دستوری، شرعی اور اخلاقی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس کنفیوژن کو دور کرے۔ ہمارے خیال میں اگر دستور میں قرآن و سنت کی غیر مشروط بالادستی تسلیم کر کے اس کی نگرانی کے لیے اہلِ سنت کے تمام مکاتبِ فکر کے اکابر علماء کرام کی ایک بااختیار کونسل ایران کی شورائے نگہبان کی طرز پر قائم کر دی جائے تو اہلِ سنت کے نظام خلافت کو بھی آج کے عالمی حالات کے تناظر میں کسی حد تک ایک دستوری ڈھانچہ فراہم ہو سکتا ہے جیسا کہ ایران کے دستور میں اہلِ تشیع کے نظام امامت کو فراہم کیا گیا ہے، چنانچہ اس طرح چند اسلامی ممالک میں اس اساس پر اسلامی امارتیں قائم ہونے کے بعد عالمی سطح پر خلافتِ اسلامیہ کے باقاعدہ قیام کی بھی کوئی عملی صورت سامنے آسکتی ہے۔

مشترکہ دینی تحریکات
اور حضرت امام اہلِ سنتؒ

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- نومبر ۲۰۱۱ء

تحریکِ ختمِ نبوت، تحریکِ تحفظِ ناموسِ رسالت اور تحریکِ نفاذِ شریعت کے لیے مشترکہ دینی تحریکات میں اہلِ تشیع کی شمولیت پر ہمارے بعض دوستوں کو اعتراض ہے۔ یہ اعتراض ان کا حق ہے اور اس کے لیے کسی بھی سطح پر کام کرنا بھی ان کا حق ہے۔ اسی طرح اعتراض کو قبول نہ کرنا ہمارا بھی حق

ہے جس کے بارے میں ہم نے مختلف مواقع پر اپنے موقف کا تفصیل کے ساتھ اظہار کیا ہے اور ضرورت کے مطابق آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اس سلسلے میں ہمارے والد گرامی امامِ اہلِ سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کا نام کثرت سے استعمال کیا جا رہا ہے جو محلِ نظر ہے اور اس حوالے سے حضرت امامِ اہلِ سنتؒ کی زندگی کے چند اہم مراحل کی طرف توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے:

- قیامِ پاکستان سے قبل حضرت امامِ اہلِ سنت مجلسِ احرارِ اسلام کے باقاعدہ کارکن رہے ہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس دور میں آل انڈیا مجلسِ احرارِ اسلام کے سیکرٹری جنرل معروف شیعہ عالم دین مولانا مظہر علی اظہر تھے۔
- قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختم نبوت میں حضرت امامِ اہلِ سنتؒ شریک رہے ہیں اور متعدّد جلوسوں کی قیادت کی ہے بلکہ از خود گرفتاری دے کر کم و بیش نو ماہ جیل میں رہے ہیں۔ اس تحریک کی قیادت میں اہلِ تشیع شریک تھے۔
- ۱۹۵۱ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی صدارت میں تمام مکاتبِ فکر کے اکابر ۳۱ علماء کرام کے طے کردہ ۲۲ متفقہ دستوری نکات کی حضرت امامِ اہلِ سنتؒ نے ہمیشہ حمایت کی ہے اور وہ ملک میں ان کے نفاذ کا مسلسل مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ ان ۲۲ نکات کی ترتیب و تدوین میں بھی اکابر شیعہ علماء شریک تھے۔
- ۱۹۷۷ء میں نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کی تحریک میں حضرت امامِ اہلِ سنتؒ نے بھرپور کردار ادا کردار ادا کیا ہے، عوامی جلوسوں کی قیادت کرتے رہے اور ایک جلوس کی قیادت کر کے از خود گرفتاری پیش کی جس کے نتیجے میں وہ اپنے فرزند مولانا عبدالحق خان بشیر کے ہمراہ ایک ماہ تک ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں قید رہے ہیں۔ اس تحریک کی قیادت میں بھی اہلِ تشیع شریک تھے۔
- ۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں امامِ اہلِ سنتؒ نے حضرت السید مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی قیادت میں بھرپور کردار ادا کیا ہے اور اس تحریک کی مرکزی مجلسِ عمل میں اہلِ تشیع شریک تھے۔
- مشترکہ دینی و سیاسی تحریکات میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کی شمولیت کے مسئلہ پر اختلاف کے باعث حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ، حضرت مولانا عبداللطیف جہلمیؒ اور ان کے رفقاء نے جمعیۃ سے الگ ہو کر جب تحریکِ خدامِ اہلِ سنت قائم کی تو حضرت امامِ اہلِ سنتؒ نے اپنے ان بزرگ دوستوں کے تمام تر احترام اور ان کی دینی خدمات کے بھرپور اعتراف کے باوجود ان کا

ساتھ نہیں دیا اور اس کے بعد بھی جمعیۃ علماء اسلام کے پلیٹ فارم پر مشترکہ دینی تحریکات میں انہوں نے ہمیشہ حصہ لیا ہے۔

- حضرت امامِ اہلِ سنتؒ کی علالت کے دور میں جب متحدہ مجلسِ عمل تشکیل پائی تو انہوں نے عام انتخابات میں متحدہ مجلسِ عمل کی کھل کر حمایت کی اور اپنے ساتھیوں کو اس میں کام کرنے کی ہدایت کی، جبکہ متحدہ مجلسِ عمل کی قیادت میں اہلِ تشیع موجود تھے۔ اور اپنے حلقہ سے حضرت امام اہلِ سنتؒ نے قومی اسمبلی کے لیے متحدہ مجلسِ عمل کے جس امیدوار جناب قدرت اللہ بٹ کی حمایت کی، ان کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے بلکہ وہ اس وقت جماعت اسلامی ضلع گوجرانوالہ کے امیر تھے۔

متحدہ مجلسِ عمل کے قیام کی تائید اور حمایت اس حوالے سے بطور خاص قابلِ توجہ ہے کہ بعض حضرات یہ استدلال پیش کر رہے ہیں کہ حضرت امام اہلِ سنتؒ نے ''ارشاد الشیعہ'' تصنیف کر کے دینی تحریکات میں اہلِ تشیع کی شمولیت کے حوالے سے اپنے سابقہ موقف سے رجوع کر لیا تھا، حالانکہ ارشاد الشیعہ کا سنِ تصنیف ۱۹۸۷ء ہے جبکہ متحدہ مجلسِ عمل کا قیام ان کی عمر کے آخری دور میں جنرل پرویز مشرف کے زمانے میں ہوا تھا۔

مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں اپنے ان دوستوں سے میری گزارش ہے کہ وہ دینی تحریکات میں اہلِ تشیع کی شمولیت پر اپنے اعتراض کا حق ضرور استعمال کریں اور اس کے لیے جائز حدود میں مہم بھی چلائیں لیکن مشترکہ دینی تحریکات کی حد تک اس سلسلہ میں امامِ اہلِ سنتؒ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا نام استعمال نہ کریں، اس لیے کہ امامِ اہلِ سنتؒ خود زندگی بھر ایسی تحریکات کا حصہ رہے ہیں۔

ایران میں زواجِ متعہ کا قانونی فروغ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۱۱ء

نیویارک سے شائع ہونے والے عربی جریدہ ''غربۃ'' نے ۱۱ نومبر ۲۰۱۱ء کی اشاعت میں خبر دی ہے کہ ایرانی حکومت نے نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی پر قابو پانے کے لیے زواج مؤقت (متعہ) کو قانونی حیثیت دینے کا اعلان کیا ہے اور عام شاہراہوں پر اس مقصد کے لیے مراکز قائم کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ خبر کے مطابق ان مراکز کو ''بیوت العفاف'' کا نام دیا گیا ہے اور ایک سرکاری اعلان میں کہا گیا ہے کہ غیر رسمی جنسی تعلقات کو کنٹرول کرنے کی غرض سے ''زواج مؤقت'' کو فروغ

دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قم، مشہد اور طہران کے مذہبی مراکز نے اس سے اتفاق کر لیا ہے جبکہ ان جنسی مراکز میں ۵۰ ڈالر سے ۱۱۰ ڈالر فی شب تک نرخ بھی متعارف کر لیا گیا ہے اور اس کا نصف منافع دینی مدارس و مراکز کے لیے مخصوص کیا جا رہا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ شاہ ایران کے دور میں اس قسم کے مراکز موجود تھے جنہیں مذہبی انقلاب کے بعد خمینی نے بند کرا دیا تھا اور زواج متعہ پر قانوناً پابندی لگا دی تھی۔ مگر ۱۹۹۱ء میں ایرانی صدر ہاشمی رفسنجانی نے یہ پابندی ختم کر کے متعہ کی پھر سے اجازت دے دی تھی اور اب موجودہ حکومت نے اسے قانونی شکل دینے کے لیے مذکورہ بالا پیشرفت کا اعلان کیا ہے۔

"متعہ" کا ذکر نکاح کے حوالہ سے بیسیوں احادیث میں موجود ہے اور ان میں اس بات کا تذکرہ بھی ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں متعہ کے نکاح کو تسلیم شدہ نکاح کی حیثیت حاصل تھی اور ابتدائے اسلام میں غزوۂ خیبر تک یہی پوزیشن رہی ہے۔ مگر اس کے بعد جناب نبی اکرمؐ نے اس کی ممانعت کا اعلان فرما دیا تھا اور قرآن کریم نے سورۃ المؤمنون کی آیت ۶ و ۷ میں باقاعدہ بیوی اور شرعی لونڈی کے سوا کسی بھی عورت کے ساتھ جنسی تعلق کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے، مگر اہلِ تشیع کے نزدیک نکاح متعہ منسوخ نہیں ہوا اور اب بھی ان کے نزدیک اس کی شرعی اجازت موجود ہے۔

راقم الحروف کو ۱۹۸۷ء میں مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ، حافظ حسین احمد اور دیگر علماء کرام کے ہمراہ ایران کے گیارہ روزہ دورہ کے دوران ایران کے سب سے بڑے مذہبی شہر قم کے بعض مذہبی مدارس میں جانے اور مختلف اساتذہ کے اسباق سننے کا موقع ملا تھا۔ اسی دوران مدرسہ فیضیہ کے ایک عمر رسیدہ مدرس کا، جو آیت اللہ کے درجہ کے عالم تھے، لیکچر بھی سنا جس میں انہوں نے متعہ کے جواز پر دلائل دیے تھے اور برطانوی مفکر برٹرینڈ رسل کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ برائی کو پورے معاشرے میں پھیلنے کا موقع دینے کی بجائے چند مقامات تک محدود کر دینا چاہیے۔ اس سے برٹرینڈ رسل نے تو شاید قحبہ خانوں کے قانونی جواز پر استدلال کیا ہو گا مگر مذکورہ مذہبی راہنما کا کہنا تھا کہ برائی کو محدود قانونی جواز دینے سے معاشرے میں برائی کا پھیلاؤ رک جاتا ہے اس لیے ہم متعہ کے تسلسل کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔

یہ فلسفہ مغربی دانشوروں کا ہے کہ برائی کو اگر پھیلنے سے روکا نہ جا سکے تو اسے محدود دائرہ میں قبول کر لیا جائے جیسا کہ امریکہ میں اب سے پون صدی قبل شراب بنانے، بیچنے اور پینے پلانے پر قانونی پابندی تھی اور اس کی باقاعدہ سزا مقرر تھی۔ لیکن جب پولیس کی طرف سے پے در پے رپورٹیں آنے لگیں کہ اس قانون پر عمل کرانا اس کے بس میں نہیں ہے تو اس بے بسی کو قانونی جواز کی شکل میں

تبدیل کر دیا گیا اور کچھ شرائط عائد کر کے شراب کی فروخت اور پینے پلانے کی اجازت دے دی گئی۔ جبکہ اسی لہجے میں اب بعض مغربی حلقے اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ہیروئن پر سخت ترین پابندیوں کے باوجود اسے روکا نہیں جا سکا اس لیے اس کے محدود اور مشروط قانونی جواز کی صورتیں تلاش کی جانی چاہئیں۔

مگر اسلام اس فلسفہ کا قائل نہیں ہے اور اس کے نزدیک شر اور برائی پر قابو پانا اور اس کو پھیلنے سے روکنا بہر حال ریاست اور حکومت کی ذمہ داری ہے، اسلام خیر اور شر کے فیصلوں اور نیکی یا بدی کے معاملات کو سوسائٹی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتا بلکہ سوسائٹی کو خیر و شر کے دائرے میں لانے اور پابند رکھنے کو ریاست و حکومت کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ ''زواج مؤقت'' کو قانونی حیثیت دینے کے لیے ایرانی حکومت جتنے جواز بھی پیش کرے ان سب کے باوجود یہ فیصلہ بہر حال برائی کو ختم کرنے کی بجائے اسے قبول کر لینے کا فیصلہ ہے اور برائی کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا طرز عمل ہے جس پر افسوس کا اظہار ہی کیا جا سکتا ہے۔

حضرت شیخ احمد فاروقی المعروف مجدد الف ثانیؒ اور ان کی جدوجہد

الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ --- جنوری ۲۰۱۲ء

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ سب سے پہلے تو اِس خطاب یعنی ''مجددِ الفِ ثانی'' کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ''الف'' ہزار کو کہتے ہیں۔ ''الفِ ثانی'' یعنی دوسرا ہزاریہ۔ مطلب یہ ہوا کہ ایک ہزار سال گزرنے کے بعد جو دوسرا ہزاریہ شروع ہوا تھا مجدد صاحب اس کے آغاز میں آئے۔ وہ دسویں صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوئے اور ان کی محنت کا جو دورانیہ ہے وہ گیارہویں صدی کے پہلے تین عشرے ہیں۔ ۱۰۳۲ء تک حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنی علمی و دینی خدمات سرانجام دیں۔ چنانچہ انہیں دوسرے ہزاریے کا مجدد کہا جاتا ہے۔

''مجدد'' ہماری شرعی اصطلاح ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ پاک ہر صدی کے آغاز میں ایک عالم، ایک شخصیت کو بھیجتے ظاہر کرتے ہیں جس کا کام یہ ہوتا ہے کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دین میں جو کمی بیشی ہوتی ہے ان کی اصلاح کرتا ہے اور دین کو اصلی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ ایک فرد بھی ہوتا ہے، کئی افراد بھی ہوتے ہیں، جماعتیں بھی ہوتی

ہیں۔ الغرض حالات کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ دین کی تجدید کا کام اشخاص سے یا جماعتوں سے لیتے رہتے ہیں۔ اور تجدید کا معنٰی یہ ہے کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دین میں جو رسوم وغیرہ شامل ہوتی رہتی ہیں ان کی چھانٹی کر کے اسلام کو اس کی اصل صورت میں پیش کرے اور لوگوں کو بتائے کہ یہ دین کا اصل ہے اور فلاں فلاں چیزیں اس میں زائد ہیں۔ یا پھر یہ کہ دین کے جو احکام و تعلیمات پس پشت چلے جاتے ہیں ان کو از سر نو لوگوں کے سامنے پیش کرے۔

حضرت مجدد صاحبؒ صدی کے مجدد تھے لیکن انہیں ہزار سال کا مجدد کہا جاتا ہے۔ مجدد الف ثانی، یعنی دوسرے ہزار سال کے مجدد۔ حالانکہ مجدد تو ہزار سال کا نہیں ہوتا مجدد کی ضرورت تو وقتاً فوقتاً پڑتی رہتی ہے۔ اگر اس اصطلاح میں بھی بات کریں تو یہ گیارہویں صدی کے مجدد ہیں لیکن معروف ''مجدد الف ثانی'' یعنی دوسرے ہزار سال کے مجدد کے نام سے ہوئے۔ اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ وہ یہ کہ دسویں صدی کے اختتام پر ہندوستان میں اکبر بادشاہ کے نام سے ایک بادشاہ گزرا ہے، اسے مغلِ اعظم بھی کہتے ہیں اور اکبر اعظم بھی۔ دنیا کے اعتبار سے بڑا باجبروت حکمران تھا، اس کی بڑی سلطنت تھی اور اس نے بڑی حکومت کی۔ اکبر نے دین کے حوالے سے کچھ اضافے اور تبدیلیاں کی تھیں۔ ان تبدیلیوں کے بارے میں اس سے یہ کہا گیا کہ دین کا ایک ہزار سال پورا ہو گیا ہے اب نئے ہزار سال کے لیے دین کی نئی تعبیر وتشریح کی ضرورت ہے۔ اکبر اعظم کو اگلے ہزار سال کے لیے مجتہدِ اعظم کا لقب دے کر دین کا داعی اور شارح کہا جاتا تھا کہ اگلے ہزار سال کے لیے اس کا دین چلے گا۔ اور اس کے دین کو ''دین الٰہی'' کا نام دیا گیا۔ چونکہ دین الٰہی والوں کا دعویٰ ہزار سال کا تھا کہ اگلے ہزار یے کے لیے اکبر کا دین چلے گا۔ اس لیے اس کے جواب میں مجدد صاحب کو بھی الف ثانی کا خطاب دیا گیا کہ دین الٰہی کے خلاف وہ میدان میں آئے اور انہوں نے سب سے زیادہ اس کا مقابلہ کیا چنانچہ وہ مجدد الف ثانی کہلانے لگے۔

شیخ احمد ان کا اصل نام ہے جو کہ کم لوگوں کو معلوم ہے۔ سرہند، مشرقی پنجاب میں ایک علاقہ ہے یہ وہاں کے بزرگ تھے اور نقشبندی خاندان کے بڑے مشائخ میں سے تھے۔ اللہ پاک نے بڑے علم اور فضل سے نوازا تھا۔ روحانی اعتبار سے بھی اور علمی اعتبار سے بھی بڑے اونچے مقام پر فائز کیا تھا۔ عالم بھی چوٹی کے تھے اور صوفیاء میں بھی ان کا بڑا مقام تھا۔ نقشبندی سلسلے میں اپنے دور کے بڑے صوفی تھے اور نقشبندی سلسلے میں بھی ان کو مجدد کی حیثیت حاصل ہے کہ ان سے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوتا ہے۔ حضرت شیخ احمد فاروقی، المعروف مجدد اَلف ثانیؒ۔ اکبر کا دور ان کے سامنے نہیں گزرا لیکن اکبر کے جانشین جہانگیر کا دور ان کے سامنے گزرا۔ مغل بادشاہ جہانگیر مجدد صاحب کا معاصر تھا۔ اس کے

اول دور میں مجدد صاحب قید رہے جبکہ بعد کے دور میں اس کے مصاحب بھی رہے۔ مجدد صاحب کی ساری محنت کا میدان جہانگیر بادشاہ کا دور تھا۔

تصوف کی اصلاح

وہ مختلف میدان جن میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے سب سے زیادہ محنت کی ان میں ایک میدان تصوف کا ہے۔ تصوف میں بہت سی باتیں ایسی شامل ہوگئی تھیں اور بہت سے رجحانات ایسے آگئے تھے جو شریعت سے مطابقت نہیں رکھتے تھے، شرعی حدود سے بڑھ گئے تھے اور غلو کے زمرے میں آتے تھے۔ چنانچہ مجدد صاحب کا ایک میدان تھا تصوف کی اصلاح اور تصوف میں حد سے بڑھ جانے والے جو کام تھے ان کی نشاندہی۔ مجدد صاحبؒ تصوف کو اس کے اصل رخ پر لائے کہ اصل تصوف کی بنیاد شریعت ہے۔ جو چیز شریعت کے مطابق ہے تصوف میں وہ درست ہے اور جو شریعت کے دائرے کی نہیں ہے وہ تصوف میں بھی درست نہیں ہے۔ جب ایک کام چلنے لگتا ہے تو بہت سی باتیں شامل ہونے لگتی ہیں کچھ جائز اور کچھ ناجائز۔ تو مجدد صاحبؒ کا ایک میدان یہ تھا کہ تصوف میں جو نئے ایسے رجحانات آگئے تھے جو اسلامی عقائد اور شریعت کے احکام سے ٹکراتے تھے مجدد صاحب نے ان کی چھانٹی کی ان صفائی کی اور اصل تصوف جو شریعت اور احکام اسلام کے دائرے کی چیز ہے اسے واضح کیا ہے۔ چنانچہ انہیں مجددِ تصوف بھی کہتے ہیں اور مجددِ نقشبندیت بھی کہتے ہیں کہ وہ اس میدان میں بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے واقعتاً بہت ساری خرافات وغیرہ کی چھانٹی کر کے، جو تصوف کی باتیں شریعت کے دائرے کی تھیں، انہیں از سر نو پیش کیا۔

اہلِ سُنت کے عقائد کا تحفظ

حضرت مجدد صاحبؒ کی جدوجہد کا ایک دائرہ اور بھی تھا اور وہ تھا اہلِ سنت عقائد کا دفاع۔ ہندوستان میں یہ بحران ہمیشہ سے رہا ہے بالخصوص ہمایوں بادشاہ اور اس کے بعد سے۔ شیر شاہ سوریؒ سے شکست کے بعد ہمایوں کی حکومت کی بحالی میں ایران کے صفوی حکمرانوں کا بڑا ہاتھ تھا جس کے ساتھ ہندوستان میں شیعہ فکر آگئی تھی۔ جب شیعہ فکر ایک حد سے آگے بڑھی تو مجدد صاحبؒ نے اس کا بھی مقابلہ کیا اور اہلِ سنت کے عقائد کی طرف توجہ دلائی۔ دین میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی حیثیت، صحابہؓ کی تعلیمات اور خلفائے راشدین کے مقام و عظمت کی اشاعت کی۔ چنانچہ ایک میدان مجدد صاحبؒ کی جدوجہد کا یہ بھی تھا کہ انہوں نے اہلِ سنت کے اصل عقائد کو، صحابہ کرامؓ کے دینی مقام کو اور صحابہ کرامؓ کی تعظیم کو لوگوں کے سامنے واضح کرنے کے لیے اس میدان میں محنت کی۔

مغل بادشاہ اکبر کے ”دینِ الٰہی“ کے خلاف جدوجہد

حضرت مجدد صاحبؒ کی جس جدوجہد کو تاریخ میں سب سے زیادہ سراہا جاتا ہے اور جس کا تمام مورخین اور مفکرین نے بڑے اہتمام سے ذکر کیا ہے وہ ہے اکبر کے دین الٰہی کے خلاف جدوجہد۔ اکبر کا دین الٰہی یہ تھا کہ اس کے درباری علماء نے یہ بات آہستہ آہستہ اکبر کے ذہن نشین کرانا شروع کر دی کہ ایک ہزار سال مکمل ہوگیا ہے اور اگلا ہزار سال شروع ہوگیا ہے۔ پچھلے ہزار سال میں دین کی جو تعبیرات تھی اور دین کا جو علمی ڈھانچہ تھا وہ پرانا ہوگیا ہے۔ اب دین کی نئی تعبیر اور نئے علمی و فکری ڈھانچے کی ضرورت ہے۔ اور اکبر کے درباری علماء نے اسے اس بات پر اکسایا کہ اکبر یہ کام کر سکتا ہے اس لیے کہ وہ بادشاہ ہے، اختیارات کا مالک ہے اور مجتہد اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ بات قابل تسلیم ہے کہ اکبر مغلوں میں سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ اکبر اعظم اور مغل اعظم کے نام سے اسے یاد کیا جاتا ہے۔ ہمارے مورخین کا یہ کہنا بھی ٹھیک ہے کہ درباری علماء نے اکبر کو ورغلا کر اس معاملے میں خراب کیا لیکن تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا۔ میرے تجزیے کے مطابق اصل بات یہ ہوئی کہ یورپ میں ”اصلاح مذہب“ کی تحریک چلی تھی جو مارٹن لوتھر کی تحریک کہلاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اکبر کے دین الٰہی کی تحریک بھی مارٹن لوتھر کی اصلاح مذہب کی تحریک سے متاثر ہو کر پروان چڑھی۔ کیونکہ مارٹن لوتھر کا دور دسویں صدی ہجری کا آخر ہے جبکہ عیسوی اعتبار سے یہ سولہویں صدی بنتی ہے۔ مارٹن لوتھر نے ۱۵۴۶ء میں وفات پائی جبکہ اکبر پیدا ہوا ۱۵۴۲ء میں اور فوت ہوا ۱۶۰۵ء میں۔ یہ وہ دور تھا جب مغرب میں پوپ کے خلاف تحریک چلی تھی اور مذہب پر پوپ کی اجارہ داری کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ وہ یہ کہ کیتھولک عیسائیت میں مذہب کی تشریح اور تعبیر کا مکمل اختیار پاپائے روم کے ہاتھ میں ہے۔ پاپائے روم اور اس کی کونسل کی تشریح کو ہی مذہب سمجھا جاتا ہے اس میں کسی دلیل کی ضرورت یا کسی چیلنج کی گنجائش نہیں ہوتی۔ تو مارٹن لوتھر نامی ایک پادری نے پاپائے روم کی اس اتھارٹی کو چیلنج کیا تھا یہ کہہ کر کہ ہم مذہب پر پاپائے روم کی اجارہ داری نہیں مانتے اور بائبل کی تشریح میں پاپائے روم کو ہم فائنل اتھارٹی تسلیم نہیں کرتے۔ یہ ایک لمبا قصہ ہے کہ مارٹن لوتھر نے کس طرح بغاوت کر کے اصلاح مذہب کی تحریک چلائی اور پھر اس کے نتیجے میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس تحریک کے نتیجے میں عیسائیت میں ایک نیا فرقہ پروٹسٹنٹ کے نام سے تشکیل پایا، اس بنیاد پر کہ مذہب کی تشریح پر چرچ اور پاپائے روم کی اجارہ داری نہیں ہے۔ جو آدمی بھی بائبل کو کامن سینس سے سمجھ لیتا ہے وہی اس کی تشریح ہے۔ اس تحریک کو کئی ناموں سے یاد کرتے ہیں، اصلاح مذہب کی تحریک، آزادی کی تحریک،

لبرٹی اور ذہنی آزادی کی تحریک وغیرہ۔

میرا یہ خیال ہے کہ مارٹن لوتھر کی اس تحریک کے اثرات ہندوستان میں آئے اور یہاں بھی یہ سوچ پیدا ہوئی کہ مذہب پر مولوی کی اجارہ داری ختم کی جائے اور ہر آدمی کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنی سمجھ کے مطابق دین کی تشریح کرے۔ چنانچہ ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کا تصور پیش کیا گیا کہ اسلامی فکر اور علم کا نیا ڈھانچہ تشکیل میں لایا جائے جس کا آغاز کرنے کے لیے انہوں نے اکبر بادشاہ کا انتخاب کیا۔ چنانچہ تاریخ میں یہ بڑی تفصیل سے مذکور ہے کہ اکبر کی اِس بات کی طرف توجہ دلائی گئی کہ یہ کام آپ کر سکتے ہیں، آپ صاحب اختیار ہیں صاحب دانش ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ اکبر کو اس کام کے لیے تیار کر لیا گیا۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اکبر کے دور میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ بادشاہ سلامت مجتہد اعظم ہیں، اس لیے قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر، نیز فقہاء کے جو اختلافات ہیں ان میں سے کسی چیز کو متعیّن کرنا وغیرہ یہ سب اختیارات اکبر کو حاصل ہیں۔ اکبر جو کہہ دے گا وہ دین ہوگا اکبر جو اعلان کر دے گا وہ شریعت ہوگی۔ اور پھر اکبر کے نام سے اکبر کی ترکیبات وخیالات ایک نئے مذہب کے طور پر پیش کر دیے گئے جسے ''دین الٰہی'' کا نام دیا گیا۔ اکبر کے دین الٰہی کی بہت سی تفصیلات کتابوں میں مذکور ہیں، اس حوالے سے دو اہم کتابیں یہ ہیں

1. ''تاریخ دعوت وعزیمت'' از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ اس کتاب کی ایک مکمل جلد اسی حوالے سے ہے۔
2. ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' از حضرت مولانا سید محمد میاں دہلویؒ۔ اس کتاب کی پہلی جلد اسی موضوع پر ہے۔

اکبر بادشاہ کا دین الٰہی ایک طرف تو یہ تھا کہ دین کی ایک نئی تعبیر وتشریح کی گئی اور دین کا ایک نیا ڈھانچہ بنایا گیا۔ اور دوسری طرف یہ کہ اس میں ہندوستان میں بسنے والے سارے مذاہب کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کی گئی۔ سکھوں کا تو شاید اس زمانے میں ابھی آغاز ہی تھا پوری طرح سامنے نہیں آئے تھے۔ ہندو، عیسائی، پارسی، مجوسی اور مسلمان، ان سب کی موٹی موٹی باتیں شامل کر کے ایک ملغوبہ بنایا گیا۔ چنانچہ اکبر کے دین الٰہی میں سورج کی پرستش بھی تھی اور اللہ کی عبادت بھی۔ حلال وحرام کے احکامات بھی تبدیل کر دیے گئے۔ سور اور شراب کو جائز قرار دیا گیا۔ زنا کو بھی بعض شرطوں کے ساتھ جائز قرار دیا گیا۔ دوسری شادی حرام قرار دے دی گئی۔ ایک لمبی فہرست ہے میں اس کی تفصیل میں نہیں جاتا لیکن اسے ''دین الٰہی'' کے نام سے باقاعدہ حکومت کی طرف سے رائج کیا گیا کہ ہندوستان کا مذہب یہ ہوگا اور لوگوں کو اِس کے احکام وضوابط کی پابندی کرنی ہوگی۔

اس وقت علماء حق نے اپنے طور پر مزاحمت کی جہاں جہاں وہ کر سکتے تھے لیکن سب سے زیادہ محنت اس پر حضرت مجدد الف ثانیؒ نے کی۔ اسی طرح جیسے پہلے زمانوں میں بڑے علماء نے اپنے دور کے چیلنجز کا سامنا کیا اور ان کے خلاف جدوجہد کی۔ چنانچہ ایک زمانے میں اکابر علماء نے خلق قرآن کے مسئلے پر معتزلہ کا مقابلہ کیا جن میں سب سے زیادہ امام احمد بن حنبلؒ سامنے آئے۔ ہمارے ہاں یہ ایک مغالطہ پایا جاتا ہے کہ معتزلہ کے خلاف ان کے علاوہ کوئی بولا نہیں، یہ بات غلط ہے۔ اس زمانے میں بھی علماء کی بڑی تعداد نے معتزلہ کے اس تسلط کے خلاف آواز اٹھائی اور قربانیاں دی لیکن چونکہ سب سے زیادہ نمایاں امام بن حنبلؒ تھے اس لیے وہ ساری جدوجہد ان کے نام منسوب ہوگئی۔ اسی طرح اکبر بادشاہ کے دین الٰہی کے بارے میں بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں علماء نے آواز اٹھائی اور اسے قبول کرنے سے انکار کیا لیکن اس پر سب سے منظم جدوجہد چونکہ حضرت مجدد صاحبؒ نے کی اس لیے ایک بات تو یہ کہہ دی جاتی ہے کہ ساری لڑائی مجدد صاحبؒ نے لڑی۔ اور پھر ساتھ یہ جملہ بھی شامل کر دیا جاتا ہے کہ مجدد صاحب کے علاوہ کوئی بولا نہیں، یہ دوسری بات غلط ہے۔ اگر آپ یہ کتابیں ”تاریخ دعوت و عزیمت“ اور ”علماء ہند کا شاندار ماضی“ پڑھیں تو آپ کو بہت سے علماء ملیں گے جنھوں نے مقابلہ کیا مزاحمت کی اور آواز اٹھائی۔ ہاں ان میں سب سے نمایاں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ تھے۔

حضرت مجدد الفؒ ثانی کی جدوجہد کا طریق کار

یہ ایک مستقل موضوع ہے کہ حضرت مجدد الفؒ ثانی کی جدوجہد کا طریق کار کیا تھا۔ حضرت مجددؒ نے مزاحمت کا راستہ اختیار نہیں کیا اور وہ براہ راست مقابلے پر یعنی میدان جنگ میں نہیں آئے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی جدوجہد کا سب سے بڑا پہلو یہ بیان کیا جاتا ہے اکبر کے دین الٰہی کے خلاف ان کی محنت علمی و فکری تھی۔ انہوں نے جہانگیر کے دربار میں، جہانگیر کے فوجیوں میں، جہانگیر کی بیوروکریسی اور اس کے سرداروں کے ساتھ رہ کر ان کی ذہن سازی کی۔ حضرت مجدد الفؒ ثانی کے کام کا سب سے بڑا ذخیرہ ان کے مکتوبات ہیں۔ مجدد صاحبؒ نے جہانگیر بادشاہ کے جو بڑے بڑے معاون تھے، درباری تھے، حکمران تھے، سردار تھے، جرنیل تھے، ان سے خط و کتابت کے ذریعے شخصی رابطے کیے۔ لابنگ اور بریفنگ کے ذریعے اپنے موقف پر ان کی حمایت حاصل کی۔ اور آج کا بڑا ہتھیار بھی یہی ہے۔ بریفنگ کرنا اور لابنگ کرنا، مقابلے پر آئے بغیر، کوئی محاذ گرم کیے بغیر، ساتھ مل جل کر ذہن سازی کرنا اور اصلاح کرنا۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ عوام میں جلسے کریں، لوگوں کو حکمرانوں کے خلاف اکسائیں اور بغاوت کا ماحول پیدا کریں، انہوں نے سرداروں کو مخاطب کیا اور ان سے بات

چیت کی۔ بلکہ جہانگیر کے اپنے مصاحبین میں ساڑھے تین سال تک رہ کر ایک ایک کی ذہن سازی کی۔ حتیٰ کہ ان کی اس محنت کا ثمرہ یہ نکلا کہ خود جہانگیر نے اپنے باپ کے دین سے دستبرداری اختیار کی اور دین اسلام کے اصل عقائد کی طرف واپس لوٹ آیا۔

حضرت مجدد صاحبؒ کی جدوجہد کی ایک خاص بات جو ذکر کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ گوالیار کے قلعے میں قید رہے۔ اگرچہ اس کا ظاہری سبب یہی تھا کہ انہوں نے جہانگیر کے دربار میں سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جہانگیر کے دربار کا یہ پروٹوکول تھا کہ جو آتا تھا پہلے سجدہ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور الزامات بھی تھے، مجدد صاحب کو گرفتار کر کے گوالیار کے قلعے میں بند کر دیا گیا۔ جہانگیر نے اپنی ”تزک جہانگیری“ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ابتداء میں تو ذکر اِس طرح ہے کہ کوئی دھوکے باز پیر تھا جسے میں نے پکڑ کر قید کر دیا۔ دو چار جملے اس طرح کے ذکر ہیں۔ لیکن حضرت مجدد الفؒ ثانی نے صبر و حوصلے اور تحمل کے ساتھ اصلاح کا طریقہ اختیار کیا۔ بلکہ ایک روایت ہے جسے بعض مؤرخین صحیح تسلیم نہیں کرتے، وہ یہ کہ جب مجدد صاحب گوالیار کے قلعے میں بند تھے تو خانِ خاناں جو مجدد صاحبؒ کا مرید تھا اور جہانگیر کا وزیر اعظم تھا، اس نے مجدد صاحب کو پیشکش کی کہ اگر اجازت ہو تو مارشل لاء لگا دوں۔ یعنی آپ کو جہانگیر کی جگہ پر لے آؤں اور جہانگیر کو آپ کی جگہ پر لے جاؤں۔ تو مجدد صاحب نے انکار کر دیا کہ فقیر اقتدار کی ہوس نہیں رکھتا یہ تو بس ان کی اصلاح چاہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی بات کا اثر جہانگیر پر ہوا۔

جدوجہد کے اثرات و نتائج

چنانچہ مجدد صاحبؒ کی جدوجہد کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ جہانگیر کے دور میں ہی اکبر کا دین الٰہی سرکاری قوت کے ساتھ ختم ہو گیا اور جہانگیر اپنے ماضی پر اور بزرگوں کے عقائد اور طرز عمل پر واپس پلٹ گیا۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد اجمل خان صاحبؒ ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ جب ملا نور اللہ شوستری جو جہانگیر بادشاہ کے دربار کا ایک بڑا درباری عالم تھا، اس نے کتاب لکھی جس میں اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اہانت کی۔ اِس بات پر جہانگیر کے دربار میں ملا نور اللہ شوستری پر مقدمہ چلا اور اسے موت کی سزا دے دی گئی۔ نور اللہ شوستری کو اہلِ تشیع کے ہاں شہید ثالث کہا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی شان میں گستاخی پر اسے جہانگیر بادشاہ نے موت کی سزا سنا دی تھی۔ جبکہ ملکہ نور جہاں شیعہ تھی، وہ پردے کے پیچھے بیٹھا کرتی تھی۔ کہتے ہیں جہانگیر کے پاؤں کے ایک انگوٹھے میں ڈوری بندھی ہوتی تھی جس کا سرا پردے کے پیچھے ملکہ نور جہاں کے پاس ہوتا تھا۔ وہ جہانگیر کے کسی فیصلے پر اپنی رائے ظاہر کرنے کے لیے پردے کے پیچھے سے وہ ڈوری ہلایا کرتی تھی۔ یہ ایک تاریخی روایت ہے، واللہ اعلم کتنی

درست ہے۔ ملکہ نور جہاں کے ڈوری ہلانے پر جہانگیر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتا تھا۔ جب جہانگیر ملا شوستری کے بارے میں فیصلہ کرنے لگا تو ملکہ نور جہاں نے پیچھے سے ڈوری ہلائی تو جہانگیر پیچھے مڑ کر کہتا ہے ''جاناں تُرا جاں دادہ ام ایمان نہ دادہ ام''۔ یعنی میری محبوبہ میں نے جان تیرے حوالے کی ہے، ایمان تیرے حوالے نہیں کیا۔ چنانچہ جہانگیر اصلِ اِسلام کی طرف واپس پلٹ گیا۔ اس کے بعد مجدد صاحبؒ جہانگیر کے ساتھ رہے۔ اس نے مجدد صاحبؒ کو اصلاح کے لیے اپنے ساتھ رکھا کہ میرے درباریوں کی اصلاح کرتے رہیں۔ اس طرح حضرت مجدد الفؒ ثانیؒ کی محنت کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اکبر کا وہ دین الٰہی اس کے بیٹے کے دور ہی میں ختم ہو گیا۔

حضرت مجدد الفؒ ثانی کی جدوجہد کا ایک نتیجہ اور نکلا جو کہ ان کی تحریک کا ایک تسلسل تھا۔ کہتے ہیں کہ مجدد صاحبؒ نے مغلیہ خاندان پر بہت محنت کی، وہ تو اس خاندان میں گھس ہی گئے۔ انہوں نے یہ دیکھ لیا کہ حکومت تو مغلوں نے ہی کرنی ہے یہی بادشاہ ہوں گے یہی وزیر ہوں گے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ ان کے ساتھ ٹکراؤ کی فضا قائم کی جائے بہتر یہ ہے کہ ان پر محنت کر کے ان کو راہ راست پر لایا جائے۔ چنانچہ اسی محنت کے نتیجے میں اورنگ زیب عالمگیرؒ بھی سامنے آیا۔ اسے بھی مؤرخین حضرت مجدد صاحب کی تحریک کے ثمرات میں شمار کرتے ہیں۔

چنانچہ دین الٰہی کے خاتمے کے بعد مجدد صاحبؒ کی تحریک کا دوسرا بڑا پھل یہ تھا کہ بات چلتے چلتے اورنگزیب عالمگیرؒ جیسے صحیح العقیدہ مغلیہ بادشاہ پر آ گئی۔ ورنہ متحدہ ہندوستان میں ماضی کا تسلسل یہ رہا ہے کہ یہاں مغلوں اور پٹھانوں میں کشمکش رہی ہے۔ محمود غزنویؒ اور شیر شاہ سوریؒ وغیرہ سب پٹھان تھے۔ آج کے دور میں اس کی مثال ایسے سمجھ لیں کہ مغل جو تھے وہ سب شمالی اتحاد تھے اور پٹھان جو تھے وہ سب طالبان تھے۔ مغل نیم لبرل اور شیعہ سے متاثر تھے، جبکہ پٹھان خالص مذہبی اور خالص سنی تھے۔ مغل مذہبی اعتبار سے نیم لبرل تھے وہ مذہب کو مانتے بھی تھے، اس پر عمل بھی کرتے تھے لیکن رواداری اور دنیاداری وغیرہ بھی ساتھ نبھاتے تھے۔ جبکہ شیر شاہ سوری اور محمود غزنوی وغیرہ پکے سنی تھے۔ پٹھانوں کی جتنی لڑی بھی آئی، مضبوط مذہبی اور سنی لوگوں کی آئی۔ جبکہ مغلوں کی جتنی لڑی بھی آئی وہ نیم لبرل تھی اور شیعہ فکر سے متاثر تھی۔ اسی لیے مغلوں میں اورنگزیب عالمگیر کا پیدا ہونا تاریخ کا عجوبہ کہلاتا ہے کہ مغلوں میں طالبان صفت بادشاہ کہاں سے آیا۔ اور یہ بھی تاریخ کا ایک عجوبہ ہے کہ اورنگزیب جیسے متصلب سنی حکمران کے بعد اس کے جانشین بیٹے بہادر شاہ اول نے باقاعدہ شیعہ مذہب اختیار کر لیا اور جمعۃ المبارک کے خطبات میں خلفاء ثلاثہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کا ذکر ممنوع قرار دے دیا جس پر بڑے ہنگامے ہوئے اور لاہور کے

عوام نے قلعہ کا باقاعدہ محاصرہ کر لیا۔

میں یہ کہا کرتا ہوں کہ یہ کشمکش بڑی پرانی ہے، اس دور میں بھی یہی لڑائیاں تھیں۔ حیرانگی کی بات یہ تھی یہ پکا مذہبی اور سنی بادشاہ اورنگزیب مغلوں میں کیسے پیدا ہو گیا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ حضرت مجدد الفؒ ثانیؒ کی جدوجہد کے اثرات تھے۔ یہ ان کی محنت کا ثمرہ تھا کہ مغلوں میں اورنگزیب آیا اور پچاس سال تک اس نے یہاں مذہبی طرز پر حکومت کی۔ فتاویٰ عالمگیری بھی اس نے مرتب کروایا اور دیگر بہت سی مذہبی روایات بحال کیں جو تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ چنانچہ حضرت مجدد الفؒ ثانی نے مزاحمت کا راستہ اختیار کیے بغیر ذہن سازی اور لابنگ سے جو خاموش محنت کی اس کے دو بڑے ثمرات مؤرخین ذکر کرتے ہیں۔ ایک جہانگیر کے دور میں اصل دینی عقائد کی طرف واپسی اور دوسرا اورنگزیب عالمگیر کی صورت میں مغلوں کا ایک خالص سنی مذہبی حکمران دنیا نے دیکھا جس نے پچاس سال تک حکومت کی۔

ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ جب بادشاہ حکومت کرتے ہیں تو اچھے کام بھی کرتے ہیں اور برے بھی۔ کسی بادشاہ کے فرشتہ ہونے کا تصور رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ اسی طرح اورنگزیب کے بارے میں بھی ابن انشاء نے اپنی تصنیف ''اردو کی آخری کتاب'' میں ایک بات لطیفہ کے طور پر لکھی ہے۔ ابن انشاء نے مزاح کے لہجے میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب ایک اچھا حکمران اور اچھا بادشاہ تھا۔ وہ دین و دنیا دونوں کا یکساں لحاظ رکھتا تھا، اس لیے اس نے زندگی میں کوئی نماز قضاء نہیں کی اور کسی بھائی کو زندہ نہیں چھوڑا۔ مطلب یہ کہ کوئی بھائی زندہ ہو گا تو بادشاہت میں دخل اندازی کرے گا۔ بہرحال اورنگزیب کے بہت کارنامے ہیں جن میں فتاویٰ عالمگیری، حنفی فقہ کی تجدیدِ نو اور زمانے کے اعتبار سے اس کی تشکیلِ نو وغیرہ شامل ہیں۔

تاریخ اورنگزیب کی جس بات پر سب سے زیادہ اعتراض کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اورنگزیب خود تو ٹھیک ٹھاک کام کرتا رہا لیکن بیٹوں میں سے کسی کی تربیت نہیں کی کہ اس کے کام کو آگے بڑھا سکیں۔ چنانچہ یہ بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ اورنگزیب کے بعد جب اس کا بیٹا بہادر شاہ اول برسرِاقتدار آیا تو وہ شیعہ ہو گیا تھا اور جمعے کے خطبے سے خلفاء ثلاثہ کے نام سب سے پہلے اس نے نکلوائے کہ میرے دور میں خلفاء کا نام کوئی نہیں لے گا۔ اِس پر لاہور وغیرہ کے علاقوں میں بہت ہنگامے ہوئے اور احتجاج ہوا، خیر میں اس کی تفصیل میں نہیں جاتا۔

خلاصۂ کلام

میں ذکر کر رہا تھا کہ حضرت مجدد الفؒ ثانی کا زمانہ گیارہویں صدی کا دور ہے۔ دس صدیاں گزر

چکی تھیں اور گیارہویں صدی کا آغاز تھا جب حضرت مجدد الف ثانیؒ نے دین کے مختلف شعبوں میں خدمات سرانجام دیں۔ ان میں سے تین بڑی خدمات میں نے عرض کی ہیں۔

1. ایک یہ کہ تصوف کی اصلاح و تجدید۔ تصوف اور صوفیاء کرام کے ماحول میں شریعت سے ہٹ کر جو باتیں شامل ہوگئی تھیں ان کی چھانٹی کی، یہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ انہوں نے تصوف کو اس کے اصل اسلامی رنگ میں پیش کیا۔
2. دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ اہلِ سنت کے عقائد اور روایات کا تحفظ کیا، ان کو جو خطرات پیش تھے ان کا مقابلہ کیا۔ علمی و عوامی دنیا میں یہ حضرت مجدد صاحبؒ کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کا دفاع، ان کی تعظیم، ان کے دینی مقام کی وضاحت اور اہلِ سنت کے عقائد کی تشریح وغیرہ۔ یہ اس دور کا ایک بڑا محاذ تھا۔ اس سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے کام کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔
3. تیسرے نمبر پر مغل بادشاہ اکبر نے جو ایک نیا رجحان دیا تھا کہ دین میں تشکیلِ نو بھی ہو سکتی ہے اور اس کا نیا ڈھانچہ بھی بن سکتا ہے اور اس نے "دین الٰہی" کے نام سے ایک نیا دین بنا کر رائج بھی کر دیا۔ اس دین میں سورج کی پوجا بھی جائز تھی اور اللہ کی عبادت بھی۔ شراب، سود اور زنا بھی جائز تھے۔ ان کے علاوہ دیگر بہت سی باتیں شامل تھیں جن کی تفصیل کے لیے میں نے دو کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ چنانچہ اس پر مجدد صاحبؒ نے بڑی حکمت عملی کے ساتھ، بڑے حوصلے کے ساتھ اور بڑی محنت کے ساتھ علمی و فکری میدان میں کام کیا یہاں تک کہ صورت حال کو بالکل پلٹ دیا۔ یعنی جہانگیر کے دور میں ریورس گیئر لگا جبکہ اورنگزیب عالمگیر کے دور تک جاتے جاتے صورتحال بالکل الٹ ہوگئی تھی۔ اور مؤرخین اس ساری جدوجہد کو علمی و فکری طور پر حضرت مجدد الف ثانیؒ کا بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں۔

یہ میں نے مختصراً حضرت مجدد صاحبؒ کا ایک تعارفی تذکرہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہم جب اپنی فکری جدوجہد کا ذکر کرتے ہیں تو "مجددی ولی اللہی" کے نام سے کرتے ہیں۔ ہماری فکری جدوجہد کے پہلے مرحلے کا آغاز حضرت مجدد صاحبؒ سے ہوتا ہے، اس کا دوسرا مرحلہ حضرت شاہ ولی اللہ کے دور کا ہے، جبکہ تیسرا مرحلہ علمائے دیوبند ہیں جو حضرت مہاجر مکی سے شروع ہوتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مجدد صاحبؒ کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اسلامی خلافت: دلیل و قانون کی حکمرانی

روزنامہ اسلام، لاہور ---۳۰ جنوری ۲۰۱۲ء

۲ تا ۴ جنوری کو جامعہ اسلامیہ کلفٹن کراچی کی مجلس صوت الاسلام کے زیر اہتمام فضلائے درس نظامی کے ایک تربیتی کورس میں مسلسل تین روز تک ''خلافت'' کے عنوان پر گفتگو کا موقع ملا۔ یہ کورس ایک تعلیمی سال کے دورانیے پر مشتمل ہوتا ہے اور کئی سالوں سے جاری ہے، مختلف اصحاب فکر و دانش اپنے اپنے پسندیدہ موضوعات پر اس میں گفتگو کرتے ہیں، مجھے بھی ہر سال دو تین روز کے لیے حاضری کی سعادت حاصل ہوتی ہے اور منتظمین کے ساتھ ساتھ فضلائے درس نظامی کا ذوق اور طلب دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ اس سال کراچی میں حاضری کے موقع پر مجھے تین نشستوں میں بات کرنا تھی، میں نے خود ہی اپنے لیے یہ موضوع منتخب کیا کہ ''خلافت'' کے بارے میں کچھ عرض کرنا زیادہ مناسب بات ہوگی۔ اس کے بعد ۱۲ جنوری کو اسلام آباد کے آبپارہ کمیونٹی سنٹر میں ''مسلم سٹوڈنٹس آرگنائزیشن'' کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار میں بھی اسی موضوع کے بعض پہلوؤں پر گزارشات پیش کیں، کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ ان معروضات کو قلمبند ہو جانا چاہیے چنانچہ ان حضرات کی فرمائش بلکہ اصرار پر مذکورہ محافل میں اس موضوع پر ہونے والی گفتگو کو ترتیب کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

خلافت کا معنیٰ اور تصور

''خلافت'' کا لفظی معنیٰ نیابت ہیں، خَلَف کے معنی ہیں ''وہ کسی کے پیچھے چلا۔ اور کسی کے جانے کے بعد اس کی جگہ سنبھالنے والے کو ''خلیفہ'' کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں خلیفہ کا لفظ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے بولا گیا ہے جس کی ایک تعبیر یہ ہے کہ حضرت آدمؑ اور ان کی نسل نے زمین پر بسنے والی پیشرو مخلوق یعنی جنوں کی جگہ سنبھالی ہے اور وہ ان کے خلیفہ ہیں۔ ایک مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اپنی خلافت عطا فرمائی ہے کہ زمین میں انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں:

- ایک یہ کہ زمین پر بسنے والے ہزاروں قسم کے جانوروں میں سے زمین پر تصرف کا ملکہ اور مواقع انسان ہی کو عطا ہوئے ہیں۔ زمین کی سطح پر، اس کے اندر، فضا میں اور سمندر میں بسنے والی مخلوقات کو شمار کیا جائے تو اس کی ہزاروں انواع گنی جاتی ہیں لیکن ان سب میں زمین کے اندر، سطح، فضا اور سمندر میں تصور کی صلاحیت انسان کو ہی حاصل ہے اور وہی سارے نظام کو کنٹرول کر رہا ہے، گویا زمین پر تکوینی تصرف کی ایک صورت انسان کے

پاس ہے۔

- جبکہ انسان کے اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی اور دوسری زمینی مخلوقات کے لیے جو نظام اور قوانین مقرر فرمائے ہیں ان کے نفاذ کی ذمہ داری انسان پر ہے۔ وہ خدا کی زمین پر خدا کا نظام نافذ کرنے پر مامور ہے اور اس کی ڈیوٹی ہے کہ انسانی سوسائٹی اور زمین کا نظام اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کے مطابق چلائے۔

قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کو خلیفہ کہا گیا ہے اور ارشاد ربانی ہے کہ:

> ”اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے، پس آپ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کریں اور خواہش کی پیروی نہ کریں۔“

یہاں خلیفہ کا لفظ حکمرانی اور قوانین و نظام کے حوالے سے استعمال ہوا ہے اور سیدنا حضرت داؤدؑ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ یہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ خواہشات کی پیروی اللہ تعالیٰ کی راہ سے ہٹا دیتی ہے اور گمراہ کر دیتی ہے۔ گویا حضرت داؤدؑ کو خطاب کر کے یہ کہا گیا ہے کہ صحیح قانون وہی ہے جو حق یعنی وحی کی روشنی میں ہو جبکہ انسانی خواہشات پر بننے والا قانون و نظام گمراہی کا نظام و قانون ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد میں خلافت کا مفہوم اور پس منظر یوں بیان فرمایا ہے کہ:

> ”بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت انبیاء کرام علیہم السلام کیا کرتے تھے، ایک نبی فوت ہو جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کی جگہ آ جاتا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، البتہ خلفاء ہوں گے۔“ (بخاری شریف)

بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت کی مختلف صورتیں تھیں۔ بعض پیغمبر خود ہی حکمران ہوتے تھے جیسے حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت یوشع بن نون، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام۔ اور بعض نبی بادشاہ گر تھے جیسے حضرت سموئیلؑ سے بنی اسرائیل نے درخواست کی کہ ان پر کسی کو بادشاہ بنایا جائے تاکہ وہ اس کی قیادت میں ظالم بادشاہ جالوت کے خلاف جہاد کر سکیں، چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت طالوت کو بادشاہ بنا دیا جن کی قیادت میں بنی اسرائیل نے جالوت کے خلاف فلسطین میں جنگ لڑی۔ اس جہاد کی تفصیلات سورۃ البقرہ کی آیات میں بیان ہوئی ہیں۔

خلافت نبی اکرمؐ کی نیابت کا نام ہے

جناب نبی اکرمؐ کے اس ارشاد گرامی کی رو سے ”خلافت“ سیاسی معاملات میں آنحضرتؐ کی نیابت کا نام ہے۔ اور اسلام کے سیاسی نظام کا بنیادی اصول یہ قرار پاتا ہے کہ وہ سیاسی قیادت جو اس سے پہلے حضرات انبیاء کرامؑ کیا کرتے تھے وہ جناب نبی اکرمؐ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو جانے کے باعث اب خلفاء کے ہاتھ میں ہوگی اور یہ خلفاء آپؐ کی نیابت کریں گے۔ چنانچہ فقہاء کرام جب خلافت کی تعریف کرتے ہیں تو یہ فرماتے ہیں کہ نیابتاً عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم امت کے اجتماعی معاملات کو جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتے ہوئے چلانا۔ اسی وجہ سے خلیفہ اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو خلیفۃ رسول اللہ کہا جاتا تھا۔ لیکن ان کے بعد ان کے جانشین حضرت عمرؓ کو خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ کہا جانے لگا تو ان کو الجھن ہوئی کہ تیسرے اور چوتھے خلیفہ کو کس لقب سے یاد کیا جائے گا؟ ایک دن غالباً حضرت عمرو بن العاصؓ نے انہیں امیر المؤمنین کے لقب سے خطاب کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ خطاب صحیح ہے، اب اس کے بعد انہیں امیر المؤمنین ہی کہا جائے۔

یہاں ایک نکتہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی نظام میں ”خلیفہ“ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں کہلاتا بلکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا حامل تصور کیا جاتا ہے، جیسا کہ فقہاء کرام نے خلیفہ کی تعریف میں لکھا ہے۔ بلکہ قاضی ابویعلی نے ”الاحکام السلطانیۃ“ میں روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت صدیق اکبرؓ کو یا خلیفۃ اللہ کہہ کر خطاب کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اسے ٹوک دیا کہ لست بخلیفۃ اللہ، انا خلیفۃ رسول اللہ یعنی میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ اللہ کے رسول کا خلیفہ ہوں۔ اسلامی سیاست کے ایک طالب علم کے طور پر میرا خیال ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ فرما کر خلافت کا ایک بڑا اصول بیان فرمایا ہے اور پاپائیت کی جڑ کاٹ دی ہے۔

خلافت اور پاپائیت میں فرق

پاپائیت کا تصور یہ ہے کہ پاپائے روم جو کیتھولک مسیحیوں کے عالمی مذہبی پیشوا کے طور پر اللہ تعالیٰ کے نمائندہ ہیں اور وہ مذہب کی کسی بات کی جو تشریح کریں اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھا جائے۔ وہ مذہب کی تعبیر کی فائنل اتھارٹی ہیں اور ان کے کسی فیصلے کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر خلیفہ کو بھی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ قرار دیا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ کی حیثیت سے فائنل اتھارٹی تصور کیا جائے گا اور اس کی بات کو چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔ اس کے برعکس جناب رسول اکرمؐ کے خلیفہ کے طور پر خلیفۂ وقت قرآن و سنت کا پابند ہوتا ہے کہ اس کی ہر بات کی دلیل قرآن کریم سے یا آنحضرتؐ کی سنت و

حدیث سے تلاش کرنا ہوگی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کا منصب سنبھالتے ہی اپنے پہلے خطبہ میں اس بات کو واضح کر دیا اور فرمایا کہ میں قرآن و سنت کی اتباع کا وعدہ کرتا ہوں اور تمہیں حق دیتا ہوں کہ اگر مجھے قرآن کریم یا سنت نبویؐ کے خلاف چلتا ہو دیکھو تو مجھے سیدھا کر دو۔ اسے دلیل اور قانون کی حکومت کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ایک ایسے قانون و دستور کی پابندی کا اعلان کر رہا ہے جو نہ اس نے خود بنایا ہے اور نہ ہی اسے اس میں ترمیم کا اختیار حاصل ہے۔

بادشاہت میں بادشاہ خود قانون بنانے والا ہوتا ہے اور خود ہی اس میں ترمیم کا اختیار رکھتا ہے، اس لیے اگر بادشاہ قانون کی پابندی کی بات کرتا ہے تو یہ بات درست نہیں ہے۔ جمہوریت میں پارلیمنٹ دستور و قانون بناتی ہے اور وہ اس میں ترمیم بھی کر سکتی ہے، اس لیے اس کی طرف سے دستور و قانون کی پابندی کا دعویٰ محل نظر ہے۔ ان دونوں کے برعکس اسلامی خلیفہ قرآن و سنت کا پابند ہوتا ہے اور خود حکمران کہلانے کی بجائے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا منصب رکھتا ہے۔ جبکہ اسے قرآن و سنت میں ردوبدل یا اس کی من مانی تشریح کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس لیے صحیح معنوں میں اگر کسی حکومت کو قانون کی حکومت کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف اسلامی خلافت ہے جس کی بنیاد قوت یا خاندانی بالادستی پر نہیں بلکہ دلیل پر ہوتی ہے۔ اس لیے دنیا کی تاریخ میں حضرات انبیاء کرامؑ کے بعد اگر دلیل اور قانون کی بنیاد پر کوئی حکومت قائم ہوئی ہے تو وہ اسلامی خلافت ہے جس کے بنیادی اصول خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پہلے خطبہ میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں۔

خلافت و امامت: اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کا بنیادی اختلاف

یہاں ایک اور بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد ان کی جانشینی کے بارے میں دو مکتبِ فکر پائے جاتے ہیں۔ ایک امامت کا اور دوسرا خلافت کا۔ اہلِ تشیع امامت کے علمبردار ہیں اور اہلِ سنت خلافت کی بات کرتے ہیں۔ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے ان دونوں میں بنیادی فرق بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میری طالبعلمانہ رائے میں خلافت اور امامت میں درج ذیل فرق پائے جاتے ہیں:

- امامت منصوص ہے یعنی اس کا قیام نص اور مبینہ طور پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے ذریعے عمل میں آیا اور اس میں امت کی رائے کا کوئی دخل نہیں۔ اس لیے اہلِ تشیع حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں وصی رسول اللہ کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ جبکہ خلافت منصوص نہیں ہے، یعنی خلیفہ کا تقرر کسی نص یا وصیت کے ذریعے نہیں ہوا بلکہ خلیفہ اول کا

انتخاب امت کی اجتماعی صوابدید کی بنیاد پر عمل میں لایا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو صحابہ کرامؓ نے باہمی مشاورت اور عمومی بحث و مباحثہ کے بعد آزادانہ رائے کے ذریعے جناب رسول اللہ کا جانشین منتخب کیا تھا۔

- امامت نسبی اور خاندانی ہے کہ جن بزرگوں کو اہلِ تشیع بارہ اماموں کا درجہ دیتے ہیں وہ ایک دوسرے کے نسبی وارث تھے۔ جبکہ خلافت راشدہ کے چاروں بزرگوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا نسبی وارث نہیں ہے۔
- اہلِ تشیع کے عقیدہ کے مطابق امام معصوم ہوتا ہے۔ اہلِ سنت خلیفہ کو معصوم نہیں سمجھتے بلکہ وہ شرعی طور پر مجتہد کا درجہ رکھتا ہے۔ معصوم سے خطا کا احتمال نہیں ہوتا اس لیے اس کی بات حتمی ہوتی ہے جس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ مجتہد کے فیصلوں میں خطا و صواب دونوں کا احتمال موجود ہوتا ہے، اس کے کسی بھی فیصلے سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا ہے اور خلفاء راشدین کے فیصلوں سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے۔
- خلیفہ اپنی رعیت اور رائے عامہ کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں نے اپنے ابتدائی خطبوں میں اس کی وضاحت کی ہے۔ جبکہ امام کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا۔
- عوام کو خلیفہ کے احتساب کا حق حاصل ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے ایک بدوی نے کھلے اجتماع میں چادر کے بارے میں پوچھ لیا تھا اور حضرت عثمانؓ خود پر لگائے گئے الزامات کے بارے میں حج کے موقع پر کھلی عدالت لگا کر اپنے حکام سمیت عوامی احتساب کے لیے پیش ہو گئے تھے، بلکہ اس عوامی احتساب کا خود سرکاری طور پر اہتمام کیا تھا۔ مگر عوام امام کا احتساب کرنے کا حق نہیں رکھتے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا نمائندہ تصور ہوتا ہے اور کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا۔
- اثنا عشری اہلِ تشیع کے ہاں امامت کا تسلسل بارہویں امام پر رک گیا ہے، جو ان کے خیال میں زندہ ہیں اور ان کے عقیدہ کے مطابق آخری دور میں انہیں واپس آنا ہے اور اس فہرست میں مزید اضافہ ممکن نہیں ہے۔ جبکہ خلافت کا تسلسل ہر دور میں قائم رہا ہے اور آج بھی شرعی شرائط اور طریق کار کے مطابق کسی بھی مسلمان کو خلیفہ منتخب کیا جا سکتا ہے۔

اس لیے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ "پاپائیت" اور "تھیاکریسی" کا یہ تصور کہ ایک شخص خدا کے نمائندہ کے طور پر حکومت کرے، قانون و دستور کی تعبیر میں حتمی اتھارٹی کا درجہ رکھتا ہو اور کسی کے

سامنے جوابدہ نہ ہو، یہ تصور اہلِ سنت کے نظام خلافت میں تو سرے سے موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس کا کوئی امکان ہے۔ البتہ اہلِ تشیع کے فلسفہ امامت میں اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

آج کے دور میں خلافت و امامت

اس حوالہ سے ایک اور بات بھی ذہن میں رکھ لینی چاہیے کہ آج کے دور میں امامت اور خلافت کے ان دونوں فلسفوں کو دستوری شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے اور خلافت و امامت کی معروف اصطلاحات پر زور دیے بغیر یہ دونوں دستوری ڈھانچے آج موجود ہیں:

- مثلاً ایران کا دستور امامت کے تصور پر تشکیل دیا گیا ہے کہ اصل حاکم تو "امام غائب" ہیں لیکن چونکہ ان کی غیبوبت کا زمانہ ہے اس لیے ان کی نمائندگی وقت کے سب سے بڑے فقیہ کریں گے جو امام غائب کی نمائندگی اور اختیارات کے ساتھ اصل حاکم ہوں گے۔ اسے "ولایت فقیہ" کا عنوان دیا گیا ہے، ایرانی انقلاب کے بعد ولایت فقیہ کا یہ منصب جناب خمینی کے پاس رہا اور ان کی وفات کے بعد سے جناب خامنہ ای اس منصب پر فائز ہیں، انہیں ایران کے دستوری و قانونی نظام میں فائنل اتھارٹی کا درجہ حاصل ہے۔ وہ حکومت، پارلیمنٹ اور عدلیہ سمیت کسی بھی ادارے کے فیصلے کو ویٹو کر سکتے ہیں اور ان کے فیصلے پر نظر ثانی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے۔ گویا وہ "امام معصوم" کہلائے بغیر عملاً امام معصوم ہی ہیں اور میرے خیال میں "پاپائیت" کا تصور بھی کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے۔
- دوسری طرف پاکستان میں "قراردادِ مقاصد" کے ذریعے یہ اصول طے کیا گیا ہے کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے، حکومت عوام کے منتخب نمائندے کریں گے مگر وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے پابند ہوں گے اور قرآن و سنت کے دائرے سے تجاوز نہیں کریں گے۔ میرے خیال میں اگر آج "خلافت" کو دستوری شکل دی جائے تو اس کی بنیاد یہی ہوگی کہ (۱) اعلیٰ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے (۲) خلیفۂ وقت اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین نافذ کرنے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہے (۳) خلیفہ کا انتخاب عوامی رائے سے ہوگا (۴) خلیفہ اور اس کی حکومت قرآن و سنت کے مطابق حکومت کرنے کی پابند ہوں گے (۵) خلیفہ اور اس کے حکّام عوام کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور میں یہ اصول "خلافت" کی اصطلاح اختیار کیے بغیر شامل کر لیے گئے ہیں، اگر ان پر عمل ہو جائے تو ایک صحیح اسلامی ریاست قائم ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایران کی قیادت اپنے فلسفہ کے ساتھ مخلص معلوم ہوتی ہے اور پورے خلوص

و دیانت کے ساتھ اس پر عمل کر رہی ہے، جبکہ پاکستان کے مقتدر طبقات کے نزدیک دستور کی اسلامی حیثیت اور دفعات و قوانین کی پوزیشن صرف ”شوپیس“ اور نمائش کی ہے اس لیے دستور کے ساتھ مسلسل منافقت روا رکھی جا رہی ہے۔

آج کے دور میں خلافت کے قیام کی صورت

اس کے بعد میں اس طرف آؤں گا کہ آج کے دور میں اسلامی خلافت کس طرح قائم کی جا سکتی ہے؟ ہمارے فقہاء کرام نے انعقادِ خلافت کی جو عملی صورتیں بیان کی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

1. امت اپنی اجتماعی صوابدید پر خلیفہ کا انتخاب کرے۔ یہ عوامی رائے سے ہو یا ارباب حل و عقد خلیفہ کا انتخاب کریں اس کے بارے میں بحث کی گنجائش موجود ہے۔
2. خلیفۂ وقت کسی کو ارباب حل و عقد کی مشاورت کے ساتھ اپنا جانشین نامزد کر دے۔
3. خلیفہ براہ راست جانشین نامزد کرنے کی بجائے کوئی کمیٹی بنا دے جو اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لے۔
4. مجلس شوریٰ خلیفہ کا انتخاب کر لے۔
5. کوئی شخص جو خلافت کی اہلیت رکھتا ہو بزور طاقت اقتدار پر قبضہ کر لے اور امت اسے قبول کر لے۔

فقہاء کرام کے ہاں مسلّمہ فقہی اصولوں کے مطابق خلافت کے انعقاد کی یہی پانچ صورتیں ہیں جن میں سے کسی ایک صورت کے ذریعے خلافت قائم ہو سکتی ہے اور خلیفہ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے آج کے حالات میں دوسری، تیسری اور چوتھی صورت قابل عمل نہیں ہے اس لیے کہ اس وقت کوئی شرعی خلیفہ موجود نہیں ہے جو کسی کو نامزد کر سکے یا کمیٹی بنا سکے اور کسی شرعی خلیفہ کی مقرر کردہ کوئی شوریٰ بھی موجود نہیں ہے جو انتخابِ خلیفہ کا حق رکھتی ہو۔ آج کے دور میں خلافت کے قیام کی پہلی اور آخری صورت ہی قابل عمل ہے کہ امت خود کسی خلیفہ کا انتخاب کرے یا کوئی اہل شخص طاقت کے ذریعے کسی مسلم ملک کے اقتدار پر قبضہ کر کے خلافت کا اعلان کر دے اور ملک کے عوام اسے قبول کر لیں۔ اس لیے میرے خیال میں اب اگر ہم خلافت قائم کرنا چاہیں تو عملی صورت یہ ہوگی کسی مسلم ملک کی منتخب پارلیمنٹ خلافت کے نظام کو اپنانے کا فیصلہ کرے اور اس کے تمام شرعی و دستوری تقاضے پورے کرتے ہوئے اپنے ملک کو ”اسلامی امارت“ قرار دے۔ اور چند اسلامی ریاستیں وجود میں آجانے کے بعد وہ آپس میں مل کر ”خلافتِ اسلامیہ“ قائم کر کے خلیفہ کا انتخاب کر لیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے خلافت کے نظام کو عالمی نظام قرار دیا ہے جو مختلف ریاستوں اور

حکومتوں کے درمیان انصاف کے قیام اور شرعی قوانین کے نفاذ کی نگرانی کرتا ہے۔ اس لیے علاقائی اسلامی حکومتوں کو خلافت کی بجائے ''امارتِ اسلامیہ'' کا نام دینا ہی زیادہ مناسب ہے جیسا کہ طالبان نے افغانستان میں شرعی حکومت قائم کرنے کے بعد خلافت کے اعلان کی بجائے اسے ''امارت اسلامیہ افغانستان'' قرار دے دیا تھا۔ اور میرے خیال میں یہ انتہائی دانشمندانہ فیصلہ تھا اس لیے کہ ہر علاقے میں الگ الگ خلافت قائم ہوگی تو باہمی ٹکراؤ اور خلفشار کی انتہائی افسوسناک صورتحال پیدا ہو جائے گی۔

اس وقت عالمِ اسلام میں خلافت کی بحالی کی بیسیوں تحریکات موجود ہیں جن کے ساتھ حالات کے مطابق مناسب مواقع پر تعاون کرتا رہتا ہوں، مگر اس وضاحت کے ساتھ کہ ہم خلافت کی بحالی کی جدوجہد میں تعاون کریں گے جبکہ خلیفہ کا انتخاب اپنے وقت پر منطقی طریقہ کار کے مطابق ہوگا اس لیے ہم خلافت کے کسی موجودہ امیدوار کی حمایت نہیں کرتے۔ چند سال قبل لندن میں جبہ قبہ پہنے ہوئے ایک صاحب ایک اجتماع میں ملے، انہوں نے اپنی ہیئت اس طرح کی بنا رکھی تھی جیسے وہ واقعتاً ''خلیفۃ المسلمین'' ہوں۔ انہوں نے کہا کہ وہ جرمنی میں رہتے ہیں، ترکی کے خاندانِ خلافت سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے خلافت کے استحقاق کا دعوٰی کیا ہے، کچھ لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں، مجھ سے انہوں نے بیعت کا تقاضا کیا۔ عربی میں گفتگو کر رہے تھے، ان کے استفسار پر میں نے عرض کیا کہ خلافت کی بحالی کے موقف سے ہم متفق ہیں لیکن خلیفہ کے انتخاب کے اس طریق کار سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ اسی طرح ایک دفعہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں اسباق کے دوران ایک بزرگ تشریف لائے جو پاکستان ہی کے ایک علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان سے ملا تو انہوں نے بیعت کا تقاضا رکھ دیا کہ میں امیر المؤمنین ہوں آپ میرے ہاتھ پر بیعت کریں۔ میں نے معذرت کر دی کہ اس طرح کوئی شخص خلیفہ نہیں بن سکتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لاہور میں خلافت کے موضوع پر سیمینار تھا جس میں مجھے بھی بلایا گیا، میں نے خلافت کی اہمیت و ضرورت اور برکات و ثمرات کے حوالہ سے گزارشات پیش کیں جن کے آخر میں دل لگی کے انداز میں عرض کیا کہ مجھے اس ہال میں پانچ چھ خلیفہ نظر آرہے ہیں، اگر لاہور میں اتنے ہیں تو پاکستان میں کتنے ہوں گے، پھر عالمِ اسلام کی کیا صورتحال ہوگی اور خلافت کے نام پر کتنی خوفناک دھماچوکڑی مچ جائے گی۔

ایسی صورتحال میں جبکہ پورا مغرب ''خلافت'' کی واپسی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے اور عالمی قوتوں نے طے کر رکھا ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں خلافت قائم نہیں ہونے دی جائے گی اور نہ ہی شریعت نافذ ہونے دی جائے گی، اس ماحول میں خلافت کا قیام بہت سنجیدہ مسئلہ ہے۔ یہ ہماری شرعی و

دینی ذمہ داری بھی ہے کہ جلد از جلد خلافت قائم ہو جائے لیکن اس سے کہیں زیادہ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ خلافت کے نام پر امت میں کوئی نیا خلفشار پیدا نہ ہو جائے اور ہم پہلے مسائل کو سمیٹتے سمیٹتے عالمِ اسلام کے لیے کوئی نیا مسئلہ کھڑا نہ کر دیں۔

قیامِ خلافت کی ضرورت اور شرعی حیثیت

جہاں تک خلافت کی ضرورت اور اس کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے، فقہاء کرام نے اسے امت کی اجتماعی ذمہ داری اور فرض کفایہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں خلافت شرعیہ موجود ہو جس سے امت کے افراد متعلقہ امور و معاملات میں رجوع کر سکتے ہوں تو گزارہ ہو جائے گا لیکن اگر کہیں بھی خلافت اسلامیہ کا وجود نہیں ہے تو امت مسلمہ بحیثیت امت مجموعی طور پر دینی فریضہ کی تارک اور گناہگار ہوگی۔ میرے خیال میں آج کی صورتحال یہی ہے کہ ہم سب دینی فریضہ کے تارک اور گناہگار ہیں۔ فقہاء کرام نے خلافت کے وجوب پر ایک دلیل یہ دی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد سب سے پہلے یہی کام کیا تھا حتیٰ کہ آنحضرتؐ کی تجہیز و تدفین سے بھی اس کو مقدم کیا۔ اس لیے یہ صرف واجب نہیں بلکہ اہم الواجبات ہے۔ فقہاء کرام خلافت کے وجوب کی ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ قرآن و سنت کے بہت سے صریح احکام مثلاً جہاد، قیامِ عدل، حدود کا نفاذ اور بیت المال وغیرہ اس بات پر موقوف ہیں کہ کوئی صاحب اقتدار انہیں قائم و نافذ کرے۔ اور اصول یہ ہے کہ فرض کا موقوف علیہ بھی فرض ہوتا ہے، اس لیے قرآن و سنت کے اجتماعی اور معاشرتی احکام کے نفاذ کے لیے خلافت کا قیام فرض اور واجب ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں ہم سب خلافت کے تارک ہیں۔ حکمران اس درجہ میں کہ ان کے پاس اختیار ہے مگر وہ نہیں کر رہے، جبکہ سیاسی راہنما اور علماء کرام اس طور پر کہ وہ منظم محنت کر کے ملک میں ایسی فضا قائم کر سکتے ہیں مگر ان کی اس طرف توجہ نہیں ہے۔ اسی طرح خلافت کے احیا کی جو تحریکیں اس وقت عالمِ اسلام میں موجود ہیں ان میں سے ہر ایک کا ہدف صرف یہ ہے کہ کسی طرح وہ دنیا کے کسی خطہ میں اقتدار حاصل کر لیں اور خلافت کے قیام میں ان کی طرف سے پہل ہو جائے، لیکن جو اصل ضرورت ہے کہ امت میں عمومی طور پر خلافت کی بحالی کا ذوق بیدار ہو، آج کے حالات اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے رائے عامہ کو خلافت کی بحالی کے لیے منظم کیا جائے اور بھرپور عوامی قوت کے ساتھ خلافت کے قیام کی جدوجہد کی جائے، یہ کام دنیائے اسلام میں کسی جگہ نہیں ہو رہا۔

اس کے برعکس ”امامت“ کا تصور رکھنے والوں نے مربوط اور منظم محنت کر کے اسے نہ صرف عملاً قائم کر لیا ہے بلکہ کامیابی کے ساتھ اسے چلا بھی رہے ہیں۔ ایران میں شاہ کے خلاف مذہبی طبقہ

نے بیداری اور بیزاری دونوں کا پوری قوت کے ساتھ اظہار کیا، جناب خمینی صاحب نے اپنی جدوجہد اور محنت کا ہدف یونیورسٹیوں کو بنایا، ان کے اساتذہ وطلبہ کی ذہن سازی کی، انہیں اپنے مذہبی فلسفہ کے مطابق حکومت کی تشکیل اور اس میں مختلف شعبوں میں خدمات سرانجام دینے کے لیے تیار کیا، رائے عامہ کو منظم کیا، شاہ ایران کے خلاف ذہن رکھنے والے تمام طبقوں حتیٰ کہ قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کو بھی ساتھ ملایا اور پہلے شاہ کو شکست دی اور پھر اپنی تربیت، ذہن سازی اور منظم تیاری کی بنیاد پر حکومت پر قبضہ کر کے کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کو دھیرے دھیرے پس منظر کی طرف دھکیل دیا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس انقلاب کے بعد زندگی کے مختلف شعبوں کو سنبھالنے اور ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے تربیت یافتہ اور ذہنی طور پر پختہ افراد کی کھیپ موجود تھی جس نے انقلاب کے بعد ملک کے نظام کو سنبھال لیا اور اب تک سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس سب کچھ کی تیاری انقلاب کے بعد نہیں کی گئی بلکہ انقلاب سے پہلے یہ سارے کام درجہ بدرجہ مکمل ہو چکے تھے، اس لیے ان کا انقلاب کامیاب ہوا اور کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔

مگر ہمارے ہاں صورتحال کیا ہے؟ مجھے اگر اس گستاخی پر معاف کر دیا جائے تو عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمارے ہاں خلافت کی تمام تر بحث صرف ایک دو نقطوں کے گرد گھومتی ہے کہ ”خلیفہ اول“ کون تھے اور خلافت راشدہ میں کون کون بزرگ شامل ہیں؟ ان دو باتوں سے ہٹ کر خلافت کا کوئی اور پہلو ہمارے ہاں سرے سے زیر بحث نہیں آتا اور نہ ہی ہم اس پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، حالانکہ خلافت کا اپنا ایک مستقل نظام ہے جو سیاسی بھی ہے، معاشی بھی ہے، قانونی بھی ہے، انتظامی بھی ہے اور معاشرتی بھی ہے۔

آج کی دنیا جن معاشی مشکلات سے دوچار ہے خود دنیا نے اس کے معاشرتی پہلو کا حل یہ نکالا ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرح ”ویلفیئر اسٹیٹ“ کا اصول اپنایا ہے۔ برطانیہ اور ناروے سمیت بعض مغربی ملکوں نے حضرت عمرؓ کے بیت المال کے نظام پر ریسرچ کی ہے اور اس کا بہت سا حصہ اپنے نظام میں شامل کیا ہے جس کا وہ اعتراف بھی کرتے ہیں۔ لیکن ہم مسلمانوں کے علمی و سیاسی حلقوں کو اس کی توفیق نہیں ہے کہ وہ آج کے حالات اور معاشرتی ضروریات کو سامنے رکھ کر خلافت راشدہ کے معاشی نظام اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کے بیت المال کے سسٹم کو اسٹڈی کریں اور اسے آج کی اصطلاحات میں ایک پورے نظام کی شکل دیں۔ میں مثال کے طور پر ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں، امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلافت کے منصب پر فائز ہوئے تو انہیں سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش تھا کہ بیت المال کے دو تہائی سے زیادہ اثاثے حکمران خاندان کے قبضے میں تھے اور

قومی خزانہ خالی تھا۔ انہوں نے قومی خزانے کے یہ اثاثے واپس لینے کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے فدک کا باغ واپس کیا جو اُن کے ذاتی قبضہ میں تھا، پھر اپنی اہلیہ فاطمہ بنت عبد الملک کے زیورات اتروا کر بیت المال کو واپس بھجوائے اور پھر حکمران خاندان کا اجتماع کر کے ان سے تقاضا کیا اور چند ہفتوں کے اندر وہ بیت المال کے اثاثے واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔

ہمارا آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ قومی خزانہ خالی ہے اور ملکی دولت بڑے بڑے لوگوں کے بیرونی اکاؤنٹس میں منتقل ہو چکی ہے اور اس کی واپسی کے لیے چیخ و پکار جاری ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے، اگر ہم آج کے مسائل کو سامنے رکھ کر خلافت راشدہ کے نظام کو ان کے حل کے طور پر پیش کریں اور عام لوگوں کو سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں تو خلافت کے نظام کے لیے امت کو تیار کرنا زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔

گلگت بلتستان میں خونریز کشیدگی

روزنامہ اسلام، لاہور ---۱۶ اپریل ۲۰۱۲ء

شمالی علاقہ جات میں خونریز کارروائیوں کا نیا سلسلہ جہاں انتہائی افسوسناک ہے وہاں مستقبل کے خطرات و خدشات کے لیے الارم کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اور یہ اندازہ کرنا اب مشکل نہیں رہا کہ اس خطہ کو کن مقاصد کے لیے اس قسم کی کارروائیوں کے ذریعے تیار کیا جا رہا ہے اور اس علاقہ کے مستقبل کی نئی نقشہ گری کا تانا بانا بننے والے عناصر شمالی علاقہ جات میں کہاں کہاں اور کون کون سا رنگ بھرنے کے خواہشمند ہیں۔

گلگت بلتستان اور سکردو وغیرہ پر مشتمل یہ خطہ بین الاقوامی نقشوں میں جموں و کشمیر کے متنازعہ علاقہ کا حصہ ہے اور اس نقشہ میں شامل ہے جس کے عوام کو آزادانہ حقِ خود ارادیت دلانے کے لیے پاکستان ہر عالمی فورم پر سفارت کاری کی جنگ لڑ رہا ہے۔ لیکن اس کے لیے جموں و کشمیر کے بارے میں عمومی پالیسی سے ہٹ کر جو سیاسی پالیسی اختیار کی گئی ہے اس نے مسئلہ کشمیر کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا دینے کے علاوہ شمالی علاقہ جات کے باشندوں کے لیے بھی مشکلات کے ایک نئے دور کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ علاقہ عوامی جمہوریہ چین کی سرحد پر واقع ہے جو شاہراہ ریشم پر چین کے لیے مین گیٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس علاقہ میں دیوسائی کا بلند ترین وسیع میدان چین سمیت چاروں طرف کے ممالک پر فضائی بالادستی اور نگرانی کے لیے موزوں ترین میدان سمجھا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں چین سے مخاصمت رکھنے اور اس کے گرد گھیرا ڈالنے والی قوتوں کی اس خطے سے دلچسپی بلکہ بیتابی کو سمجھنا کسی بھی باشعور شخص

کے لیے مشکل نہیں ہے۔ اور اس علاقائی اور بین الاقوامی تناظر میں شمالی علاقہ جات کے عوام کے لیے متنازعہ سیاسی حکمت عملی اپنانا اور پھر اس مختلف العقائد آبادی کو آپس میں لڑنے کے لیے کھلا چھوڑ دینا بلکہ مبینہ طور پر اس باہمی لڑائی کی پشت پناہی کرنا ملک کی جغرافیائی سرحدوں اور قومی وحدت و سلامتی کے لیے کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے، اس کا صحیح طور پر اندازہ کرنا ملک کے ہر محب وطن شہری کی ذمہ داری ہے۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو اور یہ محض خدشات و توہمات کے درجے کی بات ہو مگر نظر بہرحال ایسے ہی آرہا ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں قومی سیاسی حلقوں کی بے توجہی اور سرد مہری کو کم از کم الفاظ میں افسوسناک ہی قرار دیا جا سکتا ہے اور خاص طور پر کشمیر کے مسئلہ سے تعلق رکھنے والی سیاسی جماعتوں اور شخصیتوں کی بے پروائی اور بھی زیادہ قابل افسوس قرار پاتی ہے۔

گلگت بلتستان میں بسنے والے عوام سنی، شیعہ، اسماعیلی اور نور بخشی عقائد کے حوالہ سے منقسم ہیں اور آبادی کا باہمی تناسب اس قدر حساس اور نازک ہے کہ باہمی تعلقات کا کوئی مستقل اور سب کے لیے قابل قبول نظام طے نہ کیا گیا تو عالمی قوتوں کے لیے اس "کارڈ" کے استعمال کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ اس لیے اس علاقہ میں وقتاً فوقتاً رونما ہونے والی سنی شیعہ فسادات صرف مذہبی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ سیاسی اور علاقائی مسئلہ ہے، ملک کی جغرافیائی حدود کے تحفظ کا مسئلہ ہے، کشمیر کے مستقبل کا مسئلہ ہے، قومی وحدت و سالمیت کا مسئلہ ہے اور عالمی قوتوں کو اس خطہ میں مداخلت کا موقع فراہم کرنے یا اس سے باز رکھنے کا مسئلہ ہے۔ اور ان سب پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ہی اس مسئلہ کا کوئی مستقل حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

مسلح کارروائیاں اہلِ سنت کی طرف سے ہوں یا اہلِ تشیع کی طرف سے یکساں طور پر قابل مذمت ہیں اور ان کارروائیوں کا شکار ہونے والے لوگ خواہ وہ کسی طرف کے بھی ہوں یکساں ہمدردی اور غمخواری کے مستحق ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں مسلح کارروائیاں کرنے والے نہ سنی ہیں اور نہ شیعہ بلکہ ان کے پیچھے اصل ماسٹر مائنڈ کوئی تیسرا دائرہ ہے جس کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے بلکہ تلاش سے زیادہ نشاندہی کی ضرورت ہے جو ہمارے حساس اداروں کے لیے کسی درجہ بھی مشکل کام نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا پہلو یہ ہے کہ مجھے آج ہی فون پر اسی علاقے کے ایک صاحب نے بتایا کہ چند روز قبل ہونے والے سانحے میں اور گزشتہ روز کے افسوسناک واقعہ میں فائرنگ کرنے والوں کو مبینہ طور پر پولیس کی وردی میں دیکھا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ پولیس تو یہ کارروائی کرنے سے رہی، کچھ لوگوں نے پولیس کی وردی کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے اور انہوں نے دونوں طرف نفرت کی آگ بھڑکانے کے لیے یہ کارروائی کی ہے۔

اس لیے ہماری پہلی گزارش ملک کے قومی سیاسی حلقوں خاص طور پر مسئلہ کشمیر کے لیے کردار رکھنے والی جماعتوں اور شخصیتوں اور اس کے ساتھ ساتھ آزاد جموں وکشمیر کی سیاسی جماعتوں سے مشترکہ طور پر یہ ہے کہ اسے صرف مذہبی فرقہ واریت کا معاملہ کہہ کر نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ اس وسیع تناظر میں اس مسئلہ کا جائزہ لیا جائے جس کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے۔

جناب محمد خان جونیجو مرحوم کی وزارت عظمیٰ کے دور میں جب گلگت و بلتستان کو الگ صوبہ کی حیثیت دینے کا سوال سامنے آیا تھا اور جونیجو مرحوم نے اس کے باقاعدہ اعلان کے لیے گلگت کے دورے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا، اس وقت سردار عبد القیوم خان (اللہ انہیں صحت و سلامتی سے نوازیں، آمین) آزاد کشمیر کے وزیراعظم تھے۔ جمعیۃ علماء اسلام (درخواستی گروپ) کی ہائی کمان نے اس مسئلہ میں دلچسپی لینے کا فیصلہ کیا تھا اور حضرت مولانا قاضی عبد اللطیفؒ، حضرت مولانا عبد الحکیم ہزارویؒ اور راقم الحروف پر مشتمل ایک وفد نے اسلام آباد کے آزاد کشمیر ہاؤس میں سردار عبد القیوم خان سے ملاقات کر کے انہیں اپنے خدشات سے آگاہ کیا، ان سے اتفاق کرتے ہوئے سردار صاحب محترم نے وفاقی حکومت سے بات کی تھی اور معاملہ سنبھل گیا تھا۔ سردار صاحب اب صاحب فراش ہیں اور شاید کوئی عملی کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں مگر ان کے فرزند سردار عتیق احمد خان اور ان کی جماعت مسلم کانفرنس تو آج بھی اس سلسلہ میں مؤثر کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں ہے، اگر آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے سرکردہ علماء کرام کا ایک وفد ان سے مل کر انہیں کوئی کردار ادا کرنے کے لیے آمادہ کر سکے تو میرے خیال میں بات صحیح رخ پر آگے بڑھ سکتی ہے اور راہنمائی کے لیے سردار محمد عبد القیوم خان کی شخصیت تو ان کے پاس موجود ہی ہے۔

جہاں تک سنی شیعہ تنازع کا تعلق ہے میرے نزدیک اسے اب ہلکے پھلکے انداز میں لینے کا وقت نہیں رہا، معاملات بہت آگے بڑھ چکے ہیں اور مسلسل آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ میری طالبعلمانہ رائے میں مشرق وسطیٰ میں سنی شیعہ بنیاد پر آگے بڑھنے والی سیاست اور مستقبل میں اس حوالے سے نظر آنے والی کشمکش کو پاکستان کی سنی شیعہ کشمکش سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں مسلسل گرم ہوتا ہوا ماحول بھی اس سے الگ نہیں ہے۔ اس سارے تناظر کو پوری گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی درخواست تو ہم مولانا فضل الرحمان اور مولانا سمیع الحق سے کرنا چاہیں گے کہ وہ اس مسئلہ کو نظر انداز نہ کریں بلکہ اپنی جدوجہد یا کم از کم غور و فکر کے دائرہ میں اسے ضرور شامل کریں۔ دوسری درخواست سنی محاذ پر کام کرنے والی جماعتوں اور شخصیات سے ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل کے

دائرہ کو وسعت دیں اور نہ صرف یہ کہ اس سلسلہ میں محنت کرنے والی دیوبندی جماعتیں فوری طور پر مل بیٹھنے کا اہتمام کریں اور مشترکہ لائحہ عمل کا تعین کریں، بلکہ بریلوی اور اہل حدیث مکاتبِ فکر کے راہنماؤں کو اعتماد میں لینے کی کوئی صورت بھی ضرور نکالیں۔ خدا جانے ہماری یہ بات بہت سے دوستوں کے ذہنوں تک رسائی پانے میں کامیاب کیوں نہیں ہو رہی کہ صرف مسلکی بنیاد پر ہم قادیانیوں کے خلاف جدوجہد میں بھی آگے نہیں بڑھ سکے تھے، اور تعلیم یافتہ طبقہ حتٰی کہ اہلِ تشیع کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنا پڑا تھا بلکہ عالمی سطح پر سعودی عرب، مصر، انڈیا اور دوسرے ممالک کی دینی قیادتوں کو اعتماد میں لے کر اور ملک کی سیاسی جماعتوں کو جدوجہد میں شریک کر کے ہی ہم اپنی جدوجہد کو کامیابی کی منزل سے ہمکنار کر پائے تھے۔ اس لیے سنی محاذ پر بھی صرف مسلکی جدوجہد اور وہ بھی اپنی سیاسی قیادت اور فکری و علمی حلقوں کو اعتماد میں لیے بغیر اس جدوجہد میں کوئی عملی پیشرفت آخر کیسے ممکن ہے؟

حضرت مولانا محمد عبد اللہ شہیدؒ آف اسلام آباد کی زندگی کے آخری ایام کی بات ہے اس سلسلہ میں ایک وسیع تر مشاورت ہوئی تھی جس کے لیے علامہ علی شیر حیدری شہیدؒ کو بھی اعتماد میں لیا گیا تھا اور اس تجویز پر بات ہوئی تھی کہ مولانا محمد عبد اللہ شہیدؒ، مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور راقم الحروف مشترکہ طور پر پہلے مرحلہ میں اپنی ہم مسلک ایسی شخصیات سے رابطہ کریں جو سنی شیعہ مسئلہ سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ اس کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ ایسی چیدہ چیدہ شخصیات کی باہمی مشاورت کا اہتمام کر کے پوری صورتحال کا جائزہ لیا جائے اور اس سلسلہ میں اہل حق کے کردار اور طریق کار کو منظم کرنے کی کوئی عملی صورت نکالی جائے۔ حضرت مولانا محمد عبد اللہؒ کی شہادت سے ہفتہ عشرہ قبل جامعہ اسلامیہ راولپنڈی صدر میں منعقد ہونے والے پاکستان شریعت کونسل کے ایک اجلاس میں مولانا محمد عبد اللہؒ اور مولانا قاری سعید الرحمانؒ سے اس مسئلہ پر تفصیلی بات ہوئی تھی اور مولانا چنیوٹیؒ بھی اس کے لیے آمادگی کا اظہار کر چکے تھے مگر چند روز بعد حضرت مولانا محمد عبد اللہؒ کی المناک شہادت کے باعث یہ مشاورت دم توڑ گئی۔ آج کے معاملات میں اس قسم کی مشاورت کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے مگر میری صورتحال یہ ہے کہ کوئی عملی کردار ادا کرنے اور وقت دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، کوئی صاحب خیر آگے بڑھیں تو مشاورت کے درجے میں معاونت کے ساتھ قلم کا تعاون کھلے دل سے حاضر ہوگا، ان شاء اللہ تعالٰی۔

امتِ مسلمہ کی صورتحال: ہوشمندانہ حکمتِ عملی کی ضرورت

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ---اگست ۲۰۱۲ء

محترم مولانا زاہد حسین رشیدی کا مضمون ''الشریعہ'' کے اسی شمارہ میں ماہنامہ ''فقاہت'' لاہور کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے جو انہوں نے راقم الحروف کے ساتھ ایک ملاقات اور گفتگو کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے۔ اس میں انہوں نے جن اہم امور کی طرف توجہ دلائی ہے، ان کے بارے میں کچھ معروضات پیش کی جا رہی ہیں:

- علمی و فکری مباحثہ کو فروغ دینے اور علمی مسائل پر علمی انداز میں بات چیت کی ضرورت کا احساس دلانے کے لیے ''الشریعہ'' گزشتہ دو عشروں سے جو محنت کر رہا ہے، وہ چونکہ علماء کے حلقہ کی بات ہے، اس لیے میرا معمول ہے کہ عمومی مجالس میں اس پر گفتگو نہیں کرتا بلکہ اسے مفید بھی نہیں سمجھتا۔ البتہ اپنے اسباق کے دوران اور اہلِ علم کی مجالس میں حسبِ ضرورت اس کا تذکرہ کرتا ہوں اور متعلقہ سوالات کا جواب بھی دیتا ہوں۔ میری کوشش علماء، طلبہ، مدرسین اور اصحابِ فکر کو ان مسائل کی طرف توجہ دلانے کی ہوتی ہے جو امتِ مسلمہ کو کسی نہ کسی سطح پر درپیش ہیں مگر ہماری عدمِ توجہ کی وجہ سے دوسرے علمی حلقوں میں وہ پہلے زیرِ بحث آجاتے ہیں جن کے نتائجِ فکر سے ہمیں اختلاف ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اس کے بعد مسئلہ کو زیرِ بحث بنانے سے بہتر ہے کہ ہم آغاز میں ہی اس مسئلہ کی طرف توجہ دیں اور اس کے بارے میں علمی اور سنجیدہ انداز میں اپنی رائے کا مناسب اظہار کر دیں، اس کے بعد جس طرف سے جو رائے بھی آئے گی اس کی حیثیت بہرحال ثانوی اور دفاعی ہوگی۔ جبکہ موجودہ طرزِ عمل میں ہماری رائے ردِ عمل تصور کی جاتی ہے اور ثانوی و دفاعی درجہ اختیار کرنے کے باعث پوری طرح مؤثر نہیں ہو پاتی۔
- خلافتِ راشدہ کے بارے میں میرا مشاہدہ اور تاثر یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس کے صرف اعتقادی پہلو پر کسی حد تک بات کی جاتی ہے اور وہ اس جزوی دائرہ تک محدود رہتی ہے جس کا تعلق اہلِ تشیع کے ساتھ اختلاف و تنازع کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سے ہٹ کر ہم خلافت اور خلافتِ راشدہ کے موضوع پر سرے سے بات ہی نہیں کرتے۔ حالانکہ ہماری عمومی دینی ضرورت یہ ہے جو آج کے عالمی سیاسی و تہذیبی تناظر میں اور زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے کہ

خلافتِ راشدہ کے نظام کی سیاسی بنیادوں، خلافتِ راشدہ کے معاشرتی ماحول، خلافتِ راشدہ کے معاشی اصولوں اور طریقِ کار، بیت المال، رفاہی ریاست، خلافتِ راشدہ کے دور میں معاشرہ کے مختلف طبقات کو حاصل ہونے والے مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق، خلفائے راشدینؓ کے طرزِ حکومت اور ان کے طرزِ زندگی اور آج کے عالمی سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظاموں کے ساتھ خلافتِ راشدہ کے نظام کے تقابل وتجزیہ پر کھل کر بات کی جائے۔

- مجھے ذاتی طور پر جہاں مناسب محسوس ہوتا ہے ان میں سے بعض امور پر گفتگو کرتا ہوں اور اس سلسلہ کے چند بیانات تحریری صورت میں شائع بھی ہو چکے ہیں، لیکن جس سطح پر اور جن دائروں میں اس کام کی ضرورت ہے، ان میں کام کرنے کا حوصلہ، وسائل اور مصروفیات دونوں حوالوں سے اپنے اندر نہیں پاتا۔ اگر خلافت کے موضوع پر کام کرنے والی جماعتیں، بالخصوص اہلِ سنت کے عقائد ومفادات کے تحفظ کا دعویٰ رکھنے والے حلقے اس سلسلے میں کسی علمی وفکری محنت کے لیے سنجیدہ ہوں تو مجھے تعاون کر کے خوشی ہوگی اور میں اسے اپنے لیے باعث سعادت ونجات تصور کروں گا۔
- پاکستان میں اور اس سے بڑھ کر مشرقِ وسطیٰ میں سنی شیعہ تنازع جو صورت اختیار کرتا جا رہا ہے اور کشمکش کے جو دائرے تیزی کے ساتھ ابھرتے دکھائی دے رہے ہیں، وہ انتہائی پریشان کن ہیں اور مستقبل کا انتہائی افسوسناک منظر پیش کر رہے ہیں۔ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے دوران مشرقِ وسطیٰ کے بہت سے حصوں میں فاطمی حکومت تاریخ کا اہم حصہ رہی ہے اور سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں مصر کے مملوک حکمرانوں کے خلاف عثمانی خلیفہ سلطان سلیم اولؒ کی جنگ کا تناظر بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ خلافتِ عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام مصطفی صبریؒ نے مملوکوں کے خلاف سلطان سلیمؒ کی جنگ اور مصر پر ترکوں کے قبضہ کا پس منظر یہ بیان کیا ہے کہ مصر کے مملوک حکمرانوں کا رجحان ایران کی صفوی حکومت کی طرف بڑھتا جا رہا تھا اور صفوی حکمرانوں کی کوشش تھی کہ شیعی مذہب وعقائد کو قوت کے زور پر مصر کے ذریعے خلافتِ عثمانیہ کے علاقوں میں پھیلایا جائے۔ سلطان سلیمؒ نے اس کا راستہ روکنے کے لیے مصر پر قبضہ کر لیا اور مملوکوں کو راہ سے ہٹا دیا۔ اس دوران سلطان سلیمؒ اور صفویوں کے درمیان جو معاہدات ہوئے ان کے بارے میں شیخ الاسلام مصطفی صبریؒ کا کہنا ہے کہ ان میں سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ، سیدنا حضرت عمر فاروقؓ اور سیدتنا حضرت عائشہؓ کی توہین سے باز رہنے کی شقیں بھی موجود تھیں۔

- مجھے خدانخواستہ مستقبل قریب میں مشرقِ وسطیٰ کے بہت سے علاقوں میں یہ کشمکش پھر سے شروع ہوتی دکھائی دے رہی ہے جبکہ خلافتِ عثمانیہ اور سلطان سلیمؒ کا دور دور تک کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ ان خدشات و خطرات کے سدِّباب کے لیے اگر کوئی کردار ادا کرنا ہے تو اس خطہ کی دینی قیادت نے کرنا ہے، جسے سرے سے ان مسائل اور اس صورتحال کا ادراک ہی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت و اہمیت کا کوئی احساس پایا جاتا ہے۔ اس محاذ پر ہماری جدوجہد اور محنت عوامی جذبات کو بھڑکانے، نعرے لگوانے، جلسوں میں دھواں دار تقریریں کرنے اور قیمتی کارکنوں کو قربان کرتے چلے جانے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور اسی طرزِ عمل کو ہم نے اپنی کامیابی اور نجات دونوں کا مدار قرار دے لیا ہے۔ معاملہ فہمی، مسائل کا ادراک، تدبر، حکمت اور حوصلہ کے ساتھ مسائل کو حل کرنے اور اپنی قوت کو محفوظ رکھتے ہوئے اس کے صحیح اور بروقت استعمال کا ذوق اور صلاحیت ہم نے فریق ثانی کے لیے مختص کر دیے ہیں۔

میں سالہا سال سے متعلقہ حضرات سے گزارش کر رہا ہوں کہ اہلِ فکر و دانش کے باہم مل بیٹھنے کی ضرورت ہے، اس طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے، پورے خطے کی مجموعی صورتحال کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے، اس سلسلے میں مختلف ممالک میں کام کرنے والوں کے ساتھ رابطہ و مشاورت کی ضرورت ہے، عالمی استعماری قوتیں اس کشمکش کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کے لیے جس طرح مستعد و متحرک ہیں، اسے سمجھنے کی ضرورت ہے، اور جذباتیت و سطحیت سے ہٹ کر مضبوط علمی و فکری اساس پر جدوجہد کی نئی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے، مگر جہاں خود اپنی ہی طے کردہ حکمتِ عملی اور پالیسیوں پر نظرِ ثانی کو کفر کا درجہ دیا جانے لگا ہو، وہاں ان باتوں کو کون سنتا ہے اور ان پر کون توجہ دیتا ہے؟

بہرحال اگر کچھ اصحابِ فکر و دانش اس مقصد کے لیے مل بیٹھنے کو تیار ہوں تو علمی و فکری مشاورت کے دائرہ میں میری خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔ دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ہم سب کو صورتحال کا صحیح ادراک نصیب فرمائیں اور خلوص، حوصلہ اور حکمت کے ساتھ دینی جدوجہد کو آگے بڑھانے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

شام کا بحران

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- اگست ۲۰۱۲ء

شام کا بحران دن بدن سنگین ہوتا جا رہا ہے اور ان سطور کی اشاعت تک اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ

شاید سامنے آ چکا ہو، مگر اب تک کی صورت حال کے پیش نظر یہ گزارش ہے کہ شام کی صورت حال کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ عرب ممالک میں آمر اور مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف عوامی احتجاج کی لہر تیونس، لیبیا اور مصر کے بعد شام میں بھی اپنی جولانیاں دکھا رہی ہے اور عوام کی ایک بڑی تعداد سڑکوں پر ہے جو بشار الاسد کی حکومت کے جبر اور تشدد کا شکار ہے اور سیکڑوں شامی شہری اس میں جاں بحق ہو چکے ہیں، لیکن اس کا ایک مذہبی پہلو ہے جس نے اس بحران کی شدت کو مزید دو آتشہ کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ شام کے صدر بشار الاسد اور فوجی قیادت کی اکثریت کا تعلق نصیری فرقہ سے ہے جو اہلِ تشیع میں بھی انتہا پسند گروہ شمار ہوتا ہے اور جس کا عقیدہ یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ خود خدا تھے جو انسانی شکل میں دنیا میں چند روز کے لیے تشریف لائے تھے۔

ہمیں اس سے غرض نہیں کہ ان کے عقائد کیا ہیں، البتہ اس بحران کے تاریخی پس منظر کی وضاحت کے لیے یہ ذکر شاید نامناسب نہیں ہوگا کہ بشار الاسد کے والد حافظ الاسد کے دور حکومت میں بھی اب سے ربع صدی قبل یہ سانحہ پیش آیا تھا کہ اہلِ سنت کے مذہبی مرکز ''حماۃ'' کو ایک مرحلے میں بلڈوز کر دیا گیا تھا، کم و بیش دس ہزار علماء کرام اور کارکنوں نے اس سانحے میں جام شہادت نوش کیا تھا اور بہت سے علماء کرام جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے جن میں ہمارے استاذ محترم الاستاذ عبد الفتاح ابو غدۃ رحمہ اللہ تعالیٰ بھی شامل ہیں جو اس وقت اخوان المسلمون شام کے رئیس تھے اور جلاوطن ہو کر سعودی عرب آ گئے تھے۔ اب بھی عوامی مظاہرین اور ان پر تشدد کرنے والی سرکاری فورسز کی تقسیم کا منظر یہی بیان کیا جاتا ہے اور گزشتہ روز جدہ میں ایئرپورٹ کے قریب مسجد عائشہؓ میں نماز مغرب کے دوران امام محترم سے شامی حکمرانوں کے خلاف ''قنوتِ نازلہ'' سن کر ہمیں اس پہلو کی شدت کا اندازہ ہوا۔ بہرحال ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے شامی بھائیوں کو اس بحران میں سرخ روئی اور کامیابی سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

اسلام کا نظامِ خلافت

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۶ تا ۱۱ جنوری ۲۰۱۳ء

گزشتہ ہفتے کراچی میں حاضری کے دوران معروف نقشبندی شیخ حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں قائم ''زوار اکیڈمی'' میں حضرتؒ کے پوتے ڈاکٹر سید عزیز الرحمن کی فرمائش پر خلافت کے موضوع پر کچھ معروضات دو نشستوں میں پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس سے قبل کراچی میں ہی جامعہ اسلامیہ کلفٹن اور جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن کی تخصصات کی کلاسوں کے سامنے اس

موضوع پر متعدّد نشستوں میں گزارشات پیش کر چکا ہوں اور ان کے کچھ حصے اس کالم میں پہلے بھی شائع ہوئے ہیں، مگر بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ یہ ساری گفتگو مربوط شکل میں ترتیب کے ساتھ تحریر میں آجانی چاہیے۔ چنانچہ ان دوستوں کے اصرار پر اب تک اس موضوع پر مختلف نشستوں میں کی جانے والی گفتگو کا خلاصہ ترتیب کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ لیکن اس بات کی وضاحت گفتگو شروع کرنے سے قبل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ میرے ذاتی مطالعہ اور تجزیہ کا حاصل ہے اور مجھے ان میں سے کسی بات کے ہر حال میں ضروری ہونے پر اصرار نہیں ہے۔ اس لیے کسی صاحبِ فکر کو میری کسی گزارش سے اختلاف ہو تو ان کا حق ہے کہ اس کا اظہار کریں، اسے ریکارڈ پر لائیں، یا مناسب سمجھیں تو مجھے اس سے آگاہ فرمائیں، میں ان کا شکر گزار ہوں گا۔

خلافت کا معنیٰ

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ خلافت کا لفظی معنیٰ نیابت ہے جو قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے حوالہ سے آیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے اللہ رب العزت نے فرشتوں سے فرمایا کہ انی جاعل فی الأرض خلیفة میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں، اور حضرت داؤد علیہ السلام سے رب العزت نے فرمایا انا جعلناک خلیفة فی الارض ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا معنٰی بعض مفسرین بیان فرماتے ہیں کہ زمین پر پہلے جن بستے تھے، ان کی جگہ زمین کا نظام انسانوں کے حوالہ کر دیا گیا۔ یہ بات مشاہدہ میں بھی ہے کہ زمین پر بسنے والے ہزاروں قسم کے جانوروں میں سے زمین کے معاملات میں تصرف انسان ہی کر رہا ہے اور زمین کے ساتھ ہوا، پانی اور دیگر متعلقات پر بھی اسی کا تصرف ہے۔ یہ معنٰی بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی نیابت و خلافت عطا فرمائی ہے کہ زمین پر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارے گا اور خدائی احکامات و قوانین کا نفاذ کرے گا۔ جبکہ حضرت داؤد علیہ السلام کو خلیفہ قرار دے کر انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ ”لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرنا“۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کو سیاسی نظام کے طور پر بیان فرمایا ہے، بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق رسول اکرمؐ نے فرمایا کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبیاء کہ بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت حضرات انبیاء کرام علیہم السلام فرمایا کرتے تھے، وہ خود حکمران ہوتے تھے یا حکمران کا تعین ان کے حکم سے ہوتا تھا، جیسا کہ جابر بادشاہ جالوت کے مقابلہ کے لیے بنی اسرائیل نے اپنے

وقت کے پیغمبر سے درخواست کی کہ ان کے لیے بادشاہ کا تقرر کیا جائے تاکہ وہ اس کی قیادت میں جابر بادشاہ کا مقابلہ کر سکیں، چنانچہ ان کے پیغمبر حضرت سموئیل علیہ السلام نے طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ جناب نبی اکرمؐ نے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل میں سیاسی معاملات حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نمٹایا کرتے تھے، اس سے سوال پیدا ہوا کہ نبی اکرمؐ خاتم النبیین ہیں اور آپؐ کے بعد کسی نئے نبی کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے تو پھر آپؐ کے بعد سیاسی نظام کس کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس لیے مذکورہ بالا جملہ کے ساتھ ہی نبی اکرمؐ نے فرما دیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا وستکون بعدی خلفاء البتہ میرے بعد خلفاء ہوں گے جو اس سیاسی نظام کو سنبھالیں گے۔ اس طرح جناب نبی اکرمؐ نے خلافت کو امت مسلمہ کے سیاسی نظام کے طور پر بیان فرمایا ہے اور اسلام کے سیاسی نظام کا عنوان ''خلافت'' ہے۔

خلیفہ کس کا نائب ہے؟

یہاں ایک دل چسپ بحث قابل توجہ ہے کہ خلیفہ شریعت اسلامیہ میں اللہ تعالیٰ کا نائب تصور ہوتا ہے یا جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتا ہے؟ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خلیفہ اللہ تعالیٰ کا نائب ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے اس لیے کہ امام ابویعلیٰؒ کی ''الاحکام السلطانیہ'' میں واقعہ مذکور ہے کہ ایک صاحب نے خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبرؓ کو یا خلیفۃ اللہ کہہ کر خطاب کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ لست بخلیفۃ اللہ انا خلیفۃ رسول اللہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ کو یا خلیفۃ رسول اللہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کو یا خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ کہہ کر پکارا جانے لگا تو خطاب میں خلیفہ کے لفظ کے تکرار سے انہیں الجھن ہوتی تھی۔ شاید اس لیے کہ تیسرے اور چوتھے خلیفہ کے اس خطاب میں خلیفہ کے لفظ کا تکرار کتنی بار ہوگا اور اس سے کیا صورت حال پیدا ہوگی؟ اس پس منظر میں ایک دن حضرت عمرؓ کو حضرت عمرو بن العاصؓ نے یا امیر المومنین کہہ کر پکارا تو حضرت عمرؓ نے اس خطاب کو پسند کیا اور فرمایا کہ اب انہیں امیر المومنین کہہ کر ہی خطاب کیا جائے۔

اسی طرح فقہاء امت نے ''خلافت'' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے جہاں یہ بیان کیا ہے کہ خلیفہ اسے کہتے ہیں جو امت کے سیاسی اور اجتماعی امور سرانجام دے، وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ نیابتًا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کی یہ حیثیت جناب نبی اکرمؐ کے نائب کے طور پر ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی اگر ''خلافت و امامت'' کی بحث پر ایک نظر ڈال لی جائے تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے جو اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے ہاں صدیوں سے جاری ہے۔

خلافت اور امامت میں فرق

اہلِ سنت کے نزدیک جناب نبی اکرمؐ کے بعد مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی قیادت کا عنوان ''خلافت'' ہے جبکہ اہلِ تشیع اسے ''امامت'' سے تعبیر کرتے ہیں اور دونوں میں مختلف حوالوں سے واضح فرق ہے:

- خلیفہ کا تقرر جناب نبی اکرمؐ نے خود نہیں کیا تھا بلکہ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا، اور حضرت صدیق اکبرؓ کا خلیفۂ اول کے طور پر انتخاب امت مسلمہ نے خاصے بحث و مباحثہ کے بعد اپنی اجتماعی صوابدید کے مطابق کیا تھا۔ جبکہ اہلِ تشیع کے نزدیک امام کے طور پر حضرت علیؓ کا تقرر خود جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا، اسی لیے انہیں ''وصی'' کہا جاتا ہے۔
- امامت خاندانی ہے اور اہلِ تشیع کے بارہ اماموں میں سب کے سب ایک دوسرے کے نسبی وارث ہیں، جبکہ خلافت خاندانی نہیں ہے اور خلفاء راشدین میں سے کوئی بھی دوسرے کا نسبی وارث نہیں ہے۔
- امام اہلِ تشیع کے نزدیک ''معصوم'' ہوتا ہے اور اس کی بات خود دلیل ہے، وہ کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے مگر اہلِ سنت کے نزدیک خلیفہ کی شرعی حیثیت ''مجتہد'' کی ہے، وہ قرآن و سنت کی دلیل کا پابند ہے، اس کا اپنا فیصلہ اجتہادی ہوتا ہے جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اس میں صواب کے ساتھ ساتھ خطا کا احتمال بھی موجود ہوتا ہے جیسا کہ خلفاء راشدینؓ کے فیصلوں سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے۔
- امام براہ راست خدا کا نمائندہ ہے اور اس کی بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے مگر خلیفہ جناب نبی اکرمؐ کا نائب ہے اور اس کے کسی فیصلے کو خدائی فیصلے کا درجہ حاصل نہیں ہے۔
- امام کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا، جبکہ خلیفہ کی بات سے عام آدمی بھی اختلاف کر سکتا ہے اور خلیفہ کو دلیل کی بنیاد پر اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر بھی مجبور کیا جا سکتا ہے جس کے بیسیوں شواہد خلفاء راشدینؓ کے دور میں موجود ہیں۔
- اماموں کی تعداد بارہ پر پہنچ کر مکمل ہو گئی ہے اور اہلِ تشیع کے بقول بارہویں امام ہی آخری امام ہیں جو زندہ ہیں اور وہی قرب قیامت میں ظاہر ہو کر امت پر حکمرانی کریں گے۔ جبکہ اہلِ سنت کے نزدیک خلفاء کا سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا اور قیامت سے پہلے ''امام مہدی'' کا ظہور ہوگا، وہ اگرچہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے ہوں گے لیکن اپنے دور میں پیدا ہوں گے اور ان کا ظہور ہوگا جس کے بعد وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد سے امت کی

قیادت کریں گے اور کفر کی طاقتوں کو شکست دے کر اسلامی حکومت قائم کریں گے۔

خلافت پر تھیا کریسی کا الزام

خلافت اور امامت کے اس اصولی فرق کو سمجھ لینے سے ایک اور بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت کے نظام پر تھیا کریسی کا جو الزام عائد کیا جاتا ہے وہ درست نہیں ہے۔ تھیا کریسی خدا کے نام پر حکومت کرنے کو کہتے ہیں جہاں حکمران اللہ تعالیٰ کا نائب کہلا کر ہر قسم کی تنقید اور اختلاف سے بالاتر سمجھا جاتا ہے۔ یہ تصور پاپائے روم کی حکمرانی کے دور میں سامنے آیا تھا کیونکہ پوپ کو خدا کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا، اس کی بات فائنل ہوتی تھی اور اسے آخری اتھارٹی کا درجہ حاصل تھا۔ مغربی دنیا میں پاپائے روم کو صدیوں تک حکمرانوں کے سرپرست اعلیٰ کی حیثیت حاصل رہی ہے اور اس کی بات حکومت و سیاست میں بھی حرف آخر سمجھی جاتی تھی، اس لیے اس اتھارٹی کے خلاف بغاوت ہوئی اور حکومت و سیاست کو پوپ کی سرپرستی سے الگ کرتے ہوئے مذہب سے بھی آزاد کر دیا گیا۔ چنانچہ آج جب کسی جگہ اسلامی حکومت کی بات کی جاتی ہے تو اسے اسی پس منظر میں "تھیا کریسی" قرار دے کر بہت سے حلقوں میں قابل اعتراض قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن "خلافت" کے مذکورہ تصور اور دائرے کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر تھیا کریسی کا یہ الزام درست نہیں ہے، اس لیے کہ خلیفہ معصوم نہیں ہے، عوام کا منتخب نمائندہ ہوتا ہے، اس کی ہر بات سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا ہے، عوام اس کا احتساب کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ اسے معزول بھی کیا جا سکتا ہے، اور وہ خود اتھارٹی ہونے کی بجائے قرآن و سنت کی تعلیمات کا پابند ہوتا ہے جن میں رد و بدل کا اسے خود کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس لیے خلافت کو تھیا کریسی قرار دینا خلافت کے مفہوم و نظام سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے۔ البتہ اہلِ تشیع کی امامت کا مفہوم تھیا کریسی کے قریب قریب ہے لیکن اہلِ سنت اسے قبول نہیں کرتے۔

خلافت، دلیل و قانون کی حکومت

یہاں ایک اور نکتہ بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ "خلافت" ہی دنیا میں وہ واحد سیاسی نظام ہے جسے دلیل اور قانون کی حکومت قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ:

- بادشاہت میں بادشاہ خود قانون کا سرچشمہ ہوتا ہے اور وہ خود ہی اس کا شارح بھی ہوتا ہے۔ قانون بنانے، اسے تبدیل کرنے اور اس کی تشریح کرنے کا اختیار صرف اس کے پاس ہوتا ہے۔
- ڈکٹیٹر شپ خواہ فوجی ہو یا پارٹی کی، اس کی صورت حال بھی اسی قسم کی ہے کہ شخصی یا اجتماعی

ڈکٹیٹر شپ میں حکمران کے پاس ہی قانون سازی اور اس میں ردوبدل کے اختیارات ہوتے ہیں۔

- جمہوریت میں کہا جاتا ہے کہ اختیارات عوام کے پاس ہوتے ہیں لیکن یہ صرف ایک پردہ ہے، اس لیے کہ پارلیمنٹ کو ہر معاملہ میں بالادستی حاصل ہوتی ہے، وہ دستور و قانون بنانے کی مجاز ہوتی ہے، اس میں ردوبدل کا اختیار اسی کے پاس ہوتا ہے اور اسے معطل کرنے کا حق بھی اسے حاصل ہوتا ہے، اس لیے کسی ایسے دستور و قانون کی پابندی کو جسے معطل کرنے اور اس میں ردو بدل کا اختیار بھی خود عمل کرنے والے کو حاصل ہو، دلیل و قانون کی حکومت قرار دینا مشکل سی بات ہے۔
- خلافت میں حکمران شخص یا طبقہ ایک ایسے دستور و قانون کے ہر حال میں پابند ہوتے ہیں جس میں ردوبدل کا انہیں خود کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ خلیفہ اجتہادی دائرے میں فیصلوں کا مجاز ہے لیکن قرآن و سنت کے صریح احکام میں کسی قسم کے ردوبدل کا اختیار نہیں رکھتا بلکہ ان کے نفاذ کا وہ پابند ہے۔ اس لیے خالص دلیل و قانون کی حکمرانی صرف خلافت کی صورت میں دنیا کو میسر آسکتی ہے اس لیے کہ خلیفہ ایسے طے شدہ قوانین کے نفاذ کا پابند ہوتا ہے جس میں رد وبدل کا خود اسے کوئی اختیار نہیں ہے، اسی لیے اسلام کے سیاسی نظام میں حکومت کا تصور نہیں ہے بلکہ اسے خلافت و نیابت کا عنوان دیا گیا ہے۔

خلافت کے مفہوم کو ایک اور حوالہ سے بھی دیکھ لیا جائے کہ اللہ رب العزت نے جب حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو زمین پر اتارا تو دو باتیں واضح فرما دی تھی جن کی قرآن کریم میں صراحت ہے، ایک یہ کہ ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین تمہارے لیے زمین میں قرار گاہ بھی ہوگی اور زندگی کے اسباب بھی ہوں گے لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ ایک محدود مدت تک کے لیے ہوں گے۔ اور دوسری بات یہ کہ اما یأتینکم منی ھدی فمن تبع ہدای فلا خوف علیھم ولاھم یحزنون میری طرف سے ہدایات آئیں گی جو ان ہدایات کی پیروی کرے گا وہ خوف و حزن سے نجات پائے گا اور جو خلاف ورزی کرے گا وہ جہنم میں جائے گا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو ایک محدود مدت کے لیے زمین پر بھیج کر اسے ان ہدایات کا پابند کر دیا جو اس کی طرف سے آئیں گی، یہ ہدایات حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ آتی رہی ہیں جن کا فائنل ایڈیشن قرآن و سنت کی صورت میں آچکا ہے۔ ان ہدایات کی پیروی کا نظام قائم کرنے کا نام خلافت ہے اور یہی خلافت کی اصولی بنیاد ہے۔

نظامِ خلافت کا رفاہی پہلو

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مال چھوڑ کر مرا وہ مال اس کے وارثوں میں تقسیم ہو گا ومن ترک کلًا وضیاعًا فالیّ وعلیّ اور جو شخص قرض کا بوجھ اور بے سہارا اولاد چھوڑ کر مرا وہ میری طرف رجوع کریں گے اور ان کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ گویا آپؐ نے فرمایا کہ سوسائٹی کے نادار، مستحق اور بے سہارا اپنی ضروریات کے لیے میرے پاس آئیں گے، اور آپؐ نے بات صرف فالیّ پر نہیں چھوڑی بلکہ وعلیّ فرما کر خود کو اس کا ذمہ دار بھی قرار دیا۔ چنانچہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے بیت المال کا تصور سامنے آیا جس کا دائرہ آنحضرتؐ کے دور میں یہ تھا کہ کسی شخص کو جو ضرورت بھی پیش آتی تھی وہ آپؐ سے رجوع کرتا تھا اور آپؐ بیت المال کے فنڈ سے اس کی ضرورت پوری فرما دیتے تھے۔ بیسیوں واقعات احادیث میں مذکور ہیں جن میں سے صرف دو کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے خاندان کو ایک سفر کے لیے کچھ اونٹ درکار تھے، میں خاندان کا نمائندہ بن کر جناب نبی اکرمؐ کے پاس گیا اور سواریوں کا تقاضہ کیا، اس وقت آنحضرتؐ کے پاس اونٹ موجود نہیں تھے اس لیے آپؐ نے نہیں دیے لیکن تھوڑی دیر کے بعد کہیں سے اونٹوں کا بندوبست ہو گیا تو مجھے واپس بلا کر دو جوڑے میرے حوالے کیے۔ اسی طرح ایک واقعہ جناب رسول اللہؐ کی خوش طبعی اور دل لگی کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ مجھے سفر کے لیے اونٹ کی ضرورت ہے۔ آپؐ نے فرمایا ٹھہرو میں تمہیں اونٹنی کا بچہ دیتا ہوں، وہ شخص فکر مند ہو گیا کہ میں اونٹنی کے بچے کے ساتھ کیا کروں گا، تھوڑی دیر اس کی فکرمندی سے محظوظ ہونے کے بعد آپؐ نے فرمایا خدا کے بندے جو اونٹ میں تجھے دوں گا وہ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہو گا۔

حکومت کو لوگوں کی ضروریات حسبِ موقع فراہم کرنے کا ذمہ دار قرار دینے کی بات سب سے پہلے جناب رسول اللہؐ نے کی ہے اور وہیں سے رفاہی ریاست اور ویلفیئر اسٹیٹ کا آغاز ہوتا ہے، اور آج بہت سی حکومتوں نے رفاہی ریاست کا یہ نظام اختیار کر رکھا ہے۔ یہ نظام خلفاء راشدینؓ کے دور میں باقاعدہ منظم ادارے کی شکل اختیار کر گیا تھا جس کی ایک عملی صورت حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور خلافت کے ایک واقعہ کا ذکر کر کے واضح کرنا چاہتا ہوں جبکہ اس وقت مدینہ منورہ میں جناب نبی اکرمؐ کی طرف سے بیت المال کے آغاز کو کم و بیش ایک صدی گزر چکی تھی۔

کتاب الاموال میں امام ابو عبید قاسم بن سلاّمؒ نے واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز

کے دور خلافت میں ان کے عراق کے گورنر عبدالحمید مرحوم نے ایک سال انہیں خط لکھا کہ صوبہ میں زکوٰۃ و عشر اور دیگر محصولات کی وصولی کے بعد پورے سال کا خرچہ اور بجٹ پورا کر کے کچھ رقم بچ گئی ہے، اس کے بارے میں بتایا جائے کہ ہم کیا کریں؟ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب لکھا کہ یہ سروے کرواؤ کہ تمہارے صوبے میں جو لوگ مقروض ہیں اور اپنا قرضہ ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے، ان کے قرضے اس رقم میں سے ادا کر دو، گورنر نے جواب دیا کہ حضرت یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ امیر المؤمنین نے دوسرا خط لکھا کہ جن بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں اخراجات نہ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی ہیں ان کی شادیاں اس رقم میں سے کرا دو۔ گورنر نے جواب دیا کہ یہ کام بھی میں کر چکا ہوں، امیر المؤمنین نے تیسرا خط لکھا کہ جن خاوندوں نے ابھی تک بیویوں کے مہر ادا نہیں کیے اور وہ مہر ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے، ان کے مہر اس رقم میں سے دلوا دو، گورنر نے جواب دیا کہ یہ کام بھی میں کر چکا ہوں۔ امیر المؤمنین نے چوتھا خط لکھا کہ زمینوں کا سروے کرواؤ اور بے آباد زمینوں کی کاشت کے لیے کسانوں کو آسان قسطوں پر قرضے دے دو۔

خلافت کی شرعی حیثیت

اس کے بعد میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ خلافت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ فقہائے کرام نے نظام خلافت کے قیام اور خلیفہ کے تقرر کو امت کے فرائض و واجبات میں شمار کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور خلافت کے فرض ہونے پر دو بڑی دلیلیں پیش فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ نے سب سے پہلے خلیفہ کا انتخاب کیا تھا، حتیٰ کہ جناب نبی اکرمؐ کی تدفین پر بھی اسے مقدم کیا تھا، اسے فقہاء کرامؒ نے بل جعلوہ اھم الواجبات سے تعبیر کیا ہے اور حضرات صحابہ کرامؓ کا اس پر مکمل اجماع ہوا ہے جو کسی چیز کے فرض اور واجب ہونے کی واضح دلیل ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے دوسری دلیل یہ دی ہے کہ قرآن کریم کے بہت سے صریح احکام حکومت کے قیام پر موقوف ہیں۔ مثلاً حدود و قصاص کا نفاذ، امن و انصاف کا قیام، بیت المال اور زکوٰۃ کا نظام، جہاد کا تسلسل اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اجتماعی نظام حکومتی سسٹم کا تقاضہ کرتا ہے۔ کیونکہ یہ اور ان جیسے بعض دیگر احکامِ قرآن حکومتی نظام کے بغیر نافذ و جاری نہیں کیے جا سکتے اور شرعی اصول یہ ہے کہ کسی فرض پر عمل جس چیز پر موقوف ہو وہ بھی فرض ہی کا درجہ اختیار کر جاتی ہے۔

اس بنیاد پر فقہاء کرامؒ نے خلافت کے قیام کو امت مسلمہ کے اجتماعی فرائض میں شمار کیا ہے اور اسے فرض کفایہ کا درجہ دیا ہے کہ اگر دنیا کے کسی حصے میں شرعی خلافت موجود ہے تو پوری امت کی طرف سے یہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے لیکن اگر کہیں بھی خلافت کا نظام موجود نہیں ہے تو امت مسلمہ پوری

کی پوری بطور امت ایک شرعی فریضہ کی تارک قرار پاتی ہے، اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اس وقت دنیا میں کہیں بھی خلافت کا نظام کسی درجہ میں بھی خلافت کے عنوان سے اور خلافت کے مفہوم کے مطابق موجود نہیں ہے۔ اس لیے ہم سب بحیثیت امت ایک شرعی فریضہ کے تارک ہیں اور یہ گناہ ہم سب کے ذمے اس وقت تک رہے گا جب تک امت میں کسی نہ کسی سطح پر خلافت کا نظام قائم نہیں ہو جاتا۔ ۱۹۲۴ء تک خلافت کا عنوان کسی نہ کسی درجہ میں جیسا بھی تھا، دنیا کے نقشے پر موجود تھا لیکن اس کے ختم ہونے کے بعد ۱۹۲۴ء سے یہ قرضہ اور فریضہ امت کے ذمہ ہے۔ دنیائے اسلام میں خلافت کی بہت سی تحریکیں کام کر رہی ہیں جن پر آگے چل کر تبصرہ کروں گا لیکن بیسیوں فورموں پر مختلف ممالک میں خلافت کے لیے آواز اٹھائے جانے کے باوجود سرِ دست خلافت کا نظام قائم ہوتا نظر نہیں آتا۔

خلافت کا تاریخی تسلسل

ان گزارشات کے بعد میں خلافت کے تاریخی تسلسل کے بارے میں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ خلافت راشدہ کا آغاز جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبرؓ سے ہوا تھا جو تیس سال تک جاری رہا اور اس میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے اسماء گرامی شامل ہیں، جبکہ حضرت معاویہؓ سے صلح تک حضرت حسنؓ کا مختصر دورِ اقتدار بھی تیس سال کے اسی دائرہ میں آتا ہے۔ اس کے بعد حضرت امیر معاویہؓ کا بیس سالہ دورِ خلافت ہے اور پھر بنو امیہ، بنو عباس اور بنو عثمان کی خلافتیں ہیں اور درمیان میں حضرت عبد اللہ بن الزبیرؓ کی خلافت کا دور بھی ہے۔ خلافت راشدہ کا دورانیہ تیس سال میں کیوں محصور ہے اور حضرت معاویہؓ اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی خلافتوں کا شرعی مرتبہ کیا ہے؟ اس پر اہل علم کے ہاں خاصی بحث ہوئی ہے اور کسی درجہ میں اب بھی جاری ہے، لیکن اس ساری بحث سے قطع نظر میرا طالب علمانہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ امت مسلمہ کے لیے حضرات صحابہ کرامؓ قیامت تک اسوہ حسنہ اور معیار ہیں۔ اور چونکہ امت ہر دور میں عزیمت پر عمل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو سکتی اس لیے اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر عزیمت اور رخصت کے دونوں دائرے حضرات صحابہ کرامؓ کے دور میں ہی دکھا دیے تاکہ امت کو اپنے اپنے وقت میں راہ نمائی حاصل کرنے میں کسی الجھن کا سامنا نہ ہو۔ حضرات خلفائے راشدین کا دور عزیمت کا دور ہے جو ہمارا اصل آئیڈیل ہے جبکہ حضرت معاویہؓ اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی خلافتوں کو رخصت کا دور کہا جا سکتا ہے جو رخصتوں کے دائرے میں امت کے لیے قیامت تک معیار اور آئیڈیل رہے گا۔

''خلافت راشدہ تیس سال تک رہی ہے'' کا معنی یہ نہیں ہے کہ اس کے بعد اسلامی خلافت ختم ہو گئی تھی، اسلامی خلافت اس کے بعد بنو امیہ، بنو عباس اور بنو عثمان کی خلافتوں کی صورت میں ۱۹۲۴ء

تک چلتی رہی ہے، اس میں اتار چڑھاؤ یقیناً آتے رہے ہیں لیکن مجموعی طور پر خلافت کا یہ تسلسل عثمانیہ خلافت کے خاتمہ تک قائم رہا ہے۔ اور جس خلافت پر بھی اپنے دور کے اہل علم اور امت کی رائے عامہ کا اعتماد رہا ہے وہ فقہی اصولوں کے مطابق خلافت اسلامیہ ہی شمار ہوتی ہے۔ خلافت راشدہ اسلامی خلافت کے اعلیٰ ترین معیار کا ٹائٹل ہے، اس اعلیٰ ترین معیار کے قائم نہ رہنے کا مطلب خلافت کے نظام کا خاتمہ نہیں ہے، اس اعلیٰ ترین معیار میں کسی حد تک کمی ہوئی ہے بلکہ اگر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ارشاد کو دیکھا جائے کہ علی منہاج النبوۃ یعنی خلافت راشدہ کے اعلیٰ ترین معیار کے لیے جو شرائط ضروری تھیں وہ پہلے چار بزرگوں پر ہی مکمل ہوگئی تھیں اور ان کے بعد ان شرائط کا پایا جانا مثلاً یہ کہ وہ براہ راست جناب نبی اکرمؐ کی تربیت میں رہے ہوں، بعد کے خلفاء میں اس درجہ میں ممکن ہی نہ تھا، اس لیے اس کا تعلق کسی شرعی ضابطے سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام سے معلوم ہوتا ہے۔

تاریخی ترتیب کے لحاظ سے خلافت راشدہ کے بعد حضرت معاویہؓ سے شروع ہونے والا خلافت بنی امیہ کا نوے سالہ دور، پھر خلافت عباسیہ کا مختلف مراحل پر مشتمل پانچ سو سالہ دور، اور اس کے بعد ۱۹۲۴ء تک خلافتِ عثمانیہ کا دور ہمارا وہ تاریخی تسلسل ہے جس میں خلافت کا ادارہ کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے اور مختلف شعبوں میں کام بھی کرتا رہا ہے۔

خلافتِ عثمانیہ ترکوں کے بنو عثمان کی حکومت تھی، عثمان اول نے ۱۲۹۹ء میں "برسا" کے مقام پر عثمانی حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا، پھر مصر میں قائم خلافت عباسیہ نے اس کے حق میں دست برداری اختیار کر کے عثمانیوں کی خلافت کو تسلیم کر لیا اور سلطان محمد فاتحؒ نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے اسے عثمانی خلافت کا دارالسلطنت بنا دیا۔ ایک دور میں خلافتِ عثمانیہ کا دائرہ سلطنت افریقہ کے بیشتر حصوں کے علاوہ مصر، عراق، جزیرۃ العرب، بلغاریہ، البانیہ، ہنگری اور روس کے بعض علاقوں تک وسیع تھا۔

نظامِ خلافت کا خاتمہ

۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک لڑی جانے والی پہلی جنگ عظیم میں جس میں ایک طرف جرمنی اور بلغاریہ وغیرہ تھے اور دوسری طرف برطانیہ، فرانس، روس اور دوسرے ممالک کا متحدہ محاذ تھا، اس جنگ میں خلافتِ عثمانیہ جرمنی کے ساتھ تھی۔ مختلف ممالک کے درمیان لڑی جانے والی اس عالمی جنگ میں چار سال کے دوران ایک کروڑ کے لگ بھگ افراد لقمۂ اجل بنے اور دو کروڑ کے قریب زخمی اور ناکارہ ہوگئے۔ اس جنگ میں جرمنی اور خلافتِ عثمانیہ کو شکست ہوئی جس کے نتیجہ میں خلافتِ عثمانیہ کے مختلف علاقوں پر متحدہ فوجوں نے قبضہ کر لیا، حتیٰ کہ مشرقِ وسطیٰ میں عراق، فلسطین اور مصر وغیرہ پر فرانس اور برطانیہ نے تسلط جما لیا۔ اس سے قبل ترکوں اور عربوں کو قومیت کی بنیاد پر ایک دوسرے

سے متنفر کرنے کا ماحول پیدا کر لیا گیا تھا۔ ترکی میں نوجوان انقلاب پسندوں کا گروہ مصطفی کمال اتاترک کی قیادت میں سامنے آچکا تھا جبکہ عرب ممالک میں برطانوی فوج کے ایک افسر کرنل تھامس ایڈورڈ لارنس (لارنس آف عریبیا) نے مسلمان اور عرب دانش ور کا روپ دھار کر عربوں کو ترکوں کے خلاف متنفر کرنے کی مہم کامیابی کے ساتھ آگے بڑھالی تھی۔ اسی کے نتیجے میں مکہ کے گورنر شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر کے جزیرۃ العرب سے خلافتِ عثمانیہ کی فوجوں کو نکال دیا تھا، اسی دوران فلسطین پر قبضہ کر کے برطانیہ نے وہاں دنیا بھر سے یہودیوں کو لا کر بسانے کا موقع فراہم کر دیا تھا جس کے نتیجے میں اسرائیل کی ریاست وجود میں آئی اور اس طرح برطانیہ نے یہودیوں کو ان کا قومی وطن واپس دلانے کا وعدہ پورا کیا۔ خود ترکی میں فاتح متحدہ فوجوں نے ڈیرے لگا لیے تھے اور یونان نے ترکی کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔ ترکی کے قوم پرست راہ نما مصطفی کمال نے جو اتاترک کے لقب سے متعارف ہیں ترکی کی خود مختاری کا پرچم اٹھایا اور یونانی فوجوں سے جنگ لڑ کر انہیں شکست دی، انہوں نے خلافت تو ختم کر دی لیکن ترکی کی خود مختاری قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ اس پس منظر میں ترکی کے مستقبل کے سوال پر سوئٹزر لینڈ کے شہر ''لوزان'' میں بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جس میں یورپ کے اتحادیوں نے اس شرط پر اور ترک قومیت کی بنیاد پر ترکی کی خود مختاری تسلیم کرنے کا وعدہ کیا کہ:

- ترکی خلافت سے دست بردار ہو کر خلیفہ کو جلاوطن کر دے۔
- خلافت کا نظام اور شریعت کا قانون یکسر منسوخ کر دیا جائے اور آئندہ خلافت کے قیام اور شریعت کے نفاذ سے باز رہنے کا وعدہ کیا جائے، اور
- عرب، افریقہ اور یورپ میں خلافتِ عثمانیہ کے مقبوضات سے بھی دست برداری کا اعلان کیا جائے۔

قوم پرست ترکی کے لیڈروں مصطفی کمال اتاترک اور عصمت ازنو نے ''لوزان معاہدہ'' کے تحت ان شرائط کو تسلیم کر کے خلافت سے دست برداری کا اعلان کر دیا اور ۱۹۲۴ء کے دوران اس وقت کے عثمانی خلیفہ کو اس کی تمام املاک ضبط کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ یوں خلافت سے اس دست برداری کے بعد خلافت کا برائے نام ادارہ بھی ختم ہو گیا، ہم اس کے بعد سے خلافت سے محروم چلے آرہے ہیں اور خدا جانے کب تک یہ محرومی ہمارے مقدر میں رہے گی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مغربی دنیا آج پورے عالمِ اسلام میں کسی جگہ بھی خلافت کے قیام اور شریعت کے نفاذ کی مخالفت کر رہی ہے، حتیٰ کہ سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے وزیر اعظم کی حیثیت

سے ایک تقریر میں واضح طور پر کہا تھا کہ ہم دنیا کے کسی خطہ میں نہ خلافت قائم ہونے دیں گے اور نہ ہی شریعت نافذ ہونے دیں گے، اور امریکہ کے سابق نائب صدر ڈک چینی نے بھی ایک موقع پر اسی طرح کی گفتگو کی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ ترکی نے عالمِ اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے خلافت اور شریعت سے دست بردار ہونے اور آئندہ خلافت و شریعت کو نافذ نہ کرنے کا ''معاہدہ لوزان'' میں وعدہ کیا تھا، اس لیے خلافت کا دوبارہ قیام اور شریعت کا نفاذ اس بین الاقوامی معاہدہ کی خلاف ورزی ہوگا جس سے مسلمانوں کو روکنے کا عالمی قوتوں کو حق حاصل ہے اور اسی لیے دنیائے اسلام میں نفاذِ اسلام کی تحریکوں کی مخالفت کی جارہی ہے۔

خلافت کا سیاسی ڈھانچہ

خلافت کے اس تاریخی تسلسل اور خلافت کے خاتمہ کے پس منظر کے بعد اب میں چاہوں گا کہ خلافت راشدہ کے سیاسی ڈھانچے کے بارے میں بھی کچھ عرض کر دوں، اس لیے کہ خلافت کا سیاسی اسٹرکچر آج کی دنیا میں ایک اہم موضوع کے طور پر زیر بحث ہے اور بہت سا کنفیوژن لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ خلافت راشدہ کے تعارف کے ضمن میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ خلافت کی بنیاد چند اصولوں پر ہے:

- خلیفہ عوام کی صوابدید پر منتخب ہوگا، البتہ اس کے دو پہلو قابل توجہ ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے میں اہل حل و عقد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کریں اور ابن تیمیہؒ اسے عامۃ المسلمین کا حق قرار دیتے ہیں۔
- خلیفہ خاندانی بنیاد پر نہیں ہوگا بلکہ خاندان کی قید کے بغیر کسی بھی مستحق شخص کو خلیفہ منتخب کیا جا سکے گا۔
- خلیفہ عوام کے سامنے جواب دہ ہے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں واضح کر دیا تھا کہ اگر میں صحیح راستے پر چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر قرآن و سنت سے ہٹ کر چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ یہاں سیدھا کر دینے کے لفظ میں بھی ایک بلیغ اشارہ ہے کہ عوام کو صرف خلیفہ کی غلطی کی نشاندہی کر دینے کا حق نہیں دیا جا رہا بلکہ فقومونی کہہ کر سیدھا کر دینے کا حق انہیں دیا جارہا ہے جسے میں اپنی طالب علمانہ رائے میں ''حقِ احتساب'' سے تعبیر کرتا ہوں اور اس کی عملی صورتیں زمانے کے حالات کے مطابق مختلف ہو سکتی ہیں۔
- خلیفہ خود مختار نہیں بلکہ قرآن و سنت کے احکام اور امت کے اہل حل و عقد کے ساتھ مشاورت کا پابند ہوگا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور بہت سے دوسرے فقہاء کرامؒ کا کہنا یہ ہے کہ خلیفہ کا انتخاب عوام کا براہ راست حق ہے کیونکہ حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت و بیعت میں سب لوگ بلا امتیاز شریک تھے۔ میرا طالب علمانہ رجحان بھی اسی طرف ہے لیکن اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا، اس لیے کہ انتخاب براہ راست ہو یا بالواسطہ دونوں صورتوں میں خلافت کے قیام اور خلیفہ کے انتخاب کے لیے امت کی اجتماعی صوابدید ہی بنیاد ہے اور اس اجتماعی صوابدید کے اظہار کے لیے کوئی بھی صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ البتہ اس اصولی بحث کے ساتھ ساتھ خلیفہ کے انتخاب کے لیے فقہاء کرامؒ نے جو عملی صورتیں بیان فرمائی ہیں ان کا بھی جائزہ لے لینا چاہیے۔ فقہاء کرام نے خلافت کے انعقاد کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں:

- امت کے عوام یا اہل حل و عقد خلیفہ کا انتخاب کریں جیسا کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا انتخاب ہوا تھا۔
- خلیفۂ وقت کسی کو اپنا جانشین نامزد کر دے جیسا کہ حضرت عمرؓ کو خلیفہ اول نے نامزد کیا تھا۔
- خلیفۂ وقت کچھ لوگوں کو خلیفہ کے تقرر کا اختیار دے دے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے چھ ممتاز افراد پر کمیٹی قائم کر دی تھی اور انہوں نے عوام سے اجتماعی مشاورت کے بعد حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا تھا۔
- خلافت کی مجلس شوریٰ کے ارکان کسی کو خلیفہ بنا لیں جیسا کہ حضرت علیؓ کا انتخاب ہوا تھا۔
- کوئی اہل شخص اقتدار پر قبضہ کر لے اور امت اسے قبول کر لے جیسا کہ حضرت حسنؓ کی بیعت کے بعد امت مسلمہ نے حضرت امیر معاویہؓ کو متفقہ امیر المومنین کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ ان پانچ صورتوں میں سے آج کے دور میں صرف پہلی اور آخری دو صورتیں قابل عمل ہیں، درمیان کی تینوں صورتیں عملاً ممکن نہیں ہیں، اس لیے کہ ان تینوں صورتوں کا مدار خلافت اور خلیفہ کی موجودگی پر ہے اور چونکہ اس وقت خلافت اور خلیفہ شرعی طور پر موجود نہیں ہیں اس لیے درمیان کی تینوں صورتیں خارج از بحث ہو جاتی ہیں۔

خلافت کے قیام کی عملی صورتیں

اس بنیاد پر آج کے دور میں خلافت کے قیام اور خلیفہ کے انتخاب کی دو ہی صورتیں قابل عمل ہیں۔ ایک یہ کہ کسی مسلم ریاست کے عوام یا ان کے منتخب نمائندے خلافت کو اپنے ملک کا نظام قرار دے کر باقاعدہ خلیفہ کا انتخاب کر لیں اور دوسری یہ کہ کوئی اہل شخص کسی مسلم ریاست میں اقتدار پر قبضہ کر کے خلافت کے نظام کے قیام کا اعلان کرے اور عوام اسے بطور خلیفہ قبول کر لیں۔ اس کے سوا کوئی

صورت آج کے دور میں ممکن اور قابل عمل نہیں ہے۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ہمارے دور میں خلافت اور امامت کے دونوں تصورات کو دستور و قانون کی شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

جناب آیت اللہ خمینی کی قیادت میں ایران میں مذہبی انقلاب آیا تو وہاں ''امامت'' کے فلسفہ کو دستوری شکل دی گئی اس لیے کہ اہلِ تشیع کے نزدیک حکمرانی کا حق امام غائب کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ امام غائب کے ظہور تک ''ولایت فقیہ'' کو دستوری طور پر ان کا نمائندہ اور قائم مقام قرار دیا گیا ہے اور ولایت فقیہ کو ایرانی دستور میں عملاً امام کا درجہ حاصل ہے۔ ایران کے منتخب صدر، وزیر اعظم اور پارلیمنٹ سے بالاتر ولایت فقیہ کے طور پر رہبرِ انقلاب کا درجہ ہے جنہیں پارلیمنٹ، عدلیہ اور حکومت سمیت کسی بھی اتھارٹی کے فیصلے کو مسترد کرنے کا حق حاصل ہے اور ان کے فیصلے کو کسی جگہ بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا، وہ تمام معاملات میں فائنل اتھارٹی ہیں۔ البتہ ان کے ساتھ ممتاز علماء اور وکلاء پر مشتمل ''شورائے نگہبان'' بنائی گئی ہے جسے امام کے مشیروں کی کونسل سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح ایران نے ''امام'' کا لفظ اختیار کیے بغیر امامت کو دستور کا حصہ بنا لیا ہے اور اسی کے مطابق ایران کا نظام چل رہا ہے۔

جبکہ اسلام کے نام پر قائم ہونے کے بعد پاکستان میں بھی یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ اس کا سیاسی ڈھانچہ کیسا ہو گا جو اسلام سے متصادم نہ ہو۔ اس کے لیے خلافت کا عنوان اختیار کرنے سے گریز کیا گیا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ خلافت کا ماڈل اس وقت ''خلافتِ عثمانیہ'' کی صورت میں دنیا کے سامنے تھا جو خاندانی خلافت تھی اور پاکستان میں کسی خاندانی حکومت کا کوئی عملی امکان نہیں تھا۔ اس لیے قرارداد مقاصد اور اس کے ساتھ ساتھ تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ ۳۱ علماء کرام کے مرتب کردہ ۲۲ متفقہ دستوری نکات میں چند اصول واضح طور پر طے کر دیے گئے کہ:

- حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے۔
- حق حکمرانی عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل ہو گا۔
- منتخب پارلیمنٹ قرآن و سنت کی پابند ہو گی۔
- عوام کو حق احتساب حاصل ہو گا۔

میری طالب علمانہ رائے میں ہمارے ہاں بھی خلافت کی اصطلاح استعمال کیے بغیر خلافت کے اصولی مفہوم کو قرارداد مقاصد اور علماء کے ۲۲ نکات میں پوری طرح سمو دیا گیا ہے اور میرے خیال میں اگر آج ہم کسی جگہ ''خلافت'' کے ٹائٹل کے ساتھ اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں گے تو اس کی اصولی

اور دستوری بنیادیں اس سے مختلف نہیں ہوں گی۔

خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط

یہاں ایک اور بحث بھی قابل توجہ ہے کہ ایک عرصہ تک خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط کو لازمی سمجھا جاتا رہا ہے اور کم و بیش تمام فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے۔ لیکن عثمانی خلفاء قریشی نہیں تھے، اس کے باوجود ان کی خلافت پر صدیوں تک امت کے جمہور اہل علم کا اتفاق رہا ہے اور اس خلافت کو حرمین شریفین اور مسجد اقصیٰ میں بھی تسلیم کر کے جمعۃ المبارک کے خطبوں میں ان کا مسلسل تذکرہ ہوتا رہا ہے۔ اس لیے یہ سوال سامنے آیا کہ اگر خلیفہ کے لیے قریشی ہونا ضروری ہے تو عثمانی خلفاء کی خلافت کو کیسے تسلیم کر لیا گیا۔

قدیم دور میں اس پر صرف ابن خلدونؒ نے بات کی ہے، انہوں نے یہ لکھا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی الائمة من قریش بطور حکم کے نہیں بلکہ بطور خبر اور پیش گوئی کے تھا جو پوری ہوگئی ہے، اس لیے آئندہ اس شرط کو لازمی قرار دینا ضروری نہیں ہے۔ اس موقف کے حق میں یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ایک ارشاد میں خلفاء کے قریشی ہونے کا ذکر کرتے ہوئے ما اقاموا الدین کا جملہ بھی فرمایا ہے کہ جب تک وہ دین کو قائم کریں گے خلافت قریش میں رہے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قریشی اقامت دین کے فریضہ سے کوتاہی کریں گے تو خلافت ان کے پاس نہیں رہے گی۔ لیکن اس بحث کے باوجود جمہور فقہائے امت خلیفہ کے لیے لازمی شرائط میں قریشی ہونے کا برابر ذکر کرتے رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اس بحث نے اس وقت دل چسپ صورت اختیار کر لی جب متحدہ ہندوستان میں ترکوں کی خلافتِ عثمانیہ کی حمایت میں تحریک چلائی گئی تو کہا گیا کہ قریشی نہ ہونے کی وجہ سے ترکوں کا عثمانی خاندان تو سرے سے خلافت کا اہل ہی نہیں ہے۔ اور جب شریف مکہ حسین نے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کر کے حجاز سے ترکی افواج کو نکالا تب ایک فتویٰ ترکوں کے خلاف مرتب کیا گیا تھا جس میں انہیں مختلف حوالوں سے خلافت کے لیے نااہل قرار دیا گیا تھا، ان میں ایک حوالہ قریشی نہ ہونے کا بھی تھا، اس پر بریلوی مکتبِ فکر کے امام مولانا احمد رضا خان کا ایک مستقل رسالہ دوام العیش فی ان الائمة من قریش کے نام سے مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ ہمارے دیوبندی اکابر علماء نے، جو ترکوں کی خلافتِ عثمانیہ کو شرعی خلافت قرار دے کر اس کی حمایت میں جدوجہد کر رہے تھے، اس کے جواب میں ابن خلدونؒ والا موقف اپنایا اور خلافت کے قریش میں ہونے کے بارے میں جناب نبی اکرمؐ کے ارشاد گرامی کو انشاء اور حکم کی بجائے خبر اور پیش گوئی قرار دے کر ترکوں کی خلافت کی حمایت کی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ

العزیز نے اپنے ایک خطبۂ صدارت میں اس موقف کا ذکر فرمایا ہے اور اسے صحیح موقف قرار دیا ہے۔
بہر حال دلائل اور مکالمہ کی تفصیل میں جائے بغیر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک اسلامی حکومت کے بارے میں ہمارے دور کے اکابر علماء کرام نے باہمی مشاورت یا اجتہاد کے ساتھ یہ اصول طے کیا ہے کہ ایک اسلامی ریاست کا سربراہ عوام کا منتخب کردہ ہوگا، اور خلافت کی شرائط پوری کرنے والا کوئی بھی شخص خلیفہ منتخب ہو سکتا ہے۔

خلافت کی بحالی کی جدوجہد

خلافت کے بارے میں یہ صورت حال سامنے رکھنا بھی ضروری ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام میں اس مقصد کے لیے بیسیوں حلقے کام کر رہے ہیں کہ کسی جگہ خلافت اسلامیہ قائم ہو جائے۔ ان میں سے بعض حلقوں کے ساتھ میرا رابطہ ہے اور اصولی طور پر ان کی جدوجہد کی حمایت بھی کرتا ہوں لیکن اس سلسلہ میں میرے بعض تحفظات ہیں جن کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان میں ایک یہ ہے کہ کم و بیش ہر حلقہ میں خلافت کے ساتھ ساتھ خلیفہ کے لیے کسی شخصیت کو سامنے رکھ کر اس کے گرد لوگوں کو جمع کرنے کی بات بھی کی جاتی ہے جو درست نہیں ہے۔ میں ان دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ خلافت کے احیاء کی تحریک میں حمایت کرتا ہوں لیکن کسی کو خلافت کے لیے ابھی سے سامنے رکھ کر اس کے حق میں کیمپین کو درست نہیں سمجھتا۔ ابھی خلافت کے لیے رائے عامہ کو تیار کرنے کا دور ہے، لوگوں کی ذہن سازی کا دور ہے، اس کے لیے راہ ہموار کرنے کا دور ہے، اور خلافت کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں پائے جانے والے شکوک و شبہات کو دور کر کے انہیں منظم کرنے کا دور ہے۔ جب یہ مرحلہ گزر کر خلافت کی عملی تشکیل کا دور آئے گا تو پھر دیکھا جائے گا کہ خلافت کے لیے موزوں ترین شخصیت کون سی ہے۔ ایک دفعہ لندن کے ٹریفالیگر سکوائر میں حزب التحریر کے زیر اہتمام نکالی جانے والی خلافت ریلی میں مجھے شرکت کا موقع ملا، وہاں خلافت کے حق میں مسلمان لڑکیوں اور لڑکوں کے جذبات سے پُر نعرے سن کر میری آنکھیں بھی بار بار نم ہوتی رہیں۔ اس موقع پر ایک ترک نوجوان کو دیکھا کہ وہ بادشاہوں والا لباس زیب تن کیے کھڑا ہے اور لوگوں کو اپنی بیعت کی دعوت دے رہا ہے۔ اس نے مجھ سے بھی اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ کیا آپ مجھ سے متفق ہیں، میں نے عرض کیا أتفق علی الخلافة لا علی الخلیفة کہ میں خلافت کے احیاء کے لیے آپ سے متفق ہوں لیکن آپ کو خلیفہ قرار دینے سے میں متفق نہیں ہوں۔

خلافت اور رائے عامہ

کچھ لوگوں کے ذہن میں بعض فقہی جزئیات ہیں کہ اگر کسی شخص کو چند افراد خلیفہ منتخب کر لیں اور کچھ لوگ اس کی بیعت کر لیں تو باقی ساری امت پر اس خلافت کو تسلیم کرنا شرعاً ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے اور میں علماء کرام سے گزارش کیا کرتا ہوں کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خطبہ کا بغور مطالعہ کریں جو انہوں نے اپنی شہادت سے قبل غالباً آخری خطبہ جمعہ کے طور پر مسجد نبویؐ میں ارشاد فرمایا تھا اور امام بخاریؒ نے اسے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس روایت کے مطابق حضرت عمرؓ کو بتایا گیا کہ چند افراد نے باہمی مشورہ میں طے کیا ہے کہ حضرت عمرؓ فوت ہو گئے تو ہم کچھ افراد فلاں بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کی خلافت کا اعلان کر دیں گے اور باقی سب لوگوں پر اسے ماننا ضروری ہو جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے خطبہ جمعہ میں اس کا ذکر کر کے خبردار کیا کہ ایسا ہرگز نہ کرنا۔ اس خطبہ میں حضرت عمرؓ کے دو جملوں کا بطور خاص ذکر کرنا چاہوں گا، ایک یہ کہ انہوں نے فرمایا کہ جو لوگ عام مسلمانوں کی مشاورت کے بغیر کسی کو خلیفہ بنانے کی بات کر رہے ہیں یریدون أن یغصبوا امورھم وہ عام مسلمانوں کا حق چھیننا چاہتے ہیں، اور دوسری بات یہ کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی عمومی مشاورت کے بغیر اگر کسی شخص کی بیعت کی جائے تو تم اس کی بات ہرگز نہ ماننا اور نہ اس کی بیعت کرنا۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے خلیفہ کے انتخاب کے لیے مسلمانوں کی عمومی مشاورت کو ضروری قرار دیا ہے اور اس کے خلاف کرنے سے منع کیا ہے۔

ایک اور مغالطہ بھی دور ہو جائے تو مناسب ہوگا کہ خلیفہ کی طرف سے نامزدگی کی صورت میں بھی عمومی مشاورت ایک ناگزیر امر ہے۔ حضرت عمرؓ نے چھ افراد کو نامزد کیا تھا، ان میں ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے کے بعد تین رہ گئے تھے، ان تین میں سے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ کو اس صورت میں فیصلے کا اختیار دے دیا تھا کہ وہ خود یعنی عبد الرحمن بن عوفؓ امیدوار نہیں ہوں گے۔ اب فائنل راؤنڈ میں حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نے حضرت عثمان اور حضرت علیؓ میں سے کسی کا انتخاب کرنا تھا۔ لیکن بخاری شریف کی تفصیلی روایت کے مطابق حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ منورہ میں مشورہ کے لیے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا، تین دن تین رات تک مسلسل میں نے ہر طبقہ کے لوگوں سے مشاورت کی اور اس دوران میں نے نیند کا سرمہ تک آنکھوں میں نہیں لگایا، جبکہ تین دن تین رات کی مسلسل عوامی مشاورت کے بعد انہوں نے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں سنایا کہ میں نے سب لوگوں سے مشورہ کیا ہے اور اکثریت کی رائے کو حضرت عثمانؓ کے حق میں پایا ہے اس لیے میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ

نامزدگی کی صورت میں بھی رائے عامہ کو اعتماد میں لینا ضروری ہے اور عمومی مشاورت کے بغیر کسی کو خلیفہ مقرر کر لینا صحیح طرز عمل نہیں ہے۔ پھر عام لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے مختلف طریقے ہیں، حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نے تو گھر گھر جا کر لوگوں کا رجحان معلوم کیا مگر لوگوں کی رائے ان کے نمائندوں کے ذریعہ معلوم کرنا بھی سنت نبویؐ میں شامل ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ غزوۂ حنین کے بعد جب نبی اکرمؐ نے بنو ھوازن کے قیدی اور اموال صحابہ کرامؓ میں تقسیم کر دیے تو بنو ھوازن کے وفد نے حاضر ہو کر کہا کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں اس لیے ہمارے قیدی اور اموال واپس کر دیے جائیں۔ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میں کافی دنوں تک تمہارا انتظار کرتا رہا مگر تم نہیں آئے، میں نے قیدی اور اموال بطور غلام اور غنیمت اپنے مجاہدین میں تقسیم کر دیے ہیں اس لیے اب یہ ان کی ملکیت ہو گئے ہیں۔ تم مسلمان ہو کر آئے ہو تو میں دونوں چیزیں تمہیں واپس نہیں کر سکتا، قیدیوں اور اموال میں سے ایک کی بات کرو تو اس کی صورت نکل سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس صورت میں ہمارے قیدی واپس کر دیے جائیں۔ اس پر جناب نبی اکرمؐ نے صحابہ کرامؓ کو، جو بارہ ہزار کے لگ بھگ تھے، جمع کیا اور فرمایا کہ میں بنو ھوازن کو ان کے قیدی واپس کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں اس لیے تم میں سے جو شخص اپنے حصے کا قیدی بخوشی واپس کر دے تو اس کی مرضی، ورنہ قیدی واپس کر دو میں اس کے بدلے اگلی جنگ میں تمہیں معاوضہ کے طور پر قیدی بطور غلام دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ صحابہ کرامؓ نے بیک آواز کہا کہ ہم سب بخوشی سب قیدی واپس کرتے ہیں، لیکن جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ نہیں اس طرح ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ تم میں سے کون بخوشی راضی ہے اور کون راضی نہیں ہے، اس لیے تم واپس اپنے خیموں میں جاؤ اور حتٰی یرفع الینا عرفاء کم امرکم تمہارے نمائندے تمہاری رائے معلوم کر کے ہمیں بتائیں تب ہم حتمی فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ سب لوگ خیموں میں چلے گئے اور اگلے روز ان کے نمائندوں نے نبی اکرمؐ کو رپورٹ دی کہ سب لوگ راضی ہیں۔ اس پر جناب نبی اکرمؐ نے بنو ھوازن کو ان کے قیدی واپس کر دیے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی رائے معلوم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کی رائے ان کے نمائندوں کے ذریعہ معلوم کر لی جائے۔ اور جہاں ان کے حقوق کی بات ہو گی وہاں عوام کی رائے معلوم کرنا ضروری ہو گا اور یہ بھی خلافت کے سیاسی ڈھانچے کا ایک مستقل شعبہ ہے۔ اس بحث کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ خلافت کے قیام اور خلیفہ کے انعقاد کے لیے رائے عامہ کو اعتماد میں لینا اور عوامی مشاورت کے ذریعہ اس کام کو مکمل کرنا ضروری ہے۔

آج کے دور میں خلافت کی بحالی کی قابلِ عمل صورت

آخر میں آج کے دور میں خلافت کے قیام کی قابل عمل صورت کے بارے میں عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمارے ہاں پاکستان کی معروضی صورت حال میں نفاذِ اسلام کے حوالہ سے دو ذہن پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ سیاسی عمل اور پارلیمانی قوت کے ذریعہ اسلام نافذ ہو جائے گا، اور دوسرا یہ کہ ہتھیار اٹھائے بغیر اور مقتدر قوتوں سے جنگ لڑے بغیر اسلام کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔ ایک طرف صرف پارلیمانی قوت پر انحصار کیا جا رہا ہے جبکہ دوسری طرف ہتھیار اٹھا کر عسکری قوت کے ذریعہ مقتدر قوتوں سے جنگ لڑنے کو ضروری قرار دیا جا رہا ہے، میری طالب علمانہ رائے میں یہ دونوں طریقے ٹھیک نہیں ہیں۔ صرف الیکشن، جمہوریت اور پارلیمانی قوت کے ذریعہ نفاذِ اسلام اس ملک میں موجودہ حالات میں ممکن نہیں ہے، اور ہتھیار اٹھا کر حکمران طبقات کے ساتھ جنگ کرنا اس کے شرعی جواز یا عدم جواز کی بحث سے قطع نظر بھی عملاً مؤثر اور نتیجہ خیز نہیں ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ ہے کہ کسی مسلم ریاست میں مسلمان حکمرانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی شرائط فقہاء کرامؒ نے کیا بیان کی ہیں، اور خاص طور پر جمہور فقہائے احناف کا موقف اس سلسلہ میں کیا لکھا ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا عسکری گروپوں کے لیے ملک کی فوج اور اسٹیبلشمنٹ سے جنگ لڑ کر کوئی علاقہ حاصل کر لینا اور اس پر قبضہ برقرار رکھ کر اس میں کوئی نظام نافذ کر لینا ممکن بھی ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ہوش مند شخص اس سوال کا جواب اثبات میں دے گا، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس سلسلہ میں جدوجہد کے طریق کار کی حد تک ایران کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ایران کی مذہبی قیادت نے شاہ ایران کی قیادت سے انحراف کر کے یونیورسٹیوں اور کالجوں کو ذہن سازی اور فکری بیداری کی جولانگاہ بنایا، مسلسل سترہ برس تک محنت کے ذریعے اگلی نسل کو اس کے لیے تیار کر کے اسے اپنی قوت بنایا، اور اس قوت کے ذریعہ ہتھیار اٹھائے بغیر سٹریٹ پاور اور تحریکی قوت کے نتیجے میں شاہ ایران کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

میں ایرانیوں کے مذہب کی نہیں بلکہ ان کی جدوجہد کے طریق کار کی بات کر رہا ہوں کہ ان کے کامیاب تجربہ کو سامنے رکھ کر کیا ہم اپنی جدوجہد کا طریق کار طے نہیں کر سکتے؟ اگر کچھ دوستوں کو یہ حوالہ میرے قلم سے پسند نہ آ رہا ہو تو میں امریکہ کے سیاہ فاموں کی اس جدوجہد کا حوالہ دینا چاہوں گا جو اب سے صرف پون صدی قبل کالوں کو گوروں کے برابر شہری حقوق دلوانے کے لیے منظم کی گئی تھی۔ ایک مذہبی لیڈر مارٹن لوتھر کنگ نے سیاہ فاموں کی سٹریٹ پاور کو منظم کیا، پرُامن احتجاجی تحریک کو آگے بڑھایا اور صرف دو عشروں کی جدوجہد سے ۱۹۶۴ء میں اس وقت کے امریکی صدر جان

ایف کینیڈی سے سیاہ فام آبادی کے لیے سفید فاموں کے برابر شہری حقوق کی دستاویز پر دستخط کرانے میں کامیاب ہوگیا۔

میں نے دونوں تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے، دونوں کے مراکز میں گیا ہوں، ان کے راہ نماؤں سے ملاقاتیں کی ہیں اور ان کی جدوجہد کے مختلف مراحل سے واقف ہوں۔ میں افغانستان بھی گیا ہوں، بار بار گیا ہوں، روسی استعمار کے خلاف جہاد میں مختلف جنگی محاذوں پر حاضری دی ہے، افغان مجاہدین کی روسی استعمار کے خلاف جنگ کو جہاد سمجھ کر اس میں شریک ہوا ہوں، امریکی استعمار کے خلاف ان کی جنگ کو بھی جہاد سمجھتا ہوں اور حتی الوسع اسے اخلاقی اور سیاسی طور پر سپورٹ کرتا ہوں۔ اس کے باوجود پورے شرح صدر اور دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ دینی تصلب اور حمیت و غیرت میں تو بلاشبہ افغان مجاہدین اور افغان طالبان ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں، لیکن نفاذِ اسلام کی جدوجہد کے طریق کار کے حوالہ سے ہمیں ایران کی مذہبی تحریک کا مطالعہ کرنا ہوگا اور مارٹن لوتھر کنگ کی تحریک سے واقفیت حاصل کرنا ہوگی۔ اگر پُر امن عوامی تحریک اور رائے عامہ کی منظم قوت کے ذریعہ ”امامت“ کو دستوری شکل دے کر اسے نافذ کیا جاسکتا ہے تو ”خلافت“ کے احیاء و قیام کے لیے یہ قوت آخر کیوں کام میں نہیں لائی جاسکتی؟

نفاذِ اسلام کی جدوجہد اور اس کی حکمتِ عملی

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ---فروری ۲۰۱۳ء

ہمارے ہاں پاکستان کی معروضی صورتحال میں نفاذِ اسلام کے حوالے سے دو ذہن پائے جاتے ہیں:

- ایک یہ کہ سیاسی عمل اور پارلیمانی قوت کے ذریعے اسلام نافذ ہو جائے گا،
- اور دوسرا یہ کہ ہتھیار اٹھائے بغیر اور مقتدر قوتوں سے جنگ لڑے بغیر اسلام کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔

ایک طرف صرف پارلیمانی قوت پر انحصار کیا جا رہا ہے جبکہ دوسری طرف ہتھیار اٹھا کر عسکری قوت کے ذریعے مقتدر قوتوں سے جنگ لڑنے کو ضروری قرار دیا جا رہا ہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں یہ دونوں طریقے ٹھیک نہیں ہیں۔ صرف الیکشن، جمہوریت اور پارلیمانی قوت کے ذریعے نفاذِ

اسلام اس ملک میں موجودہ حالات میں ممکن نہیں ہے، اور ہتھیار اٹھا کر حکمران طبقات کے ساتھ جنگ کرنا اس کے شرعی جواز یا عدمِ جواز کی بحث سے قطع نظر بھی عملاً مؤثر اور نتیجہ خیز نہیں ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ ہے کہ کسی مسلم ریاست میں مسلمان حکمرانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی شرائط فقہاء کرامؒ نے کیا بیان کی ہیں، اور خاص طور پر جمہور فقہائے احناف کا موقف اس سلسلہ میں کیا ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا عسکری گروپوں کے لیے ملک کی فوج اور اسٹیبلشمنٹ سے جنگ لڑ کر کوئی علاقہ حاصل کر لینا اور اس پر قبضہ برقرار رکھ کر اس میں کوئی نظام نافذ کر لینا ممکن بھی ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ہوش مند شخص اس سوال کا جواب اثبات میں دے گا۔

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس سلسلہ میں جدوجہد کے طریق کار کی حد تک ایران کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ایران کی مذہبی قیادت نے شاہِ ایران کی قیادت سے انحراف کر کے یونیورسٹیوں اور کالجوں کو ذہن سازی اور فکری بیداری کی جولانگاہ بنایا، مسلسل سترہ برس تک محنت کے ذریعے اگلی نسل کو اس کے لیے تیار کر کے اسے اپنی قوت بنایا اور اس قوت کے ذریعہ ہتھیار اٹھائے بغیر اسٹریٹ پاور اور تحریکی قوت کے نتیجے میں شاہ ایران کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ میں ایرانیوں کے مذہب کی نہیں بلکہ ان کی جدوجہد کے طریق کار کی بات کر رہا ہوں کہ ان کے کامیاب تجربہ کو سامنے رکھ کر کیا ہم اپنی جدوجہد کا طریق کار طے نہیں کر سکتے؟

اگر کچھ دوستوں کو یہ حوالہ میرے قلم سے پسند نہ آ رہا ہو تو میں امریکہ کے سیاہ فاموں کی اس جدوجہد کا حوالہ دینا چاہوں گا جو اَب سے صرف پون صدی قبل کالوں کو گوروں کے برابر شہری حقوق دلوانے کے لیے منظم کی گئی تھی۔ ایک مذہبی لیڈر مارٹن لوتھر کنگ نے سیاہ فاموں کی اسٹریٹ پاور کو منظم کیا، پُرامن احتجاجی تحریک کو آگے بڑھایا اور صرف دو عشروں میں ایک گولی چلائے بغیر ۱۹۶۴ء میں اس وقت کے امریکی صدر جان ایف کینیڈی سے سیاہ فام آبادی کے لیے سفید فاموں کے برابر شہری حقوق کی دستاویز پر دستخط کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے دونوں تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے، دونوں کے مراکز میں گیا ہوں، ان کے راہنماؤں سے ملاقاتیں کی ہیں اور ان کی جدوجہد کے مختلف مراحل سے واقف ہوں۔ میں افغانستان بھی گیا ہوں، بار بار گیا ہوں، روسی استعمار کے خلاف جہاد میں مختلف جنگی محاذوں پر حاضری دی ہے، افغان مجاہدین کی روسی استعمار کے خلاف جنگ کو جہاد سمجھ کر اس میں شریک ہوا ہوں، امریکی استعمار کے خلاف ان کی جنگ کو بھی جہاد سمجھتا ہوں اور حتی الوسع اسے سپورٹ کرتا ہوں۔ لیکن پورے شرح

صدر اور دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ دینی تصلب اور حمیت و غیرت میں تو بلا شبہ افغان مجاہدین اور افغان طالبان ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں لیکن نفاذِ اسلام کی جدوجہد کے طریق کار کے حوالہ سے ہمیں ایران کی مذہبی تحریک کا مطالعہ کرنا ہوگا اور مارٹن لوتھر کنگ کی تحریک سے واقفیت حاصل کرنا ہوگی۔ اگر پُرامن عوامی تحریک اور رائے عامہ کی منظم قوت کے ذریعے ”امامت“ کو دستوری شکل دے کر اسے نافذ کیا جاسکتا ہے تو ”خلافت“ کے احیا و قیام کے لیے یہ قوت آخر کیوں کام میں نہیں لائی جاسکتی؟

شیخ الازہر ڈاکٹر احمد الطیب کی ایرانی صدر محمود احمدی نژاد سے ملاقات

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۳ فروری ۲۰۱۳ء

شیخ الازہر کا شمار عالمِ اسلام کی ممتاز علمی و دینی شخصیات میں ہوتا ہے اور ”الامام الاکبر“ کے ٹائٹل کے ساتھ اس منصب پر سرکردہ اصحابِ علم و فضل وقتاً فوقتاً فائز ہوتے آرہے ہیں، ان کی علمی و دینی رائے اور فتویٰ کو نہ صرف مصر میں بلکہ عالمِ اسلام اور خاص طور پر عرب دنیا میں اہمیت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، مصر اور عالمِ اسلام کے مختلف مسائل پر وقیع رائے کا اظہار ان کی ذمہ داری میں شامل ہوتا ہے، ان دنوں اس منصب پر فضیلۃ الدکتور احمد الطیب حفظہ اللہ تعالیٰ فائز ہیں جو مصر کی معروف علمی شخصیات میں سے ہیں۔ گزشتہ دنوں قاہرہ میں او آئی سی کی سربراہی کانفرنس میں شرکت کے لیے ایران کے صدر جناب محمود احمدی نژاد وہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے شیخ الازہر سے بھی ملاقات کی اور ان سے عالمِ اسلام کے مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا۔

اس موقع پر شیخ الازہر نے ان سے ایرانی حکومت کی بعض پالیسیوں کے حوالہ سے اہلِ سنت کے علمی و دینی تحفظات کے مسئلہ پر گفتگو کی اور انہیں اپنی شکایات سے آگاہ کیا، اس سلسلہ میں روزنامہ ”کائنات“ اسلام آباد میں ۷ فروری ۲۰۱۳ء کو شائع ہونے والی خبر یوں ہے:

> ”مصر کی معروف تاریخی دینی درسگاہ جامعہ الازہر کے سربراہ ڈاکٹر احمد الطیب نے ایرانی صدر محمود احمدی نژاد پر زور دیا ہے کہ وہ خلیجی ممالک کے معاملات میں مداخلت سے گریز اور بحرین کا برادر ہمسایہ عرب ملک کے طور پر احترام کریں۔ اہل السنۃ والجماعۃ مسلک کے پیروکار ملکوں میں شیعہ ازم کے فروغ کی کوششیں ناپسندیدہ ہیں۔ ایران کے

صدر اور شیخ الازہر کے درمیان ملاقات کے بعد جاری ہونے والے یونیورسٹی کے بیان میں ڈاکٹر احمد الطیب نے محمود احمدی نژاد سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ بحرین کا برادر عرب ہمسایہ ملک کے طور پر احترام کریں اور خلیجی ملکوں کے معاملات میں مداخلت نہ کریں، شیخ الازہر نے کہا کہ میں اہل السنۃ والجماعۃ مسلک کے پیروکار ملکوں میں شیعہ ازم کے پھیلاؤ کو مسترد کرتا ہوں۔ ایرانی صدر سے اپنی ملاقات میں شیخ الازہر نے سنی مسلک کے پیروکار ممالک میں مداخلت اور اہل السنۃ والجماعۃ مسلک کو گزند پہنچانے کی کوششوں کو انتہائی خطرناک قرار دیتے ہوئے کہا کہ مصر ماضی میں اور اب بھی اہل السنۃ والجماعۃ کا گڑھ ہے، الازہر الشریف اہالیان مصر اور بالخصوص نوجوانوں میں شیعہ ازم کو فروغ دینے کی کوششوں کو یکسر مسترد کرتا ہے۔ احمد الطیب نے ایران میں بعض لوگوں کی طرف سے امہات المومنین بالخصوص حضرت عائشہؓ اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے خلاف نازیبا کلمات کی شدید مذمت کی۔ شیخ الازہر نے ایرانی صدر سے مطالبہ کیا کہ وہ برادر ملک شام میں خون خرابہ رکوانے اور وہاں امن قائم کرنے میں مدد کے لیے آگے بڑھیں۔ انہوں نے احمدی نژاد سے ایران میں اہل السنۃ کو مکمل حقوق دینے کا بھی مطالبہ کیا۔''

روزنامہ ''کائنات'' کی یہ خبر جامعہ ازہر کے دفتر سے جاری ہونے والی پریس ریلیز کے حوالہ سے ہے جس سے اس مسئلہ پر شیخ الازہر، الازہر الشریف اور مصر کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ صرف الازہر الشریف اور مصر کے علماء اور عوام کی ترجمانی نہیں ہے بلکہ عالمِ اسلام کے بہت سے دیگر ممالک بھی اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہیں۔ لیکن وہاں کی کسی سرکردہ علمی شخصیت کو شاید شیخ الازہر کی طرح اپنے موقف وجذبات کو بیان کرنے کا حوصلہ یا موقع نہیں مل رہا۔ اس سے قبل سعودی عرب کے بزرگ عالمِ دین اور مسجد نبویؐ کے امام محترم الشیخ حذیفی حفظ اللہ تعالیٰ نے بعض مواقع پر اس قسم کے جذبات کا اظہار فرمایا تھا لیکن حوصلہ افزائی کا مناسب ماحول نہ ملنے کی وجہ سے بات صرف ان کی ذات تک محدود رہی۔ مگر جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے وہ تو کم و بیش ہر جگہ موجود ہے بلکہ اس کے توسع، تنوع اور سنگینی میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔

پاکستان کی صورت حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے، ہمارے ہاں سنی شیعہ اختلافات اور کشمکش صدیوں سے چلے آرہے ہیں لیکن ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد سے اس کی نوعیت بدل گئی ہے اور اس میں بہت سے نئے پہلوؤں کا اضافہ ہوا ہے۔ ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد انقلابی راہ نما جناب

خمینی کی نمائندگی کے ٹائٹل کے ساتھ یہاں ایک نئی جماعت ''تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ'' وجود میں آئی تھی اور اس کی طرف سے ملک میں فقہ جعفریہ کے نفاذ کے مطالبہ نے ایک ایسا خلفشار جنم دیا تھا جس کے تلخ نتائج ابھی تک سمیٹنا پڑ رہے ہیں حتیٰ کہ اس کے لیے جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کی طرف سے اسلام آباد کے وفاقی سیکرٹریٹ کا محاصرہ کیا گیا اور وہاں دھرنا دیا گیا جس کے ردعمل میں دوسری طرف بھی شدت کا عنصر ابھرا اور معاملات بگڑتے چلے گئے۔ اس صورت حال کے گہرے تجزیہ اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے جس کی طرف ہماری سرے سے توجہ ہی نہیں ہے۔ اہل السنۃ کے عقائد و مسلک اور مفادات و معاملات کے تحفظ کے حوالہ سے ہم (۱) چند عقائد اور ان کی تعبیرات کی بحث اور (۲) حضرات صحابہ کرامؓ کے ساتھ محبت و عقیدت کے جذباتی اظہار کے دو دائروں سے باہر دیکھنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں، حالانکہ خود ان دو دائروں کا تقاضہ ہے کہ ہم معروضی صورت حال اور زمینی حقائق کا جائزہ لیں اور حال و مستقبل کے خدشات، خطرات، ضروریات اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر حکمت عملی اور طریق کار وضع کریں۔

سنی شیعہ کشمکش اور اس سلسلہ میں کشیدگی میں مسلسل اضافہ اب صرف پاکستان، مصر یا سعودی عرب کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ پورا عالمِ اسلام اس کی لپیٹ میں آرہا ہے، خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ میں یہ کشمکش ایک نیا رخ اختیار کرتی جا رہی ہے اور کویت، یمن، بحرین، لبنان، عراق، اردن اور شام سے اٹھنے والا دھواں کسی نئے آتش فشاں کے بے قابو ہو جانے کی خبر دے رہا ہے۔ اس لیے ہم احباب کو توجہ دلانے کے لیے چند تجاویز ارباب فکر و دانش کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں:

- شیخ الازہر اور شیخ حذیفی سے کسی مؤثر صورت میں درخواست کی جائے کہ وہ اسے پورے عالمِ اسلام کا مسئلہ سمجھتے ہوئے مسلمان ممالک کے سرکردہ راہ نماؤں اور علماء کرام کے درمیان باہمی مشاورت کا اہتمام کریں۔
- پاکستان کے دینی و علمی حلقے بالخصوص سنی محاذ پر کام کرنے والی جماعتوں کی قیادتیں اس سلسلہ میں زمینی حقائق، معروضی صورت حال اور پیش آمدہ خطرات و خدشات کا وسیع تناظر میں ادراک و احساس کریں اور نصف صدی قبل کے ماحول سے باہر نکل کر آج کے حالات میں اپنی حکمت عملی اور طریق کار کا از سر نو تعین کریں۔
- اسے صرف دیوبندیوں کا مسئلہ بنائے رکھنے کی بجائے اہلِ سنت کے تمام حلقوں اور مکاتبِ فکر کے مشترکہ مسئلہ کے طور پر دیکھا جائے اور دوسرے مذہبی مکاتبِ فکر کو بھی اس میں شریک

کرنے کی کوشش کی جائے۔

- وکلاء، یونیورسٹیوں کے اساتذہ، سیاسی کارکنوں، صحافیوں اور دانشوروں کو مسئلہ کی نوعیت اور سنگینی سے آگاہ کرنے کی مہم چلائی جائے اور قوم کے تمام طبقات کو اس مہم کا حصہ بنایا جائے۔
- مجھے اس میں بھی کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا کہ سنی شیعہ کشمکش کے کھلے طور پر سامنے آنے والے تلخ ثمرات ونتائج اور ملی وقومی نقصانات کی روک تھام کے لیے سنجیدہ شیعہ راہ نماؤں سے بھی بات کی جائے اور معاملات کو کسی قابل قبول دائرے میں رکھنے کے لیے مشترکہ کوششوں کی کوئی صورت نکالی جائے۔

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مارچ ۲۰۱۳ء

روزنامہ کائنات اسلام آباد کے ۷ فروری ۲۰۱۳ء کے شمارے میں شائع ہونے والی خبر ملاحظہ فرمائیے کہ:

”مصر کی معروف تاریخی دینی درسگاہ جامعہ الازہر کے سربراہ ڈاکٹر احمد الطیب نے ایرانی صدر محمود احمدی نژاد پر زور دیا ہے کہ وہ خلیجی ممالک کے معاملات میں مداخلت سے گریز کریں اور بحرین کا برادر ہمسایہ عرب ملک کے طور پر احترام کریں، اہل السنۃ والجماعۃ مسلک کے پیروکار ملکوں میں شیعہ ازم کے فروغ کی کوششیں ناپسندیدہ ہیں۔ ایران کے صدر اور شیخ الازہر کے درمیان ملاقات کے بعد جاری ہونے والے یونیورسٹی کے بیان میں احمد الطیب نے محمود احمدی نژاد سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ بحرین کا برادر ہمسایہ عرب ملک کے طور پر احترام کریں اور خلیجی ملکوں کے معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ شیخ الازہر نے کہا کہ میں اہل السنۃ والجماعۃ مسلک کے پیروکار ملکوں میں شیعہ ازم کے پھیلاؤ کو مسترد کرتا ہوں۔

ایرانی صدر سے اپنی ملاقات میں شیخ الازہر نے سنی مسلک کے پیروکار ممالک میں شیعہ مداخلت اور اہل السنۃ کے مسلک کو گزند پہنچانے کی کوششوں کو انتہائی خطرناک قرار دیتے ہوئے کہا کہ مصر ماضی میں اور اب بھی اہل السنۃ والجماعۃ کا گڑھ ہے، الازہر الشریف اہالیان مصر اور بالخصوص نوجوانوں میں شیعہ ازم کو فروغ دینے کی کوششوں کو یکسر مسترد کرتا ہے۔

احمد الطیب نے ایران میں بعض لوگوں کی طرف سے امہات المومنین بالخصوص

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ اجمعین کے خلاف نازیبا کلمات کی شدید مذمت کی ہے اور ایرانی صدر سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ برادر ملک شام میں خون خرابہ رکوانے اور وہاں امن قائم کرنے کے لیے مدد میں آگے بڑھیں، انہوں نے ایران میں اہل السنۃ کو مکمل حقوق دینے کا بھی مطالبہ کیا ہے۔“

جامعہ ازہر کے شیخ جنہیں عرب دنیا اور مصر میں ”الامام الاکبر“ کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے، عالمِ اسلام کی محترم علمی و دینی شخصیت شمار ہوتے ہیں، اس منصب پر ہر دور میں ممتاز اہل علم و فضل فائز ہوتے چلے آرہے ہیں اور ان کے موقف اور ارشادات کو عالمِ اسلام اور خاص طور پر عرب دنیا میں انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ موجودہ شیخ الازہر جناب ڈاکٹر احمد الطیب حفظہ اللہ تعالیٰ نے ایران کے صدر کے سامنے یہ مطالبات پیش کر کے وقت کے ایک اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور نہ صرف عرب ممالک بلکہ دنیا بھر کے برادران اہلسنت کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

ایرانی حکومت کی سرپرستی میں شیعہ ازم کے فروغ اور اہلِ سنت کی اکثریت رکھنے والے ممالک میں فرقہ وارانہ نوعیت کی مسلسل مداخلت کی یہ شکایت صرف مصر کو نہیں بلکہ دیگر سنی ممالک بالخصوص پاکستان کے سنی مسلمانوں کی بھی یہی شکایت ہے۔ ایران میں جب رضا شاہ پہلوی کا تختہ الٹنے کے بعد وہاں کے مذہبی راہنماؤں نے زمام حکومت سنبھالی اور مذہبی بنیادوں پر نئے نظام کا آغاز کیا تو بہت سے حلقوں کی طرف سے اس خوش کن توقع کا اظہار کیا گیا تھا کہ ایران کی مذہبی حکومت بہت سے اختلافات کے باوجود مسلم ممالک میں نفاذِ اسلام کے لیے کام کرنے والی دینی تحریکات کو معاونت فراہم کرے گی اور انہیں ایران کے کامیاب مذہبی انقلاب سے تقویت حاصل ہوگی۔ لیکن ہوا یہ کہ ایران کی مذہبی حکومت نے عالمِ اسلام کی دینی تحریکات کو تقویت دینے کی بجائے اپنے انقلاب اور اثر ورسوخ کو شیعہ ازم کے فروغ کا ذریعہ بنالیا جس سے باہمی کشمکش کی ایسی فضا ہر جگہ گرم ہوگئی جس کی حرارت کو کم کرنے کی کوئی تدبیر کارگر ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔

پاکستان میں ایرانی انقلاب کی نمائندگی کے ٹائٹل کے ساتھ ”تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ“ قائم ہوئی اور غالب سنی اکثریت کے ملک میں فقہ جعفریہ کا نفاذ کا مطالبہ کر کے یہاں نفاذِ اسلام کی تحریک کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی گئی۔ پھر تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کے عنوان سے اسلام آباد میں وفاقی سیکرٹریٹ کا محاصرہ کر کے سنی حلقوں کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ بھی جواب میں منظم ہوں اور شیعہ ازم کے فروغ کی کوششوں کا مقابلہ کریں۔ اس کے نتیجے میں اب ملک کی جو صورتحال دکھائی دے رہی ہے وہ ہر محب

وطن شخص کے لیے اضطراب کا باعث بنی ہوئی ہے۔

پاکستان میں سنی شیعہ کشمکش اس سے قبل بھی موجود تھی لیکن اس میں جارحیت اور تشدد کا وہ عنصر نمایاں نہیں تھا جس نے آج انتہائی پریشان کن رخ اختیار کر لیا ہے، اور اس کی وجہ ہماری رائے میں ایرانی انقلاب کے بعد مذہبی حکومت کی طرف سے پڑوسی ممالک میں شیعہ ازم کے فروغ کی سرکاری سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی پالیسی ہے جس نے حالات کو اس حد تک بگاڑ دیا ہے۔ اس لیے ایرانی صدر کے سامنے یہ معاملات پیش کرنے میں شیخ الازہر نے صرف عرب عوام کی ترجمانی نہیں کی بلکہ پاکستانیوں کی ترجمانی کا بھی حق ادا کیا ہے جس پر ہم ان کے شکرگزار ہیں اور انہیں سلام پیش کرتے ہیں۔

ہماری معلومات کے مطابق اس سے قبل مدینہ منورہ کے ایک بزرگ امام الشیخ حذیفی حفظہ اللہ تعالیٰ بھی اس قسم کے جذبات کا اظہار کر چکے ہیں جس پر وہ دنیا بھر کے اہل السنۃ کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ ہم شیخ الازہر اور الشیخ حذیفی کے ان ارشادات کی مکمل تائید کرتے ہوئے ان سے گزارش کرنا چاہیں گے کہ وہ آگے بڑھ کر اس مسئلہ پر عالم اسلام کے علمی حلقوں کی باہمی مشاورت کا بھی اہتمام کریں تاکہ اجتماعی طور پر اس سلسلہ میں کوئی لائحہ عمل اختیار کیا جا سکے۔

متحدہ سنی محاذ کے
قومی سنی کنونشن ۱۹۸۸ء کی قراردادیں

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۷ مارچ ۲۰۱۳ء

......

- محرم الحرام اور صفر کے دوران بدامنی اور فساد کا باعث بننے والے جلوسوں پر مکمل پابندی عائد کی جائے۔
- چونکہ شیعہ حکومت کو زکوٰۃ نہیں دیتے اس لیے زکوٰۃ، عشر کمیٹیوں اور متعلقہ محکموں سے شیعہ ارکان وافسران کو فی الفور الگ کیا جائے اور جب وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تو شیعہ اداروں اور افراد کو بھی زکوٰۃ نہ دی جائے بالخصوص شیعہ ادارہ فاطمیہ ٹرسٹ کے لیے زکوٰۃ فنڈ سے مخصوص کی گئی ایک کروڑ روپے کی امداد منسوخ کی جائے۔
- اعلیٰ ملازمتوں اور کلیدی اسامیوں میں شیعہ ملازمین کو ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق جگہ دی جائے۔

- زکوٰۃ وعشر کی جگہ شیعہ آبادی پر متبادل ٹیکس عائد کیا جائے۔
- صحابہ کرامؓ کی توہین اور تنقید پر مشتمل لٹریچر ضبط کر کے مؤلفین، مترجمین اور ناشرین کے خلاف کاروائی کی جائے اور تحفظ ناموس صحابہؓ واہل بیتؓ آرڈی ننس کو مؤثر طور پر نافذ کیا جائے۔
- قرآن کریم کی حفاظت اور اشاعت کی کمیٹیوں سے شیعہ ارکان کو الگ کیا جائے۔
- عالمِ اسلام ایرانی عازمین کی طرف حرمین شریفین میں خونریزی اور بدامنی کی کاروائیوں کا نوٹس لے اور حرمین شریفین میں فسادیوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے۔
- بنوری ٹاؤن کراچی، رحیم یار خان، خیر پور ٹامیوائی جھنگ، فیصل آباد، چکوال، حویلیاں، اٹک، کوہاٹ، پارہ چنار، دینہ، گولڑہ شریف، لیہ، اگوکی ضلع سیالکوٹ اور دیگر مقامات پر اہلِ سنت کے علماء اور کارکنوں کے خلاف وحشیانہ تشدد اور انتظامیہ کے جانبدارانہ طرزِ عمل کے بارے میں ہائی کورٹ کے جج کے ذریعے عدالتی تحقیقات کرائی جائے اور علماء اور کارکنوں کے خلاف جھوٹے مقدمات واپس لیے جائیں۔ بالخصوص مولانا حق نواز جھنگوی، حاکم علی، محمد یوسف مجاہد، طارق افضال اور دیگر اسیر راہنماؤں کو فی الفور رہا کیا جائے اور ان کے خلاف جھوٹے مقدمات درج کرنے والے افسران کے خلاف کاروائی کی جائے۔
- قیامِ پاکستان کے بنیادی مقصد کی تکمیل اور نفاذِ اسلام کے لیے ملک کی اکثریتی سنی آبادی کے حقوق کا تحفظ کرتے ہوئے فقہ حنفی کو بطور واحد پبلک لاء نافذ کر کے جمہوری اصولوں کا احترام کیا جائے۔
- براہم نزد واہ کینٹ میں صحابہ کرامؓ کی اعلانیہ توہین کے سلسلہ میں درج مقدمہ پر مؤثر کارروائی کی جائے۔
- انجمن سپاہ صحابہؓ کے مرکزی راہنما مولانا ضیاء الرحمن فاروقی کو سمندری کی جامع مسجد کی خطابت سے معطل کرنے کے سلسلہ میں محکمہ اوقاف کی کاروائی معاندانہ ہے۔ اسے فی الفور واپس لیا جائے۔
- راوی روڈ لاہور میں محمڈن شرعی یونیورسٹی اور دیگر مختلف ناموں سے گمراہی پھیلانے والے محمد اکرم عربی نامی شخص کے خلاف کارروائی کی جائے اور گمراہی کے اس اڈہ کو بند کرایا جائے۔

مشرقِ وسطی کی سیاسی و مذہبی کشمکش

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ---ستمبر ۲۰۱۳ء

مصر میں ”اخوان المسلمون“ کی حکومت کا خاتمہ

مصر میں اخوان المسلمون کی منتخب حکومت کا تختہ الٹنے والے فوجی حکمرانوں کی سیاسی و اخلاقی تائید کے ساتھ ساتھ اربوں روپے کی صورت میں ان کی مالی امداد کر کے سعودی حکومت نے اپنے بارے میں بہت سے سوالات کھڑے کر لیے ہیں۔ اگرچہ یہ سوالات نئے نہیں ہیں لیکن آج کی نسل کے لیے ضرور نئے ہیں اور اپنے ماضی سے بے خبری کے باعث علم و دانش کا سطحی اور معروضی ماحول حیرت اور شش و پنج کی کیفیت سے دوچار ہے۔

سعودی حکومت اسلامی نظام کی عملداری اور قرآن و سنت کی حکمرانی کی علمبردار ہے اور اس نے اپنی مملکت کی حدود میں ایک حد تک اس کا اہتمام بھی کر رکھا ہے، جبکہ مصر میں اخوان المسلمون کا ایجنڈا بھی یہی ہے اور وہ گزشتہ پون صدی سے اس کے لیے مسلسل سرگرم عمل ہے۔ اخوان نے سول سوسائٹی اور رائے عامہ کی مدد سے حسنی مبارک کی جس حکومت بلکہ آمریت سے نجات حاصل کی ہے اور مصر کے عوام کو جبر کے جس تیس سالہ طویل دور سے نجات دلائی ہے، اس کا ایجنڈا سیکولرازم، مغرب نوازی، اسرائیل دوستی اور جبر و تشدد کے ذریعہ حکمرانی کا رہا ہے۔ حسنی مبارک کا طویل دورِ حکمرانی اس کا شاہد ہے، اس لیے جب مصر کے عوام نے سڑکوں پر آ کر قربانی اور جدوجہد کے ذریعہ حسنی مبارک کے آہنی شکنجے کو توڑا اور محمد مرسی کو بھاری اکثریت کے ساتھ منتخب کر کے ایوان صدر میں پہنچایا تو نہ صرف مصر کے عوام نے اطمینان کا سانس لیا بلکہ عالمِ اسلام کی وہ دینی تحریکات بھی مطمئن ہوئیں جو پُرامن اور عدم تشدد پر مبنی سیاسی جدوجہد کے ذریعہ اپنے اپنے ملک میں نفاذِ اسلام کے لیے کوشاں ہیں۔ لیکن ہمیں خدشہ تھا کہ عالمی اسٹیبلشمنٹ، عرب دنیا کی رولنگ کلاس اور مصر کے اردگرد کے ماحول کے لیے اخوان المسلمون کی یہ کامیابی ہضم ہونے والی چیز نہیں ہے۔

چنانچہ صدر مرسی کے اقتدار سنبھالنے کے ٹھیک ایک سال بعد فوجی مداخلت کے ذریعہ ان کی حکومت کا تختہ الٹ کر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس موقع پر توقع کی جا رہی تھی کہ دنیا بھر کی پُرامن اسلامی تحریکیں اور اسلام کی حکمرانی پر یقین رکھنے والے حلقے اخوان کی آواز میں آواز ملائیں گے اور ان کی پشت پناہی کریں گے۔ لیکن سعودی عرب کی طرف سے مصر کے فوجی انقلاب کی حمایت اور فوجی حکمرانوں کی خطیر مالی امداد کا اچانک اعلان ایک ایسا بریکر ثابت ہوا جس نے توقعات اور امیدوں کا یہ

سارا نظام تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔

نئی نسل کی اپنے ماضی سے بے خبری

ہمارے ایک فاضل دوست اور ملک کے معروف عسکری تجزیہ نگار لیفٹیننٹ جنرل (ر) غلام جیلانی خان صاحب نے روزنامہ ''پاکستان'' میں شائع ہونے والے دو کالموں میں اس صورت حال پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ انہیں یہ شکایت ہے کہ آج کی نسل کو اپنے ماضی بلکہ ماضی قریب کی بھی خبر نہیں ہے اور وہ خلافتِ عثمانیہ کے زوال میں عرب دنیا کے کردار، آلِ سعود کے سیاسی و تاریخی پس منظر، جنگ عظیم اول کے بعد نئی عرب ریاستوں کے ساتھ برطانیہ و امریکہ کے معاہدات اور موجودہ عالمی نیٹ ورک میں عرب ریاستوں کی حیثیت و مقام سے بالکل بے خبر ہیں، جس کی وجہ سے ہم نہ صرف یہ کہ معروضی حالات کے اصل تناظر اور زمینی حقائق سے آگاہی حاصل نہیں کر پاتے بلکہ کسی مسئلہ میں صحیح موقف اور طرز عمل اختیار کرنا بھی ہمارے لیے ممکن نہیں رہتا۔

ہمیں خان صاحب محترم کے اس ارشاد سے مکمل طور پر اتفاق ہے بلکہ ہم خود متعدّد بار یہ عرض کر چکے ہیں کہ یہ ''بے خبری'' ہماری نئی نسل کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، لیکن اس سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہ ''بے خبری'' محض اتفاقی اور صرف نئی نسل کی بے پروائی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ ''انجینئرڈ بے خبری'' ہے جس کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ہمارے متعلقہ سرکاری اور غیر سرکاری ادارے قیام پاکستان کے بعد سے مسلسل مصروف عمل ہیں۔ اس شعبہ میں ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ، دینی مدارس کے مدرسین، سیاسی جماعتوں کے راہ نماؤں اور ربع صدی سے زیادہ عرصہ تک خطابت و امامت کے فرائض سرانجام دینے والے علماء کرام سے یہ پوچھ لیں کہ خلافتِ عثمانیہ کا دائرہ کار کیا تھا اور اس کے زوال کے اسباب کیا تھے؟ یا اسرائیل کیسے وجود میں آیا اور اس میں کس کس نے کیا کیا کردار ادا کیا ہے؟ تو قوم کی سیاسی، دینی اور علمی قیادت کا مقام رکھنے والے ان چاروں طبقوں کی غالب اکثریت کے پاس بغلیں جھانکنے کے سوا اس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں ہوگا۔ فیا أسفاہ ویا ویلاہ۔

ایران اور سعودی عرب کی کشمکش

خان صاحب محترم کو شکوہ ہے کہ مڈل ایسٹ میں سعودی عرب اور ایران کے درمیان سنی شیعہ کشمکش کے حوالہ سے ''پراکسی وار'' چل رہی ہے اور پاکستان میں جاری فرقہ وارانہ کشیدگی اس کا حصہ ہے جس کو سعودی عرب ہوا دے رہا ہے۔ ہمیں ان کی اس بات سے بھی اختلاف نہیں ہے البتہ یہ ضرور عرض کریں گے کہ یہ یکطرفہ اور ادھوری بات ہے۔

یہ منظراب ہر ایک کو نظر آرہا ہے کہ مڈل ایسٹ میں سنی شیعہ کشمکش دن بدن بڑھتی جارہی ہے اور اس نے مذہبی دائرے سے بڑھ کر سیاسی وعسکری دائروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور یہ بات بھی حقیقت ہے کہ اس کشمکش کے دائرے میں پاکستان بھی شامل ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس مذہبی کشمکش نے سیاسی اور عسکری رُخ کب سے اختیار کیا ہے؟ اس حقیقت کا اظہار کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو، مگر اس کے حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد پاکستان میں اس کی نمائندگی کے عنوان سے تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ وجود میں آئی اور اس کی طرف سے اپنے فرقہ وارانہ مطالبات کے لیے وفاقی سول سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کیا گیا جس کے ردعمل کے طور پر سنی شدت پسند تحریکوں نے جنم لیا اور معاملات بڑھتے بڑھتے مذہبی خانہ جنگی کی افسوسناک صورت اختیار کر گئے۔

اسی طرح مڈل ایسٹ کی ریاستوں میں ایران کے مذہبی انقلاب کے اثرات نے پیش رفت شروع کی، اس عمل اور اس کے ردعمل نے مشرقِ وسطیٰ کی بہت سی ریاستوں کے داخلی ماحول کو لپیٹ میں لے لیا اور اب حالات یہ رُخ اختیار کرتے جارہے ہیں کہ غلام جیلانی خان صاحب نے اپنے مضمون میں خلافت عباسیہ کے خاتمہ کے بعد قائم ہونے والی جس فاطمی حکومت کا تذکرہ کیا ہے، اگر کوئی مضبوط رکاوٹ نہ ہوئی تو وہ فاطمی حکومت ایک بار پھر خدانخواستہ مشرقِ وسطیٰ میں اپنا پرچم لہراتی ہوئی دکھائی دینے لگی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ صورت حال پورے خطے کی سنی اکثریت کے لیے قابل قبول نہیں ہوگی اور وہ اس سے بچنے کے لیے کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں تو ضرور مارے گی۔

ہماری خان صاحب محترم سے گزارش ہے کہ وہ اس صورت حال پر تشویش کا اظہار ضرور کریں، ہم بھی ان کے ساتھ اس تشویش میں شریک ہیں، لیکن تصویر کے صرف ایک رُخ پر اکتفا کرنے کی بجائے اس کا دوسرا رُخ بھی سامنے رکھیں اور دونوں پہلو سامنے رکھتے ہوئے اس مخمصہ سے نکلنے کے لیے قوم کی راہ نمائی کریں۔

خان صاحب محترم نے شکوہ کیا ہے کہ سعودی حکومت نے مصر کے فوجی انقلاب کی تو خطیر رقم کے ساتھ مالی امداد کی ہے لیکن پاکستان جس کو اس وقت مالی امداد کی سخت ترین ضرورت ہے اسے صرف ائمہ حرمین کے دوروں کی خوش خبری پر ٹرخایا جارہا ہے۔

پاک سعودیہ تعلقات

خان صاحب نے پاکستان کی مالی امداد کی طرف توجہ نہ دینے پر جو شکوہ کیا ہے، وہ بالکل بجا ہے اور سعودی حکومت سے ہمارا شکوہ بھی یہی ہے۔ لیکن انہوں نے ائمہ حرمین کے پاکستان کے دوروں کا اس کے تقابل میں جس انداز میں تذکرہ کیا ہے، وہ بہر حال محل نظر ہے۔ ائمہ حرمین شریفین کی پاکستان

تشریف آوری ہمارے لیے ہمیشہ باعث برکت رہی ہے، وہ کبھی فرقہ وارانہ کشمکش کا حصہ نہیں بنے، حتیٰ کہ حرمین شریفین میں ان کے خطبات جمعہ و عیدین میں بھی فرقہ واریت کا مواد عام طور پر موجود نہیں ہوتا۔ جبکہ ائمہ حرمین بالخصوص فضلیۃ الشیخ السدیس حفظہ اللہ تعالیٰ اپنے خطبات میں وحدت امت اور مذہبی رواداری کے ساتھ ساتھ امت کے دینی، علمی، فکری اور معاشرتی مسائل کی طرف مسلمانوں کی جو راہ نمائی کرتے ہیں، وہ ریکارڈ کا حصہ ہے۔

ویسے بھی سعودی عرب کے علماء کرام کا اپنا ایک کردار ہے۔ سعودی حکومت کے مذہبی دائروں کو قائم رکھنے میں آل شیخ کا مسلسل کردار چلا آرہا ہے۔ سعودی نظام کی اصلاح کے لیے سعودی عرب کے سابق چیف جسٹس الشیخ محمد بن ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور فتاویٰ مسلم ممالک کی عدلیہ کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خلیج عرب میں امریکی افواج کی آمد پر سعودی عرب کے چوٹی کے دو سو علماء کرام نے جو عرضداشت ”مذکرۃ النصیحۃ“ کے عنوان سے سعودی فرمانروا کو پیش کی تھی اور جس کے نتیجے میں بہت سے علماء کرام جیلوں میں گئے تھے اور بعض جلا وطن بھی ہوئے، وہ نفاذِ اسلام کی تحریکات کے لیے گائیڈ لائن کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے ہماری درخواست ہے کہ سعودی حکومت کے سیاسی فیصلوں پر ضرور تنقید کی جائے اور ان سے اختلاف بلکہ احتجاج کا حق بھی استعمال کیا جائے، لیکن ائمہ حرمین شریفین اور سعودی عرب کے علماء کرام کو اس دائرے سے الگ رکھا جائے اور انہیں خواہ مخواہ اس کے ساتھ لپیٹنے سے احتراز کیا جائے، اس لیے کہ اُن کا اِن معاملات کی ذمہ داری میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

آلِ سعود کا تاریخی پس منظر

جہاں تک ”آلِ سعود“ کے تاریخی پس منظر اور سیاسی کردار کا تعلق ہے ہم نے کچھ عرصہ قبل ”پاکستان“ میں ہی اس کا مختصر تذکرہ کیا تھا اور سعودی عرب کے بانی شاہ عبد العزیز مرحوم اور لارڈ چیمسفورڈ کے درمیان ہونے والے اس تیرہ نکاتی معاہدے کا ذکر بھی کیا تھا جس میں برطانیہ عظمیٰ نے سعودی عرب میں آلِ سعود کے نسل در نسل حکمرانی کے حق کو تسلیم کیا تھا، جبکہ آلِ سعود کی طرف سے عالمی سطح پر برطانوی مفادات کے خلاف نہ جانے کا عہد کیا گیا تھا اور اس معاہدہ کے نتیجے میں سعودی عرب کی ریاست وجود میں آئی تھی۔ اس میں صرف یہ فرق آیا ہے کہ عالمی سطح پر برطانیہ کی جگہ امریکہ نے لے لی ہے جبکہ باقی معاملات جوں کے توں چل رہے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ جس طرح ائمہ حرمین شریفین اور علماء سعودی عرب کو ”آلِ سعود“ کے سیاسی کردار کے ساتھ نتھی کرنا مناسب نہیں ہے اسی طرح ”آلِ سعود“ کے سیاسی کردار کو حرمین شریفین کے

تقدس کی آڑ میں رکھنا بھی درست طرز عمل نہیں ہے بلکہ اس پر کھلے دل کے ساتھ بحث و مباحثہ کی ضرورت ہے۔ مگر ہم پہلے مرحلہ میں یہ چاہیں گے کہ غلام جیلانی خان صاحب محترم اپنے مخصوص انداز میں خلافتِ عثمانیہ کے عروج و زوال، اسرائیل کے قیام کے پس منظر، ہاشمی خاندان اور آلِ سعود کے تاریخی تناظر، پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافتِ عثمانیہ کی شکست و ریخت کے نتیجے میں وجود میں آنے والی عرب ریاستوں کے ساتھ برطانیہ، فرانس اور امریکہ وغیرہ کے معاہدات اور مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ صورت حال کے ''معاہداتی پس منظر'' پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں۔ ان کے پاس معلومات کے ذرائع بھی زیادہ ہیں، وہ بات کو خوبصورت انداز میں کہنے اور پھر اسے اپنے لہجے میں ڈھالنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ اس لیے اس داستان کو نئی نسل کے سامنے پیش کرنے کا حق وہ زیادہ رکھتے ہیں، البتہ کہیں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہمیں مداخلت کی ضرورت محسوس ہوئی تو ہم اس سے گریز نہیں کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی کا سانحہ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۹ نومبر ۲۰۱۳ء

دس محرم الحرام کا دن امید و یاس کی کیفیت میں گزارنے کے بعد رات کو بستر پر لیٹا تو خوشی اور اطمینان کے تاثرات ذہن وقلب پر غالب تھے اور مطمئن تھا کہ جو دن بہت سے خطرات و خدشات جلو میں لیے صبح طلوع ہوا تھا وہ کم از کم ہمارے شہر میں امن و سکون کی کیفیت کے ساتھ گزر چکا ہے، اس لیے بھی کہ محرم الحرام کے آغاز میں گوجرانوالہ کی ایک امام بارگاہ میں تین افراد ایک حملہ میں جاں بحق ہو چکے تھے اور ۱۰ محترم جمعۃ المبارک کے روز ہونے کی وجہ سے بدامنی کے امکانات زیادہ نظر آرہے تھے۔ مگر صبح نماز فجر کے لیے اٹھا تو موبائل فون کی سکرین پر موجود اس میسج نے سارا سکون غارت کر دیا جس میں سانحہ راولپنڈی کے وقوع کی خبر دی گئی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر راولپنڈی اور اسلام آباد کے احباب سے فون پر رابطہ شروع کیا تو سبھی فون بند ملے حتیٰ کہ سارا دن کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کیا ہوا ہے اور تازہ صورت حال کیا ہے؟

دارالعلوم تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی ملک کے اہم ترین علمی اداروں اور دینی مراکز میں سے ہے۔ شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان رحمہ اللہ تعالیٰ کا صدقہ جاریہ اور ان کی یادگار ہے۔ دینی تحریکات کا مرکز چلا آرہا ہے اور توحید و سنت کی اشاعت و فروغ کا داعی ہے۔ اس کے بارے میں موبائل فون کے پے در پے اضطراب انگیز پیغامات لمحہ بہ لمحہ پریشانی اور رنج و غم میں اضافہ کرتے چلے جا رہے

تھے۔ جبکہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر طوفان بپا کر دینے والا میڈیا حیرت انگیز طور پر خاموش تھا۔ راولپنڈی اور اسلام آباد کی فون سروس معطل تھی اور کوئی قابل اعتماد ذریعہ میسر نہیں آ رہا تھا جس سے اصل صورت حال معلوم کی جا سکے۔

ظہر کے بعد عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے بزرگ راہنما حافظ شیخ نذیر احمد کی اہلیہ محترمہ کے جنازے میں بہت سے علماء اور تاجر راہنماؤں سے ملاقات ہوئی، سب بے چین تھے اور ان کا تقاضہ تھا کہ فوری طور پر علماء کرام اور تاجر راہنماؤں کا اجلاس بلا کر کوئی لائحہ عمل طے کیا جائے۔ شہری یا قومی سطح پر اس قسم کا کوئی مسئلہ درپیش ہو تو علماء کرام، تاجر راہنماؤں اور دیگر شہریوں کو اکٹھا کرنے کی سعادت بحمد اللہ تعالیٰ ہمارے حصہ میں ہی آتی ہے۔ اس لیے سب دوستوں کا رُخ میری طرف تھا، مگر میرے لیے مشکل یہ تھی کہ جب تک صحیح صورت حال معلوم نہ ہو جائے کسی اجلاس میں ہم آخر کیا طے کر پائیں گے؟ شہر میں ہر طرف بے چینی تھی اور دینی راہنماؤں اور کارکنوں کے چہروں سے ان کے اندرونی غم و غصہ کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ ضلعی انتظامیہ کے اعلیٰ افسران نے بھی رابطے شروع کر دیے اور معلوم کرنا چاہا کہ ہم اس المناک سانحہ پر کیا ردعمل ظاہر کریں گے؟ میں نے ان سے کہا کہ جتنا بڑا المیہ ہوا ہے ہم اس پر خاموش تو نہیں رہیں گے اور اسی کے مطابق اپنے جذبات کا اظہار ضرور کریں گے۔ البتہ آپ مطمئن رہیں کہ ہمارا اِحتجاج قانون اور امن کے دائرے میں رہے گا اور ایک سانحہ پر احتجاج کرتے ہوئے کسی دوسرے سانحہ کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس فضا میں اتوار کو گیارہ بجے مرکزی جامع مسجد میں شہر کے علماء کرام اور تاجر راہنماؤں کا مشترکہ اجلاس ہوا جس کی صدارت مدرسہ اشرف العلوم کے مہتمم مولانا مفتی محمد نعیم اللہ نے کی اور اس میں مختلف تاجر تنظیموں کے سرکردہ راہنماؤں کے علاوہ مولانا محمد ریاض خان سواتی، مولانا عبد الواحد رسول نگری، مولانا قاضی عطاء اللہ، مولانا نصر اللہ خان راشد، مولانا سید غلام کبریا شاہ، حافظ محمد صدیق نقشبندی، مولانا ارشد حمیدی، مفتی منصور احمد، حاجی شاہ زمان، مولانا قاری محمد رفیق عابد علوی اور مولانا جواد قاسمی، جبکہ تاجر راہنماؤں میں حاجی نذیر احمد جموں والے، سیٹھ ذوالفقار، میاں فضل الرحمن چغتائی، میاں محمد اکرم، مرزا محمد سلیم اور جناب فضل الرحمن بابر کھرانہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ راقم الحروف نے بھی موقع کی مناسبت سے اجلاس میں اپنی گزارشات پیش کیں۔

جمعیۃ اہل السنۃ والجماعۃ اس اجلاس کی داعی تھی اور اس کے صدر حاجی عثمان عمر ہاشمی اور سیکرٹری جنرل چودھری بابر رضوان باجوہ نے اجلاس کی کامیابی کے لیے بھرپور محنت کی۔ اجلاس میں اس وقت تک معلوم ہونے والی صورت حال کے مطابق مقررین نے اپنے جذبات و تاثرات کا اظہار کیا جن

میں غم و غصہ اور اضطراب و بے چینی کا پہلو نمایاں تھا۔ اور اس حوالہ سے سامنے آنے والی دہشت گردی اور درندگی پر ہر شخص نفرت و غصہ کا اپنے اپنے انداز میں بھرپور اظہار کر رہا تھا۔ مگر ایک بات سب راہنماؤں کی زبانوں پر مشترک تھی کہ امن عامہ کے لیے بدامنی اور تباہی کا باعث بننے والے مذہبی جلوسوں کو عام شاہراہوں اور گلیوں بازاروں میں لانے کا کوئی جواز نہیں ہے اور اس پر حکومت کو بہرحال نظر ثانی کرنا ہوگی۔ ایسے جلوس اگر عبادت ہیں تو انہیں عبادت گاہوں تک محدود کر دینے کی ضرورت ہے اور اس طرح ہر سال سیکیورٹی کے نام پر پورے قومی نظام اور سرکاری اداروں کو مسلسل ایک عشرے تک معطل کیے رکھنا کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعہ مطالبہ کیا گیا کہ حکومت اس سلسلہ میں کوئی واضح حکمت عملی طے کرے اور امن عامہ کے لیے خطرہ بن جانے والے جلوسوں کو چار دیواری میں محدود کرنے کے لیے قانون سازی کرے۔

مقررین نے اس بات پر بھی شدید احتجاج کیا کہ ایک طرف راولپنڈی اور اسلام آباد کی فون سروس معطل ہے اور کرفیو کے باعث لوگوں کا متاثرہ علاقہ سے رابطہ مکمل طور پر منقطع ہے۔ دوسری طرف سرکاری اداروں اور میڈیا نے ملک کے شہریوں تک صحیح معلومات پہنچانے کے لیے کوئی اہتمام نہیں کیا بلکہ معمولی واقعات کو ملک گیر مسئلہ بنا دینے والے میڈیا نے مجرمانہ خاموشی اختیار کر رکھی ہے جس سے غلط خبروں اور افواہوں کے فروغ کے باعث عوام کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو رہا ہے اور کئی دیگر شہروں میں بھی امن عامہ کی صورت حال بگڑ گئی ہے۔

اجلاس میں طے پایا کہ اس سلسلہ میں ۲۰ نومبر بدھ کو ایک بجے دن مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں ایک مشترکہ احتجاجی کنونشن منعقد ہوگا جس میں مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام اور تاجر تنظیموں کے راہنما خطاب کریں گے اور سانحۂ راولپنڈی کے حوالہ سے اپنے آئندہ لائحہ عمل کا اعلان کریں گے۔ اجلاس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ جوڈیشل انکوائری کو جلد از جلد مکمل کرا کے اس کی رپورٹ کو منظر عام پر لایا جائے اور جوڈیشل انکوائری میں سانحۂ راولپنڈی کے ساتھ ساتھ اس قسم کے فرقہ وارانہ تصادم و اشتعال کا باعث بننے والے اسباب و عوامل کو بھی زیرِ بحث لایا جائے۔

اجلاس میں مطالبہ کیا گیا کہ دارالعلوم تعلیم القرآن، جامع مسجد اور مارکیٹ کی سرکاری خرچ پر از سرِ نو تعمیر کی جائے اور شہداء و زخمیوں کے خاندانوں کو معقول مالی امداد دی جائے۔

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۳ نومبر ۲۰۱۳ء

......اجلاس میں موجودہ حالات کے تناظر میں پاکستان شریعت کونسل کا جو موقف طے کیا گیا وہ درج ذیل ہے:

سانحۂ راولپنڈی ہر لحاظ سے انتہائی قابل مذمت ہے اور تشدد و بربریت کی بدترین مثال ہے جس کا سنجیدگی کے ساتھ نوٹس لینے کی ضرورت ہے۔

حکومت نے اس سانحہ کی انکوائری کے لیے جوڈیشل کمیشن قائم کیا ہے جو ایک مناسب قدم ہے مگر پاکستان شریعت کونسل کی رائے میں اس کمیشن کو سانحۂ راولپنڈی کے اسباب و عوامل کے تعین اور اس کے ذمہ دار حضرات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ سنی شیعہ کشیدگی میں مسلسل اضافہ اور اس کے ملک کے امن کے لیے تباہ کن صورت اختیار کر جانے کے اسباب و عوامل اور پس پردہ محرکات کا جائزہ لے کر ان کے سدباب کے لیے بھی سفارشات پیش کرنی چاہئیں۔ اس لیے پاکستان شریعت کونسل حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ جوڈیشل کمیشن کے دائرہ کار کو وسعت دی جائے اور سنی شیعہ کشمکش میں خوفناک اضافے کے اسباب و عوامل کے تعین کو بھی اس کی ذمہ داری میں شامل کیا جائے۔

مسجد و مدرسہ اور مارکیٹ کی سرکاری خرچ پر تعمیر جلد از جلد شروع کی جائے اور ان اداروں کے ذمہ دار حضرات کو اعتماد میں لے کر تعمیر نو کا پروگرام طے کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان شریعت کونسل یہ مطالبہ کرتی ہے کہ مدینہ کلاتھ مارکیٹ کو محکمہ اوقاف سے واگزار کر کے اسے دارالعلوم تعلیم القرآن کو واپس کیا جائے۔

محرم الحرام کے ان جلوسوں کی وجہ سے پورے ملک کی انتظامی مشنری مسلسل دس دن تک اسی کام کے لیے وقف رہتی ہے۔ بہت سے ضروری امور معطل ہو جاتے ہیں، کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں اور کم و بیش دو ہفتے تک خطرات و خدشات کی دھند ملک بھر کی فضا میں چھائی رہتی ہے۔ اس مسئلہ کا مستقل حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے ورنہ پہلے سے زیادہ خطرات اور بدامنی کو فروغ حاصل ہوتا رہے گا۔ اس لیے پاکستان شریعت کونسل تجویز کرتی ہے کہ بدامنی، خوف و ہراس اور فرقہ وارانہ تصادم کا باعث بننے والے جلوسوں کو عبادت گاہوں اور چار دیواری کے دائرہ میں محدود کیا جائے اور گلیوں بازاروں میں ایسے مذہبی جلوسوں کے گزرنے پر مکمل پابندی عائد کر دی جائے۔

اس سانحہ میں دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ ضلعی حکام کی غفلت بھی اس کا بڑا سبب ہے اس لیے سانحہ کے ملزمان اور پس پردہ افراد و محرکات کے ساتھ ضلعی حکام کی کارکردگی کا جائزہ لینے کی بھی ضرورت ہے اور حکومت کو تمام ملزمان اور ذمہ دار حضرات کے خلاف سخت کاروائی کرنی چاہیے۔

سانحۂ راولپنڈی کے موقع پر حالات کو کنٹرول کرنے اور رائے عامہ کی صحیح راہ نمائی کے لیے اسلام آباد اور راولپنڈی کے علماء کرام، وفاق المدارس العربیہ پاکستان، جمعیۃ علماء اسلام پاکستان، اہل السنۃ والجماعۃ پاکستان اور جمعیۃ اشاعت التوحید والسنۃ کے راہ نماؤں نے جس بیدار مغزی اور حوصلہ و محنت کے ساتھ کردار کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اور پاکستان شریعت کونسل ملک کے تمام دینی حلقوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ ان اداروں اور جماعتوں کے ساتھ اس سلسلہ میں بھرپور تعاون جاری رکھیں۔

اجلاس میں میڈیا کے غیر ذمہ دارانہ رویہ کا بھی نوٹس لیا گیا اور کہا گیا کہ ملک بھر میں اضطراب و بے چینی پھیلنے اور مختلف شہروں میں بدامنی کی فضا پیدا ہونے میں نیشنل میڈیا کی غفلت اور سوشل میڈیا کی غیر ذمہ دارانہ روش کا بھی بڑا دخل ہے، اس لیے اس بات کا نوٹس لینے کی بھی ضرورت ہے۔

پاکستان شریعت کونسل محسوس کرتی ہے کہ تمام مکاتبِ فکر کو سانحۂ راولپنڈی سے پیدا شدہ صورت حال میں ہم آہنگی اور باہمی مفاہمت کے ساتھ قوم کی راہ نمائی کرنی چاہیے اور خاص طور پر دیوبندی مسلک کی جماعتوں اور مراکز کے درمیان ہم آہنگی اور رابطہ و مشاورت کی انتہائی ضرورت ہے اور تمام جماعتوں کے راہ نماؤں کو اس بارے میں خصوصی توجہ دینی چاہیے۔......

اجلاس میں سانحۂ راولپنڈی کے شہداء کی مغفرت اور زخمیوں کی جلد صحت یابی کے لیے دُعا کی گئی اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ شہداء اور زخمیوں کے خاندانوں کی معقول مالی امداد کا فوری طور پر اعلان کیا جائے۔

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۱۳ء

ملک کے معروف تعلیمی ادارہ دارالعلوم تعلیم القرآن (راجہ بازار، راولپنڈی) میں ۱۰ محرم الحرام کو جو المناک سانحہ پیش آیا اس پر ہر صاحبِ درد شخص کا دل تڑپ اٹھا ہے اور کرب و اضطراب نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ کا قائم کردہ یہ دینی مرکز پون صدی سے تعلیمی و دعوتی خدمات سرانجام دینے میں مصروف ہے اور ہزاروں علماء کرام نے یہاں سے تعلیم حاصل کی ہے۔ عاشوراء کے دن نماز جمعۃ المبارک کے وقت وہاں ماتمی جلوس کے گزرنے پر جو قیامت بپا ہوئی وہ اپنے دامن میں بہت سے سوالات کو سمیٹے ہوئے ہے، ان سوالات کو جتنا بھی دبانے کی کوشش کر لی جائے، رفتہ رفتہ ان کے جوابات ضرور سامنے آئیں گے اور واقعات کی پیچ در پیچ تہیں ایک ایک کر کے کھلتی چلی جائیں گی۔

کہا جاتا ہے کہ راجہ بازار کے اس حصہ سے عاشوراء کا ماتمی جلوس عام طور پر ساڑھے تین چار بجے کے لگ بھگ گزرتا ہے لیکن اس روز جبکہ جمعۃ المبارک کا دن ہونے کی وجہ سے زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی، یہ جلوس دو بجے سے پہلے جمعہ کے اجتماع کے دوران ہی ادھر جا نکلا، جبکہ ضلعی انتظامیہ نے صورتحال سے نمٹنے کے لیے کوئی پیشگی منصوبہ بندی نہیں کر رکھی تھی۔

ہمیں گوجرانوالہ میں بھی اسی قسم کی صورتحال کا سامنا تھا، ماتمی جلوس کی گزرگاہ میں ہماری مرکزی جامع مسجد اور اہلحدیث حضرات کی مرکزی جامع مسجد چوک نیائیں انتہائی نازک پوائنٹ ہیں، جلوس کے وہاں سے گزرنے کا وقت وہی تھا جو ان مساجد میں جمعہ کی نماز کے اوقات ہوتے ہیں، مگر ضلع گوجرانوالہ کی انتظامیہ اور ضلعی امن کمیٹی کے ارکان ہم سب کے شکریہ کے ساتھ تبریک کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حالات کی نزاکت کو محسوس کیا اور نہ صرف ان دو مقامات بلکہ ضلع بھر میں خطرہ کا باعث بننے والے دیگر مقامات کے حوالہ سے پیشگی منصوبہ بندی کر لی اور متعلقہ فریقوں کو بلا کر اوقات کی ایسی ترتیب قائم کرا دی جس سے کسی بدمزگی کے خطرات کم ہو گئے۔ اس دفعہ دس محرم الحرام جمعۃ المبارک کے روز ہونے کے ساتھ ساتھ گوجرانوالہ میں ایک اور بات بھی شدید خطرہ کا الارم بن چکی تھی کہ شہر کی ایک امام بارگاہ میں محرم الحرام کے اوائل میں فجر کے وقت کسی نامعلوم شخص کی فائرنگ سے اہلِ تشیع کے تین افراد جاں بحق ہو چکے تھے اور اس حوالہ سے سخت کشیدگی کی فضا قائم ہو گئی تھی، مگر ضلعی انتظامیہ کی فرض شناسی اور امن کمیٹی کی مسلسل محنت سے متنازعہ معاملات پہلے سے آپس میں سیٹ ہو گئے اور اہلِ تشیع کے ذمہ دار حضرات کے ساتھ طے پا گیا کہ اہلحدیث حضرات کی مسجد (چوک نیائیں) کے سامنے سے ماتمی جلوس جمعہ کی اذان سے پہلے گزر جائے گا اور مرکزی جامع مسجد (شیرانوالہ باغ) کے عقب میں یہ جلوس نماز جمعہ مکمل ہونے پر سوا دو بجے کے بعد آئے گا، اس معاہدہ کی پابندی کی گئی اور تمام تر خطرات و خدشات سمیت یہ دن گوجرانوالہ میں بحمد اللہ تعالیٰ امن و سکون کے گزر گیا۔

اگر ضلع راولپنڈی کی انتظامیہ بھی ان خطرات کو بروقت محسوس کر لیتی اور وہاں کی امن کمیٹی ان سے نمٹنے کے لیے پیشگی منصوبہ بندی کر لیتی تو شرپسند عناصر کو اس نازک صورتحال سے فائدہ اٹھانے، راولپنڈی کے امن کو تباہ کرنے اور ملک بھر کے اہل دین کے دلوں کو زخمی کرنے کا یہ موقع میسر نہ آتا۔ مگر جو کچھ ہوا بہت برا ہوا اور بہت ہی برا ہوا، اس کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے اور اس پر جس قدر نفرین بھیجی جائے دل کو کسی طرح تسلی نہیں ہوتی۔

- یہ المناک سانحہ کسی منظم سازش کا حصہ تھا یا وقتی اشتعال نے صورتحال کو یہاں تک پہنچا دیا؟
- ضلعی انتظامیہ کی افسوسناک غفلت روایتی بے پرواہی تھی یا یہ بھی کسی منظم منصوبے کا حصہ تھی؟

- اور اس میں کون کون کس کس درجہ میں اور کس کس سطح پر شریک و ذمہ دار ہے؟

اس کے بارے میں عدالتی تحقیقات کے لیے ہائیکورٹ کے ایک معزز جسٹس پر مشتمل کمیشن قائم ہو گیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس کی تحقیقات اور سفارشات کے نتیجے میں نہ صرف صحیح صورتحال واضح ہو گی بلکہ ذمہ دار عناصر کے خلاف مؤثر کاروائی اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا بھی جلد از جلد اہتمام ہو گا۔

ہم دارالعلوم تعلیم القرآن کے مہتمم مولانا اشرف علی صاحب اور ان کے رفقاء کے ساتھ ساتھ اس دہشت گردی میں نذر آتش ہو جانے والی مارکیٹ کے مالکان اور راولپنڈی و اسلام آباد کے علماء کرام اور دینی حلقوں کے اس غم میں شریک ہیں، اور شہداء و زخمیوں کے خاندانوں کے ساتھ ہمدردی و تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت شہداء کو جنت الفردوس میں جگہ دیں، زخمیوں کو صحت کاملہ وعاجلہ عطاء فرمائیں، مدرسہ و مسجد اور مارکیٹ کے نقصانات کی اپنے خزانہ غیب سے تلافی فرمائیں اور ملک و قوم کے امن کو تباہ کرنے کے درپے عناصر کو ہدایت سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

سنی شیعہ جھگڑوں کی وجوہات

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۶ نومبر ۲۰۱۳ء

دارالعلوم تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی کے طلبہ اور جامع مسجد کے نمازیوں کی المناک شہادت اور سانحۂ راولپنڈی کے حوالہ سے تحریک تحفظ مساجد و مدارس لالہ موسیٰ کے زیر اہتمام ایک تعزیتی ریفرنس ۲۴ نومبر اتوار کو بعد نماز عشاء جامع مسجد رحمانیہ اہل حدیث لالہ موسیٰ میں منعقد ہوا جس کی صدارت مرکزی جمعیۃ اہل حدیث پاکستان کے نائب امیر مولانا حافظ عبد الحمید عامر نے کی، جبکہ اس میں جمعیۃ اشاعت التوحید والسنۃ پنجاب کے نائب امیر مولانا عطاء اللہ بندیالوی، جماعت اسلامی پنجاب کے راہ نما ڈاکٹر طارق سلیم اور شہری جمہوری اتحاد لالہ موسیٰ کے صدر شیخ حفیظ اللہ صدیقی کے علاوہ پروفیسر محمد افضل ضیاء، مولانا عبد الواحد سلفی، مولانا قاری عبد القیوم، مولانا محمد عمیر شریف اور مولانا قاری عبد الغفار نے خطاب کیا۔ راقم الحروف نے بھی اس موقع پر چند گزارشات پیش کیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی کا سانحہ

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ دارالعلوم تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی کا المناک سانحہ پوری قوم کے لیے

باعث کرب والم بنا ہے اور اس نے لال مسجد کے سانحہ کی یاد پھر سے تازہ کر دی ہے۔ مدرسہ کے طلبہ، مسجد کے نمازیوں اور مارکیٹ کے تاجروں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس پر اپنے غم و غصہ کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں ہے اور اس کا درد ایک عرصے تک سینوں میں اٹھتا رہے گا۔ مگر میں اپنے جذبات کو دباتے اور دل پر پتھر رکھتے ہوئے اس کے ایک پہلو پر کچھ گزارشات معروضی حقائق کے حوالہ سے پیش کرنا چاہوں گا۔ پنجاب حکومت نے اس سانحہ کی جوڈیشل انکوائری کے لیے ہائی کورٹ کے ایک محترم اور معزز جسٹس پر مشتمل عدالتی کمیشن قائم کر دیا ہے جو سانحۂ راولپنڈی کے اسباب و عوامل اور اس کے پس پردہ محرکات کا جائزہ لے رہا ہے اور پوری قوم اس کی رپورٹ اور سفارشات کے انتظار میں ہے۔ مگر میں اپنے پیش رو مقررین کی اس بات کی تائید کروں گا کہ اس موقع پر صرف سانحۂ راولپنڈی کے حوالہ سے انکوائری اور سفارشات کافی نہیں ہوں گی بلکہ سنی شیعہ کشیدگی میں مسلسل اضافے اور اس کے خوفناک تصادم کا رنگ اختیار کر جانے کے اسباب و عوامل کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔ کیونکہ بیماری کے اسباب کی تشخیص کے بغیر اس کے علاج کی کوئی صورت کارگر نہیں ہوگی۔ اس لیے میں یہ چاہوں گا اور آپ حضرات کی وساطت سے حکومت پنجاب سے مطالبہ کرتا ہوں کہ عدالتی کمیشن کے دائرہ کار میں پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی میں مسلسل اضافہ اور باہمی تصادم کی خوفناک صورت حال کے اسباب و عوامل اور پس پردہ محرکات کے جائزہ اور سفارشات کو بھی شامل کیا جائے تاکہ ان کو سامنے رکھ کر آئندہ ایسے سانحات کے امکانات کو روکا جا سکے۔

سُنی شیعہ کشیدگی کے اسباب

مجھے ملک کی دینی جدوجہد کے ماحول میں کام کرتے ہوئے نصف صدی ہوگئی ہے اور میں اپنے مشاہدات و تجربات اور احساسات و جذبات کی بنیاد پر پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی اور اس کے اشتعال انگیزی اور تشدد کا رخ اختیار کرنے کے چند اسباب کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ہمارے ہاں ربع صدی قبل تک صورت حال یہ تھی کہ ملک کے کسی حصے میں سنی شیعہ تنازعہ عام طور پر دو میں سے کسی ایک مسئلہ پر کھڑا ہوتا تھا۔

حضرات صحابہ کرامؓ پر تبرّا

ایک یہ کہ حضرات صحابہ کرامؓ میں سے کسی بزرگ شخصیت پر تبرّا کے عنوان سے توہین کی جاتی تھی جو اہلِ سنت کے کسی فرد کے لیے قابل برداشت نہیں ہو سکتی۔ اور یہ یکطرفہ ہی ہوتی ہے اس لیے کہ کوئی سنی جواب میں حضرات اہل بیت کرامؓ میں سے کسی بزرگ کی ادنیٰ ترین اہانت کے بارے میں

سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہمارے تو دونوں بزرگ ہیں، صحابہ کرامؓ اور اہل بیت عظامؓ دونوں ہماری آنکھوں کا نور ہیں۔ اس لیے حضرات صحابہ کرامؓ اور ان میں سے خاص طور پر حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت فاروق اعظمؓ، حضرت عثمان غنیؓ، ام المومنین حضرت عائشہؓ اور امیر المومنین حضرت معاویہؓ میں کسی بزرگ کی توہین پر غصہ اور جذبات کا بھڑکنا ایک فطری بات ہے جس کا یکطرفہ ہونا اس کی شدت اور سنگینی میں اور اضافہ کر دیتا ہے اور بات تنازعہ اور تصادم تک جا پہنچتی ہے۔

ماتمی جلوسوں کی گزرگاہ

دوسرا سبب عام طور پر کسی ماتمی جلوس کا روٹ ہوتا ہے۔ ماتمی جلوس اور اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ایک فریق کے نزدیک بالفرض عبادت ہو تو بھی یہ صورت حال قابل قبول نہیں ہوتی کہ دوسرا فریق جو غالب اکثریت بھی رکھتا ہے، اس کے دروازہ پر یہ عبادت ادا کی جائے۔ گلیوں، بازاروں، مارکیٹوں اور مساجد و مدارس کے سامنے اس کے مظاہرے کو ضروری قرار دے دیا جائے، جبکہ یہ بات تصادم اور خونریزی کا باعث بھی بنتی ہے۔ اس کی ایک سادہ سی مثال ہمارے سامنے ہے کہ پتنگ بازی چونکہ جانوں کے ضیاع کا باعث بنتی ہے اس لیے حکومت نے اس پر پابندی لگا دی ہے اور عدالت عظمیٰ نے بھی اس کا نوٹس لیا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی جلوس بالخصوص خنجر بردار جلوس گلیوں بازاروں اور مارکیٹوں میں گزرتا ہوا امن عامہ کے لیے خطرہ بنتا ہو تو اس کا بھی کوئی جواز نہیں بنتا۔

یہ دو سبب تو شروع سے شیعہ سنی تنازعات کا باعث بنتے آرہے ہیں اس لیے عدالتی کمیشن کو اس کا جائزہ لے کر اس کی روک تھام کے لیے سفارشات پیش کرنی چاہئیں اور حکومت کو اس بدامنی کی روک تھام کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔

فقہ جعفریہ کے نفاذ کا مطالبہ

کشیدگی کے یہ دو سبب تو مقامی اور علاقائی طور پر تنازعات کا باعث بنتے آرہے ہیں اور اب بھی موجود ہیں لیکن سنی شیعہ کشیدگی کو قومی سطح پر لانے میں جس چیز نے کلیدی کردار ادا کیا ہے وہ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ملک میں نفاذِ فقہ جعفریہ کا مطالبہ تھا جس کا قطعی طور پر کوئی جواز نہیں تھا کہ ملک کی غالب اکثریت کے خلاف کسی اقلیتی فقہ کو ملک میں نافذ کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ لیکن ایسا ہوا اور اس کے لیے وفاقی سیکرٹریٹ کا محاصرہ بھی کیا گیا جس نے ملک بھر میں سنی شیعہ تعلقات کی دیوار میں دراڑیں ڈال دیں اور یہ مطالبہ آج تک مسلسل کیا جا رہا ہے۔

نفاذِ فقہ جعفریہ کے مطالبہ اور اس کے ردعمل میں دوسری طرف سے سامنے آنے والی تشدد کی لہر

نے فرقہ وارانہ امن کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے اور اس کے تلخ ثمرات ہم اب تک سمیٹ رہے ہیں۔ عدالتی کمیشن کو اس کا بھی جائزہ لینا چاہیے اور گزشتہ ربع صدی کے دوران دونوں طرف سے جو سینکڑوں جانیں ضائع ہوئی ہیں ان کے اسباب و محرکات کو بے نقاب کر کے ان کے سدباب کے لیے سفارشات پیش کرنی چاہئیں۔

میری یہ گزارشات کسی ایک فریق کے حق میں اور دوسرے کے خلاف نہیں ہیں، بلکہ مجموعی صورت حال پر اپنے تاثرات کا اظہار ہے۔ اس لیے میں اہلِ سنت کے تمام حلقوں، اہلِ تشیع کے سنجیدہ راہ نماؤں اور حکومت کے ذمہ دار حضرات سب کو اس صورت حال پر غور کی دعوت دیتا ہوں۔ کیونکہ اس ساری صورت حال کا حقیقت پسندانہ بنیادوں پر جائزہ لیے بغیر نہ ہم اس کشیدگی کو کم کر سکتے ہیں اور نہ ہی باہمی تصادم کے بڑھتے ہوئے امکانات کو روک سکتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کی سُنی شیعہ کشمکش کا کارڈ

اس کے ساتھ ہی میں اشارتاً ایک چوتھے سبب کا بھی ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مشرقِ وسطیٰ میں سنی شیعہ اختلافات جو رُخ اختیار کرتے جا رہے ہیں اور عالمی استعمار مڈل ایسٹ میں اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے اس کارڈ کو جس ہوشیاری اور مہارت کے ساتھ استعمال کر رہا ہے، پاکستان کی داخلی صورت حال کو اس سے الگ تھلگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ مشرقِ وسطیٰ میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے والی یہ کشمکش مستقبل میں پاکستان پر پہلے سے زیادہ اثرانداز ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔

اس لیے میری تمام فریقوں سے اور ملک کے سنجیدہ مذہبی اور سیاسی راہ نماؤں سے آج کے اس اجتماع کی وساطت سے گزارش ہے کہ وہ ملک کے امن کی خاطر اور قوم کی وحدت کے لیے اس صورت حال کا مجموعی تناظر میں جائزہ لیں اور بیماری کے اسباب کو نظرانداز کرتے چلے جانے کی بجائے ان کی نشاندہی کر کے ان کے سدباب کی حکمت عملی طے کریں۔

آخر میں آج کی گفتگو میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی کو تنہا نہ سمجھا جائے، ملک بھر کے اہل دین اس کی پشت پر ہیں اور ہم کسی قسم کے تحفظات کے بغیر دارالعلوم تعلیم القرآن کے ساتھ کھڑے ہیں۔ حکومت سے یہ عرض کروں گا کہ دارالعلوم تعلیم القرآن کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے یا اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت اسے محض ایک علمی ادارہ اور مرکز تصور نہ کیا جائے، دارالعلوم ہم سب کا ہے اور اس کے وقار اور مفادات کے تحفظ کے لیے ہم سب اس کے ساتھ ہیں۔

شہداء کا مشن جاری رکھنے کی ضرورت

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۶ دسمبر ۲۰۱۳ء

گزشتہ روز مریدکے کی مسجد نمرہ میں اہل السنۃ والجماعۃ (کالعدم سپاہ صحابہؓ) کے زیر اہتمام شہداء دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی اور مولانا شمس الرحمن معاویہ شہیدؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا شمس الرحمن معاویہؒ کے جانشین مولانا اشرف طاہر اور مولانا محمد قاسم گجر کے علاوہ راقم الحروف نے بھی خطاب کیا۔

اس موقع پر میں نے گزارش کی کہ شہداء راولپنڈی اور مولانا شمس الرحمن معاویہؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کی قربانیاں جس مقصد کے لیے ہوئی ہیں اس پر توجہ دی جائے اور ان کے مشن کو جاری رکھنے کی محنت کی جائے۔ میں نے عرض کیا کہ سنی شیعہ کشیدگی کا دائرہ دن بدن پھیلتا جا رہا ہے اور اس کی سنگینی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے حل کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے، میرے خیال میں پاکستان میں سنی شیعہ تنازعات کے اسباب بنیادی طور پر تین ہیں۔

1. کسی جگہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی بزرگ کی توہین اور اس پر رد عمل کے اظہار میں تنازعہ کی صورت بن جاتی ہے۔
2. ماتمی جلوسوں کا کوئی نہ کوئی روٹ جھگڑے کا سبب بن جاتا ہے، اور
3. پاکستان میں فقہ جعفریہ کے نفاذ کی تحریک مستقل طور پر تنازعہ کا سبب بنی ہوئی ہے۔

جبکہ ان تینوں باتوں کو کامن سینس کے حوالہ سے دیکھا جائے تو یہ یکطرفہ زیادتی دکھائی دیتی ہے۔ کسی بھی طبقہ کے بزرگوں کی توہین کسی مذہب کی جائز بنیاد نہیں ہے اور اس پر اصرار بلاوجہ ہٹ دھرمی کی بات ہے۔ کوئی جلوس اگر بالفرض عبادت بھی ہو تو اسے امن عامہ کے بگاڑ کا ذریعہ نہیں ہونا چاہیے اور اسے عبادت سمجھنے والوں کی عبادت گاہوں اور مراکز تک محدود رہنا چاہیے۔ اسی طرح ملک کی غالب اکثریت کے عقائد اور فقہ کے مقابلہ میں ایک اقلیتی فقہ کے نفاذ کے مطالبہ کا بھی کوئی اصولی یا اخلاقی جواز نہیں ہے۔

ان تینوں امور کے حوالہ سے رائے عامہ کو بیدار کرنے اور خاص طور پر رولنگ کلاس کو بریف کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے مستقل فورم قائم ہونا چاہیے اور دینی جماعتوں کو اس طرف سنجیدہ توجہ دینی چاہیے۔ گزشتہ روز حضرت مولانا ظفر احمد قاسم اور حضرت مولانا محمد نواز اس سلسلہ میں مشاورت کے لیے گوجرانوالہ تشریف لائے اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر حضرت مولانا عبد

المجید لدھیانوی دامت برکاتہم سے فون پر بات ہوئی۔ میں نے ان بزرگوں سے گزارش کی ہے کہ اس محاذ پر منظم اور مربوط محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے لیے وفاق المدارس العربیہ اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے اداروں پر ذمہ داری ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم مسلک دینی اور مسلکی جماعتوں بلکہ تمام مکاتبِ فکر کے ذمہ دار حضرات پر مشتمل ایک الگ اور مستقل فورم کا قیام ضروری ہے جو اس جدوجہد کو آگے بڑھا سکے۔

میری تجویز یہ ہے کہ سب سے پہلے سنی محاذ پر کام کرنے والی جماعتوں مثلاً کالعدم سپاہ صحابہؓ، تنظیم اہلِ سنت اور تحریک خدام اہلِ سنت وغیر ذٰلک کو اس مسئلہ پر باہمی مشاورت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ دوسرے مرحلہ پر دیوبندی مسلک کی تمام جماعتوں کا مشاورتی اجلاس ان کی تحریک پر طلب کیا جائے اور پھر اس اجلاس کی عمومی مشاورت کی روشنی میں تمام دینی مکاتبِ فکر کا مشترکہ کنونشن بلا کر پاکستان میں اہلِ سنت کے عقائد و مفادات کے تحفظ اور رفض کی جارحیت کو روکنے کے لیے قومی سطح پر کوئی مضبوط فورم قائم کیا جائے۔

یہ کام بہت ضروری ہے لیکن اس کے لیے طریق کار اور ترجیحات کا صحیح ہونا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ ایک اور بات عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ کسی دوست نے مجھے ایک اخباری خبر کی طرف توجہ دلائی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مولانا زاہد الراشدی نے لال مسجد کے کیس میں بطور گواہ بیان دینے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے، اس کا ایک مرحلہ عدالت کمیشن کے سامنے پیش ہونا تھا، میں اس میں وفاق المدارس العربیہ سے ہٹ کر کمیشن کے سامنے پیش نہیں ہوا، بلکہ وفاق کی قیادت کے بیان کو ہی اپنا بیان قرار دیا تھا۔ جبکہ دوسرا مرحلہ جنرل پرویز مشرف کے خلاف تھانہ آب پارہ اسلام آباد میں درج قتل کیس کا ہے، مجھ سے اس سلسلہ میں دو روز قبل تھانہ آب پارہ کے ایس ایچ او جناب افتخار چٹھہ صاحب نے فون پر بات کی ہے اور میں نے ان سے کہا ہے کہ چونکہ میں لال مسجد کے معاملات میں وفاق المدارس العربیہ کے وفد کے رکن کے طور پر شریک ہوا تھا اس لیے اس سلسلہ میں وہی کروں گا جو وفاق کہے گا، اگر وفاق المدارس کی طرف سے مجھے بیان ریکارڈ کرانے کے لیے کہا جائے گا تو بیان دوں گا ورنہ میری طرف سے معذرت ہے۔ اس لیے اس حوالہ سے کسی اخبار میں شائع ہونے والی مذکورہ خبر ادھوری ہے اور ڈس انفرمیشن کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔

شیعہ سنی کشیدگی کا خاتمہ ممکن ہے!

روزنامہ پاکستان، لاہور --- ۲۳ جنوری ۲۰۱۴ء

جناب محمد الطاف قمر کے خیالات

سنی شیعہ کشیدگی میں اضافے کے حوالے سے جناب محمد الطاف قمر نے اپنے حالیہ مضمون میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ہمیں بھی اتفاق ہے اور یہ ملک کے ہر باشعور شہری کی سوچ ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ اصولی اور نظریاتی باتوں سے تو کسی بھی مکتبِ فکر کے لوگوں کو اختلاف نہیں ہوتا، بات ان کے عملی اطلاق اور الگ تعبیر کی ہے کہ جھگڑے اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور کوئی متوازن قانون یا حکمت عملی نہ ہونے کی وجہ سے یہ جھگڑے اپنی جائز حدود پھلانگ کر پورے معاشرے کے لیے جان لیوا بن جاتے ہیں۔ فتوے دونوں طرف سے یہی ملیں گے کہ بے گناہ شہریوں کا قتل حرام ہے اور معاشرے میں بدامنی پیدا کرنا گناہ کبیرہ ہے، اس لیے ان فتوؤں کی تمام تر اہمیت وافادیت کے باوجود اصل سوال یہ ہے کہ حالیہ کشیدگی کا واقعاتی پس منظر کیا ہے اور اس کے پس پشت کارفرما اندرونی و بیرونی عوامل کیا ہیں؟ اس کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا ضروری ہے کیونکہ اس میں جس قدر تاخیر ہوگی اس کشیدگی میں مسلسل اضافے کا باعث بنے گی۔ اگر حکومت پاکستان یا سپریم کورٹ آف پاکستان سنی شیعہ کشیدگی کی گزشتہ تین دہائیوں سے جاری لہر کے اسباب و محرکات کا جائزہ لینے اور ان کے سدباب کے لیے تجاویز پیش کرنے کی غرض سے ایک آزادانہ اور اعلیٰ سطحی عدالتی کمیشن کا قیام عمل میں لا سکیں تو معاملات کو صحیح رخ پر لانے کی کوئی مثبت راہ بہرحال نظر آنے لگے گی۔

ان گزارشات کے ساتھ محترم محمد الطاف قمر کے ارشادات کی تائید کرتے ہوئے ہم راولپنڈی کی ایک دردمند دل رکھنے والی خاتون غزالہ یاسمین کا ایک خط قارئین کی نذر کر رہے ہیں جس میں انہوں نے اسی مسئلہ پر اپنا دردِ دل پیش کیا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے عام شہریوں کے جذبات اس معاملے میں کیا ہیں اور وہ اپنی مذہبی قیادتوں سے کیا توقع رکھتے ہیں؟

غزالہ یاسمین صاحبہ کا خط

غزالہ یاسمین صاحبہ اپنے اس خط کی اشاعت کی فرمائش کے ساتھ لکھتی ہیں:

”پاکستان کبھی امن و آشتی اور یگانگت کا مظہر تھا۔ اسی قوت کے باعث اس ملک کا

قیام عمل میں آیا تھا۔ لیکن نہ جانے اس ملک کو کس کی نظر لگ گئی کہ اب یہ اختلافات خصوصًا فرقہ وارانہ نوعیت کے اختلافات کی زد میں ہے۔ ذرائع ابلاغ ان اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور یوں پوری دنیا میں اسلام اور پاکستان کی سبکی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اختلافات کو کم کرنے کو اپنا مشن بنالیا ہے۔ یہ لوگ خاموش انداز میں اپنے وسائل استعمال کرتے ہیں اور ان مؤثر شخصیات کو جو اختلافات کو کم کرنے میں کسی طرح بھی اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں، مسلسل قائل کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ ان سے روابط رکھتے ہیں اور ان روابط کو اس کارِ خیر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

قارئین، ناظرین اور سامعین کو مژدہ ہو کہ آج کی اس تحریر میں ایسے ہی تین اشخاص کے ایک مجموعے کو متعارف کرایا جارہا ہے جنھوں نے ۱۰ محرم کو راجہ بازار راولپنڈی کے سانحے کے بعد یہ قسم کھائی کہ وہ اللہ کی رضا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی کے لیے ملک بھر کے علمائے کرام، دانشوروں اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں سے روابط کو بڑھائیں گے اور جو کچھ نقصان راولپنڈی کے سانحے کی وجہ سے اسلام اور پاکستان کی ساکھ کو پہنچا ہے، اسے کم کرنے کی مقدور بھر کوشش کریں گے۔ بڑی مشکل سے ان حضرات نے اس بات کی اجازت دی کہ ان کے ناموں سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ ان تینوں شخصیات کا تعلق کشمیر کے مختلف علاقوں سے ہے۔ ان میں قدر مشترک پاکستان سے ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی محبت ہے۔ وہ اس لیے بھی پاکستان کے دکھ کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کا اپنا وطن غلام ہے اور وہ آزادی کی قدر و قیمت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ شخصیات محمد حنیف خان آف راولا کوٹ آزاد کشمیر، سردار محمد ایوب خان آف باغ آزاد کشمیر اور راجہ محمد امجد خان آف اسکردو گلگت بلتستان حال مقیم راولپنڈی ہیں۔

مختلف مواقع پر ان تین حضرات سے جو ملاقاتیں ہوئیں، ان کی تلخیص کچھ یوں ہے:

محمد حنیف خان آف راولا کوٹ: میں نے سانحہ راولپنڈی کے فورًا بعد متعلقہ علمائے کرام کو فردًا فردًا خطوط لکھے اور ان کے معاملات کو صحیح نہج پر لانے کے ضمن میں ادا کیے گئے کردار کو سراہا۔ یہ خطوط ایک عقیدت مند کے خطوط تھے جو ہر طرح کے اختلافات

سے بلند ہو کر لکھے گئے تھے۔ میری رائے میں علمائے کرام نے مثالی کردار ادا کیا تھا، اس لیے میں نے اپنے خطوط میں انہیں اولیائے کرام کہتے ہوئے بھی باک محسوس نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنے خطوط میں علمائے کرام سے یہ بھی کہا تھا کہ ہم ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جہاں کئی طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ ہندو، سکھ اور عیسائی بھی رہتے ہیں۔ شیعہ بھی رہتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ہزاروں بندے مار کر بھی آخر کار بات چیت کریں گے۔ مولانا صاحب! کچھ کیجیے۔ کسی دن کسی شیعہ لیڈر کے ساتھ مشترکہ پریس کانفرنس کرلیں۔ یقیناً قتل و غارت بند ہو جائے گی۔ روزِ محشر اگر بلند مقام نہ پایا تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مجھے شرمندہ کر دینا۔

سردار محمد ایوب خان: اپنے ملک کے تمام علمائے کرام اور ان کے عقیدت مندوں سے التماس کرتا ہوں کہ مخالفین کو پیار و محبت سے سیدھی راہ پر لایا جائے۔ ہم تو انہیں اپنی ضد پر پکا کر رہے ہیں۔ کیا ہمارے اکابرین اسی طرح تبلیغ کیا کرتے تھے؟ ہمارے اکابرین کون ہیں؟ یقیناً حضرت شاہ ولی اللہ ہیں۔ یقیناً حضرت مہاجر مکی ہیں۔ یقیناً قاری محمد طیب ہیں۔ یقیناً مولانا اشرف علی تھانوی ہیں۔ یقیناً مولانا احمد علی لاہوری ہیں۔ قریب کے زمانے میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا عبد الحق، حضرت مفتی محمود اور حضرت قاضی حسین احمد آخر ہمارے ہی اکابرین میں سے ہیں۔ کیا وہ بھی یوں ہی کیا کرتے تھے جیسے آج کل ہو رہا ہے؟

راجہ محمد امجد خان: ۲۴ دسمبر ۲۰۱۳ کو پورا ملک راولپنڈی پر کان دھرے ہوئے تھا کہ ۱۰ محرم کے المناک سانحے کے بعد راولپنڈی میں چہلم کا جلوس نکلنا تھا۔ ہر طرف خدشات تھے کہ نہ معلوم کیا ہوگا؟ ہر آدمی سوچ رہا تھا کہ کشت و خون ہوگا۔ لیکن ۲۴ دسمبر کو صورت حال بالکل مختلف نظر آئی۔ ہر طرف امن و امان تھا۔ لوگ پر سکون تھے۔ لاکھوں افراد کا جلوس تھا جو راجہ بازار سے گزرا۔ کہیں گملا نہ ٹوٹا۔ راجہ بازار کے تاجر سب سے زیادہ مطمئن تھے کہ ان کا سکون بحال ہو رہا تھا۔ میں بھی سروے کرنے نکلا۔ نماز مغرب مرکزی جامع مسجد اہل حدیث میں ادا کی۔ وہاں یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جلوس میں شامل شیعہ حضرات کی بڑی تعداد نماز ادا کر رہی تھی۔ جامع مسجد اہل حدیث کے منتظمین انہیں ہر طرح سے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ مسجد کے باہر شیعہ خواتین نماز ادا کر رہی تھیں۔ مسجد پر کوئی پہرہ نہ تھا۔ اندر آنے کی اجازت عام تھی،

بالکل عام دنوں کی طرح۔ دیگر مساجد اور مختلف مقامات پر بھی ایسا ہی دیکھا، کوئی تفریق کہیں نظر نہ آئی۔ دل بہت خوش ہوا۔ گزشتہ ۱۰ محرم کو ہونے والا سانحہ بھی نہ ہوتا اگر دونوں طرف کے علماء باہم روابط استوار رکھتے۔ کہیں نہ کہیں روابط کی کمی کے باعث افسوسناک سانحہ ہوا، لیکن بعد میں چہلم کے موقع پر راولپنڈی خصوصًا راجہ بازار کے لوگوں کے مثالی طرزِ عمل کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ آئندہ بھی ہمیشہ ایسی ہی یک جہتی کا مظاہرہ کیا جائے گا۔

یہ ربیع الاول کا مقدس مہینہ ہے جس میں رب العالمین نے پوری کائنات کو رحمۃ للعالمین کی صورت میں ایک عظیم تحفہ عطا فرمایا، وہ ذات بابرکات جس نے انسانوں میں نفرت اور تفرقے کو دفن کر دیا، جس نے انہیں عہدِ جہالت کے اندھیروں سے نکالا، جس نے بادشاہی میں فقیری کی، جس نے فتح مکہ کے موقع پر اپنے بدترین دشمنوں کو امان دی۔ یہ مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ کل جہاں کے لیے رحمت کا مہینہ ہے، اس میں ہمیں اختلافات کو کم از کم سطح پر لانا ہوگا تاکہ ہم رسولِ رحمت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور روزِ قیامت سرخرو ہو سکیں۔

سردار محمد ایوب خان، راجہ محمد حنیف خان اور راجہ محمد امجد خان نے اپنے وسائل سے جو کام کیا اس نے متحارب فریقوں میں محبت اور الفت کا جو پیغام عام کیا ہے اس کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انہیں رسولِ رحمت نبی پاکؐ کی نظر کرم حاصل ہو گئی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد احمد لدھیانوی ہوں کہ مولانا صاحبزادہ حامد رضا، مولانا اشرف علی ہوں کہ مولانا امین شہیدی، تاجروں کے رہنما شرجیل میر ہوں کہ شاہد غفور پراچہ، ہر ایک نے ان تین حضرات کی اخلاص بھری کاوشوں پر بھرپور ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ راولپنڈی مختصر سے عرصے میں ایک بار پھر امن و یگانگت کا مظہر نظر آنے لگا ہے۔ اے کاش ملک کے دیگر لوگ بھی سردار محمد ایوب خان، راجہ محمد حنیف خان اور راجہ محمد امجد خان کے نقش قدم پر چلیں۔ یہی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور میلاد النبیؐ کا حقیقی پیغام ہے۔“

مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ صورتحال اور حضرت شیخ الہندؒ کا نظریہ

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- جولائی ۲۰۱۴ء

شام میں ایک عرصہ سے جاری سنی شیعہ کشمکش میں، جو رفتہ رفتہ شدید عسکری تصادم کی شکل اختیار کر چکی ہے، اب عراق بھی شامل ہو گیا ہے اور آئی ایس آئی ایس (اسلامک اسٹیٹ آف عراق اینڈ سیریا) کے مسلح لشکر کی عراق میں مسلسل پیش قدمی نے ایک بار پھر عالمی قوتوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ عراقی وزیر اعظم نوری المالکی نے امریکہ سے تعاون کی درخواست کی ہے اور بین الاقوامی مبصرین کا کہنا ہے کہ عراق کی تقسیم اور عراق و شام سمیت پورے خطے میں از سرِ نو جغرافیائی رد و بدل کے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ جغرافیائی تقسیم اب سے ایک صدی قبل پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کے ساتھ خلافتِ عثمانیہ کی شکست سے پیدا شدہ حالات میں وجود میں آئی تھی جب فاتح یورپی اقوام نے مشرقِ وسطیٰ میں خلافتِ عثمانیہ کے زیر انتظام علاقوں کا بندوبست سنبھال کر بندر بانٹ کے ذریعے مختلف نئی ریاستوں کی تشکیل کی تھی، جس کے نتیجے میں سعودی عرب، عراق، اردن، فلسطین، اسرائیل اور شام وغیرہ کی نئی جغرافیائی سرحدیں دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئی تھیں۔ جبکہ مغربی استعمار نے اس موقع پر جہاں دنیا بھر کے یہودیوں کو فلسطین میں آباد کر کے ان کی ریاست "اسرائیل" قائم کرنے کی راہ ہموار کی تھی، وہاں اس خطہ میں اپنی معاشی اور عسکری موجودگی بلکہ بالادستی کا مقصد بھی حاصل کر لیا تھا، ورنہ اس سے قبل مشرقِ وسطیٰ کا ایک بڑا حصہ خلافتِ عثمانیہ کے زیر نگیں تھا اور سیاسی مرکزیت و وحدت کی یہ علامت کسی نہ کسی سطح پر قائم چلی آ رہی تھی۔

خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ اور مشرقِ وسطیٰ کی از سر نو جغرافیائی تقسیم نہ صرف عرب دنیا بلکہ پورے عالمِ اسلام کے خلفشار اور اضمحلال کا باعث بنے تھے جس کا خمیازہ اب تک امت مسلمہ بھگت رہی ہے اور خمیازے کی اس دلدل سے نکلنے کا مستقبل قریب میں بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔ شام کے موجودہ صدر بشار الاسد کے والد حافظ الاسد اب سے کم و بیش نصف صدی قبل برسرِ اقتدار آئے تھے تو ان کا ابتدائی تعارف قوم پرست اور سیکولر عرب سیاسی جماعت "بعث پارٹی" کے حوالہ سے تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے ان کے مذہبی عقائد نے اپنا کام دکھانا شروع کیا تو وہاں کی اکثریتی سنی آبادی کو ان سے جبر و زیادتی کی شکایات پیدا ہوئیں۔ حافظ الاسد کا تعلق اہلِ تشیع کے علوی اور نصیری فرقہ سے تھا جو

شیعہ حلقوں میں بھی انتہا پسند سمجھے جاتے ہیں اور بدقسمتی سے شام کی فوج اور بیوروکریسی میں اسی فرقہ کے اثرات کا غلبہ بتایا جاتا ہے جس کا ایک تلخ ثمرہ حافظ الاسد کے دور میں اہلِ سنت کے مذہبی شہر ''حماہ'' پر ریاستی فوجوں کے عسکری آپریشن کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس آپریشن اور اس کے حوالہ سے ملک بھر میں کیے جانے والے کریک ڈاؤن میں دس ہزار کے لگ بھگ سنی علماء اور کارکن شہید ہوئے تھے اور ہمارے شیخ محترم الاستاذ عبد الفتاح ابو غدۃؒ جو اس وقت شام کی اخوان المسلمون کے سربراہ تھے ملک سے جلاوطن ہونا پڑا تھا۔

حافظ الاسد کے بعد ان کے فرزند بشار الاسد برسراقتدار آئے تو ابتدا میں ان کا رویہ اس کشمکش سے لاتعلقی کا تھا لیکن وہ زیادہ دیر تک اپنی پالیسیوں پر لاتعلقی کا یہ پردہ قائم نہیں رکھ سکے اور یہ ان کی فرقہ وارانہ پالیسیوں کا نتیجہ ہے کہ آج شام میں سنی شیعہ کشمکش خانہ جنگی کی صورت اختیار کر چکی ہے اور شام بدامنی کے حوالہ سے دنیا کا سب سے زیادہ خطرناک ملک شمار کیا جانے لگا ہے۔

دوسری طرف عراق میں جھوٹے الزامات کے تحت صدام حسین حکومت کے خلاف مغربی فوجوں کی لشکرکشی اور لاکھوں افراد کے قتل عام کے بعد وہاں امریکہ اور اس کے دیگر اتحادیوں کی سرپرستی میں جو حکومت نوری المالکی کی قیادت میں قائم ہوئی اس کے بارے میں خود امریکہ کی سابق وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کو یہ کہنا پڑا ہے کہ وہ انتہا پسند اور فرقہ پرست شیعہ لیڈر رہیں جنہوں نے فوج اور بیوروکریسی سے چن چن کر سنی افسروں کو نکال دیا ہے اور وہ ملکی معاملات میں سنی عوام کی شرکت کو کسی درجہ میں بھی گوارا نہیں کر رہے۔ ہیلری کلنٹن کا یہ انٹرویو حال ہی میں سامنے آیا ہے جس کے کچھ حصے روزنامہ پاکستان لاہور کی ۲۳ جون ۲۰۱۴ء کے ادارتی صفحہ پر لیفٹیننٹ کرنل غلام جیلانی خان صاحب کے کالم میں مذکور ہیں۔ ہیلری کلنٹن امریکہ کی سابق خاتون اول اور سابق وزیر خارجہ ہیں اور اگلے صدارتی انتخاب کے مضبوط امیدواروں میں شمار کی جارہی ہیں، انہوں نے اس انٹرویو میں کہا ہے کہ عراق میں فوجی مداخلت کے موقع پر انہوں نے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی جو حمایت کی تھی وہ ان کی غلطی تھی اور اب بھی وہ صدر اوبامہ کو عراق میں دوبارہ مداخلت کرنے کا مشورہ نہیں دیں گی۔

عراق سے امریکہ اور اتحادیوں کی فوجوں کے نکلنے کے ساتھ ہی یہ بات عالمی پریس کے تبصروں میں سامنے آنے لگی تھی کہ عراق کو تین حصوں (۱) کرد عراق (۲) شیعہ عراق (۳) سنی عراق میں تقسیم کرنے کا پلان وائٹ ہاؤس میں تشکیل پا گیا ہے اور اس کے لیے راہ ہموار کی جارہی ہے جس کے نتائج اب دکھائی دینے لگے ہیں۔

عراق کی موجودہ صورتحال یہ ہے کہ کرد آبادی خود کو قوم پرست اور سیکولر طور پر پیش کرتی ہے اور

سنی دائرے کو اپنا تعارف بنانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اگر انہیں اس ٹائٹل کے ساتھ الگ شمار کیا جائے تو باقی آبادی میں شیعہ اکثریت ہے اور سنی آبادی اقلیت سمجھی جاتی ہے، اس لیے اگر اس بنیاد پر خدانخواستہ عراق تقسیم ہوتا ہے تو اہلِ سنت کی پوزیشن انتہائی کمزور ہو جائے گی۔ عرصہ ہوا ہم نے ایک عرب دانشور کے کالم میں اس صورتحال کا یہ تجزیہ پڑھا تھا کہ اگر عراق اس پوزیشن میں خدانخواستہ تقسیم ہوتا ہے تو تیل کے علاقے یا کردوں کے پاس ہوں گے یا شیعہ عراق میں ہوں گے، جبکہ سنی ریاست جن تین صوبوں میں قائم ہوگی وہاں تیل نہیں ہے، اس لیے وہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہوگی۔ اس کالم کا عنوان بھی یہ تھا کہ

والسنة علی باب اللہ (سنی اللہ تعالیٰ کے دروازے پر کھڑے ہیں)۔

اس صورتحال میں آئی ایس آئی ایس کے نام سے ایک نئی قوت کی پیشرفت سے بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ عراق اور شام دونوں ملکوں میں ریاستی جبر کا شکار ہونے والے سنیوں نے شاید مشترکہ حکمت عملی اختیار کرنے اور اپنی قوت کو یکجا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ عراق و شام کی موجودہ صورتحال اور مستقبل کے امکانات و خطرات کا یہ صرف ایک پہلو ہے جس کا ہم نے اپنے نقطۂ نظر سے ذکر کیا ہے ورنہ اور بھی بہت سے عوامل ہیں جو مشرقِ وسطیٰ کی مستقبل کی نئی نقشہ گری میں کارفرما ہیں اور ان سے آگاہی حاصل کرنا اس مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

ایک صدی قبل جب پہلی جنگ عظیم کے بعد مشرقِ وسطیٰ جغرافیائی تقسیم کے دور سے گزر رہا تھا تو ہمارے اکابر نے خلافتِ عثمانیہ کے تحفظ اور مسلمانوں کی علمی و فکری راہنمائی کا کردار ادا کیا تھا۔ جو اگرچہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن اکابر علماء دیوبند بالخصوص شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کے قافلہ کی عالمی سوچ اور امت مسلمہ کے اجتماعی مسائل میں ان کی فکرمندی کی علامت کے طور پر ملت اسلامیہ کی تاریخ کے ایک مستقل باب کی حیثیت ضرور اختیار کر چکا ہے۔ ہمارے خیال میں شیخ الہندؒ کی اس سوچ کو دوبارہ متحرک کرنے کی ضرورت ہے اور خود کو مقامی، علاقائی اور معروضی تقاضوں میں محدود رکھنے کی بجائے عالمِ اسلام کے اجتماعی مسائل میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کرنے کے لیے امکانات کی تلاش ہماری ذمہ داری بنتی ہے۔ مگر ہمارا حال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہمارے موجودہ خودساختہ فکری خولوں سے باہر جھانکنے کی بھی کوشش کرتا ہے تو گردن زدنی قرار پایا جاتا ہے، کیا حضرت شیخ الہندؒ کی سوچ اور دائرۂ فکر ہمارے لیے اس قدر اجنبی ہو چکا ہے؟

اسلامک اسٹیٹ آف عراق و شام

روزنامہ اسلام، لاہور ---۳ جولائی ۲۰۱۴ء

''آن لائن'' کی ایک خبر کے مطابق عراق و شام میں سنی مجاہدین کے گروپ نے اپنے مقبوضہ علاقوں میں اسلامی خلافت کے قیام کا اعلان کر دیا ہے۔ ''اسلامک اسٹیٹ آف عراق و شام'' کے نام سے کام کرنے والے ان مجاہدین نے مسلح پیشرفت کرکے عراق اور شام کی سرحد پر دونوں طرف کے بعض علاقوں پر کنٹرول حاصل کر رکھا ہے اور بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا قبضہ ختم کرانے میں عراق اور شام دونوں طرف کی حکومتوں کو کامیابی حاصل نہیں ہو رہی۔ حتیٰ کہ امریکی وزیر خارجہ جان کیری بھی گزشتہ دنوں بغداد کا دورہ کرکے اس سلسلہ میں ایک مشاورت میں شریک ہو چکے ہیں اور عراقی وزیر اعظم نوری المالکی کی درخواست پر امریکہ ان کی امداد کے لیے اقدامات کر رہا ہے۔

اسلامک اسٹیٹ کا پس منظر

''اسلامک اسٹیٹ آف عراق و شام'' کا پس منظر یہ ہے کہ عراق کے وزیر اعظم نوری المالکی اور شام کے صدر بشار الاسد دونوں کا تعلق اہلِ تشیع سے ہے اور دونوں ملکوں کی سنی آبادی کو ان کے جارحانہ اور انتقامی طرزِ عمل کی شکایت ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ کی سابق وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن ایک انٹرویو میں نوری المالکی کے بارے میں کہہ چکی ہیں کہ وہ فرقہ وارانہ تعصب رکھتے ہیں۔ انہوں نے برسر اقتدار آنے کے بعد فوج اور سول انتظامیہ سے سنی افسران کو چن چن کر نکال دیا تھا اور وہ سنی آبادی کو حکومتی معاملات میں شریک کرنے کی سوچ نہیں رکھتے۔ دوسری طرف شام کے صدر بشار الاسد کو ملک کی سنی اکثریت کے خلاف معاندانہ اقدامات اپنے والد حافظ الاسد سے ورثہ میں ملے ہیں اور وہاں یہ کشمکش گزشتہ چار عشروں سے تھوڑے بہت اتار چڑھاؤ کے ساتھ مسلسل جاری ہے۔ جب حافظ الاسد نے سنی علماء اور کارکنوں کے خلاف کریک ڈاؤن کرکے ان کے مضبوط مذہبی گڑھ اور تاریخی بستی ''حماہ'' کو فوجی آپریشن کا نشانہ بنایا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس آپریشن اور کریک ڈاؤن میں دس ہزار کے لگ بھگ سنی علماء اور کارکنوں نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ اور شام کی اخوان المسلمون کے سربراہ الاستاذ عبد الفتاح ابو غدہؒ سمیت سینکڑوں سرکردہ علماء کرام جلاوطنی پر مجبور ہو گئے تھے۔

عراقی وزیر اعظم اور شامی صدر کے لیے عالمی حمایت

موجودہ صورتحال میں نوری المالکی اور بشار الاسد کو نہ صرف ایران کی مکمل حمایت حاصل ہے بلکہ

لبنان کی حزب اللہ اس لڑائی میں ان کے شانہ بشانہ ہے اور عالمی سطح پر روس اور چین کی واضح سپورٹ کے بعد اب امریکہ بھی انہیں بچا لینے کی حکمتِ عملی پر آگیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی عالمی حلقوں میں لگاتار گردش کرنے والی اس خبر پر بھی نظر ڈال لی جائے کہ عراق کو تین حصوں (۱) شیعہ عراق (۲) کرد عراق اور (۳) سنی عراق میں تقسیم کرنے کی تیاریاں آخری مراحل میں داخل ہوگئی ہیں جس کے نتیجے میں سنی عراق صرف تین صوبوں تک محدود ہو کر رہ جائے گا، اور یہ وہ صوبے ہیں جہاں نہ تیل ہے اور نہ ہی انہیں دوسرے وسائل میسر ہیں۔ اور اس طرح ایک عرب صحافی کے بقول عراق کے سنی (السنۃ علی باب اللہ) مستقبل میں اللہ تعالیٰ کے دروازے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

اردن کے شاہ عبداللہ نے کچھ عرصہ قبل کہا تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کے اہلِ سنت شیعہ ہلال کے حصار میں ہیں۔ اور آج یہ بات علاقے کی صورتحال میں واضح عملی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔ اس پس منظر میں شام اور عراق کے سنی مجاہد گروپوں نے اتحاد قائم کر کے دونوں طرف کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا جو سلسلہ کچھ عرصہ سے شروع کر رکھا ہے اس سے یہ بات سمجھ آرہی ہے کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کے جغرافیائی نقشہ کو از سر نو تبدیل کرنے کی عالمی کوششوں میں رکاوٹ ڈالنے کی فکر میں ہیں۔

سقوطِ خلافتِ عثمانیہ اور مشرقِ وسطیٰ کی جغرافیائی تقسیم

اس خطہ کی موجودہ جغرافیائی تقسیم پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کے ساتھ "خلافتِ عثمانیہ" کی شکست وریخت اور اس کے بیشتر علاقوں پر یورپی ممالک کے تسلط کے بعد اس وقت وجود میں آئی تھی جب بین الاقوامی معاہدات کے تحت ترکی کو خلافت کا ٹائٹل ترک کر دینے کی صورت میں اس کی حدود میں محصور کر دیا گیا تھا، اور اس کے بہت سے صوبوں کو نئی سرحدات کے ساتھ آزاد ممالک کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ ورنہ یہ سب علاقے حتیٰ کہ اسرائیل بھی ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کے صوبوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر یورپی قوتوں نے خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے زیر نگیں علاقوں کو اس طرح تقسیم کر دینا بھی ضروری سمجھا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے کام نہ آسکیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے خلاف برسرِپیکار رہیں۔

عالمی استعمار کو ایک صدی کے بعد اپنے مفادات اور تسلط کے تحفظ اور اسرائیل کی بقا کے لیے مشرقِ وسطیٰ کی جغرافیائی سرحدوں کی نئے سرے سے تشکیل کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور اس کے لیے تانے بانے بنے جارہے ہیں۔ عالمی استعمار نے مشرقِ وسطیٰ کی نئی جغرافیائی تقسیم کے ساتھ ساتھ عالمِ اسلام میں خلافتِ اسلامیہ کے قیام اور شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ کو ہر قیمت پر روکنے کو بھی

اپنے ایجنڈے میں شامل کر رکھا ہے۔ کچھ عرصہ قبل برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے، جو وزارت عظمیٰ سے علیحدگی کے بعد سے مغرب کی فکری قیادت کے لیے مسلسل سرگرم ہیں، ایک خطاب میں کہا تھا کہ دنیا میں کہیں بھی خلافت قائم نہیں ہونے دی جائے گی، اور نہ ہی شریعت نافذ ہوگی۔

اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ترکی نے ''معاہدہ لوزان'' میں جب خلافت و شریعت سے دستبرداری اختیار کی تھی اور آئندہ کبھی خلافت و شریعت کو اپنی حدود میں دوبارہ واپس نہ لانے کا یورپی قوتوں سے وعدہ کیا تھا تو اس معاہدے پر دستخط کرنے والے ترک لیڈر مصطفی کمال اتاترک اور عصمت انونو اس کانفرنس میں خلیفہ عثمانی کے نمائندے کے طور پر شریک ہوئے تھے اور اسی حیثیت سے دستخط کیے تھے۔ اس پر بعض مغربی دانشوروں کا کہنا ہے کہ خلافت و شریعت سے مکمل اور مستقل دستبرداری کا یہ معاہدہ عثمانی خلافت کے نمائندے نے کیا تھا جو پورے عالمِ اسلام کی طرف سے تھا۔ اس لیے پوری مسلم امہ اس بات کی پابند ہے کہ وہ خلافت و شریعت سے دستبرداری پر ہمیشہ قائم رہے۔ جبکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عالمِ اسلام میں خلافت کے احیا کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے اور اس کے لیے مسلم ممالک میں بیسیوں تحریکیں کام کر رہی ہیں جن میں سے بعض نے عسکری جدوجہد کا راستہ اختیار کر رکھا ہے، ان کے طریق کار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ بھی خلافتِ اسلامیہ کے احیا و قیام کے لیے مصروف عمل ہیں اور عالمِ اسلام کی ایک اجتماعی دینی و ملی ضرورت کی تکمیل چاہتے ہیں۔

خلافتِ اسلامیہ امتِ مسلمہ کی دینی ضرورت تو ہے ہی، ملی اور عالمی ضرورت بھی ہے کہ عالمِ اسلام اس وقت زخموں سے چور ہے مگر عالمی سطح پر اس کی آواز اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔ جبکہ امتِ مسلمہ پوری کی پوری عالمی استعماری قوتوں کے رحم و کرم پر ہے۔ اس کا اندازہ ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو مرحومہ نے ایک انٹرویو میں عالمِ اسلام کی بے بسی کا ذکر کرتے ہوئے انتہائی حسرت کے ساتھ یہ جملہ کہا تھا کہ ''اب تو کوئی اوتومان ایمپائر (خلافتِ عثمانیہ) بھی نہیں ہے جو عالمی سطح پر مسلمانوں کی آواز اٹھا سکے''۔ اس ساری صورتحال میں سنی ممالک کی حکومتوں کا رویہ کیا ہے اور سنی دنیا کی علمی و فکری قیادتیں کس مزے سے خوابِ خرگوش میں مست ہیں، اس پر یہ شعر ان کی نذر کرنے کو جی چاہ رہا ہے کہ

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

”دولتِ فاطمیہؓ“ کی واپسی کی کوششیں!

روزنامہ اسلام، لاہور---۱۶ اکتوبر ۲۰۱۴ء

اسلام آباد کے دھرنوں کے پاکستان اور اس خطے پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں یہ جاننے کے لیے ابھی انتظار کرنا ہوگا، لیکن یمن کے دارالحکومت صنعا کے گرد حوثی قبائل کا ایک ماہ سے زیادہ جاری رہنے والا ”دھرنا“ کامیاب ہوگیا ہے اور ۱۷ اگست سے شروع ہونے والے اس دھرنے کو ۲۱ اگست کے روز اقوام متحدہ کے ایلچی جمال بن عمر کی نگرانی میں ہونے والے اس معاہدے نے تکمیل تک پہنچا دیا ہے کہ حکومت مستعفی ہوجائے گی اور اس کی جگہ ٹیکنوکریٹ حکومت قائم ہوگی۔ چند سال قبل ”عرب بہار“ کی عوامی یلغار کے بعد علی عبداللہ صالح کا تین عشروں سے زیادہ عرصہ پر محیط دور اقتدار ختم ہونے پر عبد ربہ منصور ہادی کی سربراہی میں نئی حکومت قائم کی گئی تھی جسے حوثی قبائل کی مسلسل اور مسلح یلغار کے باعث مذکورہ معاہدہ کرنا پڑ گیا ہے اور اب یمنی عوام نئی ٹیکنوکریٹ حکومت کی تشکیل کے انتظار میں ہیں۔

حوثی قبائل شمالی یمن میں اکثریت رکھتے ہیں اور یمن کی اڑھائی کروڑ آبادی کا تیس فیصد ہیں۔ حوثی قبائل زیدی شیعہ ہیں جبکہ باقی ستر فیصد آبادی اہلِ سنت شافعی فقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ زیدی خود کو حضرت امام زین العابدینؒ کے فرزند حضرت زیدؒ کا پیروکار کہتے ہیں اور تب سے اپنا مستقل مذہبی تشخص رکھتے ہیں۔ ماضی میں یمن میں زیادہ تر انہی کی حکومت رہی ہے۔ زیدی کہلاتے تو شیعہ ہیں لیکن حضرات صحابہ کرامؓ کی تکفیر نہیں کرتے بلکہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کو بھی جائز مانتے ہیں، البتہ حضرت علیؓ کی تمام صحابہ کرامؓ پر فضیلت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ افضل کی موجودگی میں مفضول کی خلافت بھی جائز ہوتی ہے۔ باقی معاملات میں وہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان ملے جلے عقائد و احکام رکھتے ہیں۔ جبکہ ایران کے دستور میں جہاں اثنا عشری مذہب کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے وہاں زیدیوں کو حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مذاہب کے ساتھ اقلیتی مذاہب میں شمار کیا گیا ہے۔

یمن میں عبد ربہ منصور ہادی کی حکومت کے خلاف، جس میں اخوان سمیت بہت سی جماعتیں شریک ہیں، حوثیوں کی اس مسلح بغاوت میں ایران کی کھلی اور بھرپور سرپرستی حاصل ہے حتٰی کہ یمن کے دارالحکومت صنعا کے محاصرے میں حوثیوں کی مذکورہ کامیابی کے بعد تہران سے ایرانی پارلیمنٹ کے رکن علی رضا زاکانی نے کہا ہے کہ ایران کو تین عرب دارالحکومتوں (۱) بغداد (۲) دمشق (۳) اور بیروت

کے بعد چوتھے دارالحکومت (۴) صنعا پر بھی اختیار حاصل ہو گیا ہے اور اس طرح عرب دنیا میں ایرانی اثر و رسوخ نے ایک نیا رخ اور نئی طاقت حاصل کر لی ہے۔ جس پر کویت کے معروف سنی دانشور ڈاکٹر عبداللہ نفیسی نے حوثیوں کی یلغار کو صفوی یلغار قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا راستہ روکنا صرف یمن کا نہیں بلکہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا دفاع بھی ہو گا۔

ہم ایک عرصہ سے گزارش کر رہے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ میں ''دولتِ فاطمیہ'' کی واپسی کی راہ ہموار کی جا رہی ہے اور اس سلسلہ میں ہر آنے والا دن گزشتہ دن سے زیادہ تشویشناک ثابت ہو رہا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ توجہ کے قابل بات یہ ہے کہ شام کے علوی، یمن کے زیدی اور ایران کے اثنا عشری باہمی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک صف میں محاذ آرا ہیں، حالانکہ ان کے درمیان بنیادی عقائد کے اختلافات اس حد تک موجود ہیں کہ عام حالات میں وہ ایک دوسرے کو اپنے ساتھ شمار کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، لیکن مشرقِ وسطیٰ میں اور خاص طور پر حرمین شریفین کے گرد تسلط قائم کرنے کے لیے وہ پوری طرح متحد اور ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ جبکہ دوسری طرف سعودی عرب کے سلفی اور مصر کے شافعی باہم مل بیٹھنے کو تیار نہیں ہیں اور پاکستان کے اہلِ سنت کو تو ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کے محبوب مشغلہ سے ہی فرصت نہیں ہے۔

یمن میں اقوامِ متحدہ کے زیر نگرانی حوثیوں اور یمنی حکومت کے درمیان طے پانے والے مذکورہ معاہدے کو عرب دنیا کے دانشوروں میں ''سقوطِ یمن'' سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور اس معاہدہ کے اگلے روز حوثیوں نے جو جشن منایا ہے وہ اس سلسلہ میں ان کے مستقبل کے عزائم کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کی یہ سنی شیعہ محاذ آرائی جو اَب وسیع تر خانہ جنگی کا روپ دھار چکی ہے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اردگرد بلکہ اندر بھی اپنے اثر و رسوخ کے دائرے بڑھاتی جا رہی ہے جسے دیکھنے کے لیے محدود ذہنی خولوں سے باہر نکل کر کھلی نظر سے ماحول کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ جبکہ اسے ہم نے اپنے لیے ''شجرِ ممنوعہ'' کا درجہ دے رکھا ہے، مگر کیا شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دے کر ہم خود کو آنے والے طوفان سے محفوظ رکھ سکیں گے؟

دولتِ فاطمیہؓ کیا تھی؟

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۴ء

دولت فاطمیہ کی واپسی کی مبینہ کوششوں کے حوالہ سے عید کے روز شائع ہونے والے میرے کالم پر بہت سے دوستوں نے فون پر تقاضہ کیا ہے کہ دولت فاطمیہ کے بارے میں کچھ معلومات اس کالم

میں فراہم کی جائیں تاکہ ان خطرات کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکے جن کا اظہار اس کالم میں کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کا مختصر سا تعارف پیش خدمت ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؒ کی وفات کے بعد اہلِ تشیع دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ نے ان کے فرزند امام موسیٰ کاظمؒ کو ان کے جانشین کے طور پر امام تسلیم کر لیا۔ اس اکثریتی گروہ نے امام موسیٰ کاظمؒ کے بعد بارہویں امام تک امام حاضر، اور پھر بارہویں امام کے غائب ہو جانے پر ''امام غائب'' کی مسلسل امامت کے ساتھ اثنا عشریہ کا عنوان اختیار کر رکھا ہے۔ جبکہ دوسرے گروہ نے امام جعفر صادقؒ کے بڑے بیٹے امام اسماعیلؒ کو، جو اُن کی زندگی میں ہی وفات پا چکے تھے، ان کا جانشین قرار دیتے ہوئے ان کے فرزند محمدؒ (امام جعفر صادقؒ کے پوتے) کو اپنا امام بنا لیا۔ یہ گروہ اسماعیلی کہلاتا ہے جو آج تک امام حاضر کے تسلسل کے ساتھ دنیا میں موجود ہے۔

عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کے دور خلافت میں شمالی افریقہ میں اسماعیلی گروہ کے عبید اللہ نامی ایک صاحب نے اس دعویٰ کے ساتھ کہ وہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے ہیں اور مہدی موعود ہیں، اس حد تک اثر و رسوخ قائم کر لیا کہ قیروان کے اردگرد علاقوں میں حکومت قائم کر لی، اور مہدیہ کے نام سے ایک نیا شہر بسا کر اسے دارالحکومت قرار دے دیا۔ اس نے ۲۹۷ھ سے ۳۲۲ھ تک اس علاقہ میں حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابوالقاسم قائم بامر اللہ اور پھر اس کا پوتا اسماعیل منصور حکمران بنا۔ پھر اسماعیل کا بیٹا المعزلدین اللہ حکمران ہوا اور اس کے دور میں اس کے کمانڈر جوہر متعلی نے مصر پر قبضہ کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ بتایا جاتا ہے کہ قاہرہ شہر کی بنیاد بھی جوہر نے رکھی جو بعد میں مصر کا دارالحکومت بنا۔ اور عالمِ اسلام کی معروف درسگاہ جامعہ ازہر کا آغاز بھی جوہر کے ہاتھوں ہوا۔ اور پھر پورا مصر کم و بیش دو سو سال تک فاطمی حکومت کا حصہ رہا۔ اس دوران انہوں نے شام اور فلسطین پر بھی قبضہ کیا۔ حتیٰ کہ ایک مرحلہ میں حرمین شریفین بھی ان کے زیر تسلط رہے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے حاکموں نے فاطمی خلفاء کی اطاعت تسلیم کر کے مسجد حرم اور مسجد نبویؐ کے خطبات جمعہ میں ان کا نام پڑھنا شروع کر دیا جو کچھ عرصہ جاری رہا۔ فاطمی حکومت کے ابتدائی تین حکمران امیر کے نام سے حکومت کرتے رہے مگر چوتھے حکمران المعز نے مصر پر قبضہ کر لینے کے بعد خلیفہ کا ٹائٹل اختیار کیا اور عباسی خلفاء کا نام خطبہ سے حذف کر کے فاطمی حکمرانوں کے نام اس میں شامل کرا دیے۔ چنانچہ کم و بیش دو سو سال تک مصر اور دیگر مقبوضہ علاقوں میں جمعہ اور عید کے خطبات میں فاطمی خلفاء کا نام ہی چلتا رہا۔ حتیٰ کہ جب شام کے حکمران سلطان نور الدین زنگیؒ کے کمانڈر صلاح الدین ایوبیؒ نے مصر پر قبضہ کیا اور بعد میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے نام سے متعارف ہوا تو سلطان ایوبیؒ نے

پورے مصر کی مساجد میں خطبات جمعہ میں فاطمی خلفاء کے نام حذف کرا کے دوبارہ عباسی خلفاء کے نام خطبوں میں شامل کرائے۔

مؤرخین بتاتے ہیں کہ المعزاللہ کے دور میں اسماعیلیوں نے جہاں مصر پر قبضہ کیا وہاں وہ سندھ میں ملتان تک جا پہنچے اور ملتان تک کا علاقہ دیبل کی بندرگاہ سمیت ان کی تحویل میں چلا گیا۔ جبکہ اس خطہ میں ان کا زور سلطان محمود غزنویؒ نے توڑا اور ملتان وغیرہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

فیروز سنز لاہور کی شائع کردہ ''تاریخ اسلام'' کے مصنف ڈاکٹر حمید الدین لکھتے ہیں کہ اس حکومت کے فرمانروا مذہب و عقیدہ کے لحاظ سے اسماعیلی شیعہ تھے۔ انہوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی حکومت اسی صورت میں مستحکم رہ سکتی ہے جب کہ رعایا کی اکثریت ان کی ہم عقیدہ ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس خاندان کے ایک وزیر یعقوب نے اسماعیلی معتقدات کے مطابق قانون کی ایک کتاب تیار کی۔ خود یعقوب مسجد میں لوگوں کو اس کا درس دیتا تھا اور جو لوگ اس کتاب کو یاد کرتے تھے۔ انہیں حکومت کی طرف سے انعامات دیے جاتے تھے۔ اس کے برعکس دوسرے مذاہب کی فقہ کا مطالعہ قابل تعزیر قرار دیا۔ چنانچہ ایک شخص کے پاس امام مالک کی مؤطا پائی گئی تو اسے زدوکوب کیا گیا اور سارے شہر میں اس کی تشہیر کی گئی۔ ۱۴۱۱ھ میں جب ظاہر خلیفہ ہوا تو اس نے حکم دیا کہ شیعی فقہاء کے سوا تمام فقہاء نکال دیے جائیں۔

البتہ تعلیمی، صنعتی، اور معاشی ترقی کے حوالہ سے فاطمیوں کا دور مصر کی ترقی وعروج کا زمانہ کہلاتا ہے جس کی سب سے بڑی علامت قاہرہ شہر اور جامعہ ازہر کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ اس پس منظر میں آج کے دور میں مشرقِ وسطیٰ میں زیدیوں، علویوں اور اثنا عشریوں کی سہ طرفہ پیش رفت کیا اس امر کی غمازی نہیں کرتی کہ دولت فاطمیہ کی ایک بار پھر واپسی کی راہ ہموار کی جا رہی ہے؟

پاکستان کو ''سنی ریاست'' قرار دینے کا مطالبہ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۴ء

ہم چار آدمی یعنی مولانا عبد الرؤف فاروقی، مولانا قاری محمد طیب حنفی، حاجی عبد اللطیف خالد چیمہ اور راقم الحروف آج کل اس کوشش میں ہیں کہ سنی شیعہ کشمکش جو صورت حال اختیار کرتی جا رہی ہے اس پر ملک کے عمومی دینی اور مسلکی ماحول میں پائے جانے والے سکوت بلکہ حبس کی کیفیت سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ خاموشی اور بے توجہی درست نہیں ہے اور صورت حال کو پوری طرح سمجھنے کے بعد جدوجہد کی حکمت عملی اور ترجیحات طے کیے بغیر جذباتی اور سطحی رد عمل

اختیار کرنے میں بھی فائدہ کی بجائے نقصان ہے، اس لیے اس سلسلہ میں طویل مشاورت اور غور و خوض کی ضرورت ہے۔

ہماری یہ بھی رائے ہے کہ اس کے لیے کوئی نیا فورم قائم کرنے کی بجائے ۱۹۸۸ء میں اسی حوالہ سے قائم ہونے والے ''متحدہ سنی محاذ'' کو دوبارہ متحرک کیا جائے جو ۱۰، ۱۱ جنوری ۱۹۸۸ء کو شیرانوالہ گیٹ لاہور میں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ کی صدارت میں منعقد ہونے والے دوروزہ قومی سنی کنونشن میں حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ کی سربراہی میں تشکیل پایا تھا۔ اس میں دیوبندی مسلک کی کم وبیش تمام جماعتیں شریک تھیں۔ اور اس میں اس وقت کے حالات کی روشنی میں موقف اور مطالبات طے کیے گئے تھے اور روزنامہ اسلام کے زیر نظر کالم میں ۷ مارچ ۲۰۱۳ء کو شائع ہو چکے ہیں۔

جبکہ اس سے قبل ۱۹۷۳ء میں اس وقت کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو ایک ہزار سنی علماء کرام کی طرف سے ''سنی مطالبات'' کے عنوان سے ایک عرضداشت پیش کی گئی تھی جو تحریک خدام اہلِ سنت پاکستان کے امیر حضرت قاضی مظہر حسین نور اللہ مرقدہ نے اس وقت کے حالات کے تناظر میں تحریر فرمائی تھی۔ اور اس پر مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا عبد الحقؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا مفتی محمد حسین نعیمیؒ، مولانا حافظ عبد القادر روپڑیؒ، مولانا عبد الستار تونسویؒ، مولانا سید حامد میاںؒ، مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، ڈاکٹر اسرار احمدؒ، مولانا محمد اجمل خانؒ، مولانا عزیز الرحمن جالندھری، مولانا تاج محمودؒ، اور مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ سمیت تمام سنی مکاتبِ فکر کے ایک ہزار کے لگ بھگ علماء کرام نے دستخط کیے تھے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ان دونوں متفقہ دستاویزات کو آئندہ جدوجہد کی بنیاد بنایا جائے اور پاکستان کو دستوری طور پر ''سنی ریاست'' قرار دینے کے مطالبہ کے ساتھ منظم محنت کا آغاز کیا جائے۔ عاشورہ محرم الحرام کے بعد اس سلسلہ میں وسیع مشاورت کا اہتمام کیا جا رہا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ سردست ۱۹۷۳ء کی مذکورہ متفقہ یادداشت کا متن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جو اس وقت تحریک خدام اہلِ سنت کے چکوال کے دفتر نے کتابچہ کی صورت میں ایک ہزار علماء کرام کے ناموں کے ساتھ شائع کیا تھا:

متفقہ یادداشت

بخدمت جناب ذوالفقار علی بھٹو، وزیر اعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان۔

سلام مسنون! عرض آنکہ پاکستان میں سنی مسلمانوں کی بہت غالب اکثریت پائی جاتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کے قریباً ۲۵ سالہ طویل دور میں اصحاب اقتدار عموماً اقلیتی فرقوں کی ناحق دلجوئی اور ناز برداری کی خاطر، بلکہ اپنے مخصوص شخصی اور سیاسی مصالح و

مفادات کے تحت سنی اکثریت کے حقوق کو نظر انداز بلکہ پامال کرتے رہے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں یہ عظیم اسلامی شاندار تاریخی کارناموں کی وارث قوم (سنی مسلمان) ہر پہلو سے انتہائی پستی اور بدحالی میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اب چونکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا جدید آئین منظور ہو کر ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء سے نافذ ہو چکا ہے۔ اس لیے سوادِ اعظم (مسلمانان اہل السنت والجماعت) کے ملکی اور ملی حقوق کے تحفظ کی خاطر ہم بعض اہم مطالبات پیش خدمت کر رہے ہیں، جو درج ذیل ہیں:۔

مطالبہ نمبرا: متعلقہ نصاب دینیات

(ا) سرکاری یا نیم سرکاری تعلیمی اداروں کے نصاب دینیات میں صرف سنی عقائد و احکام پر مشتمل دینیات کی تعلیم نافذ کی جائے جو بحیثیت اکثریت ان کا اسلامی اور جمہوری حق ہے۔ اور جو دوسرے جمہوری ممالک کے مروّجہ دساتیر اور تعامل سے بھی ظاہر ہے۔ مثلاً آئرلینڈ کے دستور میں یہ الفاظ موجود ہیں:

> ”مملکت وہاں کے شہریوں کی غالب اکثریت کے عقیدہ کے محافظ کے طور پر اپاسٹامک اور رومن چرچ کی خاص حیثیت تسلیم کرتی ہے“۔

اسی طرح ناروے کی دستوریہ میں درج ہے کہ

> ”ایونیجبلیکل لوتھرن مذہب مملکت کا پبلک مذہب رہے گا۔ اس مذہب کے پیروکاروں کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش اسی مذہب کے مطابق کریں۔ جینورٹس کو برداشت نہیں کیا جائے گا، بادشاہ ہمیشہ ایونیجبلیکل لوتھرن مذہب کا پیرو ہوگا۔“

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی ۱۱ مئی ۱۹۷۳ء)

اور خصوصاً اپنے پڑوسی ملک ایران کے نصاب تعلیم کی مثال بھی ہمارے لیے زبردست حجت ہے۔ کیونکہ وہاں حکومت کی طرف سے سرکاری تعلیمی اداروں میں صرف شیعہ اثناعشریہ کی دینیات کی تعلیم کا انتظام ہے۔ سنی دینیات کو نصاب تعلیم میں شامل نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا پاکستان کے تعلیمی نصاب میں بھی صرف سنی اکثریت کی دینیات کا نفاذ ہونا چاہیے۔ نہ یہ کہ شیعہ اقلیت کو سنی اکثریت کے مساوی درجہ دے دیا جائے۔

(۲) سنی دینیات کا انتظام حکومت کی طرف سے اہلِ سنت کے علمائے محققین کے مشورہ سے کیا جائے جس میں عقیدہ ختم نبوت اور کمالات رسالت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کے علاوہ رحمت للعالمین، خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض یافتہ مقدس جماعت (صحابہ کرامؓ)

کے حالات، بالخصوص خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان ذوالنورینؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ۔ ازواج مطہرات حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، اور حضرت حفصہؓ وغیرہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک صاحبزادوں حضرت قاسمؓ، طاہرؓ، طیبؓ، اور بنات رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ، اور خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا تذکرہ، تعلیم کا ضروری جز ہونا چاہیے۔ اور سنی دینیات کے معلّم بھی صرف سنی اساتذہ ہونے چاہئیں۔

(۳) شیعہ وغیرہ اقلیتی فرقوں کو آئین پاکستان کی حسب ذیل دفعہ کے تحت ان کے مخصوص مذہبی اداروں میں ان کی مذہبی تعلیم کا حق دیا جاسکتا ہے کہ

> ''کسی مخصوص مذہبی گروہ کو اس گروہ کے طلبہ کے لیے مذہبی تعلیم کا بندوبست کرنے کی اجازت ہوگی اور انہیں اس سلسلے میں منع نہیں کیا جا سکے گا۔ اور وہ اپنے قائم کردہ تعلیمی اداروں میں ایسا کرنے کے لیے بالکل آزاد ہوں گے۔'' (آئین پاکستان دفعہ ۲۲ شق ۳ نمبر ا)

اور آئین کی مندرجہ شق سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں اکثریت کی دینیات کا انتظام ہوگا۔ اور اقلیتی فرقے اپنے اپنے مخصوص اداروں میں اپنی مذہبی تعلیمات کا انتظام کرنے کے مجاز ہوسکتے ہیں۔

(۴) شیعہ اقلیتی فرقہ کی طرف سے ان دنوں میں پھر یہ مطالبہ کیا جارہا ہے: (ا) کراچی کے اجلاس منعقد ۳۰ ستمبر ۱۹۷۲ء میں ''سنی شیعہ نصاب کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق سنی شیعہ مشترکہ نصاب نافذ کیا جائے۔'' (ب) ''اس مشترکہ نصاب کے مرتب ہونے تک ۱۹۷۰ء میں بارہ رکنی بورڈ کی منظور کردہ دینیات کی کتابیں پڑھانے کا حکم دیا جائے۔''

حالانکہ نصاب تعلیم کی یہ دونوں صورتیں اہلِ سنت کے اسلامی اور جمہوری حقوق کے خلاف ہیں۔ علاوہ ازیں اس سلسلہ میں یہ بھی گزارش ہے کہ کراچی کے اجلاس منعقدہ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۲ء میں سنی شیعہ نصاب کمیٹی نے جو یہ فیصلہ کیا ہے کہ ''سنی و شیعی عقائد و عبادات کے ابواب تو جدا جدا ہوں گے، لیکن دینیات کی کتاب ایک ہوگی، کلاس بھی ایک ہوگی، استاد بھی ایک ہوگا، اور امتحان بھی ایک ہوگا۔''

یہ ایک مضحکہ خیز تجویز ہے جو اہلِ سنت کے لیے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ

ا۔ مشترکہ نصاب کی اس مجوزہ صورت میں شیعہ اقلیتی فرقہ کو سنی غالب اکثریت کے ساتھ مساوی درجہ پر رکھا گیا ہے۔

۲۔ مجوزہ صورت میں استاذ اور کلاس ایک ہونے کی وجہ سے سنی اساتذہ پر اپنے عقیدہ وایمان کے خلاف دینیات کی تعلیم لازمی قرار پاتی ہے، اسی طرح سنی طلبہ کو ایک ہی کلاس میں شیعہ دینیات پڑھنی پڑے گی اور بلا ضرورت اپنے عقیدہ و ایمان کے خلاف کسی دوسرے مذہب کی تعلیمات چونکہ ناقابل برداشت ہوتی ہیں، اس لیے اس سے تعلیم و تعلم کا اصلی مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔

۳۔ علاوہ ازیں نصاب تعلیم کی مروجہ صورت آئین پاکستان کی حسب ذیل دفعہ کے تحت بے اثر اور کالعدم ہوجاتی ہے کہ

"کسی شخص کو جو کسی تعلیمی ادارے میں زیر تعلیم ہو ایسی مذہبی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکے گا، اور نہ کسی مذہبی رسم میں شرکت کے لیے کہا جائے گا، نہ مذہبی عبادت کرنا ہوگی، اگر یہ ہدایات اس کے اپنے مذہب کی بجائے کسی اور مذہب سے متعلق ہوں۔" (دفعہ ۲۲ نمبرا)

اسی طرح متبادل صورت میں شیعہ کا یہ مطالبہ بھی مسترد کردینا چاہیے کہ ۱۹۷ء کے بارہ رکنی بورڈ کی منظور کردہ دینیات کی کتابیں پڑھانے کا حکم دیا جائے"۔ کیونکہ جب سرکاری تعلیمی اداروں میں جمہوری اصول کے تحت صرف سنی اکثریت کی دینیات کا نفاذ ضروری ہے تو پھر شیعہ دینیات کے داخل نصاب ہونے کا مسئلہ ہی ختم ہوجاتا ہے۔

(۵) شیعہ دینیات کا مطالبہ اس لیے بھی قابل قبول نہیں ہوسکتا کہ سنی عقائدِ اصول اور شیعی عقائدِ اصول میں تضاد پایا جاتا ہے۔ چنانچہ سنی دینیات میں جن امور کا اثبات ضروری ہے، شیعہ دینیات میں ان میں سے اکثر امور کی نفی پائی جاتی ہے۔ مثلاً سنی دینیات میں خلفائے راشدین حضرت ابوبکرؓ صدیق، حضرت عمرؓ فاروق، حضرت عثمانؓ ذوالنورین اور حضرت علیؓ المرتضیٰ کو بالترتیب برحق خلفاء تسلیم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس کے برعکس شیعہ دینیات میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بلا فصل ماننا ان کے ایمان کی بنیاد ہے اور ان کی اذان میں بھی حضرت علی المرتضیٰؓ کے لیے خلیفۂ بلافصل کے الفاظ ادا کیے جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی ہی خلیفہ برحق ہیں۔ اور نعوذ باللہ خلفائے ثلٰثہ حضرت ابوبکرؓ صدیق، حضرت عمرؓ فاروق، اور حضرت عثمانؓ ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضرت علیؓ کی خلافت کو غصب کرنے والے ہیں، اور کسی درجہ میں بھی ان کے نزدیک برحق خلیفہ نہیں ہیں۔ تو کیا حکومت کے لیے ان دونوں متضاد عقائد و نظریات کی سرپرستی تعلیمی اداروں میں جائز اور معقول ہوسکتی ہے؟

(۶) سنی شیعہ مشترک نصاب ہو یا جداگانہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں متضاد و متخالف عقائد و نظریات کی تعلیم کی بنا پر سنی و شیعہ طلبہ میں مذہبی مباحثات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا جس سے اساتذہ بھی متاثر ہوں گے اور تعلیمی نظام میں انتشار پیدا ہو کر فرقہ وارانہ فساد و منافرت کا باعث بن جائے گا۔

(۷) اگر شیعہ اقلیتی فرقہ کی دینیات کو کسی صورت میں بھی داخل نصاب ہونے کا حق دیا جائے تو اس کے بعد مرزائی، عیسائی اور ہنود تک مذہبی اقلیتوں کو بھی ان کی دینیات کو داخل نصاب کرنے کا حق دینا پڑے گا۔ جس کی وجہ سے خود حکومت سخت مشکلات میں مبتلا ہو جائے گی۔ لہٰذا مذکورہ وجوہات کی بنا پر ہمارا یہ مبنی بر حق مطالبہ ہے کہ سنی اکثریت کے اسلامی اور جمہوری حقوق کے پیش نظر سرکاری تعلیمی اداروں میں صرف سوادِ اعظم اہلِ سنت کی دینیات کو ہی داخل نصاب کیا جائے اور شیعہ اقلیتی فرقہ کی طرف سے ان کی دینیات کو داخلِ نصاب کرنے کے مطالبات کو مسترد کر کے اہلِ سنت کی عظیم اکثریت کو مطمئن کیا جائے۔

مطالبہ نمبر ۲: متعلقہ ماتمی جلوس شیعہ

شیعہ اقلیتی فرقہ کے ماتمی جلوسوں پر پابندی لگا دی جائے اور ان کے مخصوص مذہبی رسوم و شعائر کی ادائیگی کو ان کے امام باڑوں اور ان کی عبادت گاہوں میں محدود کر دیا جائے۔ کیونکہ

(۱) حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے سلسلہ میں شیعوں کے جو ماتمی جلوس نکالے جاتے ہیں وہ مذہب شیعہ کے اصول کے تحت بھی عبادت میں شمار نہیں ہو سکتے۔ اور اگر وہ ان کو عبادت قرار دینے پر مصر ہیں تو عبادت کے لیے ان کو اپنی عبادت گاہیں استعمال کرنی چاہئیں نہ کہ عام شاہراہیں اور گلی کوچے۔

(۲) مروجہ ماتمی جلوس سوادِ اعظم اہلِ سنت کے عقیدہ کے تحت ناجائز اور حرام ہیں۔ لہٰذا اقلیتی فرقہ کو یہ حق نہیں ملنا چاہیے کہ ان کے ایسے مذہبی رسوم و مظاہر جو سنی سوادِ اعظم کے نزدیک ناجائز ہیں، اہلِ سنت کے گھروں کے سامنے، ان کی مساجد اور ان کے دینی مدارس کے سامنے، ان کی گلی کوچوں میں ادا کیے جائیں۔ یہ طریق عبادت صریح اشتعال انگیزی پر مبنی ہے جس کی وجہ سے دن بدن باہمی منافرت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور باوجود سنی مسلمانوں کے صبر و تحمل کے ہر سال محرم و چہلم کے ماتمی جلوسوں کی وجہ سے متعدّد مقامات پر فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اسی بنا پر ایران جیسے ملک میں بھی شیعی ماتمی جلوسوں کی اس طرح اجازت نہیں ہے۔ حالانکہ وہاں کا سرکاری مذہب شیعہ اثنا عشری ہے۔ لہٰذا اسلامی اور جمہوری حقوق کے تحفظ کی خاطر ہمارا یہ پرزور مطالبہ ہے کہ ماتمی جلوسوں

کے سابقہ لائسنس بالکل منسوخ کر دیے جائیں، تاکہ ان ماتمی جلوسوں کی بنا پر جو فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوتے رہتے ہیں، ان کا بالکلیہ انسداد ہو سکے۔

مطالبہ نمبر ۳: سنی اوقاف بورڈ

اہلِ سنت کے اوقاف کے لیے علیحدہ سنی اوقاف بورڈ قائم کر دیا جائے اور سنی اوقاف کی آمدنی شرعی ضوابط کے تحت سنی مفادات پر صرف کی جائے اور ان کی نگرانی اور انتظام کے لیے بھی صرف سنی افسران متعیّن کیے جائیں۔

مطالبہ نمبر ۴: متعلقہ نشریات ریڈیو و ٹیلی ویژن

(۱) ریڈیو اور ٹیلی ویژن بہترین ذرائع ابلاغ ہیں، لیکن عام طور پر ان کے ذریعے جو گانے بجانے وغیرہ کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں، وہ ساری قوم کے لیے عموماً، اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے خصوصًا مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے تباہ کن ثابت ہو رہے ہیں، اور اب جبکہ آئینِ پاکستان میں یہ دفعہ رکھ دی گئی ہے:

> "پاکستان کے مسلمانوں کو اس قابل بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگیوں کو اسلام کے بنیادی نظریے اور اصولوں کے مطابق ڈھال لیں، اور قرآن پاک اور سنت نبویؐ کے روشنی میں زندگی کے مطالب کو اچھی طرح سمجھ لیں"۔ (آئین دفعہ ۳۱)

اسلامی طرز زندگی اس بنا پر ضروری ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ کتاب و سنت کے خلاف ان مخرب اخلاق پروگراموں پر بالکل پابندی لگا دی جائے تاکہ پاکستان کے نوجوان مسلمان طاؤس و رباب کی بجائے شمشیر و سناں ہاتھ میں لے سکیں۔

(۲) ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر جو مذہبی اور تبلیغی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں وہ عموماً شیعہ اقلیتی فرقے کے عقائد و نظریات کے تحت ہوتے ہیں اور خصوصًا محرم اور چہلم کی نشریات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان ایک شیعہ اسٹیٹ ہے۔ سوادِ اعظم اہلِ سنت کے عقائد کے خلاف شہادت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر شامِ غریباں کے پروگرام اور ماتم اور سینہ کوبی اور ذوالجناح اور زنجیر زنی کے مناظر بذریعہ ٹیلی ویژن دکھائے جاتے ہیں، جو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آئمہ اہل بیت کے ارشادات و اعمال کے بھی خلاف ہیں۔ اہلِ سنت کے جذبات ان کے ذریعہ مجروح کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا یہ اہم مطالبہ ہے کہ شیعہ اقلیتی فرقہ کے ان پروگراموں پر بالکل پابندی لگا دی جائے۔

(۳) ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ جہاں شیر خدا حضرت علیؓ المرتضیٰ، حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے فضائل و مناقب نشر کیے جاتے ہیں وہاں دیگر خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ فاروق اور حضرت عثمانؓ ذوالنورین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر اصحاب مثلاً سیف اللہ حضرت خالد بن ولیدؓ، فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ، امین امت حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ، کاتب وحی حضرت امیر معاویہؓ وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے حالات و کمالات کو بھی قوم کے سامنے پیش کیا جائے، جنہوں نے محبوب خدا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست فیضان حاصل کیا اور رضائے الٰہی کی قرآنی سند حاصل کی۔ جو رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک ما انا علیہ واصحابی کے تحت مابعد کی امت کے لیے معیار حق ہیں۔ جن کی تاریخی جانبازیوں اور مجاہدانہ قربانی سے طاغوتی طاقتیں سرنگوں ہوئیں۔ قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا ہوا، روم و ایران مفتوح ہوئے، پرچم اسلام بلند ہوا، نور توحید سے بر و بحر روشن ہوئے، اور جن کے ذریعہ قرآن حکیم کی عظیم پیشگوئی ''غلبہ اسلام'' تکمیل پذیر ہوئی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

(۴) جملہ اصحاب و اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و ناموس کو قانونی تحفظ دیا جائے، اور جو شخص کسی صحابی کی بھی توہین کا مرتکب ہو اس کو عبرت ناک سزا دی جائے۔

مطالبہ نمبر ۵: متعلقہ مسئلہ ختم نبوت

کتاب اللہ، ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تعامل صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی روشنی میں تمام امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔ اگر کوئی آدمی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والا نبوت و رسالت کا دعویٰ کرے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج اور قطعی کافر ہے اور اس کو ماننے والے بھی قطعی کافر ہیں۔ اسی بنا پر فرنگی دور کے مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کو تمام علمائے امت نے کافر قرار دیا ہے۔ اور اس کو نبی یا مجدد ماننے کو بھی کافر کہا ہے۔

علاوہ ازیں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین جدید میں بھی صدر مملکت اور وزیر اعظم کے حلف نامہ میں عقیدہ ختم نبوت کو بایں الفاظ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ:

> ''میں قسم کھاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں، اور خدا پر میرا یقین کامل ہے، اور اس کی کتاب قرآن پاک پر جو کہ آخری کتاب ہے، آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر (جن پر

خدا کی رحمت ہو) جن کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا، قیامت کے دن پر، رسول کی سنت و حدیث پر، قرآن پاک کے احکامات پر"۔ (آئین پاکستان تیسری شیڈول حلف صدر دفعہ ۴۲)

لیکن باوجود اس کے مرزائی گروہ کے افراد اسلام کے نام پر ملک کی اہم کلیدی آسامیوں پر متمکّن ہیں اور اس وجہ سے عروج و اقتدار حاصل کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ مذہبی اور سیاسی اعتبار سے کسی طرح بھی اسلام اور پاکستان کے وفادار نہیں بن سکتے۔ آزاد کشمیر اسمبلی کے حالیہ اس فیصلے کے رد عمل میں کہ "مرزائی غیر مسلم اقلیت ہیں" مرزائیوں کی طرف سے شائع کردہ ٹریکٹ بعنوان "احمدیوں کے بارے میں آزاد کشمیر اسمبلی کی قرارداد تجزیہ اور حقیقت حال" اور ربوہ کے ڈکٹیٹر مرزا ناصر احمد کے مطبوعہ خطبہ روزنامہ "الفضل" مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۷۳ء میں انہوں نے اپنے ناپاک عزائم کو آشکارا کر دیا ہے۔ اور ۲۵ لاکھ مسلح مرزائیوں کی طاقت کے بل بوتے پر خونی انقلاب لانے کی دھمکی بھی دے دی ہے۔ اس بنا پر مرزائیت کے بارے میں ہمارا یہ کم از کم بنیادی مطالبہ ہے کہ:

(۱) مرزائیوں کو صراحتاً غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

(۲) ان کو کلیدی آسامیوں سے فوری طور پر ہٹا دیا جائے۔

(۳) مرزا ناصر کے خطبہ اور مذکورہ ٹریکٹ کو ضبط کر کے ان کے خلاف سخت کاروائی کی جائے، اور ملک و ملت کے خلاف مرزائیوں کے ناپاک عزائم اور ان کی گہری سازشوں کا بالکلیہ سدباب کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ پاکستان اور مسلمانانِ پاکستان کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی شر سے محفوظ رکھیں اور دینِ اسلام کو غلبہ عطا فرمائیں، آمین، والسلام۔

دینی جدوجہد کے لیے متفقہ ۸ نکات

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۷ نومبر ۲۰۱۴ء

...... علمائے دیوبند کی جماعتوں، حلقوں اور مراکز کے درمیان رابطہ و اشتراک عمل کے لیے ۱۸ نومبر کو اسلام آباد میں حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر دامت برکاتہم کی سربراہی میں سپریم کونسل اور حافظ سید عطاء المومن شاہ بخاری کی سربراہی میں رابطہ کمیٹی کے قیام کے اعلان کے بعد سے ملک بھر سے احباب مسلسل پوچھ رہے ہیں کہ یہ تو بہت اچھا ہو گیا ہے اور ہمیں اس کا شدت سے انتظار تھا مگر اب کرنا کیا ہے اور خاص طور پر علاقائی اور مقامی سطح پر علماء کرام اور کارکنوں کو کس انداز سے کام کرنا

چاہیے؟ اس کے بارے میں دو تین گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ایک یہ کہ اسلام آباد کے اجتماع میں مشترکہ جدوجہد کے لیے جو اہداف طے پائے ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی جائے۔ یہ رسمی امور نہیں ہیں بلکہ طویل مشاورت اور غور و خوض کے بعد ان کا تعین کیا گیا ہے۔ ان سے ہر ایک کو واقف ہونا اور ان کے مطابق اپنے منتشر فکر و عمل کو مجتمع کرنا ضروری ہے۔ یہ بات اس لیے بھی عرض کر رہا ہوں کہ چند سال قبل جامعہ اشرفیہ لاہور میں دیوبندی جماعتوں اور مراکز کا اس سے بڑا اور بھرپور نمائندہ اجتماع ہوا تھا اور کئی نشستوں کے مباحثے اور غور و خوض کے بعد ایک اعلامیہ متفقہ طور پر طے پایا تھا جسے ملک بھر میں ایک "متوازن اور جامع اعلامیہ" کے طور پر سراہا گیا تھا مگر اس کی ایک بار اشاعت کے بعد ہم اسے بھول ہی گئے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے بیشتر دینی جرائد نے بھی اس کی اشاعت کی ضرورت محسوس نہیں کی جس کی وجہ سے اس بھرپور اجتماع کے ثمرات و فوائد دیرپا ثابت نہیں ہوئے۔ اس لیے ہمارے خیال میں یہ سب سے زیادہ ضروری ہے کہ تبلیغی جماعت کے چھ نمبروں کی طرح ان آٹھ نکات کی بھی بار بار اور ہر سطح پر تشہیر کی جائے اور ہر ایک کو ذہن نشین کرا دیا جائے کہ اس کی آئندہ جدوجہد کا دائرہ یہ آٹھ نکات ہیں:

1. پاکستان کے اسلامی تشخص کا تحفظ اور اسلامی نظام کا نفاذ۔
2. قومی خود مختاری اور ملکی سالمیت و وحدت کا تحفظ، امریکہ اور دیگر طاغوتی قوتوں کے سیاسی اور معاشی غلبہ و تسلط سے نجات۔
3. ۱۹۷۳ء کے دستور بالخصوص اسلامی دفعات کی عملداری۔
4. تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالت کے قوانین اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر عملدرآمد کی جدوجہد۔
5. مقام اہل بیت عظام و صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تحفظ۔
6. قومی تعلیمی نصاب میں غیر ملکی (خلافِ شریعت) کلچر کے فروغ کی مذمت اور روک تھام۔
7. فحاشی و عریانی اور مغربی کلچر کے فروغ کی مذمت اور روک تھام۔
8. ملک میں فرقہ وارانہ نفرت انگیزی بالخصوص سنی شیعہ اختلافات کو فسادات کی صورت اختیار کرنے سے روکنا۔

ہمارے خیال میں سپریم کونسل میں شامل جماعتوں کے نام، ان کے سربراہوں کے اسماء گرامی، رابطہ کمیٹی کے ارکان کے نام اور مذکورہ بالا آٹھ نکات ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع کر کے اس کی ملک بھر میں ہر سطح پر تشہیر کی جائے اور تمام دینی جرائد اسے شائع کر دیں تو یہ مقصد کسی حد تک پورا ہو سکتا

ہے۔......

باہمی اختلافات اور تعاملِ صحابہؓ

روزنامہ اسلام، لاہور---۱۵ دسمبر ۲۰۱۴ء

۹ دسمبر کو عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی دفتر ملتان میں مجلس علماء اسلام پاکستان کی سپریم کونسل کے منعقدہ اجلاس میں اکثر جماعتوں کے صف اول کے راہنما شریک ہوئے اور خطاب کیا۔ ان میں سے حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر اور مولانا حافظ سید عطاء المومن شاہ بخاری کے خطابات چونکہ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب محترم نے ہم مسلک دینی و سیاسی جماعتوں کے اتحاد پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے وقت کی اہم ضرورت قرار دیا اور فرمایا کہ اتحاد میں برکت ہے۔ جبکہ افتراق و خلاف میں ہمیشہ نقصان ہوتا ہے۔ انہوں نے حضرت امام حسنؓ کے ایک ارشاد کا حوالہ دیا کہ جب انہوں نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ صلح کی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے امت کو ایک بار پھر متحد کر دیا تو اس پر پوری امت میں اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ اور اس سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیش گوئی بھی پوری ہوئی جو حضرت امام حسنؓ کے بارے میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھی۔ اس سال کو عام الجماعۃ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور یہ حضرت امام حسنؓ کا عظیم کارنامہ شمار ہوتا ہے۔ مگر اعتراض کرنے والے بھی ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے اس صلح کے بعد حضرت امام حسنؓ کو یا مذل المؤمنین (اے مسلمانوں کو ذلیل کرنے والے) کہہ کر خطاب کیا تو حضرت حسنؓ نے جواب میں فرمایا کہ میں مذل المؤمنین نہیں بلکہ معز المسلمین ہوں۔ یعنی مسلمانوں کی عزت کو بحال کرنے والا ہوں۔ اس لیے کہ اتحاد اور یکجہتی سے امت کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے جبکہ الخلاف شرّ یعنی افتراق و خلاف سراسر شر ہوتا ہے۔ پھر حضرت امام حسنؓ نے فرمایا کہ تمہیں خلاف و تفرقہ میں جو فائدہ دکھائی دیتا ہے، اتحاد و اتفاق کے فوائد اس سے کہیں زیادہ ہیں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب نے علمی و فقہی اختلاف کو اس کی حدود میں رکھنے کی ضرورت پر زور دیا اور اس کے حوالہ سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ کا ذکر کیا کہ انہوں نے اپنی خلافت کے آخری دور میں حج کے دوران منیٰ میں قصر ترک کر کے ظہر اور عصر کی نماز پوری پڑھنی شروع کر دی۔ جس کی وجہ بعد میں انہوں نے یہ فرمائی کہ میں نے یہاں شادی کر لی ہے اس لیے پوری نماز پڑھتا ہوں۔ مگر ایک موقع پر حضرت عثمانؓ نے ظہر کی نماز منیٰ میں چار رکعت پڑھائی تو کسی نے یہ بات

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو بتائی جو منیٰ میں موجود تھے لیکن نماز میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ بات سن کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فرمایا کہ ہماری تو ان چار رکعتوں کے بدلے دو رکعتیں ہی قبول ہو جائیں تو غنیمت ہے۔ لیکن اس کے بعد عصر کی نماز انہوں نے حضرت عثمانؓ کی اقتدا میں چار رکعت ادا فرمائی، جس سے امت کو یہ بتانا مقصود تھا کہ اختلاف ہونا کوئی بعید بات نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے لیکن اس اختلاف کو تفرقہ اور خلاف کا ذریعہ نہیں بننا چاہیے اور امت کے اتحاد میں فرق نہیں آنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ فروعی اور نظری اختلافات کو اپنے اپنے دائرہ میں رکھتے ہوئے ہم سب کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ باہمی محبت واحترام کے ساتھ دینی مقاصد کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنی چاہیے اور امت کی وحدت کے لیے شخصی اور گروہی طور پر اگر نقصان بھی ہو تو اسے برداشت کرنا چاہیے۔

مولانا حافظ سید عطاء المومن شاہ بخاری نے اپنے خطاب میں چند اہم امور کی وضاحت کی جسے ریکارڈ میں لانا ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں لادینیت، سیکولرازم، فحاشی و عریانی اور مغربی فلسفہ و ثقافت کے فروغ کے مقابلہ میں مزاحمت کی قوت کو منظم کرنا ہوگا، اور متحد ہو کر ان کا راستہ روکنا ہوگا۔ مگر مزاحمت سے مراد مار دھاڑ، قتل و غارت اور اسلحہ اٹھانا نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح ہمارے اکابر نے دینی و قومی مقاصد کے لیے پرامن جدوجہد کی ہے اسی طرح ہم بھی پرامن عوامی جدوجہد منظم کریں گے اور اس کے لیے سب جماعتوں کو بھرپور محنت کرنا ہوگی۔

انہوں نے کہا کہ ہمارا یہ اتحاد مسلکی ضرور ہے لیکن کسی مسلک کے خلاف نہیں ہے۔ اور نہ ہی ہمارا آٹھ نکاتی ایجنڈا مسلک کے حوالہ سے ہے۔ یہ قومی ایجنڈا ہے جو ملک و قوم کے اجتماعی اہداف و مقاصد کی ترجمانی کرتا ہے۔ ہم اس کے لیے اپنی صف بندی کے بعد دوسرے مکاتبِ فکر سے بھی رابطہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہماری خواہش ہے کہ یہ جلد سے جلد ہو تاکہ ہم قومی سطح پر مشترکہ محنت کی کوئی صورت نکال سکیں۔ اس لیے کوئی مسلک اسے اپنے خلاف اتحاد تصور نہ کرلے۔ شیعہ سنی حوالہ سے بھی ہم محاذ آرائی کے ماحول کو کم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور ہماری محنت اس بات پر ہوگی کہ سنی شیعہ اختلافات کو باہمی تصادم اور فسادات کی شکل اختیار کرنے سے روکا جائے۔ اس کے لیے ہم دوسرے مکاتبِ فکر کے راہنماؤں حتیٰ کہ اہلِ تشیع کے معتدل اور سنجیدہ راہنماؤں کے ساتھ بھی بات کریں گے اور مل جل کر پاکستان کی خود مختاری و سالمیت کے تحفظ، مغربی فلسفہ و ثقافت کے مقابلہ، اسلامی نظام کے نفاذ اور فحاشی و عریانی کے سدباب کے لیے جدوجہد کی راہ ہموار کریں گے۔ انہوں نے "مجلس علماء

اسلام پاکستان" میں شامل جماعتوں کے راہنماؤں، علماء کرام اور کارکنوں پر زور دیا کہ وہ تحریر و تقریر کے ذریعہ اس پیغام کو عام کریں۔ کارکنوں کو اس مقصد کے لیے تیار کریں، ان کی ذہن سازی اور تربیت کریں اور عوامی بیداری کے لیے تمام ممکنہ ذرائع کو استعمال کریں۔ نیز اپنی صفوں میں اتحاد و یگانگت کی فضا کو مستحکم کرنے میں بھرپور کردار ادا کریں۔

مذہبی ہم آہنگی اور باہمی رواداری کے تقاضے

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۴ مارچ ۲۰۱۵ء

دعوہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے زیر اہتمام شاہ فیصل مسجد اسلام آباد میں ان دنوں میڈیا اور صحافت سے تعلق رکھنے والے حضرات کے لیے پانچ روزہ ورکشاپ جاری ہے جس میں ملک کے مختلف حصوں سے سرکردہ صحافی شریک ہیں۔ پروفیسر مصباح الرحمن یوسفی کی نگرانی میں انعقاد پذیر اس کورس میں معروف ارباب فکر و دانش صحافیوں کو اپنے تجربات و خیالات سے مستفید کر رہے ہیں۔ ۱۲ مارچ جمعرات کو ظہر کے بعد کی نشست میں مجھے بھی کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا جن کا خلاصہ نذرِ قارئین ہے:

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مجھے خوشی ہے کہ آج صحافی برادری کے کچھ دوستوں سے گفتگو کی سعادت حاصل ہو رہی ہے اور اس پر دعوہ اکیڈمی اور جناب مصباح الرحمن یوسفی کا شکر گزار ہوں۔ میرا خود بھی صحافی برادری سے تعلق ہے۔ میں نے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران روزنامہ وفاق لاہور کے نامہ نگار کے طور پر صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ تب سے مسلسل صحافت سے وابستہ ہوں۔ نامہ نگاری، کالم نگاری اور رپورٹنگ کے علاوہ مختلف جرائد و رسائل کا ایڈیٹر رہا ہوں۔ اب بھی ماہنامہ "الشریعہ" گوجرانوالہ کا چیف ایڈیٹر ہوں اور متعدّد اخبارات میں میرے کالم شائع ہو رہے ہیں۔ آج کی گفتگو کے لیے مجھے "مذہبی ہم آہنگی اور باہمی رواداری کے تقاضے" کا عنوان دیا گیا ہے اور اس کے حوالہ سے کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اختلاف ہونا فطری بات ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور غور و فکر کی صلاحیت سے نوازا ہے، اس لیے اختلاف کا ہونا ایک فطری بات ہے۔ عقل و دانش کا معیار ایک نہیں ہے، درجات مختلف ہیں، اور دائرے بھی متنوع ہیں۔ اس لیے زندگی کے ہر شعبہ میں اختلافات موجود ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ آرا و افکار کا تنوع اور

خیالات و تاثرات کا اختلاف سیاست میں بھی ہے، تہذیب و ثقافت میں بھی ہے، معیشت و تجارت میں بھی ہے، طب و حکمت میں بھی ہے، اور مذہب میں بھی ہے۔ اس لیے اختلافات کا موجود ہونا کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے بلکہ انسانی عقل و دانش کے مسلسل استعمال کی علامت ہے۔ البتہ اختلاف کا اظہار جب اپنی جائز حدود کو کراس کرنے لگتا ہے تو وہ تنازعہ اور جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ رواداری اور ہم آہنگی کے باب میں یہی نکتہ سب سے زیادہ قابل توجہ ہے۔

عالمی سطح پر ہم آہنگی اور رواداری

مذہبی رواداری کی ضرورت اور تقاضوں کی ایک سطح عالمی ہے اور ایک سطح ہماری داخلی اور قومی صورت حال ہے۔ میں آج قومی اور ملکی حالات کے تناظر میں معروضی حالات اور ان کے تقاضوں کے چند پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔ پاکستان کے داخلی ماحول کے حوالہ سے مذہبی کشمکش کا ایک دائرہ ملک میں رہنے والی غیر مسلم اقلیتوں کے حوالہ سے ہے۔ ملک میں ہندو، سکھ، مسیحی اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ وہ اس خطے کے باشندے ہیں، ملک کے شہری ہیں اور سوسائٹی کا حصہ ہیں۔ ان کے ساتھ ہمارے معاملات دستور کی صورت میں طے ہیں جس کا سب احترام کرتے ہیں اور اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ وقتاً فوقتاً تنازعات سر اٹھاتے ہیں اور باہمی تعلقات منفی صورت اختیار کر جاتے ہیں تو ان کے حل کے لیے دستور و قانون موجود ہے اور کسی نہ کسی طرح ان پر قابو پا لیا جاتا ہے۔

مگر قادیانیوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے، اس لیے کہ انہوں نے دستور پاکستان کو تسلیم کرنے سے انکار کر رکھا ہے۔ اور وہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ہر فورم میں دستور پاکستان اور منتخب پارلیمنٹ کے جمہوری فیصلوں کو قبول کرنے سے نہ صرف انکار کر رہے ہیں بلکہ مختلف عالمی اداروں میں ملک کے دستور و قانون کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر ان کے بارے میں یک زبان ہیں کہ جب تک وہ عالمِ اسلام کے اجتماعی فیصلوں اور دستور پاکستان کی جمہوری شقوں کو تسلیم کرنے کا اعلان نہیں کرتے ہیں ان کے بارے میں کوئی لچک پیدا نہیں کی جا سکتی۔ قادیانی گروہ اس وقت درمیان میں لٹکا ہوا ہے۔ امت مسلمہ اسے اپنے وجود کا حصہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور وہ اپنے بارے میں غیر مسلم اقلیت کی معاشرتی حیثیت قبول نہیں کر رہے۔ اس وجہ سے یہ جھگڑا نہ صرف ملک کے اندر بدستور موجود ہے بلکہ عالمی اداروں میں بھی اس کے حوالہ سے سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔

قومی و ملی سطح پر ہم آہنگی اور رواداری کے تقاضے

مذہبی رواداری اور ہم آہنگی کی اہمیت و ضرورت کا دوسرا دائرہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور فرقہ بندی ہے۔ اس کی معروضی صورت حال یہ ہے کہ باہمی اختلافات و تنازعات بھی چلتے رہتے ہیں، جھگڑے اور تصادم کے واقعات بھی ہوتے ہیں، باہمی خونریزی کی نوبت بھی آجاتی ہے، لیکن مشترکہ قومی و دینی مسائل پر آپس میں اکٹھے بھی ہوجاتے ہیں، اور جب بھی کوئی مشترکہ قومی یا دینی مسئلہ سنگین صورت اختیار کرتا ہے تو سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور دیگر مکاتبِ فکر مل بیٹھتے ہیں اور مشترکہ جدوجہد کا اہتمام کر لیتے ہیں۔ اور یہ تجربہ و مشاہدہ کی بات ہے کہ جس مسئلہ پر بھی یہ مکاتبِ فکر جمع ہوجاتے ہیں اس میں انہیں ہمیشہ پیش قدمی کا موقع ملتا ہے اور وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ کشمکش اور تنازعات کی فضا بھی قائم رہتی ہے اور میرے خیال میں سب سے زیادہ اسی پہلو پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ میں اس سلسلہ میں اپنے نصف صدی کے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر تین چار باتیں عرض کرتا ہوں۔

(۱) اختلاف کی سطح اور دائرہ کا لحاظ رکھا جائے

پہلی بات یہ ہے کہ ہر اختلاف کو اسی سطح پر رکھا جائے جس سطح کا وہ اختلاف ہے۔ اس لیے کہ اختلافات کے دائرے اور سطحیں الگ الگ ہیں اور سب اختلافات ایک درجہ کے نہیں ہوتے۔ مثلاً ہمارے ہاں فقہی اختلافات کا درجہ حق و باطل کا نہیں بلکہ خطا و صواب کا ہوتا ہے۔ جبکہ بہت سے اختلافات خطا و صواب کے بھی نہیں ہوتے بلکہ صرف اولیٰ و غیر اولیٰ کا فرق ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں ہر اختلاف کو حق و باطل اور کفر و اسلام کے لہجے میں بیان کرنے کا مزاج بن گیا ہے جو درست نہیں ہے۔ یہ ہمارا کلچرل معاملہ ہے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ جس طرح سماجی طور پر ہمارا مزاج یہ بن گیا ہے کہ کہیں معمولی سا جھگڑا بھی ہوجائے تو ہم اسے کم از کم ۳۰۷ کا کیس بنانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ جھوٹی گواہیاں اور جھوٹے میڈیکل سرٹیفکیٹ لاتے ہیں تاکہ معمولی تنازعہ کو بڑے جھگڑے میں تبدیل کیا جا سکے۔ اسی طرح مذہبی ماحول میں بھی معمولی اختلاف کو حق و باطل اور کفر و اسلام کا رنگ دیے بغیر ہماری تسلی نہیں ہوتی۔ اس حوالہ سے سنجیدہ محنت کی ضرورت ہے کہ ہر اختلاف کو اس کی اصل سطح اور درجے میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر ہم اس کا اہتمام کر لیں تو بہت سے جھگڑے سرے سے وجود میں ہی نہیں آئیں گے۔

(۲) اظہارِ اختلاف کے لیے معقول انداز اختیار کیا جائے

دوسری بات یہ ہے کہ اختلاف کا اظہار مناسب زبان، موزوں الفاظ اور معقول لہجے میں کیا جائے تو اس کے تنازعہ کی صورت اختیار کرنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ علماء کے حلقہ میں میری گزارش یہ ہوتی ہے کہ اختلاف کا اظہار اچھے الفاظ اور مناسب لہجے میں کرنا چاہیے۔ جبکہ صحافیوں کے ماحول میں یہ گزارش اس طرح کر رہا ہوں کہ اختلاف کی رپورٹنگ کے لیے بھی اچھے الفاظ اور مناسب لہجے کی ضرورت ہے۔ ہمارے بہت سے جھگڑے مبالغہ آمیز رپورٹنگ کی وجہ سے کھڑے ہوتے ہیں اور خبر کا اشتعال انگیز لہجہ بات کو سنوارنے کی بجائے بگاڑنے کا باعث بنتا ہے۔ کسی عقیدہ، موقف اور اختلاف کے اظہار کا صحیح طریقہ کیا ہے اس حوالہ سے صرف ایک بات پر غور کر لیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو نبی بنا کر فرعون کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ قولا له قولاً لينا کہ فرعون کے ساتھ نرمی سے بات کرنا۔ اختلاف کے اظہار میں شدت اور غلو کا یہ ماحول صرف مذہبی دنیا میں نہیں ہے بلکہ ہمارا سیاسی ماحول بھی یہی منظر پیش کر رہا ہے اور زندگی کے دیگر شعبوں کی صورت حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ اس لیے ہم اگر اختلاف کے اظہار میں اپنی زبان، الفاظ، لہجے اور رویے کو کنٹرول کر سکیں تو بہت سے اختلاف صرف اس تبدیلی کے ساتھ ختم ہو جائیں گے۔

(۳) قومی و ملی معاملات میں مشترکات کو ترجیح دی جائے

تیسری بات یہ ہے کہ ہمارے درمیان اختلافات موجود ہیں اور رہیں گے، ان کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قومی اور ملی حوالہ سے ہمارے درمیان مشترکات بھی موجود ہیں، اور مشترکات کی فہرست اختلافات سے کہیں زیادہ طویل ہے۔ اگر ہم عوامی محاذ پر ملی اور قومی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے مشترکات پر زیادہ گفتگو کریں تو ہم آہنگی اور رواداری کی فضا قائم کی جا سکتی ہے۔ ہمارے بہت سے قومی، دینی اور معاشرتی مسائل حل طلب ہیں اور ہماری مشترکہ محنت ان کے حل میں مفید ثابت ہو سکتی ہے بلکہ ہماری عدمِ توجہ کی وجہ سے وہ مسلسل حل طلب چلے آ رہے ہیں۔ اس لیے مذہبی راہ نماؤں کو اختلافات کا اپنے دائرہ میں ضرور اظہار کرنا چاہیے مگر مشترکات کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ مذہبی کشیدگی کم ہوگی بلکہ مسائل کے حل کی راہ بھی ہموار ہوگی اور قوم کو بہت سی مشکلات سے نجات ملے گی۔

(۴) ایک دوسرے کے معاشرتی بائیکاٹ سے گریز کیا جائے

جبکہ چوتھی بات یہ ہے کہ ہم نے مذہبی اختلافات کے باعث ایک دوسرے کے معاشرتی بائیکاٹ

کا جو ماحول پیدا کر رکھا ہے وہ محل نظر ہے۔ یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں یہودیوں اور منافقوں میں سے کسی کے ساتھ معاشرتی بائیکاٹ نہیں کیا تھا۔ ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا، ان کے دکھ درد میں شریک ہونا اور معاشرتی معاملات میں مشترکہ طور پر شامل ہونا مدینہ منورہ کا عمومی ماحول تھا۔ اس لیے مختلف مکاتبِ فکر کے مذہبی راہ نماؤں کو آپس میں معاشرتی بائیکاٹ کا رویہ اختیار کرنے کی بجائے باہمی ملاقاتوں اور معاشرتی معاملات میں شرکت کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ بہت سی غلط فہمیاں آپس کی ملاقات سے دور ہو جاتی ہیں اور مشترکہ قومی و ملی معاملات میں مل جل کر کام کرنے کی راہیں ہموار ہوتی ہیں جو ہماری آج کی ایک اہم معاشرتی ضرورت ہے۔

ایران کا علاقائی تشخص: چند چشم کشا خبریں

روزنامہ اسلام، لاہور ---١٦مارچ ٢٠١۵ء

مشرقِ وسطیٰ میں اس وقت سنی شیعہ کشمکش کے حوالہ سے کیا کچھ ہو رہا ہے اور کیا ہونے جا رہا ہے، اس کے بارے میں اس کالم میں وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں۔ آج اس کے بارے میں چند تازہ خبریں قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

روزنامہ ”نئی بات“ لاہور میں ١٠مارچ ٢٠١۵ء کو شائع ہونے والی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ

> ”ایران کی ایک غیر سرکاری خبر رساں ایجنسی ”ایسنا“ کے مطابق ”ایرانی تشخص“ کے عنوان سے تہران میں منعقدہ ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے ایران کے سابق وزیر علی یونسی نے کہا ہے کہ ایران اور عراق کو جغرافیائی طور پر تقسیم کرنا کسی صورت میں قابل قبول نہیں ہو گا۔ ہماری تہذیب و ثقافت، ماضی و حال سب ایک ہیں۔ اس تہذیبی رشتے نے ہمیں ایک دوسرے سے مربوط کر رکھا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ ہم ایک دوسرے سے لڑیں یا اکٹھے رہیں ہمارے اتحاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ پورا مشرقِ وسطیٰ ایران کا حصہ ہے، ہم خطے کی تمام اقوام کا دفاع کریں گے کیونکہ ہم انہیں ایران ہی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ہم اسلامی انتہا پسندی، تکفیری، الحاد، نئے عثمانیوں، وہابیوں اور مغربی صیہونیوں سے بیک وقت مقابلہ کریں گے۔ انہوں نے ترکی کو بھی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ ہمارے تاریخی مخالفین میں مشرقی رومیوں کی باقیات اور عثمانی ترک ہیں۔“

روزنامہ پاکستان لاہور نے ۱۱ مارچ ۲۰۱۵ء کو یہ خبر شائع کی ہے کہ

”یمن میں حکومت کے قیام کے بعد ایران نواز حوثی جماعت نے ملک میں عربی کی بجائے فارسی زبان وادب کی ترویج کا اعلان کیا ہے۔ ایران کے دورے پر آئے ہوئے حوثی گروپ کی جانب سے کہا گیا ہے کہ ہم جلد ہی صنعاء میں فارسی ادب اور لٹریچر کا کالج قائم کریں گے اور اس کے علاوہ ملک میں ایران کے ثقافتی کلب بھی کھولے جائیں گے۔“

روزنامہ دنیا گوجرانوالہ میں ۱۲ مارچ ۲۰۱۵ء کو شائع ہونے والی یہ خبر ملاحظہ فرمائیے کہ

”امریکی سی آئی اے کے سابق سربراہ مائیکل ھیڈن نے ایران کے جنگ زدہ عراق میں بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ایران کے کردار سے مطمئن نہیں ہیں۔ انہوں نے عراقی شہر تکریت میں داعش کے خلاف عراقی فوج اور ایرانی خصوصی دستوں کی کاروائی پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ کاروائی دراصل اہلِ تشیع کی سنی آبادی کے شہر پر چڑھائی نظر آرہی ہے۔ مائیکل ھیڈن نے اس امر پر بھی تشویش کا اظہار کیا ہے کہ جب تکریت پر ان فورسز کو دوبارہ قبضہ ہو جائے گا تو وہ مقامی آبادی کے ساتھ کیا کریں گی؟“

روزنامہ دنیا نے اسی روز اس کے ساتھ یہ خبر شائع کی ہے کہ

”سعودی عرب کے نائب ولی عہد اور وزیر داخلہ شہزادہ محمد بن نائف بن عبد العزیز نے بعض ریاستوں پر سعودی مملکت پر حملوں کے لیے بعض دہشت گرد گروپوں کی مدد وحمایت کا الزام عائد کیا ہے۔ انہوں نے الجزائر میں عرب وزرائے داخلہ کی کونسل کے بتیسویں اجلاس کے موقع پر کہا ہے کہ بعض ریاستوں اور حکومتوں کے ایسے گماشتے دہشت گرد گروپ موجود ہیں جو اپنی توانائیوں کو سعودی عرب کی سلامتی اور استحکام کو تہہ وبالا کرنے کے لیے صرف کر رہے ہیں اور وہ ہمارے وجود کے تسلسل کے منافی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔“

یہ چار خبریں ہیں جو صرف تین روز کے اندر مختلف اخبارات میں شائع ہوئی ہیں لیکن اپنے اندر معانی، سوالات اور خدشات و امکانات کا ایک وسیع جہان سموئے ہوئے ہیں جس کے بہت سے پہلوؤں میں سے ہر ایک مستقل گفتگو اور بحث و تجزیہ کا متقاضی ہے۔ مگر سرِ دست ان کی تفصیلات میں جانے کی بجائے ہم اہل السنۃ والجماعۃ کے علماء کرام، راہ نماؤں اور دانشوروں کی خدمت میں ایک سوال

پیش کرنے کی جسارت پر اکتفا کر رہے ہیں کہ کیا ہمارے لیے اس ساری صورت حال میں کچھ سوچنے، سنجیدہ ہونے اور اپنے لیے کوئی عملی کردار طے کرنے کی کسی درجہ میں کوئی گنجائش باقی ہے یا ہمارا کام صرف گرما گرم تقریریں کرنا اور پرجوش نعرے لگانا ہی رہ گیا ہے؟

حرمین شریفین کا تحفظ ہر چیز پر مقدم ہے

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۳۱ مارچ ۲۰۱۵ء

مشرقِ وسطیٰ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ حالات پر مسلسل نظر رکھنے والوں کے لیے قطعاً غیر متوقع نہیں ہے، بلکہ ہم ایک عرصہ سے وقتاً فوقتاً اس طرف توجہ دلاتے آرہے ہیں کہ ایسا کچھ ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ یمن میں حوثی قبائل کو جس طرح حکومت وقت کے خلاف کھڑا کیا گیا ہے وہ سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہے، لیکن یہ سال دو سال کا قصہ نہیں بلکہ اس کی پشت پر کم و بیش چار عشروں کی تاریخ ہے اور ایک مکمل تیاری کے ساتھ ساتھ بھرپور پلاننگ نے حالات کو یہ رخ دیا ہے۔

انقلابِ ایران ۱۹۷۹ء: خیر مقدم اور مایوسی

ایران میں جب شاہ کے خلاف مذہبی حلقوں نے ملک کے دوسرے طبقات کے ساتھ مل کر انقلاب بپا کیا تو اس کا اس لحاظ سے خیر مقدم کرنے والوں میں ہم بھی شامل تھے کہ مذہب اور لا مذہبیت کے درمیان عالمی سطح کی موجودہ کشمکش میں اس کامیاب انقلاب سے دین و مذہب کی بنیاد پر سیاست کرنے والوں کو تقویت حاصل ہوگی اور حوصلہ ملے گا۔ اگر ایرانی انقلاب کے قائدین انقلاب کا دائرہ اردگرد کے ممالک تک وسیع کرنے اور اپنے دائرہ اثر کو پورے علاقے تک وسیع کرنے کی تگ و دو میں نہ لگ جاتے تو یہ ایرانی انقلاب دنیائے اسلام کی مذہبی قوتوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتا تھا، لیکن جلد ہی یہ نظر آنے لگا کہ ایسا شاید نہ ہو پائے۔

ہمیں تو یہ بات اسی وقت کھٹک گئی تھی جب پاکستان میں نفاذِ شریعت کے لیے دھیرے دھیرے آگے بڑھنے والی جدوجہد کے لیے ملک میں نفاذ فقہ جعفریہ کے مطالبہ اور اس کے لیے وفاقی سیکرٹریٹ کے گھیراؤ تک کی کاروائیاں اچانک سامنے آنے پر مزید پیشرفت کے امکانات خطرے میں پڑ گئے تھے۔ اور نہ صرف پاکستان بلکہ پورے خطے میں شیعہ سنی کشمکش کا ایک نیا راؤنڈ شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت سے اب تک اس پالیسی کے تسلسل کا اس وقت جو نتیجہ ہمارے سامنے ہے وہ خود ایک ایرانی راہنما کے بقول یہ ہے کہ ایران کو بغداد، دمشق اور بیروت کے بعد یمن کے دارالحکومت صنعاء پر بھی

دسترس حاصل ہوگئی ہے۔ اور ایران کے ایک سابق وزیر جناب علی یونسی نے گزشتہ دنوں تہران میں ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے یہاں تک فرمادیا ہے کہ پورا مشرقِ وسطیٰ ان کا دائرہ اثر ہے اور وہ مشرقی رومیوں، عثمانی ترکوں اور سلفیوں سمیت بہت سے حلقوں کے ساتھ بیک وقت لڑنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ اردن کے شاہ عبداللہ نے اب سے کئی برس قبل یہ کہا تھا کہ ہم مشرقِ وسطیٰ میں شیعہ ہلال کے حصار میں ہیں، جس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ سنی اکثریت ارد گرد شیعہ آبادی کی زنجیرِ ہلال کی طرح اپنا دائرہ قائم کر چکی ہے۔

سعودی عرب کے گرد اس حصار کو جس طرح مکمل کیا گیا ہے، یمن میں اسی کے اگلے مرحلہ کی طرف حوثی قبائل کے ذریعہ پیش قدمی کا اہتمام کیا جا رہا ہے اور اس نے پورے عالمِ اسلام کو چونکا کر رکھ دیا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے مشرقِ وسطیٰ میں فاطمی دولت کی واپسی کے امکانات کے بارے میں کچھ عرصہ قبل چند گزارشات پیش کی تھیں، ہمارے خیال میں وہی ایجنڈا اپنی طے شدہ ترتیب اور رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور اس نے صرف سعودی عرب نہیں بلکہ حرمین شریفین کے تقدس اور مستقبل کے حوالہ سے بھی کئی سوالات کھڑے کر دیے ہیں۔

سعودی حکومت کی پالیسیاں: تحفظات اور تقاضے

جہاں تک سعودی حکومت اور آلِ سعود کی پالیسیوں کا تعلق ہے اس کے بارے میں بہت سے دیگر حلقوں کی طرح ہمارے ذہن میں بھی بہت سے تحفظات موجود ہیں جن میں سے بعض کا ہم نے اسی کالم میں متعدد بار اظہار بھی کیا ہے۔ لیکن حرمین شریفین کا تقدس اور سعودی عرب کی سالمیت و وحدت کے دو سوال ایسے ہیں جن پر کسی قسم کے تحفظات کا کوئی جواز نہیں ہے اور ملت اسلامیہ کے اجتماعی مفاد سے دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی شخص اس پر تشویش و اضطراب کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے یمن کی منتخب اور قانونی حکومت کے خلاف حوثی قبائل کی بغاوت کا راستہ روکنے کے لیے عرب لیگ اور پاکستان گورنمنٹ نے جن اقدامات کا اعلان کیا ہے وہ وقت کی ایک اہم ضرورت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی بھرپور حمایت کی جانی چاہیے۔

اس موقع پر ایک کہاوت یاد آرہی ہے کہ نہر کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے ایک لڑکا نہر میں گر گیا اور ڈبکیاں کھانے لگا تو کنارے پر کھڑے کسی شخص نے اسے ملامت کرنا شروع کر دیا کہ تم اس طرح کنارے کنارے کیوں چل رہے تھے، تم نے احتیاط کیوں نہیں کی اور چلتے ہوئے تمہارا دھیان کدھر تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اس لڑکے نے یہ باتیں سن کر آواز دی کہ ''میرے بھائی! پہلے مجھے اس گرداب سے نکال کر مجھے بچا لو پھر جتنی چاہے ملامت کرنا۔'' سعودی حکومت کی پالیسی اور آلِ سعود کے سیاسی طرز

عمل کے حوالہ سے بہت کچھ کہنے کی گنجائش بلکہ ضرورت موجود ہے لیکن اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ حرمین شریفین کا انتظام بلکہ حسن انتظام کرنے والی حکومت کے گرد جو گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے اسے اس سے نکالنے کا اہتمام کیا جائے اور اس کے لیے جو بھی قابل عمل صورت ہو سکے اسے اختیار کرنے سے گریز نہ کیا جائے۔

یہ ضروری ہے کہ حکومت پاکستان اس سلسلہ میں مجموعی پالیسی مرتب کرتے ہوئے پارلیمنٹ اور ملک کی تمام سیاسی و دینی جماعتوں کو اعتماد میں لے اور عالمِ اسلام اور پاکستان کے وسیع تر مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی حتمی فیصلہ کرے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حرمین شریفین کی حرمت و تقدس اور ان کے تحفظ و مامون مستقبل کو باقی تمام معاملات پر بہرحال ترجیح دی جائے۔

اس سلسلہ میں جمعیۃ علماء اسلام (س) پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا عبد الرؤف فاروقی کی دعوت پر گزشتہ روز جامعہ اسلامیہ کامونکی میں منعقدہ ایک اجلاس کے دوران مولانا محمد احمد لدھیانوی، مولانا عبد الرؤف فاروقی، مولانا پیر سیف اللہ خالد، مولانا فضل الرحمن خلیل، حافظ احمد علی، مولانا عبد الخالق، حاجی عثمان عمر ہاشمی اور دیگر حضرات کے ساتھ مشاورت میں راقم الحروف بھی شریک ہوا جس میں مجموعی صورت حال کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا۔ ہم سب کی مشترکہ رائے یہ ہے کہ ملک کے اندر دینی اور مسلکی جدوجہد کے لیے ”مجلس علماء اسلام پاکستان“ کو مستحکم اور متحرک کرنے کی ضرورت ہے اور مولانا حافظ سید عطاء المومن شاہ بخاری نے پیرانہ سالی اور علالت کے باوجود شبانہ روز محنت کے ساتھ جس شیرازہ بندی کا اہتمام کیا ہے اس کے تسلسل کو آگے بڑھانا ضروری ہے۔ اللہ کرے کہ اس کی کوئی مؤثر عملی صورت نکل آئے۔ البتہ ایک فوری ضرورت کے تحت حرمین شریفین کے تقدس و حرمت کے حوالہ سے دینی حلقوں کو توجہ دلانے اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کی غرض سے ”تحریک دفاع حرمین شریفین“ کے عنوان سے فورم تشکیل دیا گیا ہے جس کے کنوینر مولانا عبد الرؤف فاروقی ہیں اور رابطہ کمیٹی میں مولانا فضل الرحمن خلیل، مولانا محمد احمد لدھیانوی، مولانا پیر سیف اللہ خالد اور حاجی عبد اللطیف چیمہ کے علاوہ راقم الحروف کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اس سلسلہ میں رابطہ کمیٹی کو تعاون سے نوازیں اور اس نازک مرحلہ میں عالمِ اسلام اور خاص طور پر حرمین شریفین کے تحفظ کے لیے خصوصی دعاؤں کا بھی اہتمام کریں۔

مشرقِ وسطیٰ میں ایران کا کردار

روزنامہ اسلام، لاہور ---۱۰ اپریل ۲۰۱۵ء

ایرانی راہنماؤں کے مسلم ممالک کے دورے

ایران کے وزیر خارجہ محترم جواد ظریف گزشتہ روز اسلام آباد تشریف لائے اور وزیر اعظم پاکستان کے امور خارجہ کے مشیر جناب سرتاج عزیز سے یمن کے بحران پر گفتگو کے بعد مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ اس موقع پر ان کی طرف سے کہا گیا ہے کہ ایران امت مسلمہ کی وحدت کا خواہاں ہے اور وہ پاکستان کے ساتھ مل کر یمن کے تنازعہ کے سیاسی حل کے لیے کام کرنا چاہتا ہے۔ اس سے قبل ایران کے صدر محترم جناب حسن روحانی نے ترکی کا دورہ کیا ہے اور ترک حکمرانوں کے ساتھ ملاقات کے موقع پر وہ اسی قسم کے جذبات کا اظہار کر چکے ہیں۔

یہ بات ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے کہ ایران مشرقِ وسطیٰ اور خاص طور پر یمن کے تنازعہ کا سیاسی حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کے کچھ ضروری تقاضوں کی طرف ایران، ترکی اور پاکستان کے حکمرانوں کو توجہ دلانا اس موقع پر ضروری سمجھتے ہیں۔

یمن کا تنازعہ اور ایران

اس وقت مشرقِ وسطیٰ کی جو صورت حال ہے وہ صرف یمن کے داخلی ماحول تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اس خطہ کے نصف درجن کے لگ بھگ ممالک میں تیزی کے ساتھ پھیلنے والی اس علاقائی کشمکش کا حصہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے پھیلاؤ میں خود ایران کا بھی حصہ ہے۔ اس لیے اسے صرف یمن کا داخلی مسئلہ قرار دے کر اسی دائرہ میں اسے نمٹانے کی کوئی بھی کوشش نہ صرف یہ کہ غیر منطقی ہوگی بلکہ اس کے نتیجہ خیز ہونے کے بارے میں کوئی امید رکھنا بھی مشکل ہوگا۔ چنانچہ جہاں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ یمن کے تنازعہ کو مشرق وسطیٰ کے عمومی تناظر میں دیکھا جائے اور اسی دائرہ میں اس کا حل تلاش کیا جائے، وہاں یہ بات بھی ناگزیر ہو چکی ہے کہ ایران کے کردار کے بارے میں مختلف اطراف سے جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا جا رہا ہے ایرانی قیادت ان کے حوالہ سے اپنے موقف اور پوزیشن کی وضاحت کرے۔ کیونکہ صلح و امن کا ایجنڈا تمام تر خلوص و سعی کے باوجود شکوک و شبہات کی فضا میں آگے نہیں بڑھا کرتا۔

ایران کا ایٹمی معاہدہ اور عربوں کا تحفظ

مثلاً ۸ اپریل کی اخبارات میں شائع ہونے والی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ سعودی عرب کے فرمانروا شاہ سلمان بن عبد العزیز نے کابینہ کے اجلاس کے موقع پر عالمی قوتوں کے ساتھ ایٹمی معاملات میں ایران کے معاہدہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس معاہدہ میں عربوں کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔ اس کے ساتھ انہوں نے اس امید کا اظہار کیا کہ معاہدہ کے بعد عرب ممالک کے معاملات میں مداخلت بھی بند ہو جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ معاہدہ تو ایران کا عالمی قوتوں کے ساتھ ایٹمی مسئلہ پر ہو رہا ہے، اس میں عرب ممالک کے تحفظ اور ان کے معاملات میں مداخلت کی شکایت کہاں سے پیدا ہو گئی؟ یہ سوال سنجیدہ توجہ کا طالب ہے اور اس کا صحیح جواب تلاش کرنے کے لیے شاید گزشتہ چار عشروں کی صورت حال کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لینا پڑے گا۔

افغان جہاد کے راہنما گلبدین حکمت یار کی خواہش

اس کے ساتھ ہی اسی روز بی بی سی پر نشر ہونے والی اس خبر کو بھی پڑھ لیا جائے کہ جہاد افغانستان کے ممتاز کمانڈر اور حزب اسلامی افغانستان کے سربراہ انجینئر گلبدین حکمت یار نے کہا ہے کہ ایران نے افغانستان، عراق، شام اور بحرین کے بعد یمن کے معاملات میں بھی مداخلت شروع کر رکھی ہے۔ اس لیے وہ یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ان کے گروہ سے تعلق رکھنے والے مجاہدین کو یمن میں جا کر حوثی باغیوں کے خلاف جنگ میں شریک ہونے کا موقع دیا جائے۔ اس کے بعد سعودی عرب کے فوجی ترجمان بریگیڈیئر جنرل احمد عسیری کی طرف سے لگایا جانے والا یہ الزام بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یمن میں حوثی باغیوں کو لڑائی کی ٹریننگ ایران اور حزب اللہ نے دی ہے جس کے ان کے پاس ٹھوس شواہد موجود ہیں۔

ہم ان الزامات کی تصدیق یا توثیق نہیں کر رہے اور نہ ہی ہم اس پوزیشن میں ہیں لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ ان الزامات کے ماحول میں ایرانی حکومت کا یمن کے تنازعہ کے حوالہ سے صرف سفارتی کردار کافی نہیں ہوگا بلکہ اسے اس سے آگے بڑھنا بلکہ بہت آگے جانا ہوگا تاکہ وہ عالمِ اسلام کو یہ باور کرا سکے کہ وہ فی الواقع یمن کے تنازعہ کے سیاسی حل کے لیے کوشاں ہے اور امت مسلمہ کی وحدت اس کا مطمح نظر ہے۔

ایرانی قیادت کی خدمت میں!

ایرانی انقلاب کے بعد وہاں جب مذہبی قیادت برسراقتدار آئی تو ہم نے اس حوالہ سے خوشی کا اظہار کیا تھا اور اس کا خیر مقدم کیا تھا کہ آج کے دور میں ایک کامیاب مذہبی انقلاب دنیا بھر میں دینی حوالہ سے جدوجہد کرنے والے حلقوں کے لیے تقویت کا باعث ہوگا اور انہیں اس سے حوصلہ ملے گا۔ جبکہ ایران کی انقلابی قیادت اگر اپنے استحکام کے بعد اردگرد کے مسلم ممالک میں نفاذِ اسلام کے لیے مسلسل جاری دینی قوتوں کے لیے معاون اور مددگار کا کردار ادا کرتی اور ان کے مقابلہ میں اپنی ترجیحات کے مطابق نئی تحریکات کھڑی کرنے اور انہیں سپورٹ کرنے سے گریز کرتی تو ہماری یہ خوشی یقیناً دوچند ہو جاتی۔ لیکن خود ہمارے ہاں پاکستان میں نفاذ فقہ جعفریہ کے نام سے ایک نئی تحریک نے نفاذِ اسلام کی جدوجہد کو مضبوط کرنے کی بجائے نقصان پہنچایا اور پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی جمہوری ریاست بنانے کی جدوجہد متنازعہ ہو کر رہ گئی۔

اس پس منظر میں ہم ایران کے صدر محترم اور زیر خارجہ محترم کے حالیہ بیانات کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے وحدت امت اور مشرقِ وسطیٰ کے تنازعہ کے سیاسی حل کے لیے ان کوششوں کو بہت مفید سمجھتے ہیں بشرطیکہ زمینی حقائق اور مشرقِ وسطیٰ کے عمومی تناظر کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے مسئلہ حل ہونے کی بجائے مزید الجھ جائے گا اور سفارتی سرگرمیاں رسمی کاروائیوں سے آگے نہیں بڑھ سکیں گی۔

سنی شیعہ کشمکش: خواہشات اور حقائق

روزنامہ اسلام، لاہور ---۱۵ اپریل ۲۰۱۵ء

اس عالم رنگ و بو میں خواہشات کا دائرہ الگ ہوتا ہے جبکہ میسر و موجود کا دائرہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ میں جو کچھ چاہ رہا ہوں وہی ہو رہا ہو یا اس کا ہو جانا دائرہ امکان میں بھی ہو۔ اس لیے جو چاہ رہا ہوں اس کے لیے کوشش ضرور کرنی چاہیے لیکن مجھے نمٹنا اسی سے ہے جو موجود و میسر ہے۔ کیونکہ اپنی چاہت کے لیے سعی و محنت کرتے ہوئے موجود و میسر کو نظر انداز کر دینا اور اس سے آنکھیں بند کر لینا عقل و دانش کا تقاضہ نہیں سمجھا جاتا۔

مشرقِ وسطیٰ کی صورت حال کے بارے میں ہم نے گزشتہ کالم میں عرض کیا تھا کہ علاقائی تناظر اور معروضی حقائق کو نظر انداز کر کے کیا جانے والا کوئی بھی فیصلہ غیر منطقی ہوگا۔ مگر ہماری قومی قیادت کی "سیاسی فراست" کی داد دیجئے کہ ہم نے قومی سطح پر ایک اچھی خواہش کا اظہار کیا کہ عالمِ اسلام میں سنّی

شیعہ کشمکش کو فروغ حاصل نہیں ہونا چاہیے، اس کے لیے ہم نے ایک حکمت عملی سوچ لی کہ یمن اور مشرقِ وسطیٰ میں جاری کشمکش کو سنّی شیعہ کشمکش کا عنوان نہیں دینا چاہیے۔ یہ دونوں بہت اچھی خواہشیں ہیں، خود ہماری خواہش بھی یہی ہے، ہم نے ہمیشہ سنّی شیعہ اختلافات کو کشمکش اور تصادم کا رنگ دینے کی مخالفت کی ہے۔ اور ہماری یہ خواہش اب بھی بدستور اسی درجہ میں قائم ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی تصور کر لیا کہ مشرقِ وسطیٰ میں ایسا نہیں ہو رہا اور اس تصور پر قومی پالیسی کی بنیاد کھڑی کر کے یہ طے کر لیا کہ یمن کا مسئلہ اس کی اور سعودی عرب کی کشمکش ہے اور ہمیں اس سے الگ تھلگ رہنا چاہیے۔

یہ خواہش بہت اچھی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کی کشمکش کو سنّی شیعہ تصادم کا رنگ اختیار نہیں کرنا چاہیے لیکن ''اختیار نہیں کرنا چاہیے'' کو ''موجود نہیں ہے'' میں تبدیل کر دینا زمینی حقائق اور معروضی صورت حال سے مطابق نہیں رکھتا جس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور وہ ہر سطح پر ہونی چاہیے۔ بلکہ ہم تو اس سلسلہ میں سنجیدہ سنّی اور شیعہ راہ نماؤں کے درمیان مکالمہ کو بھی مناسب خیال کرتے ہیں، کیونکہ ایرانی انقلاب کے بعد مشرقِ وسطیٰ میں حتیٰ کہ ہمارے ہاں پاکستان میں بھی سنّی شیعہ کشمکش نے جو نیا رنگ اختیار کیا تھا اور جس پر گزشتہ چار عشروں سے مسلسل سفر جاری ہے، اس کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا اور اس پر بحث و مکالمہ اب انتہائی ضروری ہو گیا ہے۔ مثلاً عراق ایران جنگ کے اسباب اور اس میں مختلف فریقوں کا کردار مستقل بحث کا متقاضی ہے، لیکن اس کے نتیجے میں عراق کی تین حصوں میں تقسیم کا جو فارمولا عالمی حلقوں میں ایک عرصہ سے گردش کر رہا ہے اس میں سنّی اور شیعہ تقسیم کو کھرچ ڈالنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ اسی طرح شام میں حافظ الاسد اور بشار الاسد کے ہاتھوں گزشتہ نصف صدی سے ریاستی جبر کا نشانہ بننے والے مذہبی طبقے اپنے سنّی ہونے پر پردہ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ جبکہ عراق میں نوری مالکی اور شام میں بشار الاسد کے جبر کا شکار ہونے والے سنیوں کا ''داعش'' کے نام پر متحد ہو جانا بھی ایک زمینی حقیقت ہے جس کا سب مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے ایجنڈے کو ہائی جیک کن لوگوں نے کر لیا ہے اور ان کی متحدہ قوت کو کیش کرانے میں کون لوگ مصروف ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ داعش کے نام سے یکجا ہونے والے تمام عسکری گروپ ''سنّی'' ہیں اور ان کے یکجا ہونے کا باعث بھی ان کا سنّی ہونا ہی ہے۔

پھر یمن میں زیدیوں اور دیگر آبادی کی باہمی کشمکش اگرچہ صدیوں پرانی ہے لیکن اسے نیا رنگ دے کر پالش کرنے اور مسلح و متحرک طاقت کی شکل دینے کی کہانی پرانی نہیں ہے۔ اور اس میں گزشتہ دو عشروں کے دوران جس جس کا جو کردار رہا ہے وہ بھی کوئی مخفی راز نہیں ہے۔ اسی طرح بحرین، کویت اور

لبنان کے معاملات کو بھی حقیقت پسندانہ طور پر دیکھا جائے تو مذکورہ بالا مجموعی پس منظر سے انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری گزارش کا مطلب یہ نہیں کہ سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے۔ ہم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے اور اس کے پیچھے عالمی استعماری قوتوں اور اسرائیل کی خواہشات اور کوششوں کا دخل سب سے زیادہ ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ''ہو رہا ہے'' کی بدقسمتی کو ''نہیں ہونا چاہیے'' کی اچھی خواہش کے پردے میں چھپایا نہیں جا سکتا۔

مشرقِ وسطیٰ کی صورت حال کا ایک منظر تو یہ ہے جو ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے۔ جبکہ دوسرا منظر یہ ہے کہ دو واضح کیمپ تشکیل پا چکے ہیں اور دونوں نے ہمیں بحیثیت ملک و قوم اپنے ساتھ شامل ہونے کی باقاعدہ دعوت دی ہے۔ سعودی عرب کی فرمائش اور اس کے ساتھ عرب لیگ کا تقاضہ ہمارے سامنے ہے، جبکہ ایران کے وزیر خارجہ نے خود تشریف لا کر ہمیں ''سعودی مخالف اتحاد'' میں شمولیت کی دعوت دی ہے۔ ان دو کیمپوں کے درمیان غیر جانبدار رہنا موجودہ حالات میں زیادہ دیر تک قابل عمل دکھائی نہیں دے رہا۔ کیونکہ دونوں میں سے کوئی بھی ہمیں صدر بش کے لہجے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ اگر ہمارے ساتھ نہیں تو پھر ہمارے مخالف ہیں۔ بلکہ متحدہ عرب امارات کے وزیر خارجہ کے بیان میں یہ بات قدرے تلخ لہجے میں موجود بھی ہے۔ ہم نے گزشتہ کالم میں یہی بات عرض کی تھی کہ یہ مسئلہ صرف یمن کا نہیں مشرقِ وسطیٰ کا ہے اور اسے یمن اور سعودی عرب کا قضیہ قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ہمیں مشرقِ وسطیٰ کی مجموعی صورت حال اور زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر اپنا مستقبل کا ایجنڈا طے کرنا ہوگا۔

کسی شخص کو کینسر ہو جائے تو اس کے اسباب کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے اور اسے بے حوصلہ ہونے سے بچانے کے لیے اسے اس کے مرض سے آگاہ نہ کرنا بھی بسا اوقات حکمت عملی کا تقاضہ بن جاتا ہے، لیکن علاج تو بہرحال کینسر کا ہی ہوتا ہے اور موجود میسر حالات و اسباب کے دائرہ میں ہوتا ہے۔ سنّی شیعہ کشمکش اور تصادم کو ہم عالمِ اسلام کے اجتماعی وجود کے لیے کینسر سے کم نہیں سمجھتے، لیکن المیہ یہ ہے کہ یہ کینسر نہ صرف موجود ہے بلکہ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے اور اسے ''لاعلاج'' قرار دے کر حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا حکمت و دانش کا تقاضہ نہیں ہے جبکہ اس کے علاج کے لیے اپنی تمام تر دانش و حکمت اور اسباب و وسائل کو استعمال میں لے آنا ہی وقت کا سب سے اہم تقاضہ ہے۔ مگر اس کے لیے اولین ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری قومی قیادت بالخصوص قومی سیاست میں اہل دین کی نمائندگی کرنے والی دینی قیادت ''کنفیوژن'' کے ماحول سے باہر نکلے اور حالات و ضروریات کا پوری

طرح ادراک کرتے ہوئے قوم کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے عزم و ہمت سے کام لے۔ خدا کرے کہ ایسا ہو جائے، آمین یا رب العالمین۔

مشرقِ وسطٰی کی صورتحال اور امریکہ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۳ اپریل ۲۰۱۵ء

سعودیہ ایران کشمکش: تین اہم خبریں

مشرقِ وسطٰی میں صورت حال کس رخ پر جا رہی ہے، اس کے بارے میں ۱۹ اپریل کے اخبارات میں شائع ہونے والی دو خبریں ملاحظہ فرمالیں۔

- ایک خبر کے مطابق ایران کے صدر محترم جناب حسن روحانی نے کہا ہے کہ سعودی عرب نے یمن پر فضائی حملہ کر کے نفرت کے بیج بو دیے ہیں جس کے نتائج اسے سمیٹنا پڑیں گے۔
- جبکہ دوسری خبر میں لبنان کے سابق وزیر اعظم سعد حریری نے حزب اللہ کے سربراہ حسن نصر اللہ پر الزام لگایا ہے کہ وہ ایرانی ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں اور سعودی حکمرانوں کے خلاف نفرت انگیزی کی مہم چلا رہے ہیں۔
- اس کے بعد ۲۱ اپریل کے اخبارات میں ایرانی افواج کے کمانڈر بریگیڈیر احمد رضا بوردستان کا یہ بیان شائع ہوا ہے کہ یمن کے باغیوں کے خلاف فضائی حملے نہ روکنے کی صورت میں سعودی عرب پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔

امریکی صدر باراک اوباما کے خیالات

مگر ہم آج اس کی بجائے امریکہ کے صدر باراک اوباما کے ایک اہم انٹرویو کا تذکرہ کرنا چاہیں گے جو انہوں نے گزشتہ دنوں "نیویارک ٹائمز" کے صحافی تھامس فریڈمین کو دیا ہے اور مشرقِ وسطٰی کی سنی آبادی کے حوالہ سے اپنے موقف اور احساسات کا اظہار فرمایا ہے، امریکی صدر محترم کا ارشاد ہے کہ:

> "جہاں تک ہمارے سنی عرب اتحادیوں مثلاً سعودی عرب کی حفاظت کا سوال ہے تو میرے خیال میں سعودیوں کو واقعی چند حقیقی بیرونی خطرات کا سامنا ہے لیکن ان کو کئی اندرونی خطرات بھی لاحق ہیں۔ مثلاً سعودی آبادیاں ہیں کہ جو ملک کے معاملات سے بیگانہ محض بنا دی گئی ہیں۔ سعودی نوجوان (مرد اور خواتین) بے روزگار ہیں۔ سعودی آئیڈیالوجی ہے جو کہ انتہائی تباہ کن اور غیر حقیقی ہے اور ایک حد تک سعودیوں کا

وہ یقین ہے کہ ان نوجوانوں کی شکایتوں اور ناراضگیوں کے نکاس کے لیے کوئی جائز سیاسی راستہ موجود نہیں ہے۔ چنانچہ ہمارا کام یہ ہے کہ ان ممالک کے ساتھ مل کر کام کریں اور ان کو سمجھائیں کہ ہم بیرونی خطرات سے نمٹنے کے لیے ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں اور ان کی دفاعی صلاحیتوں کو کیسے مضبوط بنا سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھائیں کہ ان ریاستوں کی اندرونی سیاست کو کیسے مستحکم بنایا جا سکتا ہے، تاکہ سنی نوجوان یہ جان سکیں کہ اسلامی ریاست (ISIS) جوائن کرنے کے علاوہ بھی ان کے پاس کئی دوسرے آپشنز موجود ہیں جن کا انتخاب وہ کر سکتے ہیں۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ سنی عربوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ نہیں کہ ایران ان پر چڑھائی کر دے گا بلکہ اصل اور بڑا خطرہ ان ممالک کی آبادیوں کا وہ اندرونی خلفشار اور اضطراب ہے جو وہاں پروان چڑھ رہا ہے۔ ان ممالک کے ساتھ ان موضوعات پر بحث کرنا بہت مشکل تر ہے لیکن ایسا کرنے کے سوا ہمارے پاس کوئی اور چارہ کار بھی نہیں۔“

صدر اوباما کے اس انٹرویو کے بہت سے مضمرات پر بحث و تمحیص کی ضرورت ہے لیکن ہم نے سر دست اس کا ایک اقتباس اس لیے نقل کیا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے تنازعہ کی مجموعی صورت حال کیا ہے اور اسے صرف یمن کا داخلی معاملہ یا زیادہ سے زیادہ یمن کے ساتھ سعودی عرب کی علاقائی کشمکش کا درجہ دے کر قومی پالیسی تشکیل دینے والے عناصر نے کس قدر بھولپن کے ساتھ اس خطہ کے علاقائی تناظر سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔

سنی شیعہ کشمکش کی آبیاری میں عالمی کردار

جہاں تک امریکہ اور اس کے حواری عالمی استعماری حلقوں کا تعلق ہے ان کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں سنی شیعہ کشمکش کی آبیاری اور اس کی آڑ میں اپنے مفادات کے حصول کا اس سے بہتر کوئی موقع اسے شاید کبھی ملا ہو۔ چنانچہ وہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

گزشتہ روز ایک دوست نے کہا کہ سنی شیعہ کشیدگی امریکہ کی پیدا کردہ ہے، ہم نے عرض کیا کہ نہیں یہ کشیدگی اور باہمی جنگ و جدال امریکہ کی دریافت سے بھی صدیوں پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ البتہ اسے استعمال کرنے اور اس سے اپنے مفادات حاصل کرنے کے لیے جس چابکدستی اور ہنر مندی کا امریکہ مظاہرہ کر رہا ہے اس سے قبل اس کی کوئی مثال اس سطح پر دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کشیدگی کو اس سطح پر لے جانے کے لیے ہمارے داخلی ماحول میں کس کس کا کیا کیا

کردار ہے، کیونکہ اس کا جائزہ لیے بغیر اور اس داخلی کردار کا راستہ روکے بغیر عالمی استعمار کے ایجنڈے کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ ستم ظریفی کی بات ہے کہ صدر امریکہ کو آج عرب سنی آبادیوں کا حکومتی معاملات سے بیگانہ ہونے کا غم کھائے جارہا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ عرب عوام کو حکومتی معاملات سے لاتعلق رکھنے کے ماحول کو عالمی سطح پر سرپرستی کس کی حاصل رہی ہے؟

آج بھی صورت حال یہ ہے کہ جمہوریت اور عوام کی حکمرانی کے علمبردار امریکہ کے لیے پورے مشرقِ وسطیٰ میں شخصی حکومتیں خواہ وہ ملوکیت کے نام سے ہوں یا فوجی آمریت کی صورت میں ہوں یا ان پر ''ولایتِ فقیہ'' کا مقدس ٹائٹل آویزاں کر دیا گیا ہو، پوری طرح قابل قبول ہیں۔ مگر امارت اسلامی یا خلافت کسی بھی صورت میں قابل برداشت نہیں ہے۔ جبکہ ہمارے نزدیک مشرقِ وسطیٰ کے تنازعہ کی اصل جڑ ہی یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے حواری استعماری ممالک عالمِ اسلام اور خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ میں خلافت یا امارت کا ہر قیمت پر راستہ روکنا چاہتے ہیں۔ اسی کے لیے انہوں نے ملوکیت اور فوجی آمریت کی ہمیشہ سرپرستی کی ہے اور اسی رکاوٹ کو یقینی بنانے کے لیے اب وہ ''ولایتِ فقیہ'' کی طرف دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھاتے دکھائی دے رہے ہیں۔

ہم ایک عرصہ سے دہائی دے رہے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کی سنی قیادت کو خواب غفلت سے بیدار ہو کر کھلی آنکھوں سے حالات کا جائزہ لینا چاہیے۔ سنی قیادت سے ہماری مراد حکومتیں اور حکمران طبقات نہیں بلکہ ارباب علم و دانش ہیں۔ ہم بھی اسے اصلاً سنی شیعہ تصادم نہیں سمجھتے لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ عالمی استعمار کے ایجنڈے کی تکمیل کا موجودہ وقت میں عنوان اور ذریعہ بہر حال یہی ہے۔ ہم اس سے قبل بھی عرض کر چکے ہیں کہ ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد اگر ایرانی قیادت خود کو ارد گرد کے ممالک کی دینی تحریکات کے حریف کے طور پر سامنے لانے کی بجائے رفیق و معاون کا کردار ادا کرتی تو یہ عالمِ اسلام میں عالمی استعمار کے مذموم ایجنڈے کے لیے موت کا پیغام ہوتا۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا اور استعماری قوتوں کو اسی بدقسمتی کے مین گیٹ سے اپنا ایجنڈا آگے بڑھانے کا موقع ملا ہے۔ ہم ایران کے پڑوسی ممالک کی دینی تحریکات کو بھی اس سلسلہ میں بے قصور نہیں سمجھتے، لیکن ہمارے نزدیک ٹرننگ پوائنٹ وہی تھا جہاں سے گاڑی غلط رخ پر مڑ گئی اور اسی رخ پر اب تک چلی جا رہی ہے۔

اس حوالہ سے ایرانی قیادت کو احساس دلانے کی ضرورت ہے اور اگر ایرانی قیادت اپنے اس یک طرفہ اور حریفانہ طرز عمل پر نظر ثانی کے لیے تیار ہو تو اسے قبول کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ استعماری قوتوں کے عزائم کو مزید آگے بڑھنے سے روکنے کا اور کوئی راستہ موجود نہیں ہے۔ لیکن اس

سے پہلے اور اس سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ سنی قیادت حالات و واقعات کے صحیح ادراک کے ذوق سے بہرہ ور ہو اور پورے شعور و ادراک کے ساتھ پہلے عالمِ اسلام اور پھر اہلِ سنت کے نفع و نقصان کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر اپنے لیے کوئی واضح رخ اور پالیسی طے کرنے کی پوزیشن میں آئے، ورنہ اس وقت ہماری صورت حال اس سے مختلف نہیں ہے کہ

رو میں ہے رخش عمر تھمے دیکھیے کہاں
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یمن کا تنازعہ اور عالمِ اسلام کی ذمہ داری

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- مئی ۲۰۱۵ء

یمن کا تنازعہ رفتہ رفتہ مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال کو اس خاص رُخ کی طرف لے جا رہا ہے جس کی نشاندہی ہم ایک عرصہ سے کرتے آ رہے ہیں کہ اس خطہ میں ایران اور سعودی عرب کی کشمکش نے سنی شیعہ کشیدگی کو خانہ جنگی کا مستقل محاذ بنا دیا ہے اور دن بدن اس کے دائرے میں وسعت دکھائی دے رہی ہے۔

عالمی قوتوں کی دلچسپی

اس صورتحال کے پیچھے اصلاً تو امریکی استعمار، اسرائیل اور ان کے ہمنوا عالمی حلقے ہیں جن کی دلچسپی شروع سے اس بات میں ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں عرب اور مسلمان ممالک کے درمیان کوئی ایسی وحدت اور اشتراکِ عمل وجود میں نہ آسکے جو اسرائیل کے لیے خطرہ کا باعث بن جائے۔ چنانچہ اس کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف تنازعات کو ابھارا جاتا ہے اور عرب ممالک میں باہمی اختلافات کے ساتھ ساتھ عدم استحکام کا ماحول قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جبکہ عرب لیگ اور مسلم حکمرانوں کی عالمی تنظیم (او آئی سی) کی مسلسل غفلت اور بے پرواہی بھی حالات کو یہاں تک لے جانے کا ایک بڑا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ ایسے اختلافی معاملات میں استعماری قوتوں کے ہاتھ میں سب سے بڑا ہتھیار "سنی شیعہ تنازعہ" ثابت ہو رہا ہے، اس لیے اب ان قوتوں کی ساری توجہ اسے پروان چڑھانے اور اس کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنے پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے۔

انقلاب ایران ۱۹۷۹ء کی منفی ترجیحات

سنی شیعہ کشمکش اس خطہ میں پہلے بھی موجود تھی اور صدیوں سے چلی آ رہی تھی لیکن اس کی علاقائی

سطح پر باہمی محاذ آرائی اور مورچہ بندی کا موجودہ رُخ ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد سامنے آیا، اور اس کی وجہ یہ بنی کہ ایران کی انقلابی مذہبی قیادت نے اپنے کامیاب مذہبی انقلاب کو پڑوسی ممالک تک پھیلانے اور مسلکی بنیاد پر پورے خطے میں اپنے اثر ورسوخ کا دائرہ وسیع کرنے کو مستقل پالیسی کا حصہ بنا لیا اور اس رُخ پر ایران کی مسلسل محنت آج اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ ایران کی انقلابی قیادت اگر مذہبی تعصبات سے بالاتر ہوکر اردگرد ممالک کی دینی تحریکات کا حریف بن جانے کی بجائے حلیف و معاون کا کردار اختیار کرتی تو:

- پڑوسی ممالک کی دینی تحریکات کو تقویت حاصل ہوتی،
- مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل کے تسلط کو مستحکم کرنے کی استعماری پالیسی پر کاری ضرب لگتی،
- عالمی استعمار کی اس خطہ میں موجودگی کا جواز باقی نہ رہتا،
- اور مسلم ممالک کے درمیان ہم آہنگی اور وحدت کو فروغ حاصل ہوتا۔

مگر ایران کی انقلابی قیادت کی مسلکی ترجیحات نے عراق، شام، کویت، لبنان اور بحرین کے بعد یمن میں بھی سنی اور شیعہ آبادیوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا جس سے ہر جگہ خانہ جنگی کا ماحول پیدا ہو گیا اور پورا مشرقِ وسطیٰ سنی شیعہ خانہ جنگی کی آماجگاہ بن کر رہ گیا ہے۔

ہمارے ہاں پاکستان میں بھی ایرانی انقلاب کے بعد ''تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ'' کے قیام اور تحریک نے قومی اور مشترکہ دینی مقاصد کے لیے قیامِ پاکستان کے بعد سے چلی آنے والی سنی شیعہ مفاہمت کو سبوتاژ کر کے رکھ دیا ہے اور ہم نفاذِ اسلام کے حوالہ سے ملک میں پیش قدمی کی صلاحیت سے محروم ہو کر دفاع کی پوزیشن میں آ گئے ہیں۔

اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کی ذمہ داری

ان حالات میں او آئی سی کی سب سے زیادہ یہ ذمہ داری تھی کہ وہ مسلم حکومتوں کو اس صورتحال کی طرف متوجہ کرتی اور عالمِ اسلام کے حکمران آپس میں مل بیٹھ کر مشرقِ وسطیٰ کو اس خانہ جنگی سے نجات دلانے کے لیے کوئی واضح رُخ اختیار کرتے مگر مسلم حکمرانوں کو گویا سانپ سونگھ گیا ہے اور وہ ''ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم'' کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں۔ جبکہ مشرقِ وسطیٰ کے مختلف ممالک میں ایران کی یہ دلچسپی بلکہ عملی کردار بڑھتے بڑھتے سعودی عرب کے گرد گھیراؤ کا منظر پیش کرنے لگا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ یہ ساری کاوش سعودی عرب کے اردگرد گھیرا تنگ کرنے اور ''حرمین شریفین'' کو اپنے اثر ورسوخ کے دائرہ میں لانے کے لیے کی جا رہی ہے جس پر پورے عالمِ اسلام میں عوامی سطح پر بے چینی اور اضطراب دیکھنے میں آ رہا ہے۔

یمن میں حوثی قبائل اور زیدی فرقہ سے تعلق رکھنے والے اہلِ تشیع کی ملک کی منتخب حکومت کے خلاف مسلح بغاوت نے گزشتہ دنوں عدن کی طرف بڑھنا شروع کیا تو اہل فکر کے اضطراب میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا، اس لیے کہ عدن پر ایران کی سرپرستی میں حوثیوں کے قبضہ کا مطلب خود سعودی عرب کا براہ راست اس کی زد میں آجانا ہے جس سے سعودی عرب کی سرحدات کے ساتھ ساتھ حرمین شریفین کا ماحول بھی خطرات و خدشات کے حصار میں محسوس ہونے لگا۔ اسی خدشہ کے پیش نظر سعودی حکومت نے پاکستان سے عملی تعاون کی درخواست کی جس کا جواب پارلیمنٹ کی قرارداد کی صورت میں یہ دیا گیا کہ حرمین شریفین کے تحفظ اور سعودی عرب کی داخلی سلامتی کے دفاع میں تو ہم سعودی عرب کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں گے مگر یمن کے تنازعہ میں فریق بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پارلیمنٹ کی یہ قرارداد اصولی طور پر سعودی عرب کے حق میں ہونے کے باوجود یمن کے تنازعہ میں غیر جانبداری کا تاثر دینے کے باعث مستقل موضوع بحث بن گئی اور مختلف حوالوں سے اس کی وضاحتوں کا سلسلہ جاری ہے۔

میرے خیال میں یہ کنفیوژن اس لیے پیدا ہوا ہے کہ یمن کے تنازعہ کو مشرقِ وسطیٰ کی عمومی صورتحال سے الگ سمجھ کر اسے یمن کا داخلی جھگڑا یا زیادہ سے زیادہ سعودی عرب کے ساتھ تنازعہ تصور کر لیا گیا، ورنہ اگر اس مسئلہ کو مشرق وسطیٰ کے عمومی تناظر میں دیکھا جائے اور اس کے پس منظر میں گزشتہ چار عشروں سے جاری علاقائی کشمکش پر نظر ڈالی جائے تو اسے صرف یمن اور سعودی عرب کا تنازعہ قرار دینا محض ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ معروضی صورتحال میں سب سے پہلے مسلم حکمرانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ فوری طور پر مل بیٹھیں اور اس مسئلہ کا کوئی باوقار اور سب کے لیے قابل قبول حل نکالیں، اس کے ساتھ ہی حرمین شریفین کے تقدس اور سعودی عرب کی سالمیت کے حوالہ سے عالمِ اسلام میں پیدا ہونے والے اضطراب کو دور کرنے کے لیے عالمی سطح پر کوشش کا اہتمام کریں۔ اس کے بعد حکومت پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں اور ہر مرحلہ پر پاکستان کا غیر مشروط ساتھ دینے والے برادر ملک سعودی عرب کو ”اسلامی جمہوریہ پاکستان“ کے بارے میں بے اعتمادی کا شکار نہ ہونے دے بلکہ اس نازک مرحلہ میں مکمل حمایت و تعاون کا ماحول پیدا کر کے اپنی ملی اور اخلاقی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ پاکستان کے کروڑوں عوام کے دلی جذبات کی صحیح ترجمانی کا اہتمام کرے۔

عالمی قوتوں کے ساتھ ایران کے جوہری معاہدے کا جائزہ

روزنامہ اسلام، لاہور ---۲۷ جولائی ۲۰۱۵ء

بڑی طاقتیں کہلانے والے چھ ملکوں کے ساتھ ایران کا ایٹمی معاہدہ اس وقت پوری دنیا میں زیر بحث ہے اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر اظہار خیال کا سلسلہ جاری ہے۔ معاہدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ان چھ ملکوں نے ایران کو اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے ایٹمی پروگرام کو دس سال تک ایٹم بم بنانے کے لیے استعمال نہیں کر سکے گا۔ اور اس سلسلہ میں عالمی سطح پر نگرانی کرنے والے اداروں کو اپنی ایٹمی تنصیبات اور اثاثوں تک رسائی فراہم کرنے کا پابند ہوگا۔ جبکہ بڑی طاقتوں نے سلامتی کونسل کے ذریعہ ایران کو اس بات پر مجبور کرنے کے لیے جو اقتصادی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں وہ پابندیاں ختم کر دی جائیں گی۔ سلامتی کونسل نے اس معاہدہ کی منظوری دے دی ہے مگر امریکی کانگریس میں اس کی منظوری کا مرحلہ ابھی باقی ہے جسے رکوانے کے لیے اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ اور انہیں توقع ہے کہ چونکہ امریکی کانگریس میں ری پبلکن پارٹی کی اکثریت ہے جو صدر اوباما کے اس اقدام کی مخالفت کر رہی ہے اور خود صدر اوباما کی ڈیموکریٹک پارٹی میں بھی اس معاہدہ کے مخالفین موجود ہیں، اس لیے وہ امریکی کانگریس سے اس معاہدہ کو منظور نہ کرنے کا فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جبکہ صدر اوباما نے کہہ دیا ہے کہ اگر کانگریس نے یہ معاہدہ منظور نہ کیا تو وہ کانگریس کے اس فیصلے کو ویٹو کر دیں گے جس کا انہیں دستوری طور پر اختیار حاصل ہے اور اس طرح یہ معاہدہ بدستور نافذ العمل رہے گا۔

اس معاہدہ پر اسرائیل کے ساتھ ساتھ خلیجی تعاون کونسل نے بھی تحفظات کا اظہار کیا ہے اور امریکی وزیر دفاع نے اسرائیل کا دورہ کر کے ان تحفظات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ وزیر خارجہ جان کیری اسی سلسلہ میں قطر کا دورہ کرنے والے ہیں۔ دوسری طرف اس معاہدہ پر عمل درآمد کی صورت میں مشرقِ وسطیٰ کی صورت حال میں جن تبدیلیوں کی توقع کی جا رہی ہے وہ اس مسئلہ کا ایک مستقل پہلو ہے اور اس کا الگ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک معاہدہ کا تعلق ہے، اصولی حوالہ سے اس میں سب سے زیادہ توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس معاہدہ کے ذریعہ چند ملکوں کا یہ حق ایک بار پھر عالمی سطح پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ عسکری قوت اور ہتھیاروں کے بارے میں انہیں یہ اتھارٹی حاصل ہے کہ وہ جن ہتھیاروں کو ممنوع قرار دے دیں وہ ان

کے علاوہ باقی سب ملکوں کے لیے ممنوع قرار پائیں گے۔ اور اپنے سوا دیگر ممالک کے لیے وہ جن ہتھیاروں کا رکھنا اور تیار کرنا جائز قرار دیں گے انہیں صرف وہی ہتھیار تیار کرنے، رکھنے اور استعمال کرنے کا حق ہوگا۔

ایٹم بم کے بارے میں بھی یہی فلسفہ کار فرما ہے کہ جن کے پاس موجود ہیں اور جنہیں ایٹمی قوت تسلیم کر لیا گیا ہے ان کے پاس ایٹم بموں کے ذخیرے تو جائز ہیں مگر ان کے علاوہ کسی ملک کے پاس ایک ایٹم بم کی موجودگی بھی ناقابل برداشت جرم ہے۔ ایٹم بم کے علاوہ چند دوسرے ہتھیار بھی اس فہرست میں شمار ہوتے ہیں اور انہی "ممنوعہ ہتھیاروں" کی موجودگی کی جھوٹی اطلاعات پر حال میں ہی ان اجارہ دار قوتوں نے عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔ مگر لاکھوں افراد کے قتل کے بعد بھی وہ عراق میں ممنوعہ ہتھیاروں کی موجودگی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے اور نہ ہی اپنی اس ڈھٹائی پر کسی قسم کی شرمساری کے اظہار کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔

ایران کے سپریم لیڈر آیت اللہ خامنہ ای نے کہا ہے کہ انہوں نے فتویٰ دے رکھا ہے کہ ایٹم بم کا شمار شرعی طور پر جائز ہتھیاروں میں نہیں ہوتا اس لیے ایران کا ایٹمی ہتھیار بنانے کا پہلے سے ہی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن اس بات سے قطع نظر کہ ان کا یہ فتویٰ شرعی اصولوں کے مطابق کہاں تک درست ہے، یہ بات سمجھنا باقی ہے کہ اگر ایرانی قیادت کے نزدیک ایٹمی ہتھیاروں کو شرعاً جواز کا درجہ حاصل نہیں ہے تو پھر ایٹم بم نہ بنانے کے وعدہ کو دس سال تک محدود کرنے کا کیا مطلب ہے۔ اور کیا دس سال کے بعد ایٹم بم کی تیاری شرعاً جائز ہو جائے گی؟ اس معمہ کو ایرانی قیادت ہی حل کر سکتی ہے، ہماری سمجھ سے تو یہ بہر حال بالاتر ہے۔

اس سلسلہ میں شمالی کوریا کا یہ موقف زیادہ اصولی لگتا ہے جس میں اس کی وزارت خارجہ کے ترجمان نے کہا ہے کہ ان کا ملک اس قسم کے کسی معاہدہ کے لیے مذاکرات میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ وہ ایٹمی ملک ہے اور ایٹمی ملک کہلوانا پسند کرتا ہے۔ گویا شمالی کوریا چند اجارہ دار ملکوں کی اس اجارہ داری کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے کہ ایٹم بم بنانا اور رکھنا صرف چند ملکوں کا ہی حق ہے اور ان کے علاوہ دنیا کے کسی ملک کے لیے یہ جائز نہیں ہے۔

اس مسئلہ کا دوسرا اور ہمارے نزدیک زیادہ اہم پہلو یہ ہے جس کا اظہار خلیجی ممالک کی باہمی تعاون کی تنظیم نے مشرقِ وسطیٰ میں بڑھتے ہوئے ایرانی اثر و رسوخ پر تشویش کی صورت میں کیا ہے اور اس تشویش کو دور کرنے کے لیے امریکی وزیر خارجہ جان کیری چند روز میں قطر کا دورہ کرنے والے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ میں ایرانی اثر و رسوخ کی معروضی صورت حال یہ ہے کہ عراق، شام، لبنان اور یمن

اس کی سیاسی و عسکری مداخلت کی براہ راست جولان گاہ بنے ہوئے ہیں، جبکہ سعودی عرب بھی ایران کے تیار کردہ عسکری گروپوں کی یلغار کی مسلسل زد میں ہے جس کا اظہار یمن کی سرحد کے ساتھ ساتھ سعودی خطہ میں روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔ اس صورت حال کا ایک رخ علاقائی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں قیادت کے لیے ایران اور سعودی عرب کی واضح طور پر نظر آنے والی کشمکش میں ایران کا پلڑا بھاری ہوتا جارہا ہے اور چھ بڑی طاقتوں کے ساتھ ایٹمی معاہدہ کے بعد ایران اپنے عالمی ایجنڈے کو سردست موقوف کرتے ہوئے اپنے مشرقِ وسطیٰ والے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے فارغ ہوگیا ہے۔ اور اقتصادی پابندیاں ہٹنے کے بعد اس کی معیشت کے مضبوط و مستحکم ہونے سے اس کے مواقع بھی اسے پہلے سے کہیں زیادہ میسر آنے والے ہیں۔ جبکہ اس معاہدہ کو اگر مشرق وسطیٰ کے بارے میں ان چھ بڑے ملکوں کی پالیسی اور کردار میں نئے رجحانات کا پیش خیمہ سمجھا جائے تو خلیجی تعاون تنظیم کی طرف سے جس تشویش کا اظہار کیا گیا ہے اس کی سنگینی میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔

جبکہ اس معروضی تناظر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جسے مسلکی منظر میں ممکنہ تبدیلیوں کا باعث سمجھا جاسکتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی کشمکش ایک نئے راؤنڈ میں داخل ہورہی ہے۔ ہمارے بعض دوست اس سنی شیعہ کشمکش کی موجودگی سے انکاری ہیں جو ہمارے خیال میں شترمرغ کی طرح صحرا میں طوفان آتا دیکھ کر ریت میں سر دبا لینے کے مترادف ہے، یا کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے کی طرح ہے۔ اس لیے کہ اگر عراق، لبنان، شام اور یمن میں ایک عرصہ سے جاری کشمکش اب سعودی عرب اور بحرین کا رخ کرتی ہے تو حرمین شریفین کو درپیش خطرات و خدشات کو غیر حقیقی قرار دینے اور وحدت امت کے نام پر اسے نظر انداز کر دینے کا کوئی جواز اور موقع باقی نہیں رہے گا۔ مشرقِ وسطیٰ کی تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حال کا یہی وہ اہم ترین پہلو ہے جس کی طرف ہم اہلِ سنت کی دینی و سیاسی دانش کو توجہ دلانے کی ایک عرصہ سے کوشش کر رہے ہیں۔ مگر وہاں تو ''ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم'' کا منظر دکھائی دے رہا ہے۔ اللہ پاک ہمارے حال پر رحم فرمائے، آمین یارب العالمین۔

مشرقِ وسطیٰ میں مسلکی کشمکش

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۳۱ جولائی ۲۰۱۵ء

مشرقِ وسطیٰ کے متعدّد ممالک میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان سالہا سال سے جاری کشمکش بلکہ خانہ جنگی کے بارے میں جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ سنی شیعہ کشمکش نہیں ہے یا اسے سنی شیعہ کشمکش کا عنوان نہیں دینا چاہیے تو دل کی بات یہ ہے کہ خود میرا بھی جی چاہتا ہے کہ یہی بات

کہوں اور مسلسل کہتا چلا جاؤں۔ لیکن معروضی حال کو دیکھتا ہوں تو کھلی آنکھوں سے نظر آنے والا منظر اس معصوم سی خواہش کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔

خاموش علاج کی ضرورت و اہمیت

کسی شخص کو کینسر جیسی مہلک بیماری کا سامنا ہو تو بہت سے معالجین اور خاندان کوشش کرتے ہیں کہ اسے اس بیماری کے بارے میں نہ بتایا جائے اور اسے بے حوصلہ کرنے کی بجائے خاموشی کے ساتھ اس کا علاج کیا جاتا رہے۔ لیکن اسے نہ بتانے کے باوجود وہ اس کا علاج ضرور کرتے ہیں اور اسی بیماری کا علاج کرتے ہیں جو اسے لاحق ہے۔

مجھے اس حکمت عملی کی افادیت و ضرورت سے انکار نہیں ہے اور میرا موقف بھی یہی ہے کہ اس کشمکش کو پھیلانے کی بجائے سمیٹنے کی کوشش کی جائے اور اس کا بار بار ڈھنڈورا پیٹنے کی بجائے خاموشی کے ساتھ اس کا حل تلاش کیا جائے، حتیٰ کہ میں یہ تجویز بھی رکھتا ہوں کہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع دونوں کے سنجیدہ دانشوروں کو مل بیٹھ کر اس کا حل نکالنا چاہیے اور امت کو اس گرداب سے نکالنے کی صورتیں تلاش کرنی چاہئیں۔ میں اس حقیقت سے بحمد اللہ پوری طرح باخبر ہوں کہ عالمِ اسلام میں سنی شیعہ کشیدگی کا مسلسل فروغ اور اسے ''نوٹرن'' پوائنٹ تک لے جانا استعماری ایجنڈا ہے اور اس خانہ جنگی کا سب سے زیادہ فائدہ امریکہ اور اسرائیل کو ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسے سمیٹنے کے لیے اس کے پھیلاؤ کی حدود کو جاننا ضروری نہیں ہے؟ اور کیا امت کو اس گرداب سے نکالنے کے لیے اس گرداب اور دلدل کی گہرائی کا جائزہ لینا اس کا اولین تقاضہ نہیں ہے؟

میری کمزوری بلکہ مجبوری یہ ہے کہ خبریں آنکھیں بند کر کے نہیں پڑھتا بلکہ کوئی خبر پڑھتے ہوئے اس کا سیاق و سباق نہ چاہتے ہوئے بھی ذہن کی سکرین پر نمودار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور بعض خبروں پر جذبات و احساسات میں جو تلاطم بپا ہوتا ہے اس کے اظہار کے لیے الفاظ کی تلاش میرے لیے سب سے مشکل کام بن جاتا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال: چند اہم خبریں

اس وقت کراچی سے شائع ہونے والے کثیر الاشاعت اردو ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کا ۲۰ تا ۲۶ جولائی ۲۰۱۵ء کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ اس کے ایک صفحہ پر عالمِ اسلام کے بارے میں اہم خبریں شائع کی گئی ہیں، ان میں سے مشرقِ وسطیٰ کے حوالہ سے چند خبریں ایک نظر دیکھ لیں:

- کویت کے اخبار ''الوطن'' کے مطابق سنی اور شیعہ آبادی نے باہمی یکجہتی کے اظہار کے لیے اہلِ

سنت کی سب سے بڑی مسجد میں جمعہ کی نماز اکٹھے ادا کی ہے اور اس میں کویت کے حکمران الشیخ صباح احمد الجابر الصباح بھی شریک ہوئے ہیں۔ کویت کی آبادی تیرہ لاکھ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے جس میں ایک تہائی آبادی اہلِ تشیع کی ہے۔ کویت میں اسے مذہبی یکجہتی کا ایک اچھا مظاہرہ سمجھا جارہا ہے۔

- لبنان کے ممتاز سیاستدان اور دروز فرقے کے سربراہ ولید جنبلاط نے انکشاف کیا ہے کہ شام کی حکومت اسرائیل کے ساتھ مل کر لبنان، شام اور اسرائیل میں موجود دروز آبادی اور اہلِ سنت کے درمیان موجود مفاہمت کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ شام کے صوبہ السویدا میں ”درع الوطن“ نامی گروہ کے افراد کو گرفتار کیا گیا ہے جنہوں نے تین بدوؤں کو تشدد کرکے قتل کیا تھا۔ تفتیش کے بعد ان لوگوں کا شامی حکومت کے ساتھ گٹھ جوڑ ثابت ہوا ہے۔
- ایران نے شورش زدہ پڑوسی ملک شام میں اپنے اتحادی بشار الاسد کی حکومت کے لیے ایک ارب ڈالر کی مالی مدد کی منظوری دی ہے جبکہ اس سے قبل ایران اپنے اس حلیف کو ۲۰۱۳ء میں بھی تین ارب ڈالر سے زائد مدد فراہم کرچکا ہے۔
- بحرینی پولیس نے اپنے ملک اور سعودی عرب میں دہشت گردی کی ایک بڑی سازش ناکام بنادی ہے۔ بحرین کے محکمہ امن عامہ کے سربراہ میجر جنرل طارق الحسن نے بتایا ہے کہ اس سلسلہ میں جو ساز وسامان اور دھماکہ خیز مواد پکڑا گیا ہے وہ ایرانی پاسداران انقلاب سے وابستہ گروہ بم دھماکوں میں استعمال کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ایران پر الزام لگایا ہے کہ وہ بحرین کے اندرونی امور میں مداخلت کررہا ہے۔
- ایرانی رہبر انقلاب جناب خامنہ ای کے عسکری مشیر جنرل یحییٰ رحیم صفوی نے کہا ہے کہ انہوں نے عراق میں سرگرم شدت پسند تنظیم داعش تک یہ پیغام پہنچا دیا ہے کہ اگر وہ شیعوں کے مقدس مقامات کی طرف بڑھے تو ایران کو ان مقامات کے دفاع کے لیے خود آنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

یہ چند خبریں وہ ہیں جو ایک جریدہ کی ایک ہی اشاعت میں شائع ہوئی ہیں۔

داعش پر قابو پانے میں پاکستان کا کردار

اس پس منظر میں ۲۳ جولائی کو پاکستان کے قومی اخبارات میں شائع ہونے والی اس خبر کو بھی دیکھ لیا جائے کہ وزیراعظم پاکستان جناب محمد نواز شریف کے سیاسی امور کے معاون خصوصی جناب طارق فاطمی

نے امریکہ کا دورہ کر کے وہاں کے سرکردہ حکام سے ملاقاتیں کی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ ان ملاقاتوں میں اس بات پر اتفاق ہو گیا ہے کہ پاکستان میں ''داعش'' پر قابو پانے کے لیے امریکہ اور پاکستان کی حکومتیں مشترکہ حکمت عملی اختیار کریں گی۔ عراق داعش کو صفوی صاحب کے انتباہ اور پاکستان میں مبینہ طور پر موجود داعش سے نمٹنے کے لیے فاطمی صاحب کے امریکی حکام کے مذاکرات سے مستقبل کا جو منظر دکھائی دینے لگا ہے وہ خاصا غور طلب ہے۔ ہمیں داعش سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور عالم عرب کے جمہور علماء کرام کی طرح سے ہم بھی اسے ''خوارج'' کا جدید ایڈیشن ہی سمجھتے ہیں، لیکن داعش کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے اور ہونے جا رہا ہے وہ ضرور تشویشناک ہے۔ بالخصوص میاں شہباز شریف کے سابقہ دور کی طرح ''پولیس مقابلوں'' کا نیا راؤنڈ بہرحال ایک لمحہ فکریہ ہے جس کو نظر انداز کر دینا شاید پاکستان کی دینی دانش کے لیے زیادہ دیر تک ممکن نہ رہے۔

ایران کا ایٹمی سمجھوتہ اور مشرقِ وسطٰی کا مستقبل

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- اگست ۲۰۱۵ء

ایران کے ساتھ چھ بڑے ممالک کے ایٹمی سمجھوتے پر دنیا بھر میں اطمینان کا اظہار کیا جا رہا ہے، ایران میں اسے اپنی کامیابی سمجھتے ہوئے جشن کا سماں ہے، اقتصادی پابندیوں کے ختم ہو جانے پر ہر طرف خوشی منائی جا رہی ہے اور اسے ایران کی سفارتی کامیابی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ معروضی صورتحال میں ہمیں بھی اس سے اختلاف نہیں ہے مگر اصولی طور پر دیکھا جائے تو اسے حالات کے جبر اور طاقت کی حکمرانی کے روایتی طریقِ کار کی ایک بار پھر توثیق کے علاوہ اور کوئی عنوان نہیں دیا جا سکتا کہ دنیا کا ایک ملک ایٹمی ہتھیار بنانے کے حق سے صرف اس لیے ہنسی خوشی دستبردار ہو گیا ہے کہ ایٹمی ہتھیار رکھنے والی قوتوں کو یہ گوارا نہیں ہے کہ ان کے علاوہ کوئی ملک بھی ایٹمی ہتھیاروں کو اپنے استعمال کے لیے تیار کر سکے۔

ایٹمی ہتھیاروں کی اجارہ داری

ان چند ملکوں کو ایٹمی ہتھیار رکھنے کا حق حاصل ہے اور باقی دنیا کو یہ حق حاصل نہیں ہے، اس کے جواز کے لیے یہ خود ساختہ اصول وضع کر لیا گیا ہے کہ یہ چند ملک ذمہ داری کے احساس سے بہرہ ور ہیں اور باقی ساری دنیا اس قابل نہیں ہے کہ اسے اس حوالہ سے ذمہ دار ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا جا سکے،

اس لیے ان چند ممالک کے لیے ایٹمی ہتھیار بنانا اور رکھنا جائز ہے اور باقی کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ پوری دنیا ان کی عسکری برتری کے سامنے سرنگوں رہے اور کوئی ان کو چیلنج نہ کر سکے، جبکہ معروضی صورتحال یہ ہے کہ جو ملک ایٹمی ہتھیار استعمال کر کے ہزاروں افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے وہ اس حوالہ سے سب سے ذمہ داری کا احساس رکھنے والا ملک قرار پایا ہے اور جن ملکوں میں ابھی ایٹمی ہتھیار تیار کر لینے کی نوبت بھی نہیں آئی ان کے سینوں پر ''غیر ذمہ داری'' کے تمغے آویزاں کر دیے گئے ہیں۔ پھر بات صرف ایٹمی ہتھیاروں پر اجارہ داری قائم کرنے تک محدود نہیں بلکہ عالمی نظام کی بنیاد اس اصول پر کھڑی کر دی گئی ہے کہ جس ملک کے پاس ایٹم بم موجود ہے اور جسے ذمہ دار ایٹمی طاقت تسلیم کر لیا گیا ہے اسے یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں بیٹھ کر پوری دنیا کے کسی بھی اجتماعی فیصلے کو صرف ایک انگلی اٹھا کر مسترد کر سکتا ہے اور اس کے لیے کوئی دلیل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا جانے ''جنگل کا قانون'' کسے کہا جاتا ہے اور ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے محاورے کا اطلاق اس کے علاوہ اور کون سے طرز عمل پر ہو سکتا ہے، مگر یہ حالات کا جبر اور طاقت کا کرشمہ ہے کہ بے اصولی پر اصول کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے اور دھونس کو قانون کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔

ان ''بھلے مانسوں'' سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ جو ہتھیار رکھنے کا ایک ملک کو حق حاصل ہے وہ حق دوسرے ملک کو کیوں حاصل نہیں ہے؟ یہ سادہ سی بات ہے جسے میڈیا، لابنگ اور یکطرفہ قانون سازی کے زور سے گورکھ دھندا بنا دیا گیا ہے اور دنیا بھر کے اداروں اور حکومتوں کے ساتھ ساتھ ''عقل و دانش'' بھی اسی کی اسیر ہو کر رہ گئی ہے۔ ہمارے نزدیک چھ بڑے ملکوں کے ساتھ ایران کے ایٹمی سمجھوتے کا سب سے اہم پہلو یہی ہے اور عقل، دانش، انصاف اور عدل کے کسی دائرے میں اسے فٹ کرنے کی ہمیں کوئی صورت سمجھ میں نہیں آ رہی، صرف اتنی بات ہے کہ ایران کے پڑوس میں عراق کی ایٹمی تنصیبات کو اسرائیل نے تباہ کر دیا تھا اور اس ملک میں ممنوعہ ہتھیاروں کی موجودگی کی جھوٹی رپورٹوں پر بڑی طاقتوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، جبکہ لیبیا کے ایٹمی اثاثوں کو یہ اجارہ دار ملک اٹھا کر ہی لے گئے ہیں، (اس صورتحال میں) ایرانی قیادت نے سمجھداری کا ثبوت دیا ہے اور کامیاب سفارتکاری کے ذریعے خود کو عراق اور لیبیا جیسے حشر سے بچا لیا ہے، اسے حکمت و مصلحت تو کہا جا سکتا ہے لیکن کیا یہ انصاف کا تقاضہ بھی ہے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں دینا کم از کم ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

ایران کا مد مقابل کون؟

البتہ اس معاملہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جو ہمارے لیے زیادہ قابل توجہ ہے کہ ایران کا ایک عالمی ایجنڈا تھا جس میں وہ بظاہر امریکہ کے مقابل کھڑا دکھائی دیتا تھا اور یہ بات اس کے علاقائی ایجنڈے میں پیشرفت کے لیے اہم رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ جبکہ اس کا علاقائی ایجنڈا مشرقِ وسطیٰ میں اسی طرح کی چودھراہٹ اور اجارہ داری کے حصول کا ہے جیسی چودھراہٹ کے لیے جنوبی ایشیا میں بھارت ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ ایرانی قیادت تاثر یہ دے رہی ہے کہ اس کا اس محاذ پر مد مقابل اسرائیل ہے جبکہ اس کی پالیسیوں کا ہدف سب سے زیادہ عرب ممالک بن رہے ہیں کہ عراق، یمن، شام، بحرین، کویت اور لبنان اس حوالہ سے اس کی جولانگاہ کا حصہ ہیں اور سعودی دانشوروں کا کہنا ہے کہ ان کا ملک اس کے نشانہ پر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس ایٹمی سمجھوتے کے ذریعے فی الحال ایران نے اپنے عالمی ایجنڈے کو بریک لگائی ہے اور وہ علاقائی ایجنڈے میں پیشرفت کے لیے نہ صرف فارغ ہو گیا ہے بلکہ اس نے عالمی طاقتوں کو اپنا ہمنوا بنا لینے کے امکانات بھی پیدا کر لیے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں جغرافیائی تبدیلیوں اور بین الاقوامی سرحدات میں تغیر و تبدل کے جن خدشات کا عرصہ سے عالمی سطح پر تذکرہ ہو رہا ہے انہیں روبہ عمل لانے کی خدانخواستہ راہ ہموار ہو جائے اور خاص طور پر اس بارے میں وائٹ ہاؤس نے جو اشارات دے رکھے ہیں وہ زمینی حقائق کی صورت اختیار کرنا شروع کر دیں۔

یہ صورتحال عرب ممالک کے لیے بالعموم اور دنیا بھر کے اہلِ سنت کے لیے بالخصوص لمحۂ فکریہ ہے بلکہ حرمین شریفین کے مستقبل کے حوالہ سے الارم کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن کیا ہم نے باہمی مفادات اور ترجیحات کی کشمکش میں فکر، دانش اور حقیقت شناسی کے لیے اندر آنے کی کوئی کھڑکی کھلی بھی چھوڑ رکھی ہے؟ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

سنی شیعہ تصادم روکنے کی ضرورت

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۱ ستمبر ۲۰۱۵ء

دلیل و مناظرہ کو قتل و قتال پر ترجیح دینے کی ضرورت

مشرقِ وسطیٰ ہو یا پاکستان، ہم کسی بھی جگہ سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ اور اس کے فروغ کے حق میں نہیں ہیں اور پہلے کی طرح اب بھی دل سے چاہتے ہیں کہ اس کی شدت اور سنگینی میں کمی لائی جائے اور

اس ماحول کو بحال کرنے کی کوشش کی جائے جو سنی شیعہ کشیدگی کے باقاعدہ خانہ جنگی کی صورت اختیار کرنے سے قبل موجود تھا کہ باہمی اختلافات کے باوجود مشترکہ قومی مسائل میں ایک دوسرے سے تعاون کیا جاتا تھا، اختلافات کو دلیل اور مناظرہ کے دائرے میں محدود رکھا جاتا تھا، ایک دوسرے کے عقیدہ و موقف پر شدید تنقید بھی کچھ حدود کا لحاظ رکھتی تھی، اور باہمی قتل و قتال اور تصادم سے ہر ممکن گریز کیا جاتا تھا۔ ہم نے پاکستان کے قیام کی تحریک سے لے کر تحریکِ ختمِ نبوتؐ، تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ، تحریک تحفظ ناموس رسالتؐ اور دیگر دینی و قومی تحریکات میں مشترکہ کردار ادا کیا ہے۔ اور ان تمام تر اختلافات کے باوجود کیا ہے جنہوں نے اب ہمیں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا رکھا ہے۔ اور سنی شیعہ اختلافات کا جملہ زبان پر آتے ہی دل و دماغ میں عجیب سے ہیجان بپا ہونے لگتا ہے۔

جہاں تک اختلافات کی بات ہے وہ تو صدیوں سے چلے آرہے ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ انہیں ختم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی دونوں میں سے کوئی گروہ دوسرے کو ختم یا مغلوب کر سکتا ہے۔ یہ اختلاف عقیدہ میں بھی ہے، شخصیات میں بھی ہے، فقہ و شریعت میں بھی ہے، اور رسوم و عبادات میں بھی ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ یہ اختلافات کسی طرح ختم کیے جا سکتے ہیں تو وہ انسانی فطرت، معاشرتی نفسیات اور تاریخی پس منظر و عوامل سے بے خبری کا اظہار کرتا ہے۔ البتہ ان اختلافات کا ایسا اظہار اور ان کی بنیاد پر ایسا باہمی رویہ ضرور غور طلب ہے جو کشیدگی میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور باہمی تصادم کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اس کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہم اس پر غور و خوض کی اہل فکر و دانش کو وقتاً فوقتاً دعوت دیتے رہتے ہیں اور اسے اپنی دینی و قومی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔

اسباب و عوامل کا سامنا کرنے کی ضرورت

دراصل ہمارے ہاں یہ سوچ مسلسل پروان چڑھ رہی ہے کہ کسی مسئلہ کو "کیموفلاج" کر دینے سے شاید اس کے حل کی کوئی صورت نکل آتی ہے۔ یعنی مسئلہ کے وجود سے انکار کر دیا جائے، اس پر بحث و تمحیص سے گریز کیا جائے، اور اسے نظر انداز کیا جاتا رہے تو وقتی طور پر وہ آنکھوں سے ضرور اوجھل ہو جاتا ہے لیکن اس کی سطح سمندر جیسی خاموشی کی تہہ میں جو طوفان کروٹیں لے رہے ہوتے ہیں ان میں ایک بھی ابھر آئے تو سب کچھ تہہ و بالا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور پھر جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ بھی نہیں ہو پاتا۔

پاکستان کا داخلی ماحول ہو یا مشرق وسطیٰ کا وسیع تناظر ہو، ہم ہر جگہ اور ہر حوالہ سے اس بات پر زور دیتے آرہے ہیں کہ کشیدگی کی موجودگی کو محسوس کیا جائے، اس کے معروضی تناظر کو کھلی آنکھوں سے دیکھا جائے، اس کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کی جائے، ان پر فریقین کے سنجیدہ اور ارباب دانش کے درمیان مکالمہ کا اہتمام کیا جائے، ان اسباب و عوامل کو کم کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا جائے،

ایک دوسرے کے وجود اور جائز حقوق کا احترام کیا جائے، اور ایک دوسرے کی شکایات و تحفظات کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ یہ کام یک طرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ بنیادوں پر ہونا چاہیے اور ایسے مؤثر افراد و طبقات کو سامنے آنا چاہیے جو عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے دونوں فریقوں سے بات کر سکیں، دونوں کو ایک میز پر لا سکیں، حقیقت پسندانہ توازن قائم کر سکیں اور معاملات کو سلجھانے یا کم از کم مزید بگڑنے سے روکنے کے لیے کوئی کردار ادا کر سکیں۔

ملکی و عالمی سطح پر ثالثی کی ضرورت

ہمارے خیال میں مسئلہ کا اصل حل یہی ہے اور اس کے لیے مشرقِ وسطیٰ کے ماحول میں اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) جبکہ پاکستان کے اندر عدالت عظمیٰ یا ریٹائرڈ جسٹس صاحبان کا کوئی فورم اس کام کو بطریق احسن سرانجام دے سکتا ہے۔ اگر حکومتی سطح پر یا فریقین کی طرف سے اس کی پذیرائی نہ ہو تو بھی غیر جانبدار دانش وروں کا کوئی فورم اپنے طور پر یہ ذمہ داری قبول کر کے آزادانہ انکوائری اور تحقیقات کے ذریعہ سنی شیعہ کشیدگی میں مسلسل اضافہ کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کر کے اس میں کمی لانے کے لیے تجاویز اور سفارشات ملکی اور عالمی رائے عامہ کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ اس سے لوگوں کو اصل صورت حال سمجھنے میں مدد ملے گی اور رائے عامہ کی راہ نمائی ہو جائے گی۔ اور یہ طرز عمل کوئی نئی اور انہونی بات نہیں ہو گی کیونکہ قومی اور عالمی سطح پر تنازعات میں ایسا ہوتا آ رہا ہے اور اس کی افادیت اور تاثیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مثلاً مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ صورت حال کو سعودی عرب اور ایران کے درمیان پراکسی وار سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اور ظاہری تناظر بھی یہی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے نصف درجن کے لگ بھگ ممالک میں یہ کشیدگی آگے بڑھ رہی ہے اور اس کے فروغ کی پشت پر ایران اور سعودی عرب کی موجودگی ہر ایک کو نظر آ رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا موقف یہی ہو گا کہ وہ یہ سب کچھ اپنے دفاع میں کر رہا ہے اور اپنے ہم خیال لوگوں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اپنی سلامتی اور بقا کی خاطر اسے ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن کیا ان دعووں کا زمینی حقائق کی بنیاد پر جائزہ لینا ضروری نہیں ہے؟

سوال یہ ہے کہ زمینی حقائق کیا ہیں، واقعات کی ترتیب کیا ہے، اور ایک دوسرے کے حوالہ سے اقدامات اور پالیسیوں میں توازن و تناسب کیا ہے؟ جب تک ان امور کا جائزہ نہیں لیا جائے گا اور معروضی صورت حال کی پشت پر کار فرما حقائق و اسباب کو سامنے نہیں لایا جائے گا، نہ تو اس کشیدگی بلکہ تصادم کو روکنا ممکن ہو گا اور نہ ہی انصاف کے تقاضے پورے کیے جا سکیں گے۔ دونوں میں سے کسی کو یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کشیدگی اور تصادم کا فائدہ صرف امریکہ، اسرائیل اور ان عالمی

قوتوں کو ہے جو عالمِ اسلام کو بکھری ہوئی حالت میں رکھنا چاہتی ہیں، جنہیں عالمِ اسلام میں دینی بیداری اور مذہبی رجحانات کا فروغ برداشت نہیں ہے، جن کا مفاد اسرائیل کے تحفظ و استحکام اور اس کے ذریعہ مشرقِ وسطیٰ کے وسائل اور دولت پر اپنی گرفت قائم رکھنے میں ہے، اور جو عالمِ اسلام کو اس کے اپنے وسائل کے کنٹرول اور استعمال سے محروم رکھنے میں اپنی عافیت سمجھ رہی ہیں۔

عالمی قوتوں سے گریز کی ضرورت

لیکن اس کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں، اسباب و عوامل کا تعین کریں اور انہیں دور کرنے کے لیے باہمی مکالمہ و مشاورت کے ساتھ راستہ نکالیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم سب نے مسائل کے حل کے لیے امریکہ کی طرف دیکھنے کی روش کو عادت بنا لیا ہے۔ ہماری اپنی پالیسیوں کا تعین بھی واشنگٹن کا موڈ دیکھ کر ہوتا ہے۔ اور اسے دولت و طاقت کا کرشمہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ بہادر بیک وقت حریف بھی ہے، فریق بھی ہے، ریفری بھی ہے، قابض بھی ہے، جج بھی ہے، گواہ بھی ہے، وکیل بھی ہے، اور فیصلہ صادر کرنے کے بعد سزا دینے کی اتھارٹی بھی وہی رکھتا ہے۔ کیا عالمِ اسلام کی مثال آپریشن تھیٹر کے اس مریض کی تو نہیں جسے سرجن نے بے ہوش کر کے اس کے پورے جسم کی چیر پھاڑ شروع کر رکھی ہے؟ بات آپریشن کی حد تک رہتی تو کسی حد تک قابل فہم تھی مگر اب تو یہ آپریشن "پوسٹ مارٹم" کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

گزشتہ دنوں دو بظاہر چھوٹی سی خبریں نظر سے گزریں جن کو کسی تبصرہ کے بغیر قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے دوستوں کو ہماری گزارشات کا مقصد سمجھنے میں اس سے کچھ سہولت ہو جائے۔

ایک خبر روزنامہ "جنگ" کے ملتان ایڈیشن میں ۵ ستمبر کو شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ:

> "ایران کے قونصلیٹ جنرل نے حال ہی میں حکومت پنجاب کی اعلیٰ شخصیات سے ملاقات کر کے انہیں پیش کش کی تھی کہ پنجاب پولیس اور ایران پولیس ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں تاکہ دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے پولیس کو جدید خطوط پر تربیت دی جا سکے۔ ذرائع کے مطابق حکومت پنجاب نے یہ پیش کش قبول کر لی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ سیکرٹری داخلہ پنجاب، آئی جی پولیس پنجاب اور ایڈیشنل آئی جی اسپیشل برانچ پر مشتمل ایک وفد تین روزہ دورے پر ایران جائے گا اور ایران کے پولیس سسٹم کا جائزہ لے گا۔"

جبکہ دوسری خبر روزنامہ ''دنیا'' کے گوجرانوالہ ایڈیشن نے ۸ ستمبر کو شائع کی ہے جس کا متن یہ ہے کہ:

''امریکی اخبار ''واشنگٹن ٹائمز'' نے اپنی رپورٹ میں دعویٰ کیا ہے کہ یمن، شام، لبنان اور غزہ کی پٹی میں ایران اپنے حامی جنگجوؤں کو سالانہ اربوں ڈالر کی امداد مہیا کرتا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ایران وزارت دفاع کا سالانہ بجٹ ۱۴ سے ۳۰ ارب ڈالر کے درمیان ہے جس کا ایک بڑا حصہ بیرون ملک مسلح دہشت گرد گروپوں بالخصوص مشرقِ وسطیٰ میں سرگرم تنظیموں کو پہنچایا جاتا ہے۔ شام میں بشار الاسد کی حمایت میں لڑنے والے اجرتی قاتلوں کو ماہانہ ۵۰۰ سے ایک ہزار ڈالر اجرت ایران کی طرف سے ادا کی جاتی ہے۔ ان میں سے بیشتر جنگجوؤں کا تعلق افغانستان اور دوسرے ملکوں سے ہے، پہلے ان کی ایران ہی میں عسکری تربیت کی جاتی ہے۔''

مسلکی اختلافات اور صدر ممنون حسین

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ --- دسمبر ۲۰۱۵ء

صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان جناب ممنون حسین نے گزشتہ روز رابطہ عالمِ اسلامی کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر عبد اللہ عبد المحسن الترکی حفظہ اللہ تعالیٰ سے ایوان صدر اسلام آباد میں ملاقات کے دوران دو اہم باتوں کا ذکر کیا ہے جس کی طرف نہ صرف رابطہ عالمِ اسلامی بلکہ عالمِ اسلام کے دیگر بین الاقوامی اداروں اور علمی و دینی مراکز کو بھی فوری توجہ دینی چاہیے۔

- ایک بات یہ کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالمی سطح پر چلائی جانے والی مہم اور پروپیگنڈا کا مؤثر جواب دینے کی ضرورت ہے اور صدر محترم کے نزدیک رابطہ عالمِ اسلامی اس کے لیے موزوں فورم ہے۔
- دوسری بات انہوں نے یہ فرمائی ہے کہ مسلکی اختلاف فطری بات ہے اور اختلاف رائے سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر اپنا مسلک دوسروں پر زبردستی لاگو کرنے کی کوشش درست نہیں ہے۔

ڈاکٹر ترکی سعودی عرب کی محترم شخصیت ہیں اور ایک عرصہ سے رابطہ عالمِ اسلامی کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں، ان کے سامنے صدر پاکستان کا ان دو امور کا بطور خاص تذکرہ کرنا انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور ہم بھی اس حوالہ سے کچھ گزارشات پیش کرنا مناسب

سمجھتے ہیں۔

......بدقسمتی سے معروضی صورتحال اس حوالہ سے حوصلہ افزا دکھائی نہیں دے رہی جس کا مظہر مشرقِ وسطیٰ میں سنی شیعہ کشیدگی میں روز افزوں اضافہ ہے اور پورے مشرقِ وسطیٰ میں اپنا اثر و نفوذ بڑھانے بلکہ اسے اپنے دائرہ میں شامل کرنے کے لیے ایرانی حکومت کی حکمتِ عملی اور پالیسیاں ہیں جن کے اثرات مشرقِ وسطیٰ سے ہٹ کر اردگرد کے دیگر ممالک تک پھیلتے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بدقسمتی بھی ہمارے حصہ میں آئی ہے کہ مصر میں اخوانیوں اور سلفیوں کی کشمکش نے جو ماحول قائم کر رکھا ہے وہ بھی مسلسل کشیدگی کے حوالہ سے امید افزا نہیں ہے، اور مزید بدقسمتی یہ ہے کہ اس امر کا تذکرہ بھی اب بادل نخواستہ ضروری محسوس ہونے لگا ہے کہ سعودی عرب اور رابطہ عالمِ اسلامی کی طرف سے دنیائے اسلام کے دینی و علمی حلقوں کے ساتھ ربط و تعاون کا جو نیٹ ورک اس وقت کام کر رہا ہے وہ بھی مسلکی ترجیحات کے تاثر سے خالی نہیں ہے، اور اس کے بارے میں غیر سلفی علمی و دینی حلقوں کی شکایات کا سلسلہ دراز تر ہوتا جا رہا ہے جس کی طرف سنجیدہ توجہ کی ضرورت ہے۔

اس پس منظر میں ہم سعودی حکومت اور رابطہ عالمِ اسلامی سے گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ جہاں ایرانی جارحیت سے سعودی عرب کی سالمیت اور حرمین شریفین کے تقدس کو درپیش خطرات کے سدباب کے لیے عالمِ اسلام میں آگاہی اور بیداری کی ضرورت ہے، وہاں مصر کی اخوانی سلفی کشمکش کے نقصانات کی تلافی بھی ضروری ہے۔ اور اسی طرح عالمِ اسلام میں رابطہ عالمِ اسلامی کی سرگرمیوں کو مسلکی چھاپ کے دائرے سے نکال کر سب کے لیے قابل قبول بنانا بھی ملت اسلامیہ کے مفاد میں ہے۔

صدر پاکستان جناب ممنون حسین اور رابطہ عالمِ اسلامی کے سیکرٹری جنرل کی باہمی گفتگو کی اخباری رپورٹ دیکھ کر جو تاثر ذہن میں قائم ہوا اس کا اظہار ہم نے مذکورہ بالا سطور میں کر دیا ہے، خدا کرے کہ ہمارے حکمران اس نازک وقت میں ملت اسلامیہ کی وحدت و یکجہتی اور اسلامی عقائد و روایات کے تحفظ کی کوئی مناسب صورت نکال سکیں، آمین یا رب العالمین۔

اہلِ تشیع کا جداگانہ تعلیمی نصاب کا مطالبہ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۰ دسمبر ۲۰۱۵ء

اہلِ تشیع کی طرف سے قومی معاملات میں اپنے جداگانہ تشخص و امتیاز کی تحریک نے زور پکڑا تو ان کے مطالبات میں ایک بات یہ بھی تھی کہ سکولوں اور سرکاری تعلیمی اداروں میں ان کے لیے دینیات کا

الگ نصاب رائج کیا جائے اور انہیں اہلِ سنت کے اکثریتی احکام و عقائد کی تعلیم حاصل کرنے سے مستثنیٰ رکھا جائے۔

یہ قصہ ۱۹۷۴ء کے لگ بھگ کا ہے، ملک میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم وزیراعظم تھے۔ اہلِ تشیع کے مطالبے پر ان کے لیے جداگانہ تعلیمی نصاب رائج کرنے کا حکومتی سطح پر فیصلہ ہوا تو اس حوالہ سے تنظیمِ اہلِ سنت پاکستان کے راہنماؤں میں اختلاف رائے ہو گیا۔ حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ، حضرت مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ اور ان کے رفقا کا موقف اس فیصلے کو قبول کر لینے کا تھا۔ جبکہ حضرت مولانا عبد الحئی جام پوریؒ اور دیگر حضرات نے اس سے اختلاف کیا اور تنظیم اہلِ سنت پاکستان دو حصوں میں بٹ گئی۔

قائد جمعیۃ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی حمایت دوسرے فریق کو حاصل تھی، چنانچہ مارچ ۱۹۷۶ء کے دوران شیرانوالہ گیٹ لاہور میں منعقدہ کنونشن میں "مجلسِ تحفظِ حقوقِ اہلِ سنت پاکستان" کے نام سے ایک الگ پلیٹ فارم قائم ہو گیا جس کی سرپرستی حضرت مولانا مفتی محمودؒ کر رہے تھے اور اس کے تاسیسی اجلاس میں شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ بھی شریک تھے۔ مولانا عبد الحئی جام پوریؒ کو نئی تنظیم کا سرپرست، مولانا عبد الشکور دین پوریؒ کو صدر اور مولانا سید عبد المجید ندیمؒ کو سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ جبکہ دوسری طرف تنظیم اہلِ سنت پاکستان کے سربراہ حضرت مولانا سید نور الحسن بخاریؒ اور سیکرٹری جنرل مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ تھے۔ ایک عرصہ تک دونوں جماعتیں اہلِ سنت کے حقوق و مفادات کے تحفظ اور سنی عقائد و افکار کے فروغ کے لیے اپنے اپنے انداز میں ملک بھر میں متحرک رہیں۔ مگر رفتہ رفتہ بڑی شخصیات کے یکے بعد دیگرے رخصت ہو جانے کے بعد ان کی سرگرمیاں ماضی کا حصہ بن گئیں۔......

سعودیہ ایران کشمکش اور اس کے مضمرات

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۹ فروری ۲۰۱۶ء

گزشتہ تین چار روز کے دوران شائع ہونے والی چند خبروں پر ایک بار پھر نظر ڈال لیں:

- سعودی عرب نے داعش کے خلاف لڑنے کے لیے زمینی فوج کے دستے بھجوانے کی پیشکش کی ہے جس کا امریکی صدر اوباما نے خیر مقدم کیا ہے۔
- ایران کے پاسداران انقلاب کے سربراہ محمد علی جعفری نے کہا ہے کہ سعودی عرب اتنا بہادر نہیں ہے کہ وہ یہ کام کر سکے، لیکن اگر اس نے ایسا کیا تو یہ اس کا اقدام خودکشی ہو گا اور اس کے

فوجی دستوں کو ختم کر دیا جائے گا۔

- اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون نے کہا ہے کہ داعش کا دائرہ دن بدن پھیلتا جا رہا ہے اور ان کی رپورٹ کے مطابق اب تک دنیا بھر کے ۳۴ کے لگ بھگ مسلح گروپوں نے داعش کے ساتھ اتحاد کا وعدہ کر لیا ہے۔ بان کی مون کا یہ بھی کہنا ہے کہ داعش کی سرگرمیوں کو محدود کرنا مشکل ہو گیا ہے۔
- ایران کے سپریم لیڈر جناب خامنہ ای نے فرمایا ہے کہ شام میں صدر بشار الاسد کی حمایت میں لڑنے والے ایرانی حضرات مجاہد ہیں اور شام میں ایران کی فوجی کارروائیوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔
- متحدہ عرب امارات کے وزیر مملکت برائے امور خارجہ جناب انور قرقاش نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا ہے کہ متحدہ عرب امارات بھی اپنی زمینی افواج داعش کے خلاف کارروائی میں بھجوانے کے لیے تیار ہے، لیکن اس فوجی اتحاد کے لیے امریکی قیادت ان کی پیشگی شرط ہوگی۔

ان خبروں سے مشرقِ وسطیٰ کی صورت حال اور سعودی عرب اور ایران کی بڑھتی ہوئی کشمکش کے معروضی خدشات و رجحانات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ پاکستان کے وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف اور آرمی چیف جنرل راحیل شریف کے اس دورے کے مثبت نتائج کا ابھی انتظار جاری ہے جو انہوں نے سعودی عرب اور ایران کے درمیان کشیدگی کو کم کرنے اور مفاہمت کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے ریاض اور تہران کے ہنگامی سفر کی صورت میں کیا تھا۔ اس دورے سے نہ صرف پاکستانی قوم بلکہ دنیا کے مختلف حلقوں نے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ خدا کرے کہ یہ توقعات بر آنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، آمین یارب العالمین۔

سعودی عرب اور ایران کی یہ کشمکش مسلسل آگے بڑھ رہی ہے جس سے مشرقِ وسطیٰ میں سنی شیعہ تصادم خوفناک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ عرب اسرائیل تنازعہ بھی پس منظر میں چلا گیا ہے اور پاکستان پر اس کے منفی اثرات کے سیاہ بادل منڈلانا شروع ہو گئے ہیں۔ وطن عزیز پاکستان کی داخلی صورت حال اس سے قبل بھی سنی شیعہ کشمکش اور باہمی خونریزی کے تلخ مراحل سے گزر چکی ہے۔ اس لیے واقفان حال کو اس کے دوبارہ لوٹ آنے کے امکانات و خدشات نے بے چین و مضطرب کر رکھا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ پاکستان سمیت جنوبی ایشیا میں سنی شیعہ کشمکش کی تاریخ صدیوں پرانی ہے لیکن ماضی میں کبھی بھی یہ کشمکش مناظروں، مجادلوں اور تشدد کے اکا دکا انفرادی واقعات سے آگے نہیں

بڑھی۔ جبکہ ایرانی انقلاب کے بعد کی گزشتہ تین دہائیوں میں اس کشمکش نے ایک دوسرے کے خلاف مسلح کارروائیوں اور قتل وقتال کا جو بازار گرم کیا ہے وہ پاکستان کی تاریخ کا بلاشبہ ایک المناک باب ہے، اسے مشرقِ وسطیٰ کے ان معاملات سے الگ نہیں کیا جا سکتا جو مبینہ طور پر سعودی عرب اور ایران کے درمیان پراکسی وار کا حصہ سمجھے جا رہے ہیں، اور آئندہ بھی اس پراکسی وار کا تسلسل پاکستان کے داخلی حالات پر پہلے کی طرح اثرانداز ہوتا رہے گا۔

اس پس منظر میں گزشتہ روز لاہور میں ''متحدہ سنی محاذ'' کی رابطہ کمیٹی کا ایک مشاورتی اجلاس مولانا عبد الرؤف فاروقی کی رہائش گاہ پر ان کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں جناب حاجی عبد اللطیف خالد چیمہ اور راقم الحروف کے علاوہ مفتی محمد سفیان قصوری، مفتی محمد مغیرہ، قاری محمد قاسم، حافظ محمد بلال فاروقی اور حافظ محمد زبیر جمیل نے بھی شرکت کی۔

اجلاس میں اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی گئی کہ عالمِ اسلام کی سیاسی قیادت اور علمی وفکری راہنماؤں سے گزارش کی جائے کہ وہ اس سلسلہ میں خاموش تماشائی کا کردار ادا نہ کریں بلکہ آگے بڑھ کر اس کشیدگی کو مزید بڑھنے سے روکنے کے لیے مؤثر اقدامات کی کوئی صورت ضرور نکالیں۔ اس حوالہ سے سب سے زیادہ ذمہ داری او آئی سی یعنی مسلم ممالک کے سربراہان حکومت پر عائد ہوتی ہے کہ وہ فوری طور پر مل بیٹھیں۔ اس کے لیے او آئی سی کا ہنگامی سربراہی اجلاس طلب کیا جائے اور سعودی عرب اور ایران کی باہمی شکایات و تنازعات کا جائزہ لینے کے لیے عالمِ اسلام کی مقتدر علمی وسیاسی شخصیات پر مشتمل بین الاقوامی کمیشن قائم کیا جائے جو دونوں ملکوں کے باہمی تنازعات وشکایات کے بارے میں جامع رپورٹ مرتب کر کے ان کے ازالہ کے لیے تجاویز پیش کرے۔

سعودی عرب اور ایران کی باہمی شکایات و تنازعات کے بارے میں مستند معلومات اور حقائق کا منظر عام پر آنا اور اس سے عالمی رائے عامہ کو آگاہ کرنا اس معاملہ کی اولین ضرورت ہے۔ اس کے بعد ان کو حل کرنے اور ان میں کمی لانے کی مثبت اور مؤثر کوششیں درکار ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام او آئی سی یا کم از کم مؤتمر عالمِ اسلامی جیسے بین الاقوامی ادارے ہی کر سکتے ہیں۔ جبکہ انہیں اس طرف متوجہ کرنے کے لیے مؤثر اور سنجیدہ محنت کے لیے شخصیات اور اداروں کو ضرور محنت کرنی چاہیے۔ اس بارے میں دوسری رائے نہیں ہو سکتی کہ مشرق وسطیٰ ہو یا پاکستان، سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ دونوں فریقوں میں سے کسی کے مفاد میں نہیں ہے، بلکہ اس سے عالمِ اسلام کو شدید نقصان ہوگا اور اسرائیل اور اس کے سرپرستوں کے سوا کوئی بھی اس سے فائدہ حاصل نہیں کر سکے گا جو کہ ملت اسلامیہ

کے لیے یقیناً بدقسمتی کی بات ہوگی۔ جبکہ مشرق وسطیٰ میں داعش کی دہشت گردی اور امریکی پالیسیاں بھی مستقل طور پر عالمِ اسلام کے لیے دردِ سر بنی ہوئی ہیں۔......

مشرقِ وسطیٰ میں ایران اور سعودیہ کا کردار

روزنامہ دنیا سنڈے میگزین، لاہور---۱۷ جولائی ۲۰۱۶ء

......

سوال: مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ صورتحال کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: ایران نے انقلاب کے بعد اسے اپنی ملکی حدود میں رکھنے کی بجائے اس کے اثرات کو دیگر ممالک تک پہنچانے اور پورے مشرقِ وسطیٰ کو کنٹرول کرنے کی کوششیں کیں، آج کے حالات اسی کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے ہاں پاکستان میں بھی جب یہ کوششیں شروع ہوئیں تو ردعمل میں تنظیمیں بنیں۔ یہی ردعمل بحرین، کویت اور عراق میں سامنے آیا۔

سوال: یہی الزام سعودی عرب پر بھی تو لگایا جاتا ہے۔ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

جواب: سعودی عرب نے سلفی فکر کو حنفیوں اور اخوانیوں کے مقابلے میں آگے بڑھایا، ایران کے مقابلے پر نہیں۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ مالی امداد ہی دیتے ہیں جبکہ یہ تو سب کچھ ہی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ سعودی عرب کے پاس صرف پیسے ہی ہیں۔ انہوں نے پورے عالمِ اسلام کو سنبھالنے کے لیے کئی ایسے اقدامات کیے جن کے مثبت اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ لیکن اب وہ کچھ پالیسیوں پر نظر ثانی کر رہے ہیں مگر بہت تاخیر سے ایسا ہو رہا ہے۔

سوال: مشرقِ وسطیٰ کے حالات کے تناظر میں فرقہ وارانہ انتشار کو روکنے کے لیے کیا اقدامات کرنے کی ضرورت ہے؟

جواب: او آئی سی کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ اسے اب گہری نیند سے جاگنا ہوگا۔ اس مسئلے کے دو پہلو ہیں۔ ایک شیعہ سنی لڑائی جبکہ دوسرا عالمی استعمار کے مفادات۔ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے او آئی سی کے پلیٹ فارم سے سعودیہ اور ایران کو اپنی اپنی حدود میں لانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم تو صرف اپیل ہی کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

......

ترکی اور مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال پر ایک اجلاس

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۰ جولائی ۲۰۱۶ء

گزشتہ روز جمعیۃ علماء اسلام (س) پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا عبد الرؤف فاروقی نے ''متحدہ سنی محاذ پاکستان'' کی رابطہ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا جس کا مقصد مشرقِ وسطیٰ کی صورت حال بالخصوص حرم نبویؐ اور دیگر مقامات پر خونریز دھماکوں سے پیدا شدہ حالات اور حج بیت اللہ کے موقع پر سعودی عرب اور ایران کے تنازعہ کے حوالہ سے سامنے آنے والے خدشات کا جائزہ لینا اور اس سلسلہ میں سنجیدہ دینی حلقوں کو فکر مندی دلانے کی کوشش کرنا تھا۔ اجلاس میں کمیٹی کے ارکان، مجلس احرار اسلام کے سیکرٹری جنرل حاجی عبد اللطیف چیمہ اور راقم الحروف کے علاوہ پاکستان شریعت کونسل کے مولانا قاری جمیل الرحمن اختر، مفتی محمد مغیرہ، حافظ محمد بلال فاروقی، اور حافظ شفقت اللہ بھی شریک ہوئے۔
کمیٹی نے تفصیلی غور و خوض کے بعد مختلف امور پر مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا:

ترک عوام نے جس جرأت اور دلیری کے ساتھ ایک فوجی گروہ کی بغاوت کو ناکام بنایا ہے وہ لائق تحسین ہے اور اس پر ترکی کے صدر جناب طیب اردگان اور پوری ترکی قوم مبارکباد کی مستحق ہے۔ جناب طیب اردگان کی قیادت میں ترکی کی منتخب جمہوری حکومت ترک عوام کی خدمت، ملک کی ترقی و استحکام اور ترک قوم کے امتیاز و تشخص کو اجاگر کرنے کے لیے جس تدبر اور حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے، حالیہ ناکام فوجی بغاوت اس کے خلاف ایک عالمی سازش کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کا مقصد اردگان حکومت کو ترک عوام کی بے لاگ نمائندگی اور ترکی کو عالمی سیاست بالخصوص عالمِ اسلام کے مسائل میں جرأت مندانہ کردار سے روکنا تھا۔ اور ترک عوام نے اسے ناکام بنا کر ایک آزاد اور زندہ دل قوم ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ہم اس مرحلہ پر اپنے ترک بھائیوں کے ساتھ ہیں اور انہیں خراج تحسین و تبریک پیش کرتے ہوئے دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت ترکی کو مزید استحکام و ترقی سے نوازیں اور ترک عوام اور ان کی قیادت کی حفاظت فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ صورت حال ہمارے نزدیک ایران کی اس مسلسل پالیسی کا نتیجہ ہے جو انقلاب ایران کے بعد اس انقلاب کے اثرات کو اردگرد کے ممالک میں پھیلانے اور خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ کے معاملات کو کنٹرول کرنے کے لیے اختیار کی گئی۔ اور اس پالیسی کے تحت بتدریج عراق، شام، یمن اور لبنان میں حالات کو خراب کر کے مداخلت کی راہ ہموار کی گئی اور ان ممالک میں

فرقہ وارانہ خانہ جنگی کا ماحول پیدا کر کے اب بحرین کو افراتفری کے اس ماحول میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ سعودی عرب کے گرد حصار مکمل کر کے حرمین شریفین کو گھیرے میں لینے کی اسکیم کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ ہمارے خیال میں نہ تو سعودی عرب نے اس صورتحال کا صحیح ادراک کرنے اور اس کے لیے اپنے مخصوص دائرے سے باہر نکل کر وسیع پیمانے پر مشاورت و تعاون کا ماحول پیدا کرنے کی طرف سنجیدہ توجہ دی ہے اور نہ ہی اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کوئی مؤثر کردار ادا کرنے میں پیش رفت کرتی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ مسئلہ پورے عالمِ اسلام کا ہے کیونکہ اسے کنٹرول کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو پورا عالمِ اسلام اس سے متاثر ہوگا اور تیزی سے بڑھتی اور پھیلتی ہوئی اس فرقہ وارانہ کشیدگی اور باہمی تصادم کا فائدہ اسرائیل اور اس کے پشت پناہوں کے سوا کسی کو نہیں ہوگا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ایران اور سعودی عرب دونوں سے اس مسئلہ پر بات کی جائے، دونوں کی باہمی شکایات کا جائزہ لیا جائے اور اس تنازعہ کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لیے دونوں کو ایک میز پر لایا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ عالمی قوتوں سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی اس لیے کہ وہ خود اس آگ کو بھڑکانے میں خاص دلچسپی رکھتی ہیں اور اسی میں وہ اپنا مفاد سمجھتی ہیں۔ اس لیے عالمِ اسلام کو ہی اس سلسلہ میں کوئی کردار ادا کرنا ہوگا اور اس کے لیے سب سے اہم کردار او آئی سی کا بنتا ہے کہ وہ خاموش تماشائی بنے رہنے کی بجائے اس معاملہ میں متحرک ہو۔ ہمارے خیال میں حج بیت اللہ سے پہلے او آئی سی کا سربراہی اجلاس ضروری ہے جو حرمین شریفین کے تحفظ، مشرقِ وسطیٰ میں سنی شیعہ تصادم کو روکنے، سعودی عرب اور ایران کی باہمی شکایات کو دور کرنے اور کسی بھی طرف سے ہونے والے تشدد کی روک تھام کے لیے ٹھوس لائحہ عمل اختیار کرے۔ ہماری رائے میں پاکستان اور ترکی کی حکومتیں اس سلسلہ میں مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں جبکہ مسلم حکمرانوں کو اس طرف توجہ دلانے کے لیے سیاسی و دینی حلقوں اور علمی مراکز کا متحرک ہونا ضروری ہے۔ اور عالمِ اسلام کی رائے عامہ کو بیدار و منظم کرنا وقت کا اہم تقاضہ ہے۔......

ملی یکجہتی کونسل کا پس منظر

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۲ اکتوبر ۲۰۱۶ء

۲۸ ستمبر بدھ کا دن لاہور میں مختلف سرگرمیوں میں مصروف گزرا، اس سفر میں عزیزم حافظ محمد خزیمہ خان سواتی ہمراہ تھا جو میرا چھوٹا نواسہ ہے اور فیس بک پر میرے نام کا پیج چلا رہا ہے جس پر شائقین کے لیے میری ویڈیوز اور تحریریں شائع کرتا رہتا ہے۔ منصورہ میں ملی یکجہتی کونسل پاکستان کا

سالانہ اجلاس تھا جس میں شرکت کے لیے بطور خاص سردار محمد خان لغاری صاحب اور پیر محمد محفوظ مشہدی صاحب نے مجھے فرمایا تھا۔

ملی یکجہتی کونسل کا قیام اب سے دو عشرے قبل عمل میں لایا گیا تھا۔ مولانا شاہ احمدؒ نورانیؒ، مولانا سمیع الحق، قاضی حسین احمدؒ، ڈاکٹر اسرار احمدؒ، اور دیگر زعماء اس میں سرگرم عمل تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ملک میں سپاہ صحابہؓ اور تحریک جعفریہ آمنے سامنے تھیں، سنی شیعہ کشیدگی قتل و غارت کے عروج کے دور سے گزر رہی تھی اور دونوں طرف کی بہت سی قیمتی جانیں اس کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ اس پس منظر میں ملی یکجہتی کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ اس کشیدگی کو کنٹرول کیا جائے اور فرقہ وارانہ تصادم کو مزید آگے بڑھنے سے روکا جائے۔ چنانچہ دونوں طرف کے ذمہ دار حضرات کو اس میں شریک کیا گیا اور ایک میز پر بٹھا کر سترہ نکاتی ''متفقہ ضابطہ اخلاق'' دونوں کی منظوری سے طے کیا گیا۔ ایک طرف سے علامہ ساجد علی نقوی اور دوسری طرف سے مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ قیادت کر رہے تھے جن کے ساتھ علامہ ضیاء الرحمان فاروقی شہیدؒ اور مولانا محمد احمد لدھیانوی بھی اس کارِ خیر میں شریک تھے۔

علامہ سید ساجد علی نقوی اور مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ نے جس حوصلہ، تدبر اور جذبۂ حب الوطنی کے ساتھ اس کشیدگی کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے کردار ادا کیا اس کے باعث مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا سمیع الحق اور قاضی حسین احمدؒ کی قیادت میں ملی یکجہتی کونسل فرقہ وارانہ تصادم کے اس طوفان کے سامنے بند باندھنے میں کامیاب ہوگئی جسے پاکستان کی تاریخ میں کونسل کے ایک شاندار کارنامہ کے طور پر ہمیشہ ذکر کیا جائے گا۔ میں بھی اس دور میں ملی یکجہتی کونسل کے ساتھ شریک کار تھا۔ کونسل نے اس موقع پر ناموس رسالتؐ کے تحفظ کے قانون کے لیے عوامی رائے کو منظم کرنے کا کردار بھی مؤثر طور پر ادا کیا جس کے نتیجے میں تاریخ ساز ملک گیر ہڑتال ہوئی اور ناموس رسالتؐ کے قانون کو خدانخواستہ تبدیل کرنے کے لیے بین الاقوامی دباؤ کا حکومت پاکستان کامیابی کے ساتھ سامنا کر سکی۔ میں اس ملک گیر ہڑتال کے کارکنوں میں شامل تھا اور اسے اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں۔

ملی یکجہتی کونسل پاکستان کا دوسرا دور محترم قاضی حسین احمدؒ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں متحرک کیا تھا۔ انہوں نے مجھے بھی بذات خود اس میں شریک کار بننے کی دعوت دی تھی لیکن میرا ذوق اب عملی تحریکات سے الگ رہتے ہوئے فکری اور علمی حوالہ سے تگ و دو کے دائرہ میں محدود ہو کر رہ گیا ہے اس لیے اس میں متحرک نہ ہو سکا۔ البتہ ۲۸ ستمبر کے اجلاس میں مذکورہ بالا دوستوں کے ارشاد پر حاضر ہو گیا جو ملی یکجہتی کونسل کے دوسرے دور کے کسی اجلاس میں میری پہلی حاضری تھی۔ قومی وحدت، ملکی سالمیت، اور ملی اتحاد کے لیے جن جذبات کا اجلاس میں اظہار کیا گیا وہ قابل قدر تھے۔ اور اجلاس میں

مولانا صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر الوری، جناب سراج الحق، حافظ عبد الرحمان مکی، جناب لیاقت بلوچ، حافظ عاکف سعید، علامہ ساجد علی نقوی، علامہ نیاز حسین نقوی، مولانا محمد امجد خان، مولانا عبد الوہاب روپڑی، مولانا عبد الرؤف ملک، مولانا اللہ وسایا، پیر محفوظ احمد مشہدی اور مختلف دینی جماعتوں کے دیگر زعماء کی موجودگی مذہبی مکاتبِ فکر کے حوالہ سے فی الواقع ملی یکجہتی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ البتہ کونسل کے پہلے دور کو یاد کرتے ہوئے یہ بات ضرور محسوس ہو رہی تھی کہ علامہ ساجد علی نقوی تو اپنی بھرپور ٹیم کے ساتھ اجلاس میں شریک ہیں لیکن مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ کی سیٹ خالی دکھائی دے رہی ہے۔ حالانکہ دو عشرے قبل کونسل کی یہ محفل انہی دونوں کو یکجا بٹھانے کے لیے سجائی گئی تھی مگر اب مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ کے کیمپ کا کوئی نمائندہ موجود نہیں تھا۔ میرے خیال میں ملی یکجہتی کونسل اگر اس عدم توازن کو محسوس کرتے ہوئے اس کی تلافی کی کوئی صورت نکال لے تو پہلے دور کی طرح اب بھی وہ ملک و قوم کے بہت سے معاملات میں مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے۔......

مشرق وسطیٰ کی صورتحال اور ایران پر اسلحہ فراہمی کا الزام

روزنامہ اسلام، لاہور ---۱۸ اکتوبر ۲۰۱۶ء

لاہور سے شائع ہونے والے ایک اخبار نے ۱۶ اکتوبر کو یہ خبر شائع کی ہے کہ عرب ٹی وی کے مطابق امریکی فوج کے ایک عہدہ دار نے کہا ہے کہ ایران دنیا بھر میں شیعہ ملیشیاؤں کو اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ ایران نہ صرف یمن میں حکومت کے خلاف سرگرم شیعہ باغیوں کو اسلحہ فراہم کر رہا ہے بلکہ وہ دنیا کے کئی دوسرے ملکوں کو بھی بھاری جنگی ہتھیار مہیا کرتا ہے۔ یہ خبر چونکہ امریکی فوج کے ایک عہدہ دار کے حوالہ سے سامنے آئی ہے اس لیے اسے امریکی الزام یا پروپیگنڈا کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے ایک روز قبل عرب ممالک کی خلیجی تعاون کونسل اور ترکی کی کابینہ کے ارکان کے مشترکہ اجلاس کے بعد ان کی طرف سے یہ مشترکہ مطالبہ شائع ہو چکا ہے کہ ایران خطے میں مداخلت کی پالیسی ترک کر دے۔ جبکہ اس مشترکہ بیان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ شام اور عراق کی سالمیت اور وحدت کا تحفظ ضروری ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال دن بدن جو گھمبیر صورتحال اختیار کرتی جا رہی ہے اس نے پورے عالمِ اسلام کو مضطرب کر رکھا ہے اور پاکستان کے عوام بطور خاص اس اضطراب اور بے چینی کا شکار ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کے حالات جو بھی رخ اختیار کریں پاکستان اس سے براہ راست متاثر ہوتا ہے اور پاکستانی معاشرہ اور ماحول میں اس کے منفی اثرات کئی حوالوں سے سامنے آنے لگتے ہیں۔

سقوطِ خلافتِ عثمانیہ اور مشرقِ وسطیٰ کی جغرافیائی بندر بانٹ

اس مسئلہ کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اب سے ایک صدی قبل برطانوی استعمار نے دیگر مغربی ممالک کی ملی بھگت سے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ کر کے مشرقِ وسطیٰ کے جغرافیہ اور بین الاقوامی سرحدات کا جو نیا نقشہ تشکیل دیا تھا اس کے مطلوبہ نتائج پورے ہو جانے کے بعد اب مغربی قوتوں کے قائد امریکہ کو اپنے مستقبل کے عزائم کی تکمیل کے لیے اس جغرافیائی نقشے اور بین الاقوامی سرحدات میں از سر نو تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور اس کی راہ ہموار کرنے کے لیے یہ ساری افراتفری پھیلائی گئی ہے۔ ایک نظر اس صورتحال پر اس پہلو سے بھی ڈال لیں کہ امریکہ اور روس سمیت تمام عالمی قوتوں کا ہر قدم اس سمت اٹھ رہا ہے جس سے اس افراتفری میں اضافہ اور جنگی ماحول برقرار رکھنے کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ عراق و شام کے لاکھوں شہریوں کے قتل عام اور لاکھوں کی جلاوطنی کے بعد بھی سینوں کی آگ ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی اور جنگ کو رکوانے کی بجائے نئے نئے محاذ کھولنے پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔

سنی شیعہ کشمکش: علمی مباحث سے قتل و قتال تک

اس صورتحال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سنی شیعہ اختلاف جو اس سے قبل طویل عرصہ سے علمی مباحث، مناظروں، مذہبی گروہ بندی، اور زیادہ سے زیادہ پراکسی وار تک محدود تھا اب کھلی خانہ جنگی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ہماری اس بارے میں ہمیشہ سے یہی رائے رہی ہے کہ مذہبی دائروں میں یہ اختلافات صدیوں سے چلے آرہے ہیں اور انہیں سرے سے ختم کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان اختلافات کو مناسب دائرے میں رکھتے ہوئے ایک دوسرے کو برداشت کرنا اور مشترکہ قومی و ملی معاملات میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا ہی اس سلسلہ میں صحیح راستہ ہے۔ ان اختلافات کا شدت پسندانہ اظہار اور ان کی بنیاد پر گروہی محاذ آرائی کا اسلام دشمن استعماری قوتوں کے سوا کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اور جو بھی ایسا کرتا ہے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام دشمن قوتوں کو ہی فائدہ پہنچاتا ہے۔ اس سے ہر ممکن گریز کی ضرورت ہے بالخصوص مشرقِ وسطیٰ میں یہ فرقہ وارانہ محاذ آرائی استعماری قوتوں کے ان عزائم میں تقویت کا باعث بن رہی ہے جن کا ہم سطور بالا میں تذکرہ کر چکے ہیں۔

اس زمینی حقیقت سے کسی صاحب شعور کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ جو سنی شیعہ اختلافات موجود ہیں وہ اصولی اور بنیادی ہیں اور صدیوں سے چلے آرہے ہیں، نہ ان سے انکار کیا جا سکتا ہے، نہ دونوں میں سے کوئی فریق دوسرے کو مغلوب کر سکتا ہے، اور نہ ہی ان اختلافات کو ختم کرنا ممکن

ہے۔ ان اختلافات کو تسلیم کرتے ہوئے اور ایک دوسرے کے وجود کا اعتراف کرتے ہوئے باہمی معاملات کو از سر نو طے کرنے کی ضرورت بہرحال موجود ہے جس کے لیے آبادی کے تناسب اور دیگر مسلمہ معروضی حقائق کو سامنے رکھ کر ہی توازن کا صحیح راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

ایران کا واقعاتی کردار

جبکہ اس مسئلہ کا تیسرا پہلو مشرقِ وسطیٰ کے موجودہ حالات میں ایران کا مسلسل کردار ہے جو سراسر واقعاتی ہے اور اسے واقعاتی ترتیب کے ساتھ ہی دیکھا جانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ایرانی انقلاب سے پہلے اور بعد کے ماحول کا تقابلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ایرانی انقلاب کو ابتداء میں ایک کامیاب مذہبی انقلاب سمجھا گیا تھا اور ایسا سمجھنے والوں میں ہم بھی شامل تھے۔ ہمیں توقع تھی کہ عالمی سیکولر قوتوں کے ایجنڈے کے علی الرغم ایران کا یہ کامیاب مذہبی انقلاب دنیا بھر کی اسلامی تحریکات کی تقویت کا ذریعہ بنے گا لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا۔ بلکہ ایرانی انقلاب کے نتیجے میں اکثر مسلم ممالک بشمول پاکستان کی اسلامی تحریکات کو نئی اور متوازی فرقہ وارانہ تحریکات کا سامنا کرنا پڑ گیا جس کے تلخ ثمرات آج پورے عالمِ اسلام کو بھگتنا پڑ رہے ہیں۔ چنانچہ خلیجی کونسل اور ترکی کا مشترکہ اعلامیہ اس معاملہ کی سنگینی کی انتہائی حدوں کی نشاندہی کر رہا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مشرقِ وسطیٰ میں عراق، شام، لبنان، یمن، اور بحرین میں سنی شیعہ کشیدگی نے جو نیا رخ اختیار کیا ہے وہ سب ایرانی انقلاب کے بعد کی پیداوار ہے اور بعض حلقوں کا یہ خدشہ بے جا نہیں ہے کہ اس سے سعودی عرب کے گرد حصار تنگ ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ جبکہ بعض ذمہ دار ایرانی راہنماؤں کی طرف سے ایسی باتیں عالمی پریس کے ریکارڈ پر موجود ہیں جن میں حرمین شریفین کے حوالہ سے سعودی عرب کے انتظامات اور کنٹرول کو براہ راست تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے، یہ دیکھے بغیر کہ اگر ایرانی مطالبہ پر حرمین شریفین کو سعودی کنٹرول سے نکالنے کی بات خدانخواستہ مان لی جائے تو اس کا اگلا مرحلہ کیا ہوگا اور اس ممکنہ مرحلہ میں عالمِ اسلام کی غالب اکثریت کا ردعمل اور جذبات کیا ہوسکتے ہیں؟

مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ سنگین صورتحال کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے سے ہمارا مقصد ایران کو مطعون کرنا نہیں بلکہ ایرانی قیادت کو توجہ دلانا ہے کہ ان حالات کا بہرحال دوطرفہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور اس کے سوا اس دلدل سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا کہ ایران اور خلیجی ممالک کی اس کشمکش کے واقعاتی اسباب کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے، دونوں طرف کی شکایات کو سامنے لا کر ان کا تجزیہ کیا جائے، اور انہیں دور کرنے کے لیے ٹھوس حکمت عملی طے کی جائے۔ لیکن کیا ایران خلیجی تعاون کونسل اور ترکی کے اس مشترکہ مطالبہ کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے ان کے

ساتھ بامقصد مذاکرات کی کوئی صورت نکالنے کے لیے تیار ہو جائے گا؟

فرزندِ جھنگویؒ اور جمعیۃ علماء اسلام

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۹ دسمبر ۲۰۱۶ء

مولانا مسرور نواز جھنگوی کی الیکشن میں بھاری اکثریت سے کامیابی اور اس کے بعد جمعیۃ علماء اسلام میں شمولیت کا اعلان دونوں اچھی اور حوصلہ افزا خبریں ہیں جن پر دینی حلقوں میں خوشی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور جھنگ کی صورتحال میں اس تبدیلی کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ ہمارے جذبات بھی اس حوالہ سے یہی ہیں اور ہم اپنے عزیز محترم مولانا مسرور نواز کو مبارک باد دیتے ہوئے خوشی محسوس کر رہے ہیں۔

موصوف کے ساتھ کوئی ملاقات تو یاد نہیں ہے مگر ان کے والد محترم حضرت مولانا حق نواز جھنگوی شہیدؒ کے ساتھ ایک عرصہ تک ملاقاتیں اور دینی جدوجہد میں رفاقت رہی ہے۔ ہم دونوں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے سرگرم حضرات میں سے تھے اور مختلف مراحل میں باہمی مشاورت اور رفاقت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء اسلام درخواستی گروپ اور فضل الرحمن گروپ میں تقسیم ہوئی تو ہم دونوں بھی اس تقسیم کا شکار ہوئے۔ میں درخواستی گروپ کا فعال کردار تھا اور وہ فضل الرحمن گروپ میں متحرک تھے۔ دونوں ورکر تھے اور سیاسی بیانات کے علاوہ پبلک اجتماعات کے خطابات دونوں کا میدان کارزار تھا اس لیے آپس میں نوک جھونک بھی چلتی رہتی تھی۔ لیکن باہمی ملاقاتیں، مشاورت اور مختلف معاملات میں تعاون کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔

مولانا حق نواز جھنگوی شہیدؒ نے جھنگ کی وڈیرہ سیاست کے خلاف محاذ آرائی کے ساتھ ساتھ اہلِ سنت کے عقائد و مفادات کے تحفظ کا مورچہ سنبھالا تو ان کے موقف سے اصولی اتفاق رکھتے ہوئے بوقت ضرورت ان کو سپورٹ کرنے کی سعادت مجھے بھی حاصل ہوتی رہی۔ البتہ ان کے طریق کار سے خود کو کبھی متفق نہیں پا سکا اور اس کے اظہار میں بھی کبھی مجھے حجاب نہیں رہا۔ ان کے ساتھ میں نے بارہا اس سلسلہ میں گفتگو کی حتیٰ کہ ان کی شہادت کے روز اس سانحہ سے ایک گھنٹہ قبل بھی فون پر ان سے اسی حوالہ سے میری گفتگو ہوئی تھی جو ان کے ساتھ میری آخری گفتگو ثابت ہوئی۔ وہ سپاہ صحابہؓ کے نام سے نئی تنظیم قائم کرتے ہوئے بھی جمعیۃ علماء اسلام فضل الرحمن گروپ کے صوبائی نائب امیر تھے لیکن دھیرے دھیرے وہ جمعیۃ علماء اسلام میں غیر متحرک ہوتے ہوئے اپنی قائم کردہ تنظیم کے لیے ہی

وقف ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے دفاع صحابہؓ کے لیے ملک بھر کے ہزاروں نوجوانوں کو اپنے ذوق کے مطابق منظم کیا، پرجوش اور متحرک کیا، جذبہ وقربانی کی ایک نئی تاریخ رقم کی اور پھر اسی مشن کے لیے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیا۔

مولانا جھنگویؒ کی شہادت کے بعد کیا ہوا اور کیا ہوتا رہا، میں اس مرحلہ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میں نے یہ ساری تمہید اس لیے باندھی ہے کہ ان کے فرزند مولانا مسرور نواز جھنگوی نے جمعیۃ علماء اسلام میں شمولیت کا اعلان کیا ہے تو کوئی نئی بات نہیں کی بلکہ اپنے پرانے گھر میں ہی واپسی کی ہے۔ جبکہ جمعیۃ کے امیر مولانا فضل الرحمن نے بھی اپنے بھتیجے کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھ کر بڑے پن کا ثبوت دیا ہے۔

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کا اصل میدان ملک میں نفاذِ اسلام ہے۔ البتہ ایک دور میں جمعیۃ مسلکی معاملات بالخصوص سنی شیعہ کشمکش سے اس قدر لاتعلق نہیں ہوتی تھی جتنی اس وقت بظاہر دکھائی دے رہی ہے۔ بلکہ ان امور میں متعلقہ حلقوں کو سپورٹ کرنے کے ساتھ ساتھ جمعیۃ کا اپنا بھی ایک موقف اور کردار ہوتا تھا اور وہ مسلکی محاذ کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والے حلقوں کے درمیان کوارڈینیشن اور سرپرستی کا فریضہ سرانجام دیا کرتی تھی۔ یہ پہلو جوں جوں دھیما پڑتا گیا مسلکی مسائل پر محنت کرنے والی جماعتیں خودمختار اور آزاد ہوتی چلی گئیں جس سے مسلکی حلقوں میں باہمی عدم تعاون بلکہ خلفشار کا ماحول پیدا ہو گیا۔ میرے خیال میں آج بھی اگر جمعیۃ علماء اسلام پاکستان اجتماعی دینی وملی معاملات کے حوالہ سے تمام مذہبی مکاتبِ فکر کے درمیان جبکہ مسلکی مسائل کے حوالہ سے متعلقہ جماعتوں کے درمیان حقیقی اور عملی کوارڈینیٹر کا کردار سنبھال لے تو ملک بھر کے دینی حلقوں میں دن بدن بڑھتے چلے جانے والے خلفشار کی سنگینی کو کم کیا جا سکتا ہے۔

اہلِ سنت کے حقوق ومفادات اور صحابہ کرامؓ کی عظمت ومقام کے تحفظ کا محاذ ان میں سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے، اس لیے کہ اس دائرہ میں مستقبل کے خدشات وخطرات کی فہرست طویل ہوتی جا رہی ہے اور مشرقِ وسطیٰ کے وسعت پذیر تغیرات پاکستان کی صورتحال پر براہ راست اثرانداز ہوتے دکھائی دینے لگے ہیں۔ میرے خیال میں یہ محاذ پہلے بھی جوش وخروش سے زیادہ حکمت وتدبر کا متقاضی تھا اور اب تو اس میں کوئی مؤثر کردار ادا کرنے کے لیے حکمت وتدبر اور دانش وحوصلہ ہی واحد ذریعہ اور آپشن باقی رہ گیا ہے۔ اس پس منظر میں مولانا مسرور نواز جھنگوی کی اپنے پرانے گھر میں واپسی خوش آئند ہے اور یہ بات مزید خوش کن ہے کہ اس سارے عمل کو مولانا محمد احمد لدھیانوی کی سرپرستی حاصل ہے۔

ملک بھر میں مختلف دینی محاذوں پر کام کرنے والے دیوبندی علماء کرام اور کارکن اصل میں جمعیۃ علماء اسلام ہی کا اثاثہ ہیں جنہیں اپنا حقیقی اور قیمتی اثاثہ سمجھنے کے ساتھ ساتھ دوطرفہ اعتماد اور تعلقات کار بحال کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ ضروری ہے کہ حضرت مولانا فضل الرحمن اور حضرت مولانا سمیع الحق مل بیٹھ کر اس کا راستہ نکالیں۔ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان اگلے سال اپریل کے دوران صد سالہ تقریبات کا انعقاد کرنے جا رہی ہے، اگر اس سے قبل اس سلسلہ میں کوئی مشترکہ حکمت عملی اور روڈ میپ طے کیا جا سکے تو نہ صرف تقریبات کا لطف دوبالا ہو جائے گا بلکہ علماء اور کارکنوں کو بہت حوصلہ ملے گا۔ اس سے بین الاقوامی اور ملکی سطح پر دین اور دینی حلقوں کے خلاف مصروف عمل سیکولر قوتوں کو مؤثر پیغام جائے گا اور علماء حق کا یہ قافلہ نئے عزم اور حوصلہ کے ساتھ اگلی صدی کے سفر کا آغاز کر سکے گا۔

دلی دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمارے عزیز بھتیجے مولانا مسرور نواز جھنگوی کو اس کارِ خیر کا نقطۂ آغاز بنا دیں اور اہل حق کو آج کے تقاضوں اور ضروریات کے ادراک کے ساتھ جدوجہد جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

انقلابِ ایران اور مریم رجاوی

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۹ جون ۲۰۱۷ء

ایران کے معروف اپوزیشن گروپ ”قومی مزاحمتی کونسل“ کی چیئرپرسن مریم رجاوی نے گزشتہ دنوں سعودی عرب کی میزبانی میں ہونے والی اسلامی امریکی سربراہی کانفرنس کے فیصلوں کا خیر مقدم کیا ہے۔ لاہور کے ایک روزنامہ میں ۶ جون ۲۰۱۷ء کو شائع ہونے والی خبر کے مطابق مریم رجاوی نے پیرس میں اپنی پارٹی کی ایک میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ خطے میں جنگوں اور دہشت گردی کا ماخذ ایران کو قرار دینے کا اعلان حقیقت ہے اور ایران میں ولایتِ فقیہ پر مبنی سیاسی نظام ہی خطے میں بدامنی اور دیگر تمام مسائل کی جڑ ہے۔

مریم رجاوی کا تعلق مسعود رجاوی کے خاندان سے بتایا جاتا ہے جو شاہ ایران کے دور میں بائیں بازو کی سیاسی جماعت ”تودہ پارٹی“ کے لیڈر تھے اور شاہِ ایران کے خلاف انقلاب کی جدوجہد کا حصہ تھے۔ بادشاہت کے خلاف انقلاب کی عوامی جدوجہد میں ایران کے مذہبی راہنماؤں کے ساتھ کمیونسٹ اور نیشنلسٹ عناصر بھی شریک تھے مگر کامیابی کے بعد مذہبی راہنماؤں کی قوت کار، نظم وضبط، منصوبہ بندی اور بے پناہ عوامی حمایت کے باعث باقی عناصر بتدریج پیچھے ہٹتے چلے گئے اور مذہبی قیادت

نے انقلاب کا تمام تر نظم نہ صرف اپنے ہاتھ میں لے لیا بلکہ وہ اب تک اسے کامیابی کے ساتھ چلا بھی رہے ہیں جو ان کے نظریات اور پالیسیوں سے اختلاف کے باوجود بہرحال ان کا کریڈٹ بنتا ہے۔

ہمارے ہاں دراصل معاملات کو صرف ایک رخ سے دیکھنے کا مزاج اس قدر پختہ ہو گیا ہے کہ اس سے مختلف زاویہ سے صورتحال کا جائزہ لینا "شجرِ ممنوعہ" کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے، ورنہ عقائد و نظریات سے ہٹ کر عوامی انقلاب لانے، اسے کنٹرول کرنے اور کامیابی و تسلسل کے ساتھ اسے جاری رکھنے میں ایرانی مذہبی قیادت کی اب تک کی حکمت عملی اور طریق کار کی اسٹڈی کی ضرورت ہے۔ مگر ہم محض جذباتی نعروں اور مطالبوں والی قوم ہیں اور اس سے زیادہ کوئی ذمہ داری لینے کے لیے ہم تیار نہیں ہوتے۔

مریم رجاوی اور ان کی قومی مزاحمت کونسل کا ایجنڈا کیا ہے اور ان کے حالیہ نظریات و افکار کا دائرہ کیا ہے، ہم سرِدست نہ اس سے پوری طرح آگاہ ہیں اور نہ ہی ان سے دلچسپی کا کوئی فوری داعیہ ہمارے سامنے ہے۔ البتہ انہوں نے مشرقِ وسطیٰ کی تازہ صورتحال کے بارے میں اسلامی امریکی کانفرنس کے فیصلوں کی حمایت کرتے ہوئے جو مذکورہ بالا دو جملے کہے ہیں ان کے بارے میں ہم کچھ عرض کرنا چاہیں گے۔

1. ایک یہ کہ ان کے نزدیک ایران میں ولایت فقیہ پر مبنی سیاسی نظام خطے میں بدامنی اور دیگر تمام مسائل کی جڑ ہے،
2. اور دوسرا ان کے خیال میں ایران کو خطے میں موجودہ جنگوں اور دہشت گردوں کا ماخذ قرار دینا درست ہے۔

مریم رجاوی اگرچہ پیرس میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہیں اور اپنے خاندانی ماضی کے باعث بائیں بازو کے خیالات کی حامل سمجھی جاتی ہیں لیکن بہرحال وہ ایرانی ہیں، سیاسی راہنما ہیں اور ایرانی قوم کے ایک حصے کی نمائندگی کرتی ہیں اس لیے ان کی اس بات کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اس کا جائزہ لینا معاملات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

"ولایت فقیہ پر مبنی سیاسی نظام" سے مراد یہ ہے کہ ایرانی دستور میں اثنا عشری شیعہ مذہب کے عقائد کو دستور و قانون کی بنیاد بنایا گیا ہے جس کے مطابق بارہ اماموں میں سے آخری بزرگ جو "امام غائب" اور "ولی عصر" کے خطاب سے یاد کیے جاتے ہیں، چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں اس لیے حاکمیت اعلیٰ کا حق وہی رکھتے ہیں اور ایرانی دستور میں انہی کی حاکمیت کو عملاً نافذ کرنے کا نظم وضع کیا گیا ہے۔ امام غائب کے ظاہر ہونے تک کا زمانہ "غیبوبت" کا زمان کہلاتا ہے اور اس دوران ان

تک براہ راست رسائی بھی میسر نہیں ہے، اس لیے ان کی نیابت کے لیے اپنے وقت کے سب سے بڑے اور ممتاز فقیہ کو ان کا قائم مقام چنا جاتا ہے جس کے لیے ایرانی دستور میں باقاعدہ طریق کار اور شرائط طے ہیں۔ اس دستوری طریق کار کے مطابق جو صاحب اس منصب کے لیے چن لیے جاتے ہیں انہیں ''ولایت فقیہ'' کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور وہ امام غائب کے نمائندہ کے طور پر ان کے اختیارات استعمال کرنے کے مجاز ہوتے ہیں۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ انہیں حکومت، صدر، پارلیمنٹ اور عدالتِ عظمیٰ سمیت کسی بھی ادارے کے کسی بھی فیصلے کو ''ویٹو'' کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے اور ان کے کسی فیصلے کو کہیں بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ وقت میں یہ حیثیت جناب آیت اللہ خامنہ ای کو حاصل ہے۔

''ولایت فقیہ'' کا یہ شخصی اختیار ''پاپائے روم'' کے ان اختیارات کے مشابہ لگتا ہے جو انہیں یورپ کے بادشاہی دور میں حکومتوں کے مذہبی سرپرست کے طور پر حاصل تھا اور شاید مریم رجاوی بھی ولایت فقیہ کے اسی پہلو پر تنقید کر رہی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل مجھ سے ایک مجلس میں کسی دوست نے سوال کیا کہ سعودی عرب کا نظام شخصی بادشاہت پر قائم ہے، کیا آپ اس کی حمایت کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ میں بادشاہت کی کسی بھی شکل کو اسلامی نہیں سمجھتا اور نہ اس کی حمایت کرتا ہوں لیکن مجھے شخصی اختیارات کے حوالہ سے بادشاہت اور ولایت فقیہ میں بھی کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ عملی نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے۔

جہاں تک خطے میں جنگوں اور دہشت گردی کے فروغ میں ایران کے مبینہ کردار کی بات ہے اس کا بھی گہری سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور ہمارے خیال میں سب سے زیادہ یہ ضرورت خود ایران کی ہے کہ وہ انقلاب ایران کے بعد سے اب تک کی صورتحال کا از سرِ نو جائزہ لے اور دیکھے کہ موجودہ حالات کے پس منظر میں اس کی پالیسیاں اور طرزِ عمل کہاں کہاں اور کس کس انداز میں جھلک رہا ہے۔ ہم اس سے قبل یہ بات متعدّد بار لکھ چکے ہیں کہ اگر انقلابِ ایران کو مذہب دشمنی اور سیکولرازم کے عالمی تسلط کے اس دور میں ایک کامیاب مذہبی انقلاب کے دائرے میں محدود رکھا جاتا اور اسے ایک مسلکی انقلاب کے طور پر اردگرد کے دیگر ممالک میں برآمد کرنے کی پالیسی اختیار نہ کی جاتی تو آج صورتحال یقیناً بہت مختلف ہوتی۔

ایک کامیاب مذہبی انقلاب کے طور پر ہم بھی انقلابِ ایران کا خیر مقدم کرنے والوں میں شامل تھے اور ہم نے یہ توقع وابستہ کر لی تھی کہ ایران کا کامیاب اور بھرپور مذہبی انقلاب عالمِ اسلام کی ان مذہبی قوتوں اور تحریکوں کا معاون بنے گا جو اپنے اپنے ممالک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے محنت

کر رہی ہیں۔ لیکن یہ توقع غلط ثابت ہوئی حتیٰ کہ خود ہمارے ہاں پاکستان میں اسلامی تحریکوں کو سپورٹ کرنے کی بجائے ”فقہ جعفریہ“ کے نفاذ کی تحریک کے عنوان سے پریشان کن مسائل کھڑے کر دیے گئے۔ جبکہ دیگر مسلم ممالک بالخصوص مشرقِ وسطیٰ میں بھی مسلکی ہم نواؤں کو منظم و متحرک بلکہ مسلح اور مورچہ بند کرنے کی حکمت عملی اختیار کی گئی جیسا کہ عراق، شام، کویت، سعودی عرب، لبنان اور یمن وغیرہ کی صورتحال سے واضح ہے۔ یہاں تک کہ اردن کے فرمانروا شاہ عبداللہ کو ایک موقع پر یہ کہنا پڑا کہ ”ہم اس خطے کے سنی شیعہ ہلال کے حصار میں ہیں“۔ جبکہ اس حصار کو آج سعودی عرب کے گرد کھلی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

ایران عراق جنگ سے لے کر یمن اور شام کے موجودہ بحران تک حالات و واقعات کا جو تسلسل ہمارے کربناک ملی المیوں کی نشاندہی کر رہا ہے اس میں یقیناً عالمی استعمار کا کردار سب سے زیادہ شرمناک اور خوفناک ہے لیکن اس سے ہم اس کے علاوہ اور کیا توقع کر سکتے ہیں؟ ہم خطے میں سنی و شیعہ کے باہمی تصادم کے حق میں نہیں ہیں بلکہ یہ خواہش رکھتے ہیں کہ اس حوالہ سے اب تک جو ہو چکا ہے اسے کسی طرح ”ریورس گیئر“ لگے کیونکہ اس کا فائدہ اسرائیل اور اس کے سرپرست عالمی استعمار کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ لیکن ایرانی راہنما مریم رجاوی کی طرح ہمارے خیال میں بھی ماضی اور مستقبل دونوں حوالوں سے اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری ایران پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کا کوئی راستہ ضرور نکالے ورنہ خطرہ ہے کہ خطہ کے امن کے ساتھ ایران کا مذہبی انقلاب بھی اس انتشار کی زد میں آئے گا۔

یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ ایران کی پارلیمنٹ اور جناب آیت اللہ خمینی کے مزار پر حملوں کی خبر آگئی، ان حملوں کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے اور ہم اس پر ایرانی قوم کے ساتھ افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پورے عالمِ اسلام کو ہر قسم کی دہشت گردی سے نجات عطا فرمائے، آمین۔

مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں امریکی منصوبہ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۳ جولائی ۲۰۱۷ء

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ”قومی سلامتی کونسل“ نے ۱۹۹۱ء کے دوران عالمِ اسلام اور مشرقِ وسطیٰ کے حوالہ سے ایک منصوبہ طے کیا تھا جو وائس آف امریکہ سے نشر ہوا اور روزنامہ جنگ لاہور نے ۱۵ جولائی ۱۹۹۲ء کو اس کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ ربع صدی کے بعد اسے ارباب فکر و دانش کی خدمت

میں اس گزارش کے ساتھ ایک بار پھر پیش کیا جا رہا ہے کہ اس امر کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ اس منصوبے پر عملدرآمد کی اب تک کی صورتحال کیا ہے اور اس وقت ہم کس مرحلہ سے گزر رہے ہیں۔ عملاً ہم کچھ کرنا چاہیں یا نہیں یا کچھ کر سکیں یا نہیں، کم از کم ہمیں اس حوالہ سے اپنی موجودہ صورتحال کا علم اور ادراک تو ہونا چاہیے:

منصوبہ کے مندرجات

1. مستقبل میں قیامِ امن کے نفاذ میں دیگر ممالک مثلاً فرانس، برطانیہ، اٹلی اور روس کو شامل کیا جانا چاہیے۔
2. ایران اور ترکی ایسے غیر عربی ممالک کو ان ممالک کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے تیار کیا جانا چاہیے جنہوں نے ہمارے ساتھ مل کر عراق کے خلاف جنگ لڑی مثلاً خلیجی ریاستیں، مصر، شام اور مراکش۔
3. ایران اور عراق میں ہونے والے واقعات کے پیش نظر ہماری مستقبل میں سیاست یہ ہوگی کہ ایک ایسی فوج تیار کی جائے یا موجود رکھی جائے جو کسی بھی دوسری فوجی طاقت کا مقابلہ کر سکے، اس طرح اس منطقہ (مشرقِ وسطیٰ) میں طاقت کا توازن بھی قائم رہے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا کہ کسی عرب ریاست یا ترکی یا ایران یا ایتھوپیا (حبشہ) کو (علاقہ کا پولیس مین بنا کر اسے یہ اجازت بھی دی جائے کہ وہ) امریکی مفادات کے لیے خطرہ بن سکے۔
4. خلیجی ریاستوں کی دفاعی طاقت (نہ کہ جنگی صلاحیت) کو بہتر بنایا جائے اور یہاں فوجی خدمات کو لازمی بنایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھا جائے کہ ان ریاستوں کے ہمسایہ ممالک میں سے کسی کو بھی فوجی اعتبار سے اس قدر طاقتور نہ بننے دیا جائے کہ وہ ان پر حملہ آور ہو سکے۔
5. جارحانہ اور مکمل تباہ کن جنگی ساز و سامان کی فروخت عربی اور اسلامی ممالک کو کرنا ہی پڑے تو درج ذیل امور کو مدنظر رکھنا ہوگا۔
   - ایسا اسلحہ زیادہ مقدار میں نہ دیا جائے۔
   - اس قسم کا اسلحہ نہ دیا جائے جو تیزی کے ساتھ حرکت میں لایا جا سکے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکے۔
   - فاضل پرزہ جات پوری مقدار میں نہ دیے جائیں۔
   - اس اسلحہ کا سودا پانچ عرب ریاستوں (غالباً سعودی عرب، عرب امارات، شام، مصر

اور مراکش) کی نگرانی میں کیا جائے۔

- بعض مخصوص اقسام کا اسلحہ فروخت نہ کیا جائے بلکہ کرایہ پر دیا جائے۔

6. شام، مصر اور بعض دوسری چھوٹی غیر عرب ریاستوں مثلاً ایران، ترکی اور ایتھوپیا کی معمولی نمائندگی کے اشتراک سے ایک مشترکہ امن فوج تیار کی جائے۔

7. خلیجی ریاستوں کی دولت جو ان پر حملوں کا سبب بنی ہوئی ہے، کی مناسب تقسیم ایک بینک برائے تعمیر کے ذریعے عمل میں لائی جائے گی مگر اس بینک کی اصل پالیسی امریکہ، برطانیہ اور فرانس وضع کریں گے۔ اس بینک کی نمایاں ترجیحات یہ ہوں گی۔

- مشترکہ امن فوج کا کنٹرول سنبھالنا۔
- ایسے ممالک میں بڑے منصوبوں کی تعمیر و تکمیل کے لیے فنڈ مہیا کرنا جو (مذکورہ بالا) مشترکہ فوج کے معاون ہوں مثلاً شام۔
- اس طرح ان بعض غیر عرب ممالک میں ایسے منصوبوں کی تکمیل کے لیے فنڈات مہیا کرنا جو اس منطقہ میں امن کے لیے ایک بڑا رول ادا کر سکتے ہیں مثلاً ایران، ترکی اور حبشہ۔
- بعض غیر اہم اور غریب حکومتوں مثلاً یمن، تیونس اور سوڈان کی مالی معاونت کرنا۔ البتہ ان حکومتوں کی اس طرح مدد کرتے وقت ان باتوں کو زیر غور رکھنا ہوگا۔
  - یہ مالی مدد صرف معمولی قسم کی تعمیر و ترقی کے لیے ہو۔
  - اس کے بدلے ان سے مضبوط تعلقات کی استواری کی توقع کرنا۔
  - اس مالی مدد کا مقصد ان حکومتوں سے امریکی پالیسی کی ہمنوائی حاصل کرنا ہوگا۔

8. تمام عرب ملکوں کے ایسے حکومتی نظاموں کی تبدیلی جو امریکی پالیسی سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ اس منصوبہ کی بعض تفصیلات یوں ہوں گی۔

خلیجی ریاستیں

ان ریاستوں کے حکومتی نظام میں ردوبدل کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ہمیشہ امریکی پالیسی کی پرجوش حامی رہی ہیں اور رہیں گی۔ ان کے اس حکومتی نظام کو باقی رکھنا ہی امریکی مفادات کا تحفظ ہے۔ البتہ یہ کوششیں جاری رکھی جائیں کہ ان ریاستوں میں زمام اقتدار ایسے افراد کے ہاتھوں میں آئے جو مغرب کے تعلیم یافتہ ہیں اور ایسی کوششیں بھی کی جائیں جن کی بدولت ان ریاستوں کی مذہبی ثقافت کو بدل دیا جائے۔

دیگر ممالک

شام: شام کے حکمران حافظ الاسد ہمیں قبول ہیں، انہیں اس منطقہ میں کام کرنے کا موقع دیا جانا چاہیے۔ شام کو ترقی کے اس مقام پر لے جانا چاہیے جو حافظ الاسد کو اس خطہ کا مرد آہن بنا سکے کیونکہ انہوں نے (عراق کے خلاف جنگ میں) عملاً ثابت کر دیا ہے کہ ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

مصر: اگرچہ مصر کی موجودہ قیادت نے (امریکی پالیسی کے اتباع میں) صحیح اور قابل قبول رویہ اختیار کیا لیکن یہ حکومت مصری رائے عامہ کو کنٹرول نہیں کر سکتی۔ لہٰذا ہمیں اس کے بارے میں جدید خطوط پر سوچنا ہوگا۔ دراصل جمال عبد الناصر اور انور السادات کے دور میں آزادئ رائے پر پہرہ لگا دیا گیا تھا جس کے جمہوریت پر منفی اثرات ظاہر ہوئے۔ اب ضروری ہے کہ مصر میں جمہوریت کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جانا چاہیے تاکہ ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکے اور اسلامیین (بنیاد پرستوں) کو راہ سے ہٹانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

فلسطین اور اسلامی تحریکات: اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کو روکنے اور فلسطین کے قبضہ پر مسلمانوں کے (دینی، اخلاقی اور نفسیاتی) دباؤ کو کم کرنے کے لیے ان خطوط پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔

- مسلمانوں کو ان کے فروعی اختلافات میں الجھا کر ایک دوسرے سے لڑانا تاکہ وہ اپنی طاقت کا آپ مقابلہ کرتے رہیں۔ جیسے مصر کے محمد الغزالی نے اسلام میں عورت کے مقام کے موضوع کو چھیڑ کر باہمی منافرت کی جنگ کو بھڑکایا۔
- وہ خلیجی ریاستیں جو اسلامی شریعت کے نفاذ پر سنجیدگی سے عمل پیرا ہیں یا اس کے نفاذ کے بارے میں غور کر رہی ہیں، ان کی حکومتوں کو تبدیل کرنا۔ جب کوئی حکومت اسلامی شریعت کا نفاذ کرے، اس کے خاتمہ کے لیے پوری کوشش کرنا۔ مثلاً سعودی عرب میں شرعی حدود کا نفاذ ہے، اس لیے ان کے بعض شیوخ کو ورغلانا اور ان کی سرگرمیوں کو معطل کرنا چاہیے۔ اس طرح تمام اسلامی تحریکات اور مظاہر پر کاری ضرب لگانا ضروری ہے۔
- جہاں اسلامی ذہن رکھنے والی حکومتوں کے بدلنے سے ایسے شرعی قوانین سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا وہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہوگی کہ وہ علماء اسلام جو رائے عامہ پر اثر انداز ہو سکتے ہیں ان کے خیالات کی عوام تک رسائی میں رکاوٹیں کھڑی کرنا ہوں گی۔
- حساس قسم کے حکومتی اداروں میں اسلامی ذہن رکھنے والوں کو ملازمت کے مواقع نہیں ملنا چاہئیں۔ یہ پالیسی صرف خلیجی ریاستوں تک ہی محدود نہ ہوگی بلکہ اس کا دائرہ کار تمام اسلامی ریاستوں تک بڑھانا ہوگا۔ اسلامی فکر کو آگے بڑھانے والوں کو تعلیم و تربیت اور

ابلاغ عامہ کے ذریعے اپنے خیالات عوام الناس تک پہنچانے سے روکنا ہوگا۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کی بدولت اسلام کی ترویج و ترقی کے لیے کام کرنے والوں کو رائے عامہ کو متاثر کرنے کا موقع ملتا ہے اور یوسف القرضاوی نے انہی ذرائع (تعلیم و تربیت اور ابلاغ عامہ) سے عوام الناس میں پذیرائی پائی۔ اسی طرح سعودی عرب میں مناع القطان نے اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔

○ اسلامیین کو (ان کے اپنے ممالک میں بھی) اقتصادی اور اجتماعی معاملات میں نمایاں مقام پیدا کرنے سے باز رکھنا ہوگا، ورنہ وہ ان کے توسط سے اپنے ممالک سے باہر بھی اثر انداز ہوں گے۔

9. بہت ہی قابل توجہ معاملہ عرب اور مسلمان ممالک سے افرادی قوت کا خلیجی ریاستوں میں آنے کا ہے، اس کا روکنا نہایت ضروری ہے۔ ان کے مقابل افرادی قوت کا سری لنکا، فلپائن اور تھائی لینڈ سے لانا ضروری ہے کیونکہ ان ممالک سے لائی گئی غیر مسلم افرادی قوت اسلامی اعتقادات اور اقدار پر منفی اثرات چھوڑے گی۔ اگر ان تینوں ملکوں کی افرادی قوت ضرورت کا معیار یا مقدار پوری کرنے سے قاصر ہو اور دیگر ممالک (اسلامیہ اور عربیہ) سے لوگ منگوانا ہی پڑیں تو پھر یہ ضرور ملحوظ رکھنا ہوگا کہ وہ پاکستان یا بنگلہ دیش سے نہ ہوں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ دیگر (غیر مسلم) ممالک سے رابطہ کیا جائے (تاکہ بوقت ضرورت وہاں سے افراد بلائے جاسکیں)۔

10. ضروری ہو گیا ہے کہ (مسلم ممالک) کے نظام تعلیم اور ثقافت کو تبدیل کیا جائے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کا وقت بڑھایا جائے۔

11. اسلامی اور دینی جماعتوں مثلاً سلفی اور اخوانی کے مابین اختلافات کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں زیادہ بڑھایا جائے۔

12. اسلامی فکر و کردار رکھنے والی حکومتوں مثلاً پاکستان اور سوڈان کو پسماندگی اور مشکلات کا شکار رہنے دیا جائے۔

استنبول اعلامیہ، متحدہ مجلسِ عمل، دفاعِ پاکستان کونسل

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۶ دسمبر ۲۰۱۷ء

گزشتہ ہفتہ کی تین اہم خبروں کے حوالہ سے آج کچھ گزارشات پیش کرنا چاہ رہا ہوں۔

استنبول اعلامیہ

پہلی خبر اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کے استنبول میں ہونے والے سربراہی اجلاس کی ہے جس میں امریکہ کا سفارت خانہ بیت المقدس میں منتقل کرنے کے بارے میں امریکی صدر ٹرمپ کے اعلان کو مسترد کرتے ہوئے اعلان کیا گیا ہے کہ ''القدس'' فلسطین کا دارالحکومت ہے اور امریکی صدر کا یہ اعلان غیر قانونی اور قابلِ مذمت ہے۔ کانفرنس کے اعلامیہ میں عالمی برادری سے اپیل کی گئی ہے کہ مشرقی بیت المقدس کو فلسطین کا دارالحکومت تسلیم کرنے کا اعلان کیا جائے۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے مذکورہ اعلان کے بعد مسلم سربراہوں کے مل بیٹھنے کا پوری دنیا میں شدت کے ساتھ انتظار کیا جا رہا تھا جس کے لیے ترک صدر رجب طیب اردگان نے متحرک کردار ادا کیا ہے اور ان کی سرگرمیاں دیکھ کر عالمِ اسلام کے بیشتر حلقوں کو یہ اطمینان ہوا ہے کہ ہم اپنی عالمی قیادت سے یکسر محروم نہیں ہیں۔

صدر اردگان کو عالمِ اسلام کے اجتماعی مسائل کے لیے مضطرب اور بے چین دیکھ کر شاہ فیصلؒ، ذوالفقار علی بھٹوؒ اور مہاتیر محمد یاد آرہے ہیں جو امت مسلمہ کے اجتماعی مسائل پر گفتگو کرتے تھے اور ان کے لیے اپنے اپنے دائرہ میں کوشاں بھی ہوتے تھے۔ اول الذکر دونوں اللہ تعالیٰ کے حضور جا چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت اور رحمت کا معاملہ فرمائیں جبکہ آخر الذکر مہاتیر محمد علیل ہیں اور ہم ان کی صحت یابی کے لیے بارگاہ ایزدی میں دعاگو ہیں، آمین یارب العالمین۔

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی خدمات میں لاہور کی مسلم سربراہ کانفرنس تاریخی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جبکہ شاہ فیصل شہیدؒ نے مغربی ملکوں کو تیل کی سپلائی بند کر کے دنیا کو یہ احساس دلایا تھا کہ مسلم دنیا اور عالم عرب اگر آج بھی متحد و بیدار ہو جائیں تو عالمی معاملات پر مغرب کی اجارہ داری کو چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے او آئی سی کے سربراہ کے طور پر یہ مہم چلائی تھی کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مسلم امہ کو ویٹو پاور کا حق دلانے اور متنازعہ بین الاقوامی معاہدات

پر نظر ثانی کے لیے مضبوط موقف اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے انہوں نے اقوام متحدہ کی پچاس سالہ تقریبات کا بائیکاٹ کرنے کی تجویز دی تھی مگر بیشتر مسلم حکومتوں کی سرد مہری نے ان کی اس تجویز کو آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔ ان کے بعد اب رجب طیب اردگان سامنے آئے ہیں جو حوصلہ و تدبر کے ساتھ عالمِ اسلام کے مسائل و مشکلات پر بات کر رہے ہیں اور ان کی پشت پر چونکہ ''خلافتِ عثمانیہ'' کا شاندار ماضی ہے اس لیے ہم جیسے نظریاتی کارکنوں کو ان کی باتیں زیادہ بھلی لگ رہی ہیں اور ان سے توقعات بھی زیادہ وابستہ ہوگئی ہیں، خدا کرے کہ وہ ان توقعات پر پورا اتریں، آمین یا رب العالمین۔

جہاں تک استنبول کانفرنس کے اعلامیہ کا تعلق ہے ہمارے نزدیک یہ خوش آئند اور عالمِ اسلام کے جذبات کا ترجمان ہے۔ لیکن اعلامیہ سے آگے بھی کچھ کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں پاکستان کے سابق وزیر داخلہ جناب رحمان ملک کی یہ تجویز زیادہ مناسب لگتی ہے کہ او آئی سی میں شامل تمام ممالک امریکہ کا چند روز کے لیے عملی بائیکاٹ کر کے اس کو اپنی سنجیدگی کا احساس دلائیں۔ یہ بائیکاٹ اگرچہ علامتی ہوگا لیکن اگر اتنا بھی عملاً ہو جائے تو صدر ٹرمپ کو اپنے اعلان پر نظر ثانی کے لیے آمادہ کرنے میں مؤثر ثابت ہو سکتا ہے ورنہ اسرائیلی رویہ کے خلاف قرار دادیں تو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بھی منظور کر رکھی ہیں جن سے صدر ٹرمپ بے خبر نہیں ہیں۔

متحدہ مجلس عمل کی بحالی

دوسری اہم خبر متحدہ مجلس عمل کی بحالی کی ہے جس کا ملک بھر کے سنجیدہ علمی و دینی حلقوں میں خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ متحدہ مجلس عمل کی بحالی اور آئندہ الیکشن ''کتاب'' کے انتخابی نشان پر مشترکہ طور پر لڑنے کا اعلان قومی سیاست میں دینی جماعتوں کے کردار کو زیادہ مؤثر بنانے کا باعث ہوگا اور یہ وقت کی اہم ترین ملی و قومی ضرورت ہے۔ اس پر سیکولر اور لبرل حلقوں کو ضرور پریشانی ہوگی اور وہ اس کا شدت کے ساتھ اظہار بھی کریں گے جس سے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ بعض دینی حلقوں کی طرف سے جو تحفظات سامنے لائے جا رہے ہیں ان پر توجہ دینی چاہیے۔ ہمارے خیال میں متحدہ مجلس عمل کی قیادت میں شیعہ نمائندگی پر اعتراض درست نہیں ہے کہ تحریک آزادی، تحریک پاکستان، تحریکِ ختمِ نبوت، تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ اور تحریک تحفظ ناموسِ رسالتؐ سمیت ہر قومی و دینی تحریک میں اہلِ تشیع کی مؤثر نمائندگی نہ صرف ہماری قومی روایات کا حصہ چلی آ رہی ہے بلکہ ملی ضرورت بھی ہے۔ مگر جو بات زیادہ محسوس ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ ماضی قریب میں ملک گیر سطح پر سنی شیعہ کشمکش اور باہمی تصادم میں جو حلقے اور جماعتیں ایک دوسرے کے مقابل محاذ آراء رہی ہیں ان میں ایک کو

متحدہ مجلس عمل کی قیادت میں شامل کرنا اور دوسروں کو یکسر نظر انداز کر دینا قرین انصاف نہیں ہے۔ اس مسئلہ کو قومی و ملی تحریکات میں اہلِ تشیع کی نمائندگی کے حوالہ سے نہیں بلکہ ماضی قریب کی باہمی محاذ آرائی کے تناظر میں دیکھنا زیادہ حقیقت پسندانہ بات ہوگی۔ بہرحال بعض دینی حلقوں کے ان تحفظات کے تذکرہ کے باوجود ہم متحدہ مجلس عمل کی بحالی کو قومی اور دینی ضرورت سمجھتے ہوئے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ متحدہ مجلس عمل کی قیادت ماضی کے تجربات، حال کی ضروریات اور مستقبل کے خدشات کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامیان پاکستان کو مؤثر اور حوصلہ مند دینی قیادت فراہم کرنے میں کامیاب ہوگی۔

دفاعِ پاکستان کونسل کی آل پارٹیز کانفرنس

اسی دوران مولانا سمیع الحق کی سربراہی میں دفاع پاکستان کونسل بھی نئے سرے سے متحرک ہوئی ہے اور اسلام آباد میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد کر کے بیت المقدس کے مسئلہ پر تمام مکاتبِ فکر کے راہنماؤں نے مشترکہ جدوجہد کا فیصلہ کیا ہے جو تحسین و تبریک کے لائق ہے۔ مولانا سمیع الحق نے مجھے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی تھی مگر میں اپنی بعض مصروفیات کے باعث حاضر نہ ہو سکا۔ عام حلقوں میں متحدہ مجلس عمل کی بحالی اور دفاع پاکستان کونسل کے از سرنو متحرک ہونے کو باہمی معاصرت کے تناظر میں دیکھا جا رہا ہے مگر قارئین جانتے ہیں کہ میں ہر معاملہ میں مثبت اور امید کے پہلو کو ترجیح دیا کرتا ہوں۔ میرے خیال میں جہاں یہ ضروری ہے کہ دینی مکاتبِ فکر اور جماعتیں قومی سیاست میں متحد ہو کر حصہ لیں اور الیکشن مل کر لڑیں وہاں یہ بھی قومی ضرورت ہے کہ الیکشن اور پاور پالیٹیکس سے ہٹ کر غیر انتخابی بنیادوں پر تمام مکاتبِ فکر کا کوئی مؤثر مشترکہ تحریکی فورم بھی قومی سطح پر متحرک رہے۔ یہ دونوں فورم قومی اور ملی ضرورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی ضرورت بھی ہیں۔ اگر متحدہ مجلس عمل اور دفاع پاکستان کونسل اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے دریا کے دو کناروں کی طرح متوازی چلتے ہوئے بھی خاموش انڈرسٹینڈنگ کر لیں تو بہت سی قومی اور ملی ضروریات کو حصار میں لے کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو، آمین یارب العالمین۔

اسلام میں حقِ حکمرانی کی بنیاد اور اقوام متحدہ کا منشور

روزنامہ اسلام، لاہور ---۲۰ دسمبر ۲۰۱۷ء

......دفعہ نمبر ۲۱ سیاسی نظام کے بارے میں ہے جس کے تحت اقوام متحدہ کے رکن ممالک نے عالمی سطح پر اس ذمہ داری کو قبول کیا ہے کہ ان کا سیاسی نظام اور حکومتی نظم شہریوں کی اجتماعی رائے کے تابع ہوگا اور عوام کی رائے سے ہٹ کر قائم ہونے والی کوئی حکومت اس منشور کی رو سے جائز حکومت متصور نہیں ہوگی۔ اسے جمہوریت کہا جاتا ہے اور عوام کی حاکمیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور قرآن وسنت کی عملداری

اس حوالہ سے اسلامی تعلیمات، قرآن و سنت کے ارشادات اور خلفاء راشدینؓ کے طرز عمل کی روشنی میں کچھ گزارشات پیش کرنا ضروری ہے:

- اسلام میں عوام کی حاکمیت کی بجائے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور قرآن وسنت کی پابندی ایک اسلامی حکومت کی بنیاد ہے اور حکمران فرد یا گروہ عوام کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی بجائے قرآن وسنت کے احکام کو نافذ کرنے کا پابند ہے، اس لیے اسلام کے سیاسی نظام میں نظام حکومت کو حکومت کی بجائے خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ حکمران از خود حکومت نہیں کرتا بلکہ قرآن وسنت کے احکام کے نفاذ میں جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتا ہے۔ چنانچہ فقہاء امت نے خلافت کی جو تعریف بیان کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ خلیفہ وہ ہے جو جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتے ہوئے امت مسلمہ کے اجتماعی معاملات سرانجام دے۔
- اسلام میں عوام یا ان کے نمائندوں کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ قرآن وسنت کے صریح اور قطعی احکام میں کوئی رد و بدل کریں، ان کی پابندی ہر حال میں حکمران، عوام اور ان کے نمائندوں پر ضروری ہے، مگر وہ احکام و مسائل جو قرآن وسنت میں موجود نہیں ہیں، یا واضح نہیں ہیں، یا ان کی تعبیر و تشریح میں امت کے اہل علم کی آراء مختلف چلی آرہی ہیں، ان میں اجتہاد کے شرعی اصولوں کے دائرے میں حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلے کیے جاسکتے ہیں۔ البتہ ان میں یہ فرق ضروری ہے کہ جن امور و مسائل کا تعلق عوامی اور انتظامی معاملات سے ہے ان کا فیصلہ کرنا حکومت یا عوام کے نمائندوں کا حق ہے اور جن مسائل کا تعلق شرعی

امور اور دینی تعبیر و تشریح سے ہے ان میں مسلمہ اہل علم فیصلے کی اتھارٹی ہوں گے اور انہی کے فیصلے معتبر ہوں گے۔

- اسلام میں حکومت کی تشکیل اور خلیفہ کا انتخاب عوام کی رائے پر ہو گا جیسا کہ جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد ان کے جانشین کا انتخاب عوامی بحث و مباحثہ کے بعد عوامی رائے اور انتخاب کے ذریعہ ہوا، اپنا جانشین جناب نبی اکرمؐ نے خود نامزد نہیں فرمایا البتہ اشارات ضرور کیے تھے لیکن فیصلہ مسلمانوں کی رائے پر چھوڑ دیا تھا۔ بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ایک موقع پر اپنا جانشین نامزد کرنے اور اس کے لیے تحریر لکھوانے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ فرما کر یہ ارادہ ترک کر دیا کہ یأبی اللہ والمؤمنون الا ابابکر اللہ تعالیٰ ابو بکر کے سوا کسی کو خلیفہ نہیں بننے دیں گے اور مسلمان بھی کسی اور کو قبول نہیں کریں گے، یہ ارشاد گرامی جہاں حضرت ابو بکرؓ کے خلیفۂ رسولؐ ہونے کی اہلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے وہاں مسلمانوں کی اجتماعی رائے کی اصابت پر اعتماد کا اظہار بھی ہے۔ چنانچہ عملاً یہی ہوا کہ نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد اس مسئلہ پر اختلاف تو ہوا لیکن بالآخر امت حضرت ابو بکرؓ پر متفق ہو گئی۔

تشکیلِ حکومت کی صورتیں

فقہاء اسلام نے خلافت کے انعقاد یعنی ایک اسلامی حکومت کی تشکیل کی جو صورتیں بیان فرمائی ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، کم و بیش سبھی فقہاء نے اس کی پانچ صورتیں بیان فرمائی ہیں:

1. عامۃ المسلمین یا ان کے اہل حل و عقد خلیفہ کا انتخاب کریں جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ کا چناؤ کیا گیا تھا، اسے آج کے دور میں براہ راست انتخاب یا بالواسطہ انتخاب کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے۔
2. خلیفۃ المسلمین اپنا جانشین خود نامزد کر دے جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد کر دیا تھا۔
3. خلیفۂ وقت کسی ایک فرد کو جانشین بنانے کی بجائے خلافت کے اہل لوگوں کا ایک پینل نامزد کر دے اور ان میں سے کسی کو منتخب کیا جائے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے چھ بزرگوں کا پینل نامزد کر دیا تھا اور ان میں سے حضرت عثمانؓ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ فرماتے ہیں جو اس پینل میں شامل تھے اور جنہیں اس پینل نے خلیفہ کے چناؤ کا اختیار دے دیا تھا، ان کا ارشاد ہے کہ وہ مسلسل تین دن تک اس سلسلہ میں لوگوں سے مشاورت کرتے رہے، انہوں نے مدینہ منورہ کا کوئی طبقہ اور حلقہ نہیں چھوڑا

جس سے مشاورت نہ کی ہو، حتیٰ کہ انہوں نے مسلسل تین دن اور تین رات تک آنکھ میں نیند کا سرمہ تک نہیں لگایا اور جب یہ اطمینان حاصل کر لیا کہ لوگوں کی عمومی رائے حضرت عثمانؓ کے حق میں ہے تو انہیں خلیفہ نامزد کرنے کا اعلان کر دیا۔

4. خلیفہ کے انتقال کے وقت جو ارباب شوریٰ یا اہل حل و عقد موجود ہوں وہ نئے خلیفہ کا انتخاب کر لیں جیسا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ منورہ میں موجود اصحاب شوریٰ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ منتخب کر لیا تھا۔

5. خلافت کی اہلیت رکھنے والے کوئی صاحب طاقت کے بل پر اقتدار پر قبضہ کر لیں اور امت انہیں قبول کر لے جیسا کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کو حضرت حسنؓ کی بیعت کے بعد امت نے قبول کر لیا تھا اور وہ اس کے بعد کم و بیش بیس برس تک امت کے متفقہ امیر المؤمنین رہے۔

خلافت کے انعقاد یعنی کسی اسلامی حکومت کی تشکیل اور اس کے جواز کی یہ پانچ صورتیں فقہاء اسلام نے بیان فرمائی ہیں، ان میں سے دوسری، تیسری اور چوتھی صورت تو آج کے دور میں قابل عمل نہیں ہیں، اس لیے کہ اس وقت دنیا میں کوئی شرعی خلیفہ موجود نہیں ہے جو کسی کو اپنا جانشین نامزد کر سکے یا اس کے لیے کوئی پینل مقرر کر سکے اور نہ ہی خلافت کی کوئی باضابطہ شوریٰ موجود ہے جس کے ارکان خلیفہ کا انتخاب کر سکیں، اس لیے آج کے عالمی حالات میں خلافت کے انعقاد یا ایک اسلامی حکومت کی تشکیل کے دو ہی راستے ممکن اور قابل عمل ہیں۔ ایک یہ کہ کسی ملک کے عوام براہ راست یا اپنے معتمد نمائندوں (ارباب حل و عقد) کے ذریعہ خلیفہ کا انتخاب کریں اور دوسرا یہ کہ خلافت کی اہلیت رکھنے والا کوئی شخص طاقت کے ذریعہ اقتدار پر قبضہ کر لے اور ملک کے عوام اسے بطور حکمران قبول کر لیں یعنی عملاً اس کی رٹ قائم ہو جائے۔

اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کا اختلاف

خلافت یا اسلامی حکومت کے حوالہ سے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے اختلاف کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ اہلِ سنت کے ہاں یہ نظام "خلافت" کہلاتا ہے جبکہ اہلِ تشیع اسے "امامت" سے تعبیر کرتے ہیں اور خلافت و امامت میں چند اصولی اور بنیادی فرق پائے جاتے ہیں:

- امام نامزد ہوتا ہے اور خلیفہ امت کی صوابدید پر منتخب ہوتا ہے جیسا کہ اہلِ تشیع کے نزدیک جناب نبی اکرمؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا، جبکہ اہلِ سنت کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے تمام طبقات نے باہمی مشاورت اور اتفاق رائے سے حضرت ابوبکرؓ کا

انتخاب کیا تھا۔

- امام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اسی لیے وہ معصوم ہوتا ہے، مگر خلیفہ احکام اسلامی کے نفاذ اور حق حکمرانی استعمال کرنے میں اللہ تعالیٰ کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتا ہے۔ قاضی ابو یعلیٰؒ نے "الاحکام السلطانیہ" میں واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ کسی صاحب نے حضرت ابوبکرؓ کو یا خلیفة الله کہہ کر خطاب کیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے اسے ٹوک دیا اور فرمایا کہ لست بخلیفة الله، انا خلیفة رسول الله میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ امام اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے خود دلیل کی حیثیت رکھتا ہے اور کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے، مگر خلیفہ جناب نبی اکرمؐ کی نیابت کرتے ہوئے اپنے فیصلے اور حکم میں قرآن و سنت کی دلیل کا پابند ہے جیسا کہ صدیق اکبرؓ نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے خطبہ میں یہ واضح کر دیا تھا کہ میں اگر قرآن و سنت کے مطابق چلوں تو میری اطاعت تم پر ضروری ہے اور اگر اس کے خلاف چلنے لگوں تو تم پر میری اطاعت ضروری نہیں ہے۔
- امام نسبی اور خاندانی ہے جیسا کہ اہلِ تشیع کے بارہ امام ایک ہی نسب اور خاندان سے ہیں مگر خلافت نسبی اور خاندانی نہیں ہے، اس لیے کہ چاروں خلفاء راشدین حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور ان کے بعد صحابہ کرامؓ کے دور میں بننے والے مسلمانوں کے متفقہ امیر المومنین حضرت معاویہؓ میں سے کوئی بزرگ بھی ایک دوسرے کا نسبی اور خاندانی وارث نہیں تھا، اگرچہ بعد میں مسلمانوں کی خلافت اکثر خاندانی دائروں میں ہی چلتی آرہی ہے لیکن حضرات صحابہ کرامؓ کے دور کا نظام خلافت جو آئیڈیل اور اسوہ کی حیثیت رکھتا ہے، خاندانی اور نسبی خلافت کے دائرہ سے ہٹ کر تھا۔
- امام کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا مگر خلیفہ عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پہلے خطبہ میں فرما دیا تھا کہ اگر سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو لیکن اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو، یہ خلیفہ کا عوام کے سامنے جواب دہ ہونا ہے اور عوام کا حقِ احتساب ہے جو خلافت راشدہ کے دور میں عملی طور پر موجود رہا ہے۔
- امام معصوم عن الخطاء ہے اس کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا مگر خلیفہ کی شرعی حیثیت مجتہد کی ہے جس کے بارے میں اصول یہ ہے کہ المجتهد یخطئ ویصیب اس لیے حضرات خلفاء راشدینؓ کے بہت سے فیصلوں سے ان کے سامنے اختلاف کیا جاتا تھا اور وہ درست

ہونے کی صورت میں اختلاف کو قبول بھی کرتے تھے۔

دورِ حاضر میں ایران کا دستور ''امامت'' کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے کہ امام غائب کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے ''ولایت فقیہ'' کو ان کے نمائندہ کی حیثیت دی گئی ہے اور ولایت فقیہ کے طور پر آیت اللہ خمینی اور ان کے بعد آیت اللہ خامنائی اس منصب پر فائز ہوئے ہیں، ان کے ساتھ ایک ''شوریٰ نگہبان'' ہے اور ولایت فقیہ اور شوریٰ نگہبان کو دستوری طور پر یہ حیثیت حاصل ہے کہ ان کے فیصلے حکومت، پارلیمنٹ، عدالت اور دیگر تمام شعبوں پر بالادستی رکھتے ہیں، وہ ان میں سے کسی کا فیصلہ بھی منسوخ کر سکتے ہیں، مگر ان کے فیصلے کو کسی جگہ چیلنج نہیں کیا جا سکتا، حکومت اور پارلیمنٹ وقفہ وقفہ سے منتخب ہوتی ہیں مگر ''ولایت فقیہ'' کا منصب تاحیات ہے۔

جبکہ سعودی عرب اور پاکستان کے دستور ''خلافت'' کے تصور کے قریب ہیں، سعودی عرب میں حاکمیت اعلیٰ قرآن و سنت کی ہے، حق حکمرانی آلِ سعود کو حاصل ہے مگر وہ قرآن و سنت کے مطابق حکومت کرنے کے پابند ہیں، پاکستان کے دستور میں حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی تسلیم کی گئی ہے، حق حکمرانی عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل ہے اور حکومت اور پارلیمنٹ دونوں دستوری طور پر قرآن و سنت کے پابند ہیں۔......

متحدہ مجلسِ عمل کی بحالی

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۳ مارچ ۲۰۱۸ء

متحدہ مجلس عمل کی بحالی کا اعلان کر دیا گیا ہے جس کے تحت مولانا فضل الرحمان کو صدر، جناب لیاقت بلوچ کو سیکرٹری جنرل اور مولانا شاہ اویس نورانی کو سیکرٹری اطلاعات منتخب کر کے مرکزی باڈی تشکیل دی گئی ہے۔ اور کم و بیش سبھی دینی مکاتبِ فکر کی اہم قیادتوں نے اگلا الیکشن متحدہ مجلس عمل کے فورم پر ایک پرچم، ایک منشور اور ایک نشان کے ساتھ لڑنے کا عزم ظاہر کیا ہے جس پر ملک بھر کے سنجیدہ دینی حلقوں میں اطمینان کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ ساتھ متحدہ مجلس عمل کے سابقہ دور اور اس کے بکھر جانے کے حوالہ سے کچھ تحفظات بھی مختلف حلقوں کی طرف سے سامنے آرہے ہیں جن میں سے بعض قابل توجہ بھی ہیں مگر سرِدست یہی بات قابل اطمینان ہے کہ مختلف دینی مکاتبِ فکر کی قیادتوں نے اس ضرورت کا احساس کر لیا ہے کہ انہیں پھر سے مل بیٹھنا چاہیے اور مشترکہ طور پر آج کے نازک حالات میں قوم کی راہنمائی اور قیادت کرنی چاہیے۔ اور ہمارے خیال میں یہ دوبارہ مل بیٹھنا اس امر کا غماز ہے کہ ماضی کی کوتاہیاں اور غلطیاں دینی قیادت کے سامنے ہیں اور

انہیں باہمی اعتماد کے ساتھ دور کرنے کی کوئی نہ کوئی حکمت عملی طے کرلی گئی ہے، اس لیے ہم اس موقع پر تحفظات کی طرف جانے کی بجائے ضروریات کے پہلو پر چند باتیں عرض کرنا چاہیں گے جو بہرحال دینی قیادت کے یکجا ہوجانے کا تقاضا کر رہی ہیں کیونکہ عالمی و قومی حالات کا رخ جس جانب دکھائی دے رہا ہے اس کے پیش نظر ان ضروریات کو مزید نظر انداز کرنے کی گنجائش موجود نہیں ہے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کو اسلامی، نظریاتی اور تہذیبی شناخت و امتیاز سے بہر صورت محروم کر دینے کی عالمی مہم اس وقت اپنے عروج پر ہے اور بین الاقوامی سیکولر اداروں کے ساتھ ساتھ ملک کے اندر بااثر حلقے، ادارے اور لابیاں بھی اس کے لیے مسلسل متحرک ہیں۔ اس کا راستہ اس سے قبل بھی دینی قوتوں کے اتحاد اور رائے عامہ کی قوت نے روکا تھا اور اب بھی ان عالمی اور اندرونی سازشوں کی روک تھام کا یہی ایک مؤثر راستہ ہے کہ دینی جماعتیں متحد ہوں اور قوم کو مشترکہ دینی، فکری اور تہذیبی قیادت فراہم کریں۔ بحمد اللہ تعالیٰ پاکستانی قوم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کی مختلف دینی قیادتیں تمام تر باہمی اختلافات اور جداگانہ ترجیحات کے باوجود (۱) نفاذِ اسلام (۲) ناموسِ رسالتؐ (۳) اور عقیدۂ ختم نبوت کے لیے ضرورت کے ہر موقع پر متحد ہوئی ہیں اور جب بھی وہ ایک فورم پر جمع ہوئی ہیں سیکولر ایجنڈے کو پسپائی اختیار کرنا پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس ایجنڈے پر تسلسل کے ساتھ نت نئے طریقوں سے کام کو آگے بڑھایا جا رہا ہے کہ دینی قیادتوں کے مل بیٹھنے کی راہ روکی جائے اور اجتماعی دینی و قومی مسائل کے لیے الگ الگ مسلکی ڈگڈگیوں کی حوصلہ افزائی کا اہتمام کرکے رائے عامہ کے کسی ایک فورم پر جمع ہونے کے امکانات کو کم سے کم کر دیا جائے تاکہ اس قومی وحدت کا راستہ روکا جاسکے جو ہر ایسے موقع پر استعماری ایجنڈے اور سیکولر منصوبوں کی راہ میں سد سکندری بن جاتی ہے۔

چنانچہ اس صورتحال میں ہم اس کی ضرورت زیادہ محسوس کر رہے ہیں کہ متحدہ مجلس عمل کو ایک بار پھر پوری وحدت و قوت کے ساتھ سامنے آنا چاہیے اور استعماری قوتوں کو دوٹوک پیغام دینا چاہیے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دینی حلقوں اور مذہبی مکاتبِ فکر کو مختلف حوالوں سے باہم لڑانے اور ان کے درمیان کشیدگی و تصادم کا ہر سطح پر اہتمام کرنے کے باوجود نفاذِ شریعت، ناموس رسالتؐ اور عقیدۂ ختم نبوت کے محاذوں پر بوقت ضرورت ان کے باہمی اتحاد کے امکانات کو کبھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ دراصل جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز اور اسلام کی سدا بہار صداقت کا اظہار ہے کہ آپؐ کی امت ہر قسم کے جھگڑوں اور اختلافات کو بھول کر اپنے محبوب پیغمبرؐ کے نام پر متحد ہوجاتی ہے اور ان کے باہمی تنازعات کو لادینیت کے لیے استعمال کرنے کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

ہمیں اس بات پر بھی خوشی ہے کہ متحدہ مجلس عمل کی تشکیل نو میں کسی مذہبی مکتبِ فکر کی مسلمہ قیادت پیچھے نہیں ہے اور یہ ایک بھرپور نمائندہ فورم ہے، البتہ بعض حلقوں اور قیادتوں کی صف اول میں عدم موجودگی کسی حد تک تشنگی کا تاثر قائم رکھے ہوئے ہے جس کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

پاکستان میں فرقہ وارانہ کشیدگی کا خواہ اس کا عنوان سنی شیعہ ہو، دیوبندی بریلوی ہو یا حنفی اہلحدیث، اس حد تک آگے بڑھنا کسی طور قبول نہیں کیا جاسکتا جو ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم نہ کرنے اور ایک دوسرے کو طاقت کے زور سے دبانے کی نفسیات کو فروغ دے۔ ایسی صورتحال نہ اصولی اور اخلاقی طور پر درست ہے اور نہ ہی ملک کے اندرونی اور عالمِ اسلام کے بین الاقوامی حالات اس کے متحمل ہیں۔ قادیانیوں کے علاوہ پاکستانی معاشرہ کے باقی سب حلقوں کو ایک دوسرے کا وجود تسلیم کرنا ہوگا، ایک دوسرے کے معاشرتی احترام کا راستہ اختیار کرنا ہوگا اور ملکی و قومی معاملات میں ایک دوسرے کی شراکت کو قبول کرنا ہوگا۔ قادیانیوں کی استثنا بھی صرف اس لیے ہے کہ وہ اپنے بارے میں قوم اور دستور کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں، ورنہ اگر وہ دستور پاکستان کے تحت اپنا سوشل اسٹیٹس قبول کرلیں تو انہیں بھی قومی دائرے کی ایک اکائی کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے۔

بہرحال ان جذبات و احساسات کے ساتھ ہم متحدہ مجلس عمل کی بحالی کا خیر مقدم کرتے ہوئے دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت ہماری دینی قیادتوں کو خلوص و ایثار کے ساتھ آگے بڑھنے کی توفیق دیں اور ماضی کی کوتاہیوں کی تلافی کرتے ہوئے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی اسلامی شناخت کے تحفظ، مسلم تہذیب و ثقافت کی بقا، نظامِ مصطفیٰؐ کے نفاذ، تحفظ عقیدۂ ختم نبوت اور تحفظِ ناموس رسالتؐ کے لیے قوم کی صحیح سمت مؤثر راہنمائی کے مواقع عطا فرمائیں اور جدوجہد کو قبولیت سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

خلافتِ عثمانیہ، سنی شیعہ کشمکش اور ہمارے اکابر

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۱۲ فروری ۲۰۱۹ء

جامعہ مظاہر علوم سہارنپور (انڈیا) کے ناظمِ اعلیٰ مولانا مفتی سید شاہد الحسنی سہارنپوری کا تحریر کردہ ایک کتابچہ گزشتہ روز نظر سے گزرا جس میں انہوں نے اب سے ایک صدی قبل بپا ہونے والی تحریکِ خلافت میں جامعہ مظاہر علوم کی سرگرمیوں اور کردار کا تعارف کرتے ہوئے اس دور کے کچھ فقہی

مسائل اور مباحث کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ ہماری ملی تحریک اور جدوجہد آزادی کا ایک اہم ریکارڈ ہے جس کا مطالعہ ہر دینی کارکن کو کرنا چاہیے، البتہ اس میں سے چند باتیں قارئین کے علم میں لانے کے لیے اس کالم میں نقل کی جارہی ہیں تاکہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے حوالہ سے اس وقت کے عمومی ماحول سے کچھ شناسائی ہوجائے۔

مفتی صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ:

(۱) ۳مارچ ۱۹۲۴ء کو جب خلافتِ اسلامیہ (عثمانیہ) کے خاتمہ کا اعلان کردیا گیا اور اس کے صرف چار ماہ بعد جولائی ۱۹۲۴ء میں لندن معاہدہ پر دستخط کرتے ہوئے (برطانوی وزیرِاعظم) لارڈ کرزن نے پارلیمنٹ میں کبر و نخوت سے بھرپور ایک اعلان ان الفاظ کے ساتھ کیا کہ:

> ”آج پوزیشن یہ ہے کہ ترکی مٹ چکا ہے اور اب کبھی کھڑا نہیں ہوسکتا کیونکہ ہم نے خلافت کو مٹا دیا ہے، وہ خلافت جو مسلمانوں کی کامیابی کا راز تھی۔ اس طرح ہم نے خلافت کو مٹا کر دراصل اسلام کو مٹا دیا ہے۔“

اور برطانوی وزیر خارجہ نے پارلیمنٹ میں یہ بیان دیا کہ:

> ”ہمیں ہر حال میں وہ چیز مٹا دینا ہے جس سے مسلمانوں میں اتحاد بنتا ہو، جس طرح ہم نے خلافت کو مٹا دیا ہے جو مسلمانوں کو متحد رکھتی تھی۔ ہمیں کسی ایسی چیز کو سر نہیں اٹھانے دینا جو انہیں پھر سے متحد کرے خواہ وہ اتحاد فکری ہو یا تہذیبی۔“

(۲) خلیفہ ترکی کے تعلق سے مسلمانانِ ہند کے اس جذبۂ عقیدت و محبت کا مظہر وہ تجویز بھی ہے جو ۳۱دسمبر ۱۹۱۹ء کو جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اجلاس میں کامل اتفاق کے ساتھ بایں الفاظ منظور کی تھی:

> ”جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس کامل ارادت مندی اور خلوص کے ساتھ اظہار کرتا ہے کہ حضرت سلطان المعظم مسلمانوں کے مسلّم خلیفہ اور امیر المومنین ہیں اس لیے آپ کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔“

(۳) دیوبند کے اکابر علماء کرام کے نام ایک خط میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ”مذہبی تعلیم جس کا بیڑا میرے اکابر نے اٹھایا ہے اور جس میں وہ تمام عمر منہمک رہے ہیں اس کو نہایت ضروری اور مہتم بالشان سمجھتا ہوں اور ہر اس تحریک کا سختی سے مخالف ہوں جو اس میں نقصان پہنچانے والی ہو۔ میں نے سنا ہے کہ بعض علماء اسلام جوش کے ساتھ فرماتے ہیں کہ مدارسِ دینیہ بند کردو اور سب کے سب خلافت کی

طرف متوجہ ہو جاؤ۔ میرے نزدیک یہ نہایت غلط راستہ ہے۔ دونوں امر فرضِ کفایہ ہیں، علماء اور ہادیانِ ملت کا دونوں کی طرف توجہ فرمانا اور دونوں کو یکساں سمجھنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ اور نیز ہر ایسے امر کو جو مسلمانوں میں تفریق و اختلاف کا باعث ہو یا حدودِ شرع سے متجاوز ہو، مثلاً کسی جزوی اختلاف پر یا محض گمان مخالفت پر کسی زندہ یا مردہ مسلمان کی تذلیل و توہین، یا تقلیدِ یورپ میں ایسے اصولوں پر عمل جو اسلام کی تعلیم کے مطابق نہیں، ان سب کو نہایت مکروہ اور غیر مستحسن خیال کرتا ہوں۔"

(۴) حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی نگاہ میں تحریکِ خلافت کی کتنی اہمیت تھی اور خلافتِ عثمانیہ کے بقا اور تحفظ کے لیے وہ کتنی گہرائی سے سوچتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ / نومبر ۱۹۲۰ء میں امروہہ شہر کے شیعوں اور سنیوں کے درمیان اس حد تک اختلاف اور انتشار پیدا ہوا (بلکہ پیدا کر دیا گیا) کہ دونوں میدانِ مناظرہ میں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ صورتحال کی اس سنگینی کو محسوس فرما کر مولانا خلیل احمد امروہہ تشریف لے گئے، وہاں پہنچ کر آپ نے بڑے سخت اور مضبوط لب و لہجہ میں اپنے تمام اہلِ تعلق کو مشورہ دیا کہ یہ زمانہ شیعہ اور سنی کے درمیان خلیج پیدا کرنے اور ٹکراؤ کا ہرگز نہیں ہے کہ اس سے آزادی کے پروگرام خاص طور پر تحریکِ خلافت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ مولانا خلیل احمد کے مشورہ اور ایما سے شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ امروہہ تشریف لائے اور فریقین کو ایک مجلس میں بٹھا کر بہت مؤثر اور دلوں کو جھنجھوڑنے والی تقریر فرمائی جس کے نتیجے میں ٹکراؤ کا ماحول اتفاق و اتحاد کے ماحول میں بدل گیا۔ چنانچہ شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ اس مناظرہ کا ذکر کرتے ہوئے واقعہ کی وضاحت میں خود تحریر فرماتے ہیں:

"چونکہ خلافت کی تحریک اس وقت بہت زوروں پر تھی، عام فضا مسلمانوں میں خصوصاً ہندوستان میں عموماً اتفاق و اتحاد قائم کرنے کی تھی اس لیے عام اہلِ شہر مناظرہ کے خلاف تھے اور سخت اعتراض کرتے تھے۔ اسی لیے سنجیدہ حضرات چاہتے تھے کہ مناظرہ نہ ہو، مگر کوئی کھل کر روکنے پر آمادہ نہیں تھا اس لیے کہ اس میں اس کی اور اس کی پارٹی کی بدنامی ہوتی تھی، اس لیے چاہتے تھے کہ کوئی قومی تحریک کا حامی شخص بیچ میں پڑ کر مناظرہ رکوا دے۔ میں حضرت مولانا خلیل احمد کا مخلص خادم اور تلمیذ بھی تھا اس لیے حضرت موصوف اور دیگر احباب نے ضروری سمجھا کہ مجھے درمیان میں ڈالا جائے تاکہ پھر کسی کو حرف گیری اور اعتراض کا موقع ہاتھ میں نہ آئے۔ چنانچہ میں نے حاضر ہو کر وہاں بڑے مجمع میں تقریر کی جس کی وجہ سے اشتعال ٹھنڈا ہوا، میں نے ہر دو فریق

سنیوں اور شیعوں کو سمجھایا اور وقت کی نزاکتوں کو دکھلا کر زوردار اپیل کی کہ کوئی اس قسم کی کاروائی اس زمانہ میں مناسب نہیں ہے جس سے افتراق کی خلیج وسیع ہو۔ میں نے کربلا شریف، بغداد اور عراق کے انگریزی مظالم دکھائے نیز مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور دیگر مقامات مقدسہ کے قیامت خیز واقعات بھی سنائے اور شیعوں اور سنیوں دونوں کو ملامت کی، بہرحال اس طویل تقریر کا فریقین کے عوام پر اچھا اثر ہوا اور فریقین سمجھ گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔"

تہران میں چند روز

روزنامہ اسلام، لاہور ---۲۷ جون ۲۰۱۹ء

تہران یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۲۶ جون کو "پر امن معاشرہ کے حوالہ سے اسلامی تعلیمات و اقدار کی حکمت عملی" کے عنوان سے منعقد ہونے والے بین الاقوامی موتمر میں شرکت کی دعوت ملی تو میں نے اس سلسلہ میں ایران میں اہلِ سنت کے مرکزی ادارہ دارالعلوم زاہدان کے بزرگوں کے ساتھ مشورہ کو ضروری سمجھتے ہوئے ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اس میں ضرور شریک ہوں اور بتایا کہ وہ بھی اس اجتماع میں شریک ہو رہے ہیں، چنانچہ میں نے دعوت قبول کر لی۔ اور اگرچہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں نئے تعلیمی سال کے آغاز کے موقع پر یہ سفر میرے معمولات سے ہٹ کر ہے مگر زاہدان کے بزرگوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے حاضری کا پروگرام بنا لیا اور ۲۴ جون پیر کو صبح ماہان ایئر کے ذریعے تہران پہنچ گیا۔

تہران یونیورسٹی کی میزبانی

تہران میں اہلِ سنت کے سرکردہ علماء کرام مولانا عبید اللہ موسیٰ زادہ، مولانا شبیر احمد صمدانی، مولانا محمد براھوی، ڈاکٹر بلوچ کاری اور مولانا محمد یحییٰ حقانی خیر مقدم کے لیے ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ تہران یونیورسٹی کی طرف سے مہمانوں کے قیام کا اہتمام ایک ہوٹل میں کیا گیا ہے وہاں پہنچ کر کچھ آرام کیا اور پھر مولانا محمد شاہنوازی کے ہمراہ ڈاکٹر بلوچ کاری محترم کی طرف سے دیے گئے ظہرانہ میں حاضری دی جس میں ایران کے دو بزرگ اور اکابر علماء کرام حضرت مولانا عبد الحمید اور مولانا محمد حسین گورگیج کی زیارت سے شاد کام ہوا۔ مولانا عبد الحمید ایران کے علماء اہلِ سنت کے سرخیل اور دارالعلوم زاہدان کے سربراہ ہیں، انہیں ایران کے سنی حلقوں میں شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور ملک کے

مقتدر اور با اثر علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ دونوں بزرگوں نے میری حاضری پر خوشی کا اظہار کیا اور دعاؤں سے نوازا۔

مذکورہ عالمی موتمر جامعہ تہران کے ”كلية الشريعة والمعارف الاسلامی“ کے زیر اہتمام منعقد ہو رہا ہے جس میں شرکت کے لیے مختلف ممالک سے سرکردہ علماء کرام تہران پہنچ چکے ہیں اور پاکستان سے بھی بہت سے حضرات شریک ہو رہے ہیں جن کی تفصیل اگلے کالم میں ہی عرض کر سکوں گا۔

میں اس سے قبل جنوری ۱۹۸۷ء میں ایران آچکا ہوں۔ مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور حافظ حسین احمد سمیت ایک بڑے وفد نے تہران، قم، زاہدان، مشہد اور دیگر مقامات کا گیارہ روزہ دورہ کر کے انقلاب ایران کا جائزہ لیا تھا۔ میں بھی اس وفد میں شامل تھا اور اپنے مشاہدات و تاثرات کا ایک تفصیلی رپورٹ میں تذکرہ کیا تھا جو ہفت روزہ ترجمانِ اسلام لاہور کے ۴ فروری ۱۹۸۷ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔

سرکاری خبر رساں ایجنسی ارنا سے گفتگو

موتمر سے ایک روز قبل ایران کی سرکاری خبر رساں ایجنسی ارنا نے مختلف مہمانوں سے انٹرویو کیا میں بھی ان میں شامل تھا، اس میں سے چند سوالات اور ان کے جوابات کا تذکرہ یہاں کیا جا رہا ہے۔

مذکورہ موتمر کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے عرض کیا کہ ایسے اجتماعات کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف ممالک اور مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کرام اور اہل دانش کو باہم مل بیٹھنے اور ضروری مسائل پر آپس میں تبادلہ خیالات کا موقع مل جاتا ہے۔ اس وقت پوری دنیا بالخصوص عالمِ اسلام میں جس فکری اور تہذیبی انتشار بلکہ خلفشار کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اس کے ماحول میں اس قسم کے مشترکہ اجتماعات کو میں ضروری اور مفید سمجھتا ہوں اور اسی جذبہ کے ساتھ اس میں شریک ہوا ہوں، ایسے علمی و فکری اجتماعات دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں ہوتے رہنے چاہئیں۔

ایک سوال یہ تھا کہ اس وقت عالمِ اسلام میں جو باہمی تنازعات اور کشمکش کی صورتحال دکھائی دے رہی ہے اس کا کیا حل ہے؟ میں نے گزارش کی کہ مسلم اقوام و ممالک کو اس وقت باہمی ماحول میں جن تنازعات اور کشمکش کا سامنا ہے ان کے حوالہ سے تین امور کا اہتمام میرے خیال میں انتہائی ضروری ہے:

1. ایک یہ کہ اس امر کی پوری کوشش کی جائے کہ مسلم امہ کے کسی باہمی تنازعہ سے عالمی استعماری قوتوں کو اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے کا موقع نہ ملے اور ایسے تنازعات کو عالمی قوتوں کی دخل اندازی سے ہر ممکن طور پر بچانے کی کوشش کی جائے۔

2. دوسری بات یہ کہ ایک دوسرے کے وجود، سالمیت، وقار اور مفادات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا احترام کیا جائے، ایک دوسرے کی حدود میں مداخلت سے گریز کیا جائے اور باہمی تنازعات کو مذاکرات اور افہام وتفہیم کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جائے۔
3. جبکہ تیسری گزارش یہ ہے کہ مسلم ممالک کے مشترکہ فورم اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کو ان معاملات میں فعال کردار ادا کرنا چاہیے بالخصوص مشرقِ وسطیٰ میں سعودی عرب اور ایران کے مابین جو صورتحال دکھائی دے رہی ہے اس میں او آئی سی کا متحرک ہونا بہت ضروری ہے اور اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہو سکے تو پاکستان، ترکی اور ملائیشیا جیسے ممالک کو باہمی مشاورت کے ساتھ آگے بڑھ کر کشیدگی کو کم کرنے اور مسائل کو حل کرانے کے راستے نکالنے چاہئیں۔

فرقہ وارانہ مسائل میں کشیدگی کے بارے میں ایک سوال پر عرض کیا کہ ہر قوم، طبقہ اور کمیونٹی میں شدت پسند بھی ہوتے ہیں اور اعتدال پسند بھی ہوتے ہیں۔ اگر اعتدال و توازن کی قوتیں اپنا کردار ادا کرتی رہیں اور پیش آمدہ مسائل و مشکلات کو مطلوبہ توجہ ملتی رہے تو صورتحال کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے، لیکن اگر مسائل و مشکلات کے بروقت حل کی کوشش نہ کی جائے تو پھر شدت پسندوں کو آگے آنے کا موقع ملتا ہے جس سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے، وغیر ذٰلک۔

ایران آنے سے پہلے کے طے شدہ پروگرام کے مطابق مجھے جمعرات کو پاکستان واپس پہنچنا تھا، لیکن جمعرات کو دارالعلوم زاہدان کے نئے تعلیمی سال کے آغاز کی تقریب ہے جس میں میری شرکت کے لیے حضرت مولانا عبد الحمید کا اصرار ہے اس لیے ہو سکتا ہے ایک آدھ دن واپسی میں تاخیر ہو جائے، اس کے بعد قارئین کی خدمت میں موتمر اور سفر کے حوالہ سے مزید معروضات پیش کر سکوں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تہران یونیورسٹی میں فقہ حنفی کا شعبہ قائم کرنے کی تجویز

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۲۹ جون ۲۰۱۹ء

تہران یونیورسٹی میں منعقد ہونے والا عالمی موتمر گزشتہ روز بخیر و خوبی اختتام پذیر ہو گیا جو صبح ساڑھے نو بجے سے شام چھ بجے تک جاری رہا اور اس میں مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام،

جامعات کے اساتذہ اور اہل دانش نے شرکت کی۔ جبکہ بھارت سے مولانا سید سلمان الحسینی ندوی اور پاکستان سے جامعہ دارالعلوم کراچی کے مولانا عزیزالرحمان سواتی اور جماعت اسلامی بلوچستان کے امیر مولانا عبدالحق ہاشمی کے علاوہ ایران سے بہت سے سرکردہ حضرات اس اجتماع میں شریک ہوئے۔ صدر ایران کے مشیر حجۃ الاسلام علی یونسی مہمان خصوصی تھے اور کلیۃ الالہیات جامعہ تہران کے استاذ ڈاکٹر مصطفٰی ذوالفقار طلب موتمر کے رئیس تھے۔ کانفرنس میں انسانی معاشرہ کو پر امن ماحول فراہم کرنے، بالخصوص عالمِ اسلام میں باہمی وحدت کے فروغ اور فرقہ وارانہ و دیگر تنازعات و اختلافات کو ان کی جائز حدود میں رکھنے کے حوالہ سے علماء کرام اور ارباب دانش نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

موتمر سے ایک دن قبل جامعہ تہران میں موتمر کے میزبان شعبہ کلیۃ الشریعۃ والالہیات الاسلامیۃ میں مہمانوں کے ساتھ ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں انہیں کلیہ کی سرگرمیوں سے آگاہ کیا گیا۔ اس موقع پر بتایا گیا کہ اس شعبہ میں فقہ شافعی کی تدریس گزشتہ سات عشروں سے جاری ہے جس میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے درجوں میں تحقیق و تدریس کا کام ہوتا ہے اور سینکڑوں طلبہ اس سے استفادہ کر چکے ہیں جن میں بعض اسی شعبہ میں خدمات سرانجام دینے میں مصروف ہیں۔ جامعہ تہران کا اس سلسلہ میں مصر کے جامعۃ الازہر کے ساتھ باہمی تعاون کا معاہدہ ہوا تھا جس کے مطابق یہ تسلسل قائم ہے۔ اس موقع پر فقہ حنفی کی تعلیم و تدریس کے لیے بھی "چیئر" قائم کی گئی تھی مگر اس کا سلسلہ آگے نہ چل سکا۔ گفتگو کے دوران اس شعبہ کے سربراہ ڈاکٹر احمد باکری کو توجہ دلائی گئی کہ فقہ شافعی کی تعلیم و تدریس بہت مستحسن امر ہے مگر اس کے ساتھ فقہ حنفی کا شعبہ قائم ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ ایران میں رہنے والے اہلِ سنت میں احناف کی تعداد زیادہ ہے۔ انہوں نے اس سے اتفاق کیا، چنانچہ طے پایا کہ موتمر کے بعد دوسرے روز اس سلسلہ میں ایک خصوصی مشاورتی نشست کی جائے گی جو جمعرات کو گیارہ بجے اسی شعبہ کے کالج میں ڈاکٹر احمد باکری کی صدارت میں منعقد ہوئی اور اس میں شعبہ کے اساتذہ ڈاکٹر مصطفٰی ذوالفقار طلب، ڈاکٹر جمال جمالی زادہ اور دیگر حضرات کے ساتھ مولانا سید سلمان ندوی، مولانا عبدالحمید آف زاہدان، مولانا عزیزالرحمان سواتی اور راقم الحروف نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر جامعہ تہران میں فقہ حنفی کی تدریس و تحقیق کا شعبہ قائم کرنے کی تجویز پر تفصیل کے ساتھ تبادلہ خیالات ہوا اور صدر شعبہ نے بتایا کہ وہ اس سے متفق ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں جلد از جلد عملی اقدامات کیے جائیں گے۔ ان کے اس فیصلہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے شرکاء محفل نے کہا کہ یہ موتمر کے مثبت ثمرات میں شمار کیا جائے گا اور اس کے دور رس اثرات مرتب ہوں

گے۔

موتمر کے اختتام پر صدارتی مہمان خانہ میں صدر ایران کے مشیر حجۃ الاسلام علی یونسی نے بیرونی ممالک سے آنے والے مہمانوں کے اعزاز میں عشائیہ دیا جس میں مختلف مندوبین نے عالمِ اسلام کی وحدت، امت مسلمہ کے باہمی تنازعات کو آپس میں گفتگو کے ذریعے حل کرنے اور اسلامی تعلیمات کے فروغ کے سلسلہ میں خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقع پر میزبان جناب حجۃ الاسلام علی یونسی کو مولانا سید سلمان ندوی حسینی نے توجہ دلائی کہ یہ بات دنیا بھر کے اہلِ سنت میں محسوس کی جارہی ہے کہ تہران میں اہلِ سنت لاکھوں کی تعداد میں آباد ہیں مگر ان کی کوئی باضابطہ مسجد بالخصوص جمعۃ المبارک کی اجتماعی ادائیگی کا اہتمام موجود نہیں ہے۔ ایرانی صدر کے مشیر محترم نے اس شکایت سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں بھی اس کا احساس ہے، وہ یقین دلاتے ہیں کہ اس شکایت کو جلد از جلد دور کیا جائے گا اور تہران میں اہلِ سنت کی باقاعدہ مسجد کے قیام کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں گے۔

میں نے گزشتہ کالم میں عرض کیا تھا کہ جمعرات کو دارالعلوم زاہدان کے تعلیمی سال کے آغاز کی تقریب میں شرکت کے لیے میں نے اپنے قیام کی مدت میں ایک دن کا اضافہ کیا تھا مگر جامعہ تہران میں فقہ حنفی کا شعبہ قائم کرنے کی تجویز پر جمعرات کے روز جس خصوصی نشست کا اہتمام ہوا اس کے منتظمین کا تقاضہ تھا کہ ہم اس میں ضرور شریک ہوں جبکہ مولانا سید سلمان ندوی، مولانا عزیز الرحمان سواتی اور راقم الحروف تینوں مولانا عبد الحمید کے ساتھ زاہدان جانے کی ترتیب طے کر چکے تھے اور شام کی فلائیٹ سے سیٹیں کنفرم تھیں، مگر مذکورہ نشست کی اہمیت کے پیش نظر ہم سب نے زاہدان جانے کا پروگرام ترک کر کے اس میں شرکت کی اور بحمد اللہ تعالیٰ ایک اچھا فیصلہ ہو گیا۔ اب میں واپسی کے سفر کی تیاری میں ہوں، امید ہے کہ ہفتہ کے روز جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں اسباق کے باقاعدہ آغاز کے وعدہ کی تکمیل میں ان شاء اللہ تعالیٰ کامیاب ہو جاؤں گا۔

پُرامن بقائے باہمی کیلئے اسلام کی تعلیمات

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ --- جولائی ۲۰۱۹ء

(جامعہ تہران کے کلیۃ الالہیات والمعارف الاسلامیۃ کے زیر اہتمام ۲۶ جون ۲۰۱۹ء کو منعقدہ الموتمر العالمی للقدرات الاستجراتیجیۃ لتعالیم الاسلامی فی تحقیق التعایش السلمی کے لیے لکھا گیا۔)

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ

واتباعہ اجمعین۔

میں سب سے پہلے جامعہ طہران کے کلیۃ الالہیات والمعارف الاسلامیۃ اور اس کے رئیس فضلیۃ الشیخ الدکتور مصطفی ذوالفقار طلب حفظہ اللہ تعالیٰ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اربابِ علم و دانش کی اس موقر محفل میں مجھے شرکت کا اعزاز بخشا اور عالمِ اسلام کے سرکردہ علماء کرام اور دانش وران کے ارشادات سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازیں اور ہمارے اس مل بیٹھنے کو انسانی سوسائٹی، عالمِ اسلام اور امت مسلمہ کے لیے خیر و برکت کا ذریعہ بنائیں، آمین یارب العالمین۔

ہم اس وقت اس عنوان پر غور و خوض اور تبادلۂ خیال کے لیے جمع ہیں کہ امت مسلمہ کو پر امن معاشرت اور اجتماعی زندگی کے لیے اسلامی تعلیمات کے کن پہلوؤں پر زیادہ توجہ دینے اور کون سی حکمت عملی اور اقدار و روایات کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے علمی و فکری حلقوں بالخصوص جامعات کو کیا طریقِ کار اختیار کرنا چاہیے۔ جہاں تک پر امن معاشرت اور سلامتی پر مبنی سوسائٹی کا تعلق ہے، یہ نہ صرف امت مسلمہ بلکہ پوری نسلِ انسانی کی ہمیشہ سے ضرورت چلی آرہی ہے اور جب تک اس زمین پر انسان آباد ہیں اس کی ضرورت رہے گی، لیکن اس کے لیے مختلف اقوام اور ادوار میں الگ الگ فلسفہ اور طریقِ کار رہا ہے اور آج بھی یہ اختلاف و تنوع انسانی سوسائٹی میں امن و سلامتی کے مجموعی اہتمام میں رکاوٹ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی ماحول میں سے ہم نے اپنے لیے امن و سلامتی کا راستہ نکالنا ہے اور فساد و بدامنی کی موجودہ دلدل سے نکلنے کی صورتیں پیدا کرنی ہیں جو اہلِ علم و دانش کے فطری و شرعی فرائض میں داخل ہے۔

اسلام تو عبارت ہی سلامتی سے ہے اور اس کا مادہ "سلم" ہے۔ سلم اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی کہ خود بھی سلامتی سے رہنا ہے اور دوسروں کو بھی سلامتی کے ساتھ رہنے کے مواقع فراہم کرنا ہے اور یہ بات کسی اصول و ضابطہ اور اجتماعی اخلاقیات و اقدار کی تشکیل و تعین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسلام نے اس کا فطری راستہ بتایا ہے کہ نسلِ انسانی خود کو اپنے پیدا کرنے اور زندگی کے ہر قسم کے اسباب فراہم کرنے والی ذات کے حوالے کر دے اور اس کی ہدایات کی پابندی قبول کرے جو اس نے اپنے مقدس پیغمبروں صلوات اللہ علیہم اجمعین کے ذریعہ بھجوائی ہیں اور جن کی نشاندہی اللہ تعالیٰ نے زمین پر حضرت آدم و حوا علیہا السلام کو اتارتے وقت اس طرح کر دی تھی کہ فاما یأتینکم منی ھدًی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ جب کہ آسمانی تعلیمات کی پابندی قبول نہ کرنے والی اقوام و طبقات اور گروہوں نے باہمی امن و سلامتی کا ماحول پیدا کرنے کے لیے عقل و خواہش کو

بنیاد بنایا اور یہ طے کر لیا کہ انسانی سوسائٹی اپنے نفع ونقصان کو خود ہی بہتر سمجھتی ہے، اس لیے وہ اجتماعی سوچ اور تقاضوں کی بنیاد پر جو طے کر لے، وہی اس کے لیے امن و سلامتی کا راستہ ہے۔ قرآن کریم نے اسے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس ولقد جاء ھم من ربھم الھدٰی۔

آج بھی فکری اور تہذیبی ماحول میں یہی کشمکش پوری نسلِ انسانی کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، اس لیے ہماری اولین ذمہ داری یہ ہے کہ ہم نسلِ انسانی کو اسلامی تعلیمات اور ولقد جاء ھم من ربھم الھدٰی کی طرف متوجہ کریں اور اس حقیقت سے آگاہ کریں کہ انسانی سوسائٹی اگر سارے معاملات خود طے کرنے لگے گی تو افراد و طبقات اور اقوام و ممالک کے درمیان خواہشات و مفادات کا ہمہ گیر تنوع اسے کبھی کسی نتیجے تک نہیں پہنچنے دے گا اور باہمی تصادم و کشمکش سے اسے نکلنا کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے معاملات طے کرنے کے لیے کسی بالاتر ذات و قوت کی طرف رجوع کرے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی ہے جس کی ہدایات حضرات انبیاء کرام علیہم السلام بالخصوص حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی صورت میں اس کے پاس موجود ہیں۔

اس اصولی گزارش کے ساتھ ساتھ گفتگو کو طوالت سے بچانے کے لیے موجودہ معروضی صورتِ حال میں چند معروضات تجاویز کی صورت میں اس موقر مؤتمر کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر انہیں بھی غور وفکر کے دائرہ میں شامل کر لیا جائے تو اس عمل میں شرکت کے حوالہ سے مجھ جیسے طالب علم کا بھی کوئی حصہ پڑ جائے گا۔

1. اس وقت دنیا میں بین الاقوامی معاہدات کے جس نیٹ ورک نے اقوام و ممالک کو حصار میں لے رکھا ہے، اس سے آگاہی کا ماحول پیدا کرنا اربابِ فکر و دانش اور جامعات کی ذمہ داری ہے اور میرے خیال میں بڑی جامعات کو بین الاقوامی معاہدات اور نسلِ انسانی کے ساتھ ساتھ عالمِ اسلام پر ان کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے تحقیق و مطالعہ کے دائرہ کو وسعت دینی چاہیے۔
2. بین الاقوامی معاہدات میں جو امور ملت اسلامیہ اور مسلم ممالک کے لیے پوری طرح قابلِ قبول نہیں ہیں، ان کے لیے بین الاقوامی اداروں اور عالمی فورموں پر مذاکرہ و مباحثہ اور امت مسلمہ کا موقف صحیح طور پر ان تک پہنچانا بہر حال ہماری ذمہ داری ہے۔
3. امت مسلمہ اور مسلم ممالک کے باہمی تنازعات و اختلافات کو قابلِ برداشت حد میں رکھنے

کے لیے کوئی اجتماعی ضابطۂ اخلاق طے کرنے پر کام ہونا چاہیے اور وحدت و اجتماعیت کے زیادہ سے زیادہ اہتمام کے لیے سنجیدہ اور اجتماعی ورک کی ضرورت ہے۔

4. عالمی استعمار اور استبدادی قوتوں کے دباؤ اور جبر کا شکار ہونے والے مسلمانوں بلکہ دیگر ایسے گروہوں کے حق میں آواز اٹھانا اور جبر و دباؤ کو کم کرنے کی تدابیر کرنا بھی ہماری ذمہ داریوں میں شامل ہے۔
5. کشمیر، فلسطین، اردن اور دیگر مظلوم خطوں کے مسلمانوں کو ظلم و تشدد سے نجات دلانا اور ان کے قومی و ملی حقوق کی پاسداری کے لیے عالمِ اسلام کو مؤثر آواز اٹھانی چاہیے۔
6. مسلم امہ کے بین الاقوامی اداروں بالخصوص او آئی سی (اسلامی تعاون تنظیم) سے درخواست کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ عالمِ اسلام کے معروضی حالات اور مشکلات و مسائل کے تناظر میں باہمی بحث و مباحثہ اور بالادست اقوام و ممالک کے ساتھ مذاکرہ و مکالمہ کے راستے نکالیں۔
7. جامعات اور دینی اداروں کو چاہیے کہ وہ اسلام کی اجتماعی و معاشرتی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کا اہتمام کریں۔

امید ہے کہ میری ان معروضات پر مؤتمر کے معزز شرکاء غور و خوض کی زحمت فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ مؤتمر کو کامیابی سے نوازیں، منتظمین کو جزائے خیر سے نوازیں اور پورے عالمِ اسلام کے لیے ہمارے اس اجتماع کو بہتر رہنمائی اور خیر و برکت کا ذریعہ بنائیں، آمین یارب العالمین۔

سفرِ ایران کے چند تاثرات و مشاہدات

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲ جولائی ۲۰۱۹ء

ہفتہ کے روز ایران سے واپس گوجرانوالہ واپس پہنچ گیا ہوں مگر دوحہ سے لاہور کی فلائیٹ پانچ گھنٹے لیٹ ہونے کی وجہ سے اسباق میں حاضری نہیں ہو سکی۔ سفر کی مدت میں ایک دن کے اضافہ کی وجہ سے نیا روٹ قطر ایئرویز کے ذریعے تہران سے دوحہ اور وہاں سے لاہور کا ترتیب پایا۔ دوحہ میں اسٹاپ سات گھنٹے کا تھا مگر فلائیٹ کی روانگی میں پانچ گھنٹے کی تاخیر کی وجہ سے بارہ گھنٹے تک پھیل گیا جو میرے لیے آزمائش سے کم نہیں تھا۔ میرے ٹخنوں میں ایک عرصہ سے درد رہتا ہے جس کی وجہ سے زیادہ چلنا پھرنا دشوار ہو جاتا ہے، اللہ بھلا کرے گوجرانوالہ کے ایک نوجوان حافظ محمد صدیق کا جو گلاسگو سے آرہا تھا اور اسی فلائٹ سے اسے بھی لاہور آنا تھا، اس نے مجھے پہچان لیا اور بتایا کہ وہ گوجرانوالہ کے مولانا

حافظ ریاض انور گجراتی کا شاگرد ہے اور ان کے ہاں میرے بیانات سنتا رہتا ہے، پھر وہ جہاز میں سوار ہونے تک مسلسل میرا اسہارا بنا رہا، اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

ساڑھے پچیس ہزار کا ناشتہ

اس میں لطیفہ کا پہلو یہ ہے کہ تہران ایئرپورٹ پر میں صبح جلدی پہنچ گیا تھا اور ناشتہ وہیں کیا، انڈے والا ایک برگر اور ایک چائے کا آرڈر دیا لیکن جب اس کا بل دیکھا تو وہ ساڑھے پچیس ہزار ایرانی ریال کا تھا۔ ایک دفعہ تو سر گھومنے لگا، پھر میں نے کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی سے کہا کہ کسی اور کرنسی میں بتاؤ، اس نے کہا تین امریکی ڈالر، یہ سن کر میرا سانس بحال ہوا اور ایک کونے میں میز پر سامان رکھ کر اطمینان سے ناشتہ کیا۔ جبکہ شام کو دوحہ ایئرپورٹ پر ایک بڑا کپ چائے کا پانچ امریکی ڈالر میں میسر ہوا، جو دو چار سال پہلے پانچ سو روپے کے لگ بھگ بنتا تھا، اب ساڑھے سات سے آٹھ سو روپے کے درمیان بنتا ہے۔

ایرانی اہلِ سنت کی جدوجہد اور مصروفیات

میرا ایران کا یہ سفر تین عشروں کے بعد تھا، پہلے سفر کی خود اپنی لکھی ہوئی تفصیلی رپورٹ پرانے ریکارڈ سے نکلوا کر میں ساتھ لے گیا تھا اور اب اسے دوبارہ کمپوز کر کے اپنی ویب سائیٹ پر ڈالنے کا پروگرام ہے۔ وہاں کے کچھ دوستوں نے اسے پڑھا اور میرے استفسار پر بتایا کہ مجموعی صورتحال اب بھی کم و بیش اسی طرح ہے۔ جبکہ کوئی نمایاں فرق مجھے بھی دکھائی نہیں دیا البتہ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ایران کے اہلِ سنت علماء کرام نے اپنے تحفظات و شکایات کے حوالہ سے تصادم اور کشمکش کی بجائے تعاون اور افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کر رکھا ہے جس کے مثبت اثرات دھیرے دھیرے سامنے آرہے ہیں اور اہلِ سنت کے حقوق و مفادات کے لیے پیشرفت دیکھنے میں آرہی ہے جس کا کریڈٹ یقیناً زاہدان کے حضرت مولانا عبد الحمید کو جاتا ہے جو بڑی حکمت عملی، تدبر اور حوصلہ کے ساتھ اہلِ سنت کی راہنمائی اور قیادت کر رہے ہیں اور ان کی بات کو سرکاری حلقوں میں بھی توجہ کے ساتھ سنا جاتا ہے۔

یہ بات وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوئی کہ ۲۶ جون کو تہران یونیورسٹی میں منعقد ہونے والے عالمی موتمر کے اصل محرک یونیورسٹی کے سنی اساتذہ تھے بالخصوص فقہ شافعی کے شعبہ میں کام کرنے والے اساتذہ اور دانشور حضرات نے اس کی تحریک کی تھی جس میں انہیں سرکاری سرپرستی کے ساتھ ساتھ اہلِ سنت کے اکابر علماء کرام کی حمایت بھی حاصل تھی۔

میری حاضری پر سب سے زیادہ خوش یہ اکابر علماء کرام تھے، اس کے ساتھ ہی والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے تلامذہ اور خود میرے شاگردوں میں سے جو بھی وہاں آسکا اس نے ملاقات کی صورت ضرور نکالی۔ بالخصوص زاہدان کے مولانا غلام اللہ اور مولانا محمد شاہنوازی کی خوشی قابل دید تھی۔ یہ دونوں جامعہ دارالعلوم کراچی کے فضلاء میں سے ہیں، ایک سال کے لگ بھگ عرصہ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں گزار چکے ہیں اور اب دارالعلوم زاہدان میں تعلیمی و تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ دونوں حضرات باری باری پورے سفر میں میرے ساتھ رہے اور خدمت و میزبانی کا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں دونوں جہانوں کی سعادتوں سے بہرہ ور فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

ایران میں جامعہ دارالعلوم کراچی، جامعہ فاروقیہ، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ اور جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے بہت سے فضلاء مختلف مقامات پر تدریسی و تعلیمی خدمات میں مصروف ہیں، ان کی محنت و کاوش کا تسلسل دیکھ کر دل خوش ہوا۔

خطۂ ایران اور عربی زبان

مختلف مجالس میں علمی و فکری مسائل پر بھی ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی، ان میں سے ایک کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ ایک مجلس میں ایران کے سرکردہ علماء کرام سے ہمارے کسی ساتھی نے سوال کیا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرامؓ اور تابعین جن علاقوں میں بھی گئے وہاں عربی زبان کو فروغ ہوا اور آہستہ آہستہ وہ سب علاقے عرب بن گئے۔ مثلاً مصر، شام، عراق، سوڈان، الجزائر اور لیبیا وغیرہ ایسے ممالک ہیں جو عرب نہیں تھے مگر عرب بن گئے۔ جبکہ ایران میں ایسا نہیں ہوا حالانکہ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی اچھی خاصی تعداد یہاں آئی ہے، ایسا کیوں ہوا ہے؟ اس موقع پر میں نے عرض کیا کہ اس سوال میں میری طرف سے ایک اضافہ کر لیں کہ ایرانیوں نے نہ صرف یہ کہ خود عربی زبان کو قبول نہیں کیا بلکہ ہمارے لیے بھی رکاوٹ بن گئے اور ہمارے ہاں صدیوں تک فارسی بطور دفتری، عدالتی اور قومی زبان رہی، جو اب انگریزی میں تبدیل ہوگئی ہے اور اس سے پیچھا چھڑانا ہمارے لیے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

میں نے اس مجلس میں بتایا کہ مصدقہ معلومات کے مطابق پاکستان بن جانے کے بعد ممتاز مسلم لیگی لیڈر آغا خان نے تجویز دی تھی کہ اس نئے ملک میں انگریزی کی بجائے عربی کو سرکاری زبان بنایا جائے جس سے یہ ملک عرب کلچر سے وابستہ ہو جائے گا اور بہت سی ثقافتی الجھنوں سے محفوظ رہے گا، مگر ان کی بات قابل توجہ قرار نہیں پائی چنانچہ انگریزی زبان اب تک اپنے تمام تر ثقافتی ماحول اور تہذیبی رعب و ادب کے ساتھ ہم پر بدستور مسلط ہے اور اس کے حصار کو توڑنے میں دستور، پارلیمنٹ اور

سپریم کورٹ کے واضح فیصلے بھی کامیاب نہیں ہو پا رہے۔

یہ بات میرے لیے اطمینان کا باعث ہے کہ اپنی علمی و فکری جدوجہد کا اصل موضوع اس سفر میں بھی مجھے یاد رہا کہ آج کی سب سے بڑی علمی و فکری ضرورت انسانی حقوق کے عالمی فلسفہ و نظام اور بین الاقوامی معاہدات سے صحیح طور پر آگاہی حاصل کرنا اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس حوالہ سے امت کی راہنمائی کرنا علماء کرام کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ گزشتہ ماہ مکہ مکرمہ کے سفر کے دوران اس سلسلہ میں اپنی تجاویز اور دیگر ضروری دستاویزات پر مشتمل فائل میں نے رابطہ عالمِ اسلامی کے سیکرٹری جنرل سعادت الدکتور ڈاکٹر عبد الکریم العیسی حفظہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کی تھی، اور اب ایران کے سفر میں وہی فائل زاہدان اور تہران کے سرکردہ علماء کرام کے حوالہ کر کے آیا ہوں۔ اس درخواست کے ساتھ کہ وہ اس پر مذاکرہ و مکالمہ کا ماحول بنائیں گے اور نئی نسل کی صحیح طور پر راہنمائی کا اہتمام کریں گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۹ء

وزیر اعظم عمران خان ان دنوں ایران اور سعودی عرب کے درمیان مصالحت کے مشن پر ہیں اور انہوں نے پہلے تہران اور پھر ریاض جا کر دونوں ممالک کے سربراہان سے ملاقاتیں کی ہیں۔ اور سرکاری ذرائع کا کہنا ہے کہ دونوں ممالک نے مصالحت کی پاکستانی پیشکش کا خیر مقدم کرتے ہوئے گفت وشنید کا سلسلہ شروع کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے جو کہ ایک اچھی علامت ہے۔ ایران اور سعودی عرب کے درمیان تنازعات کا بنیادی پس منظر جاننے کے لیے مشرقِ وسطیٰ میں جاری شیعہ سنی کشمکش کی صورتحال پر ایک نظر دوڑانا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں پانچ سال قبل لکھی گئی یہ تحریر شاید قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث بنے۔ ان پانچ برسوں کے دوران مشرقِ وسطیٰ میں جو تبدیلیاں آچکی ہیں وہ اس تحریر کے مندرجات کی روشنی میں زیادہ واضح انداز میں دیکھی جا سکتی ہیں:

یمن کے صدر کا ایران سے مطالبہ

ثنا نیوز کے حوالہ سے ۱۲ اپریل کو ایک قومی اخبار میں شائع ہونے والی خبر ملاحظہ فرمائیے:

”یمن کے صدر عبد ربہ منصور ہادی نے ایران سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ان کے ملک کی داخلی سیاست میں مداخلت کا سلسلہ بند کر دے۔ صدر منصور نے پان عرب

روزنامہ ''الحیات'' کے ساتھ انٹرویو میں ایران پر جنوبی یمن میں علیحدگی پسندوں اور شمالی یمن سے تعلق رکھنے والے مذہبی گروہوں کی حمایت کا الزام عائد کیا ہے جوان کے بقول ان کے ملک کو عدم استحکام سے دوچار کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ''بدقسمتی سے ایران کی مداخلت جاری ہے، خواہ یہ حراک علیحدگی پسندوں کی حمایت کی صورت میں ہے یا شمالی یمن سے تعلق رکھنے والے مذہبی گروہوں کی حمایت ہے''۔ ان کا واضح اشارہ شمالی یمن سے تعلق رکھنے والے حوثی باغیوں کے لیے ایران کی حمایت کی جانب تھا۔ گزشتہ روز شائع ہونے والے اس انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ ''ہم نے اپنے ایرانی بھائیوں سے یمن میں غلط پالیسیوں پر نظر ثانی کے لیے کہا ہے لیکن ہمارے مطالبات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ ہم ایران سے کشیدگی کو بڑھانا نہیں چاہتے لیکن اس کے ساتھ ہم اس سے یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ یمن سے اپنا ہاتھ کھینچ لے''۔

ایران ماضی میں متعدّد مرتبہ یمن میں مداخلت کے الزامات کو مسترد کر چکا ہے لیکن یہ یمن ہی نہیں ہے جو اس پر ایسے الزام عائد کر رہا ہے بلکہ سعودی عرب اور امریکہ بھی اس پر یمن کی داخلی سیاست میں مداخلت اور خاص طور پر حوثی اہلِ تشیع کی حمایت کے الزام عائد کر رہے ہیں۔ گزشتہ سال یمن نے اپنے علاقے میں اسلحے سے لدے ایک بحری جہاز کو پکڑنے کی اطلاع دی تھی اور کہا تھا کہ اس کے ذریعے دھماکہ خیز مواد اور زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل یمن میں لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ تاہم ایران نے اس اسلحے سے کسی قسم کے تعلق سے انکار کر دیا تھا۔''

ثنا نیوز کی یہ تفصیلی خبر اس صورت حال کی صرف ایک جھلک ہے جو مشرقِ وسطیٰ بلکہ عالمِ اسلام میں سنی شیعہ کشیدگی کے حوالہ سے دن بدن واضح ہوتی جا رہی ہے اور جس کے متوقع مستقبل کے حوالہ سے اربابِ فکر و دانش کی تشویش مسلسل بڑھ رہی ہے۔ شیعہ سنی کشیدگی کا یہ تناظر صرف مشرقِ وسطیٰ تک محدود نہیں بلکہ پاکستان بھی اس کے دائرے میں شامل ہے، حتیٰ کہ مشرق بعید کے بعض ممالک سے آنے والی بعض خبریں اس کے اثرات وہاں تک وسیع ہونے کے امکانات بھی پیش کر رہی ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ میں سُنی شیعہ کشیدگی کا واقعاتی تناظر

مشرقِ وسطیٰ میں اس کشیدگی کا واقعاتی تناظر یہ ہے کہ

- شام میں اس وقت حکومت اور باغیوں کے درمیان جو جنگ جاری ہے وہ زیادہ تر سنی شیعہ کشیدگی کا پس منظر رکھتی ہے۔

- کویت میں گزشتہ انتخابات میں سنی شیعہ بنیادوں پر پارلیمنٹ میں جو تناسب سامنے آیا اور اس کے بعد حکومتی سطح پر جو اقدامات دکھائی دیے وہ اس کشیدگی کی موجودگی اور کویت کی قومی سیاست میں اس کی اثر خیزی کی غمازی کرتے ہیں۔
- عراق کو سنی شیعہ بنیادوں پر مختلف ریاستوں میں تقسیم کر دینے کی تجویزیں بین الاقوامی حلقوں میں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔
- لبنان میں دستور کے دائرے میں یہ تقسیم موجود ہے اور عوامی شعبوں میں اس کا وقتاً فوقتاً اظہار ہوتا رہتا ہے۔
- بحرین میں سنی شیعہ آبادی کے تناسب اور اس کے سیاسی عواقب کی بات اس اب تجزیوں اور تبصروں سے بڑھ کر اس کے عملی اظہار کی شکل اختیار کر چکی ہے۔
- جبکہ خود سعودی عرب کے داخلی ماحول میں بھی اس کی تپش کا درجہ حرارت کم کرنے کی تدبیریں کامیاب ہوتی نظر نہیں آتیں۔
- اردن کے شاہ عبداللہ نے چند سال قبل یہ کہا تھا کہ ہم مشرقِ وسطیٰ میں ''شیعہ ہلال کے حصار میں ہیں''، جبکہ عرب ممالک کی صورت حال پر نظر ڈالتے ہوئے یہ بات خلاف واقعہ نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں شام کی موجودہ خانہ جنگی ان تمام حوالوں سے سنی شیعہ کشیدگی کا سب سے بڑا مرکز اور مورچہ بنتی جا رہی ہے اور دونوں طرف کی قوتیں اپنا سارا زور اسی مورچے پر صرف کر دینے کے موڈ میں دکھائی دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پاکستانی حکومت اور قوم دونوں میں سے کوئی بھی اس سے لا تعلق نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اس کے اثرات سے بچنا ہمارے لیے ممکن ہے۔ آج کے سیاسی حلقوں میں اسے سعودی عرب اور ایران کی پراکسی وار سے تعبیر کیا جا رہا ہے جو معروضی حالات میں غلط بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ پورے خطے میں سنی حلقوں کو فطری طور پر سعودی عرب کی طرف سے کسی حمایت یا تعاون کی توقع ہو سکتی ہے اور شیعہ گروہوں کو ایران کی سپورٹ حاصل ہونا ایک فطری سی بات ہے۔ آخر دونوں طرف سے کسی نہ کسی نے تو قیادت اور نمائندگی کرنی ہی ہے۔

سُنی شیعہ کشیدگی کا مستقبل کیا ہے؟

اصل بات غور کرنے کی یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ اور پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی جو رخ اختیار کرتی جا رہی ہے اس کا مستقبل کیا ہے اور اس میں دونوں طرف کے نفع و نقصانات کے امکانات کا تناسب کیا ہے؟ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ دونوں طرف کی مذہبی روایات کی رو سے حضرت امام مہدیؒ کے ظہور

کا زمانہ قریب نظر آرہا ہے اور چونکہ ان کا ظہور شام کے علاقہ میں ہونا ہے اس لیے شام اس کشمکش کا مرکز بنتا جارہا ہے اور دونوں حلقوں میں آخری زور آزمائی اسی علاقہ میں وقوع پذیر ہوتی نظر آرہی ہے۔

کچھ حضرات کا خیال ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل کی مزعومہ بالادستی کو تحفظ دینے کے لیے عالمی استعماری قوتوں کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اس خطہ میں سنی شیعہ کشیدگی کی آگ کو مسلسل ہوا دیتے رہیں تاکہ دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں مل کر اسرائیل کے لیے حقیقی چیلنج کی صورت اختیار نہ کرسکیں۔ جبکہ یہ کہنا بھی تاریخی پس منظر کے حوالہ سے شاید غلط نہ ہو کہ ایک طرف ایران کو ماضی کی فاطمی حکومت کی یاد ستانے لگی ہے اور دوسری طرف ترکی کو خلافتِ عثمانیہ کا دور پھر سے یاد آرہا ہے اور دونوں طرف کی دھیرے دھیرے پیش رفت درمیان کی بہت سی قوموں اور ملکوں کو پریشان کررہی ہے۔

عالمی قوتوں کے ایجنڈے سے باخبر رہنے کی ضرورت

اس پس منظر میں ایک بات دونوں کے سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کی ہے کہ ان کی یہ مسلسل بڑھتی ہوئی کشمکش عالمی استعماری قوتوں کے ایجنڈے کی تکمیل اور اسرائیل کے استحکام وتحفظ کا ایک بڑا ذریعہ تو ثابت نہیں ہوگی؟ اور دوسری بات اہلِ سنت کے ارباب فکرونظر کی توجہ کی طالب ہے کہ مشرقِ وسطیٰ اور پاکستان میں اہلِ تشیع کی بڑھتی ہوئی فکری، سیاسی، علمی اور معاشرتی سرگرمیاں اور گہری منصوبہ بندی اہلِ سنت کی واضح اکثریت کے لیے خطرات و خدشات میں اضافے کے ساتھ ساتھ اہلِ سنت کے موجودہ سیاسی و معاشرتی مقام وحیثیت کے لیے چیلنج تو نہیں بن جائے گی؟ یہ باتیں سوچنے کی ہیں، انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن مجھے معاف رکھا جائے کہ اہلِ سنت کے حقوق ومفادات کے لیے مصروف کار موجودہ سیٹ اپ اور نیٹ ورک اس کے فکری وعملی تقاضے پورے کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے بلکہ شاید صورت حال کے حقیقی ادراک کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور نہیں ہے۔ میں ایک عرصہ سے اہلِ سنت کے ارباب دانش سے عرض کررہا ہوں کہ کم ازکم صورت حال کے ادراک اور معاملات کو سمجھنے کے لیے ہی کچھ ارباب فکرودانش مل بیٹھیں مگر اس نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟

وحدتِ امت اور
تحفظِ ختمِ نبوت کے ضروری تقاضے

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲۲ نومبر ۲۰۱۹ء

لاہور میں ”جامعۃ العروۃ الوثقٰی“ کے نام سے اہلِ تشیع کا ایک بڑا تعلیمی ادارہ ہے جو آغا سید جواد نقوی کی سربراہی میں کام کر رہا ہے اور طلبہ و طالبات کی ایک بڑی تعداد وہاں مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ مشترکہ دینی و قومی معاملات میں ملی مجلس شرعی کے فورم پر ان کا ہمارے ساتھ رابطہ رہتا ہے اور نقوی صاحب کے نائب علامہ توقیر عباس اجلاسوں میں ان کی اکثر نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک عرصہ سے ان کا تقاضہ تھا کہ جامعہ کی سالانہ کانفرنس میں شریک ہوں مگر موقع نہیں بن رہا تھا۔ گزشتہ دنوں چیمبر آف کامرس گوجرانوالہ میں منعقدہ ہمارے ایک پروگرام میں آغا سید جواد نقوی تشریف لائے تو انہوں نے ۱۷ نومبر کو منعقد ہونے والی ”وحدت امت ختم نبوت کانفرنس“ میں شرکت کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی اور اپنے عزیز ساتھیوں حافظ امجد محمود معاویہ، حافظ نصر الدین خان عمر اور حافظ شاہد میر کے ہمراہ کانفرنس کی ظہر سے پہلے والی نشست میں شریک ہوا۔ جامعہ کا ماحول دیکھ کر احساس ہوا کہ مجھے یہاں بہت پہلے آنا چاہیے تھا اس لیے کہ علمی، فکری اور لٹریری ماحول جہاں بھی ہو ہمیشہ سے میری کمزوری چلا آرہا ہے۔ اس موقع پر جو گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلٰوۃ۔ کانفرنس کا عنوان ”وحدت امت ختم نبوت کانفرنس“ ہے۔ وحدت امت ہماری ضرورت ہے اور ختم نبوت اس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، خدا کرے کہ یہ اجتماع اس کے لیے مفید ثابت ہو، آمین۔

ہماری وحدتِ امت نسلِ انسانی کی ضرورت بھی ہے کہ اس وقت پوری انسانی سوسائٹی کو جس ہدایت اور راہنمائی کی ضرورت ہے وہ قرآن و سنت کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے مگر ہم اسے دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچانے کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ اس کے لیے ہمارے ہاں یکسوئی اور وحدت درکار ہے کہ ہم اجتماعی احساس و ادراک کے ساتھ دنیائے انسانیت کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کی طرف توجہ دلا سکیں۔

وحدت امت ہماری ملی ضرورت بھی ہے کہ عالمِ اسلام اس وقت جن مشکلات و مسائل میں گھرا ہوا ہے اور مصائب کی جس دلدل کا شکار ہے اس سے نکلنے کے لیے وحدت ضروری ہے۔ مگر صورتحال یہ ہے کہ ہمیں لڑانے والے ہوشیار بھی ہیں، طاقتور بھی ہیں اور مسلسل متحرک بھی ہیں۔ جبکہ

وحدت کی آواز اٹھانے والوں کی آواز مؤثر نہیں ہو پا رہی۔ ہمیں ہر جگہ اور ہر سطح پر باہمی تنازعات اور جھگڑوں میں الجھا دیا گیا ہے اور ان کو سمیٹنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی۔ جبکہ پاکستان کے داخلی ماحول میں بھی وحدت امت ہی ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے جس کے لیے محنت ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

اس وحدت امت کے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور اسوۂ حسنہ ہماری سب سے بڑی بنیاد ہے، بالخصوص ناموس رسالتؐ اور ختم نبوت کے تحفظ کے عنوانات ہمیشہ ہماری وحدت اور یکجہتی کا ذریعہ بنتے ہیں اور ہم سارے تنازعات کے باوجود ان دونوں بنیادوں پر ہمیشہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ مگر ختم نبوت کے حوالہ سے میں ایک بات عرض کرنا چاہوں گا جو ایک عرصہ سے ہر سطح پر اور ہر ماحول میں کر رہا ہوں کہ ہمارے تین بڑے مسائل (۱) مسلم معاشرہ میں اسلامی احکام و قوانین کی عملداری، (۲) ناموس رسالتؐ کی پاسداری، اور (۳) عقیدۂ ختم نبوت کا تحفظ جو ہماری بنیادی ملی ضروریات کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وقت عالمی اداروں اور لابیوں میں موضوع بحث ہیں اور ان تینوں حوالوں سے جو کشمکش موجود ہے وہ بین الاقوامی معاہدات کے ٹائٹل کے ساتھ عالمی اداروں، ورلڈ میڈیا اور انٹرنیشنل لابیوں میں بڑھتی جا رہی ہے، مگر وہاں تک نہ ہماری رسائی ہے اور نہ ہی نمائندگی ہے جو بہت بڑا المیہ ہے۔

میں ہر جگہ یہ بات کہہ رہا ہوں بلکہ خود مواقع تلاش کر کے مختلف حلقوں میں کہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ گزشتہ سال کے دوران مکہ مکرمہ میں رابطہ عالمی اسلامی کی کانفرنس میں حاضری ہوئی تو میں نے وہاں کے ذمہ دار حضرات کو اس طرف توجہ دلائی، جبکہ اس کے بعد تہران یونیورسٹی کی ایک کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا تو وہاں بھی یہی گزارش پیش کی، اس کے علاوہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے متعدّد پروگراموں میں یہ آواز اٹھا چکا ہوں اور وہی بات آج کے اس ماحول میں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ (۱) شریعت کے احکام کی عملداری، (۲) ناموس رسالتؐ کی پاسداری، اور (۳) ختم نبوت کے تحفظ کے تینوں حوالوں سے اصل کشمکش بین الاقوامی اداروں میں ہے، جہاں رسائی حاصل کر کے اپنی بات وہاں تک پہنچانے اور اپنا کیس اصل جگہ لڑنے میں ہم ابھی تک سنجیدہ نہیں ہیں۔ گویا ہم فضائی جنگ زمین پر لڑنے میں مصروف ہیں وہ بھی ضروری آلات اور تکنیک اختیار کیے بغیر، یہ صورتحال انتہائی تکلیف دہ ہے اور آپ حضرات کے سامنے بھی یہی درد دل لے کر حاضر ہوا ہوں۔

ہمیں دراصل بین الاقوامی معاہدات نے جکڑا ہوا ہے جو ہم پر ہماری کمزوریوں کی وجہ سے مسلط کر

دیے گئے ہیں۔ عالمی اداروں نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں اور مغربی فلسفہ کی علمبردار لابیاں، جنہیں ہر قسم کی قوت اور سپورٹ میسر ہے، ہمارے خلاف کاروائیوں کا سلسلہ تیز کرتی جا رہی ہیں۔ میں ''وحدت امت ختم نبوت کانفرنس'' کے اس فورم سے بھی یہی پیغام متعلقہ اداروں، حلقوں اور مراکز تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ ہمیں اپنی علمی، فکری، ثقافتی اور دینی جنگ اس کے اصل مورچوں میں لڑنے کی صورت نکالنی ہوگی ورنہ ہم اپنی جدوجہد اور موقف کے ساتھ انصاف نہیں کر پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

فرقہ وارانہ کشیدگی کی صورتحال

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد --- ۲ جون ۲۰۲۰ء

...... دوسرا مسئلہ ملک میں سنی شیعہ کشیدگی کے ماحول میں مسلسل اضافے کا ہے جس میں رمضان المبارک کے دوران سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے یوم شہادت کے موقع پر ایک فرقہ کے عوامی جلوسوں کے حوالہ سے سرکاری اداروں کی پالیسی میں کھلے تضاد اور جانبداری نے اضافہ کیا ہے۔ اور اب بہت سے دیگر واقعات کے علاوہ شام میں امیر المومنین عمر ثانی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی قبر کی بے حرمتی کے شرمناک سانحہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔ عام دینی کارکن ایک طرف یہ دیکھ رہا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے بہت سے ممالک کی طرح پاکستان میں بھی سنی شیعہ تصادم کا ماحول پیدا کرنا اور فرقہ وارانہ خانہ جنگی کی راہ ہموار کرنا اسرائیل اور اس کی سرپرست عالمی طاقتوں کا ایجنڈا ہے مگر دوسری طرف ملک میں فرقہ وارانہ معاملات میں ریاستی اداروں میں گھات لگائے ہوئے کچھ لوگوں کی منصوبہ بندی بھی اب کوئی خفیہ بات نہیں رہی۔ ان حالات میں دینی کارکن بلکہ ملک کا عام شہری اس اضطراب اور بے چینی سے نجات حاصل کرنے کے لیے دینی قیادتوں کے ساتھ ساتھ ریاستی اداروں کے ذمہ دار حضرات سے ہی کسی مثبت اور مؤثر کردار کی توقع کر سکتا ہے، خدا کرے کہ اس کی کوئی صورت نکل آئے۔......

''کل جماعتی مجلسِ عمل تحفظِ ناموسِ صحابہ کرامؓ واہلِ بیت عظامؓ''

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۱۲اگست ۲۰۲۰ء

''کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ناموس صحابہ کرام واہل بیت عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین'' کے قیام کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی تاکہ اسلام کی مقدس ہستیوں بالخصوص حضرات انبیاء کرامؑ اور صحابہ کرامؓ و اہل بیت عظامؓ کی حرمت و ناموس کے قانونی تحفظ کے لیے مشترکہ جدوجہد کا راستہ ہموار ہو۔

مذہبی شخصیات کی حرمت و ناموس کا تقاضہ

ہر ملک میں قومی شخصیات کی عزت و احترام کے تحفظ کے قوانین موجود ہیں لیکن جب سے مذہب کو ریاستی اور قومی معاملات سے باہر کی چیز سمجھا جانے لگا ہے، مذہبی شخصیات کی حرمت و ناموس کے تحفظ کا مسئلہ بھی قانون کے دائرہ سے خارج کر دیا گیا ہے اور اسے غیر ضروری امر قرار دیا جا رہا ہے۔ حتٰی کہ عالمی سطح پر مقدس مذہبی شعائر و شخصیات کے ناموس کے تحفظ کے لیے قانون سازی کے مسلسل مطالبہ کے باوجود اقوام متحدہ اور اس کے متعلقہ ادارے اس کی طرف متوجہ نہیں ہو پا رہے ہے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کی بنیاد چونکہ نظریاتی اور تہذیبی ہے اور اس کے دستور میں قرارداد مقاصد اور دیگر اسلامی دفعات کی رو سے اسلام ہی اس ملک کی تاریخی، نظریاتی اور تہذیبی اساس ہے، اس لیے مقدس شخصیات و شعائر کی حرمت و ناموس کے تحفظ کے لیے باقاعدہ قانون سازی ایک ناگزیر ملی تقاضے کی حیثیت رکھتی ہے جس کے لیے مختلف دائروں میں متعدّد قوانین ملک کے دستور و قانون کا حصہ بنتے آ رہے ہیں، مگر ایک جامع اور تمام ضروری تقاضوں کو سمونے والے قانون کی ضرورت باقی تھی، جس کے لیے پنجاب اسمبلی نے یہ بل منظور کر کے پیشرفت کی ہے۔

اسی پس منظر میں ملک بھر میں مختلف دینی حلقوں کی طرف سے اس کے خیر مقدم کا سلسلہ جاری ہے اور ۹/اگست کو مجلس احرار اسلام پاکستان کے مرکزی دفتر لاہور میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان (س) کے سیکرٹری جنرل مولانا عبد الرؤف فاروقی کی دعوت پر منعقد ہونے والی جماعتوں اور حلقوں کی کل جماعتی کانفرنس نے بعض تحفظات کے اظہار کے ساتھ اس بل کا خیر مقدم کیا ہے۔ کانفرنس کی صدارت جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی نائب امیر مولانا مفتی حبیب الرحمان درخواستی نے کی اور اس میں

مولانا سید کفیل شاہ بخاری، مولانا محمد احمد لدھیانوی، جناب لیاقت بلوچ، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، مولانا عبد الرؤف ملک، مولانا حافظ عبد الغفار روپڑی، علامہ حافظ ابتسام الٰہی ظہیر، حاجی عبد اللطیف چیمہ، مولانا قاری زوار بہادر، قاضی محمد ظفر الحق، مولانا محمد الیاس چنیوٹی، اور اہلِ سنت کے تمام مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والی بہت سی دیگر ممتاز شخصیات کے علاوہ راقم الحروف نے بھی شرکت کی۔

اہلِ سنت کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے سب طبقات قابلِ احترام ہیں

صحابہ کرامؓ میں اہلِ سنت کے نزدیک ازواجِ مطہراتؓ، خلفاء راشدینؓ، اہلِ بیت عظامؓ، بناتِ رسولؐ اور اس دور کے دیگر سب طبقات شامل ہیں۔ اس لیے جب صحابہ کرامؓ کا جملہ بولا جاتا ہے تو اس سے سبھی مراد ہوتے ہیں، لیکن مختلف طبقات کے تحفظات کے باعث ان کا بسا اوقات الگ الگ تذکرہ بھی کیا جاتا ہے، مگر یہ سب بزرگ اہلِ سنت کے تمام مکاتبِ فکر کے ہاں تعظیم و احترام کے مستحق ہیں اور ان میں سے کسی کی بھی بے ادبی اور گستاخی سنگین جرم سمجھی جاتی ہے۔ البتہ اہلِ تشیع اہل بیت عظامؓ کے سوا عام طور پر باقی اصحابِؓ رسولؐ کو اس دائرہ میں شمار کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اس لیے اس قسم کے تنازعات عرصہ سے جاری ہیں اور ان کا اظہار مختلف پیرایوں میں ہوتا رہتا ہے۔

اہلِ تشیع کی معروف قیادت کا افسوسناک اعلان

ہمارے ہاں اس سے قبل قانون سازی، یا باہمی ضابطۂ اخلاق کے تعین کی جب بھی بات ہوئی ہے پاکستان کی سنجیدہ شیعہ قیادت نے مثبت رویہ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ملی یکجہتی کونسل کے طے کردہ متفقہ ضابطۂ اخلاق اور دیگر بہت سے باہمی معاہدات اس کی شہادت کے طور پر تاریخ کے ریکارڈ کا حصہ ہیں۔ مگر ''تحفظ بنیاد اسلام بل'' کی پنجاب اسمبلی میں منظوری کے بعد پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ اہلِ تشیع کی معروف قیادت نے کھلے بندوں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ احترام و تقدس اور تعظیم و حرمت کے قانونی دائرے میں صحابہ کرامؓ کی اکثریت کو شامل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور اسی وجہ سے وہ یہ بل مسترد کر رہے ہیں۔ اہلِ تشیع کی معروف قیادت کی طرف سے اس افسوسناک اعلان کے بعد ملک بھر میں ہیجان کی کیفیت پیدا ہونا فطری بات تھی جس کا ہلکا سا اظہار ۹۔ اگست کے مذکورہ کل جماعتی کنونشن کی صورت میں ہوا ہے۔ کیونکہ پاکستان اہلِ سنت کی غالب اکثریت کا ملک ہے جس کے لیے یہ بات سننا بھی مشکل ہے کہ ازواج مطہرات، خلفاء راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کی اکثریت کو تعظیم و احترام کے قانونی تحفظ کے دائرہ میں شامل کرنے کو متنازعہ قرار دیا جائے۔ یہ بات جلسوں، مناظروں اور درس و تدریس میں تو ہوتی آرہی ہے لیکن کسی گروہ کا قومی سطح پر مستقل طور پر اسے اپنا موقف قرار دینے کا اعلان

بہر حال ناقابل برداشت ہے، اور یہی بات ”کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ناموس صحابہ کرامؓ واہل بیت عظامؓ“ کے قیام کا فوری باعث بنی ہے۔ جس میں کل جماعتی اجلاس کے داعی مولانا عبدالرؤف فاروقی کو سب شرکاء کی طرف سے یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ مختلف مکاتبِ فکر کی سنی جماعتوں اور علمی مراکز سے رابطہ کر کے مجلس عمل کی باقاعدہ تشکیل کی راہ ہموار کریں۔

مجلس عمل کے لیے چند تجاویز

کل جماعتی مجلس عمل کو اس سلسلہ میں اب کیا کرنا ہے، اس کے بارے میں تو مجلس عمل کی مرکزی رابطہ کمیٹی کی تشکیل کے بعد ہی مشترکہ طور پر کوئی لائحہ عمل اور طریق کار طے کیا جا سکے گا، مگر معروضی صورتحال میں چند گزارشات تجاویز کے طور پر پیش کی جا رہی ہیں:

- اپنے اس موقف کو کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح حضرات صحابہ کرامؓ و اہل بیت عظامؓ کی عزت و ناموس کے تحفظ کا جامع قانون بھی ضروری ہے، اور اس کے لیے تحفظات کو دور کر کے پنجاب اسمبلی کے منظور کردہ ”تحفظ بنیاد اسلام بل“ کو نافذ العمل بنایا جا سکتا ہے، سنجیدگی اور اہتمام کے ساتھ منظم طور پر سامنے لانا ضروری ہے۔
- ملک بھر میں مدح صحابہ کرامؓ و خلفاء راشدین، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہراتؓ و بنات مکرماتؓ کی مدح و تعظیم کے لیے مسلسل اجتماعات کا اہتمام کیا جائے اور ابلاغ کے دیگر میسر ذرائع کا اس کے لیے بھرپور استعمال کیا جائے۔
- اہلِ سنت کی مختلف جماعتوں اور حلقوں کے درمیان باہمی رابطوں اور مفاہمت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے اور مشترکہ جدوجہد کا ماحول بنایا جائے۔
- محرم الحرام کے دوران امن و امان کے قیام اور فرقہ وارانہ کشیدگی کو روکنے کے لیے ہر سطح پر محنت کی جائے تاکہ اس صورتحال سے کوئی بیرونی قوت اپنے ایجنڈے کے لیے فائدہ نہ اٹھا سکے۔
- ارکان اسمبلی اور دیگر ذمہ دار حضرات سے ملاقاتیں کر کے انہیں بریف کرنے کا اہتمام کیا جائے۔
- اور تمام سنی جماعتوں کے سرکردہ قائدین باہمی مفاہمت و اعتماد کے ساتھ جلد از جلد مشترکہ لائحہ عمل کا تعین کریں۔

نفاذِ شریعت اور فقہ جعفریہ

روزنامہ اسلام، لاہور --- ۵ دسمبر ۲۰۲۰ء

ان دنوں پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے لیے ایک مسودہ قانون علمی حلقوں میں زیر بحث ہے جس میں اہلِ تشیع کے لیے بعض معاملات میں فقہ جعفریہ کے مطابق قانونی فیصلوں کی گنجائش پیدا کی گئی ہے، بتایا گیا ہے کہ یہ بل ایوان بالا میں عنقریب منظوری کے لیے پیش کیا جائے گا۔

پاکستان میں دستوری طور پر شرعی قوانین کا نفاذ اور لوگوں کو قرآن و سنت کے مطابق ان کے مقدمات، تنازعات اور معاملات طے کرنے کے انتظامات کرنا حکومت کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے اور اس کے لیے وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ پیشرفت ہوتی رہتی ہے۔ قرآن و سنت کی بالادستی دینی تقاضہ ہونے کے ساتھ ساتھ دستوری ضرورت بھی ہے، البتہ قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے لیے کسی ایک فقہ کو بنیاد بنانے کی بجائے ایک متبادل دائرہ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کی صورت میں طے کیا گیا ہے اور اس کے مطابق نظام چل رہا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد یہ سوال شدت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کی بنیاد کیا ہوگی؟ بالخصوص سنی شیعہ کشمکش کے تناظر میں سیکولر حلقوں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ اس ماحول میں نفاذِ شریعت کی بات کرنا فرقہ وارانہ کشیدگی کو فروغ دینے کے مترادف ہوگا، اس لیے سرے سے اس راستہ کو ہی ترک کر دیا جائے اور ملک کی قانونی نظام کی اساس سیکولرزم پر رکھی جائے۔ جس کے جواب میں تمام مکاتبِ فکر کے ۱۳۱ اکابر علماء کرام نے ۲۲ متفقہ دستوری نکات پیش کر کے واضح کیا تھا کہ نفاذِ اسلام کے بنیادی معاملات پر سنی اور شیعت سمیت تمام مکاتبِ فکر متفق ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد سے قومی اور ملی مسائل پر مشترکہ موقف اور جدوجہد کی روایت چلی آرہی ہے حتیٰ کہ ملک میں غالب اکثریت رکھنے والے احناف نے بھی اس ٹائٹل کو اختیار کرنے سے یہ سمجھ کر گریز کیا کہ دنیا کے مسلمہ اصولوں کے مطابق ملک کی اکثریت کی فقہی تعبیرات کو ہی ترجیح حاصل ہوگی جیسا کہ ایران میں فقہ جعفریہ اور مصر میں فقہ شافعی کو حاصل ہے۔

اس پس منظر میں جب انقلاب ایران کے بعد پاکستان میں "تحریک نفاذِ فقہ جعفریہ" کا آغاز ہوا تو ہم نے اس پر تحفظات کا اظہار کیا کہ اس سے فرقہ وارانہ عنوانات اور کشمکش کا تاثر نمایاں ہوگا اور قومی وحدت کو نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ پاکستان کے ایک حصہ نے اپنے نام سے نفاذ کا لفظ حذف کر کے تحریک جعفریہ کا ٹائٹل اختیار کر لیا جبکہ دوسرا حصہ ابھی تک تحریک نفاذِ فقہ جعفریہ کے عنوان سے مصروف عمل ہے۔ ہمیں اہلِ تشیع کے جائز قانونی اور مذہبی حقوق سے کبھی اختلاف نہیں

رہا مگر الگ فقہی عنوان کے ساتھ کسی امتیاز کو قانونی شکل دینے کی صورت ہمارے نزدیک محل نظر ہے، حالانکہ مروجہ انگریزی قانونی نظام جب برطانوی حکومت نے ۱۸۵۷ء کے دوران نافذ کیا تھا تو اس سے قبل فقہ حنفی ہی پورے متحدہ ہندوستان کے قانونی نظام کی بنیاد تھی، اور اصولاً اس کا حق بنتا تھا کہ اس کی جگہ نافذ کیے جانے والے قانونی نظام کو ختم کرنے کی صورت میں سابقہ پوزیشن کو بحال کیا جائے۔ اس کے علاوہ انقلاب ایران کے بعد جب ایران کی مذہبی حکومت کی طرف سے ملک کے قانونی نظام میں فقہ جعفریہ کو اس کی اساس قرار دیا ہے اس لیے کہ وہ ملک کے عوام کی اکثریت کا فقہی مذہب ہے۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود فقہ حنفی کا یہ استحقاق واضح ہوتے ہوئے بھی اس ٹائٹل پر اصرار نہیں کیا گیا جبکہ اہلِ تشیع کی طرف سے اس ٹائٹل پر اصرار بدستور موجود ہے جس کی تازہ مثال یہ مسودہ قانون ہے، جس میں اہلِ تشیع کے کچھ مطالبات کو فقہ جعفریہ کے عنوان کے ساتھ قانون میں شامل کر کے فقہی تقسیم کو قانوناً تسلیم کرنے کی صورت پیدا کی جا رہی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بات اب بھی محل نظر ہے کہ اگر خدانخواستہ یہ مسودہ قانون اس شکل میں منظور کر لیا گیا تو ملک کے قانونی نظام میں فرقہ وارانہ الگ الگ فقہی عنوانات کا دروازہ کھل جائے گا اور سیکولر حلقوں کو موقع ملے گا کہ وہ اس کی آڑ میں سرے سے شرعی قوانین کے نفاذ و اطلاق کو ہی متنازعہ بنانے کی مہم تیز کر دیں۔

اس لیے ہم حکمران اداروں اور پارلیمنٹ کے ساتھ ساتھ ملک بھر کی دونوں طرف کے علمی حلقوں سے گزارش کریں گے کہ وہ اس صورتحال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں اور ملک و قوم کو کسی ایسے راستے پر لے جانے سے گریز کریں جو عالمی سیکولر استعمار اور ملک میں نفاذِ اسلام کو متنازعہ قرار دینے والے سیکولر حلقوں کے ایجنڈے کے لیے تقویت کا باعث بن سکے۔

مسلم حکومتیں اور اسلامی نظام

۲۶ ستمبر ۲۰۲۱ء کو ادارۃ النعمان، گوجرانوالہ میں خطاب

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج میں آپ حضرات کو موجودہ معروضی حالات میں اسلام کے قانون و نظام کو کسی بھی سطح پر تسلیم کرنے والی مسلم حکومتوں کی صورتحال سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں جن کے دستور و قانون میں اسلام کا نام شامل ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اسلامی حکومتیں اور ریاستیں ہیں۔ سعودی عرب، پاکستان اور ایران تو سب کے سامنے ہیں البتہ مراکش میں بھی سربراہ مملکت کو امیر المؤمنین کہا جاتا ہے جس کا پس منظر اس وقت میرے سامنے نہیں ہے۔

1. سعودی عرب کا باقاعدہ نام ”المملکۃ العربیۃ السعودیۃ“ ہے جو آج سے کم و بیش ایک صدی

قبل خلافتِ عثمانیہ کے بکھرنے کے دور میں قائم ہوئی تھی۔ اس ریاست میں ”آلِ سعود“ کے زیرِ اقتدار وہ علاقے شامل ہیں جن میں اس وقت مختلف معاہدات کی صورت میں آلِ سعود کے دائرۂ اقتدار میں شامل کیا گیا تھا اور ان پر بین الاقوامی طور پر آلِ سعود کا حق حکمرانی خاندانی اور نسلی بنیاد پر تسلیم کیا گیا تھا، جبکہ آلِ سعود نے حکمرانی کا حق ملنے کے بعد قرآن کریم کو اپنی مملکت کا ریاستی مذہب اور دستور و قانون کی بنیاد قرار دینے کا اعلان کیا تھا، سعودی عرب کی حکومتی نظام میں الشیخ محمد بن عبدالوہابؒ کا خاندان بھی ”آل شیخ“ کے نام سے ایک معاہدہ کے تحت شریک تھے اور ان کے درمیان تقسیم کار چلی آ رہی ہے۔

سعودی عرب کا عدالتی نظام مکمل طور پر قرآن و سنت کے تابع ہے جس کی برکات پورے ملک میں دکھائی دے رہی ہیں، البتہ اب موجودہ ولی عہد شہزادہ محمد نے یہ سوال اٹھا دیا ہے کہ دستور و قانون کی بنیاد قرآن کریم کے ساتھ حدیث و سنت بھی ہے یا صرف قرآن کریم ہی ریاست و حکومت کی اساس ہے۔ بہرحال خاندانی حکومت ہونے کے باوجود اپنے دستور و قانون کے حوالہ سے ایک اسلامی ریاست ہے اور حالات میں مختلف تغیرات کے باوجود اسلامی ریاست اور حرمین شریفین کے انتظام و خدمت کے حوالہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں کی عقیدت و احترام سے بہرہ ور ہے۔

2. پاکستان ایک سیاسی اور عوامی تحریک کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء کے دوران برطانوی استعمار کے تسلط کے خاتمہ اور متحدہ ہندوستان کی تقسیم کے موقع پر وجود میں آیا تھا، اور اس نئی مملکت کے قیام کی تحریک چلانے والے قائدین نے واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے لیے الگ ریاست کے قیام کا مطالبہ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی عملداری کے لیے کر رہے ہیں، چنانچہ ملک کے باقاعدہ قیام اور مسلم لیگ کو اقتدار منتقل ہونے کے بعد اس کے ریاستی و حکومتی نظام کی تشکیل کا سوال کھڑا ہوا تو اگرچہ سیکولر حلقوں اور لابیوں نے پوری کوشش کی کہ اس نوزائیدہ مملکت کو ایک سیکولر اور جمہوری ریاست کی حیثیت دے دی جائے مگر دستور ساز اسمبلی نے ”قرارداد مقاصد“ کی صورت اس کی نظریاتی بنیاد ہمیشہ کے لیے طے کر دی کہ

- حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔
- حقِ حکمرانی عوام کے منتخب نمائندوں کو ہوگا اور
- پارلیمنٹ اور حکومت قرآن و سنت کے احکام کی پابند ہوں گی۔

ان اصولوں کی تشریح تمام مکاتبِ فکر کے ۱۳۱ اکابر علماء کرام نے متفقہ ’’۲۲ دستوری نکات‘‘ کی صورت میں کر دی جن میں سے بیشتر نکات دستورِ پاکستان کا باقاعدہ حصہ ہیں اور انہی اسلامی دستوری بنیادوں کی وجہ سے اسلامی جمہوریہ پاکستان ایک نظریاتی اسلامی ریاست سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ عملی صورتحال شروع سے اب تک اس سے مختلف چلی آ رہی ہے اور مقتدر حلقے دستوری صراحتوں کے باوجود عملی طور پر اسلامی احکام و قوانین کو نفاذ و فروغ کا کوئی راستہ نہیں دے رہے۔ البتہ دستوری اساس کے لحاظ سے ہر ایک اسلامی ریاست ہے اور اگر دستور پر تمام ادارے اور طبقے خلوص کے ساتھ عمل کریں تو پاکستان اسلامی ریاست کے طور پر ایک آئیڈیل ملک کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آ سکتا ہے۔

3. تیسری طرف ایران نے جناب آیت اللہ خمینی کی قیادت سے مذہبی انقلاب کے بعد خود کو ’’اسلامی جمہوریہ ایران‘‘ کی شکل دی اور اسلام کو ریاست کا سرکاری دین اور ’’اثناعشری فقہ‘‘ کو ملک کا ریاستی مذہب قرار دیا، دستور کے مطابق ملک میں حاکمیت اعلیٰ ’’امامِ غائب‘‘ کی تسلیم کی گئی اور ان کی نمائندگی ’’ولایتِ فقیہ‘‘ کے عنوان سے ملک کے سب سے بڑے فقیہ کرتے ہیں جو اپنے دور میں خمینی صاحب تھے، اور اب جناب آیت اللہ خامنہ ای صاحب کو وہ مقام حاصل ہے جو مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ سمیت تمام ریاستی و حکومتی اداروں کے لیے حکمران اعلیٰ اور فائنل اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ نظام حکومت چلانے کے لیے عوام کے منتخب نمائندوں کو ذریعہ بنایا گیا ہے اور پارلیمنٹ اور حکومتی مناصب عوامی الیکشن کے ذریعے وجود میں آتے ہیں۔ گویا ایران میں اہلِ تشیع کے اثناعشری طبقہ نے اپنے ’’تصور امامت‘‘ کو دستوری اور قانونی حیثیت دے دی ہے جو ان کے دائرہ میں کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور وہ اس پر سختی سے قائم ہیں۔

4. اس پس منظر میں افغانستان اور طالبان پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہئے۔ طالبان نے اب سے دو عشرے قبل اپنے دور اقتدار میں افغانستان کو ’’امارت اسلامی افغانستان‘‘ کا عنوان دیا تھا جس میں امیر المؤمنین کے طور پر ملا محمد عمر مجاہدؒ نے کم و بیش پانچ سال حکومت کی جس کے مثبت ثمرات و نتائج اور برکات کا ابھی تک عالمی سطح پر اعتراف کیا جا رہا ہے، اس کے بعد انہیں امریکی اتحاد کے ساتھ بیس سال تک جنگ لڑنا پڑی جس میں سرخرو ہونے کے بعد اب پھر وہ پورے افغانستان میں برسر اقتدار ہیں اور نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنے اقتدار اور نظام کو حتمی شکل دینے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس موقع پر میں باقی تفصیلات سے قطع نظر دو

باتوں کا بطور خاص تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

○ ایک یہ کہ افغانستان پر طالبان کے کنٹرول اور حکومت کو تسلیم کرنے کی بجائے بین الاقوامی دباؤ کے ذریعے انہیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ ان شرائط اور قیود کو بہر حال تسلیم کریں جو عالمی اداروں نے ان کے لیے طے کر رکھے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ زیادتی اور ناانصافی کی بات ہے، وہ اسلامی عقیدہ اور افغان ثقافت کے ساتھ بے لچک کمٹمنٹ رکھتے ہیں اور ان کا ایک مستقل ''وژن'' ہے جسے یکسر مسترد کر دینے کی بجائے معاشرتی تجربہ اور سماجی عملداری کا موقع ملنا چاہئے۔ عالمی قوتیں اپنے نظام اور سولائزیشن کو ہر جگہ مسلط کرنے کے لیے دباؤ، جبر اور مکر کے جو حربے مسلسل استعمال کر رہی ہیں وہ بجائے خود ان کے نظام و ثقافت کے کھوکھلا ہونے کی علامت ہے۔ انہیں اگر اپنی سولائزیشن کے انسانی سماج کے لیے مفید ہونے کا یقین ہے تو اس کا فیصلہ انسانی سماج کو کرنے دیں جو تجربہ و مشاہدہ کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ متبادل نظام و ثقافت کے طور پر امارت اسلامی افغانستان کو کسی بیرونی مداخلت اور ڈکٹیشن کے بغیر آزادی کے ساتھ اپنا نظام قائم کرنے کا موقع دیں اور کچھ عرصہ انہیں مکمل خود مختاری کے ساتھ اپنے نظام و ثقافت پر عمل کرنے دیں، تاکہ دنیا کے سامنے یہ بات واضح ہو سکے کہ انسانی سماج کی بہتری کے لیے مغرب کا نظام و ثقافت زیادہ کارآمد ہے یا اسلامی نظام و قانون زیادہ مفید ہے۔ یہ فیصلہ خود کرنے کا کسی بھی فریق کو حق حاصل نہیں ہے، جبکہ مغرب یکطرفہ طور پر دھونس، دھاندلی، جبر اور دباؤ کے تمام حربے اختیار کر کے افغانستان میں اسلامی نظام و ثقافت کے نفاذ کا راستہ روکنے پر تُلا بیٹھا ہے۔

○ دوسری بات مسلم حکومتوں سے کرنا چاہوں گا کہ اسلام کے عقیدہ و ثقافت کے ساتھ وہ بھی اپنے ایمان و کمٹمنٹ کا دعویٰ کرتے ہیں مگر عالمی دباؤ کے سامنے خود کو بے بس محسوس کر رہے ہیں، ان کے لیے اپنے ایمان و عقیدہ اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ وابستگی کے اظہار کا طریقہ یہی ہے کہ وہ امارت اسلامی افغانستان کے راستے میں روڑے اٹکانے کی بجائے اسے آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیں، وہ اگر تعاون نہیں کر سکتے تو رکاوٹیں کھڑی کرنے سے گریز کریں، ہمیں یقین ہے کہ اگر امارت اسلامی افغانستان کو کسی قسم کی بیرونی مداخلت اور ڈکٹیشن کے بغیر کم از کم دس

سال آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا تو دنیا کے سامنے اسلامی احکام و قوانین کو آئیڈیل نظام کے طور پر پیش کرنے کا جو خواب بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے پیش کیا تھا وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پڑوس میں امارت اسلامی افغانستان کی صورت میں دنیا ضرور دیکھ لے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔